

سلسلہ مواعظِ اشرفیہ نمبر ۸

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حقیقت مالِ حجابہ

از افاضات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

مرتبہ ✓
فشتی عمرب الرحمن خاں

تالیف کردہ

مکتبہ اشرف المعارف، چمپلیکٹ

ملتان شہر ————— قون نمبر ۲۶۷

۱۰۰

تعداد

۱۲ روپے

قیمت

اگست ۱۹۴۲ء

اشاعت اول

ناشر

مکتبہ اشرف المعارف - چلیک - ملتان شہر

طابع

ولیمٹ پنجاب پرنٹنگ پریس - اردو بازار

لاہور

✓ ۲۹۷۶۲
۲۷۵۵
۱۱:۲۲۶

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ
أَوْلَادُكُمْ فَبَيْنَهُمَا



تمہارے اموال اور اولاد میں
تمہاری آزمائش کے لئے ہیں

ترتيب

١	المال والحياه	١٢
٢	احكام المال	٨٣
٣	احكام الحياه	١٩٩
٤	خير المال للرجال	٢٤٥
٥	خير الاناث للاناث	٣٤٩
٦	علاج الحرص	٤١٩
٧	وعظ ميرك	٤٢٢
٨	وعظ الحيات	٥٢٤
٩	مطهر الاموال	٦٢٣
١٠	تائيد النبيا	٦٩٩

تفصیل

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	۱۔ المال والہجاء		۹	علماء اور مال و حجاب	۳۹
۱	فہم القرآن	۲۰	۱۰	جدید طبقہ کے افکار	۴۱
۲	حکماء و اُمت	۲۲	۱۱	علماء اور کافر گیری	۴۲
۳	منافقین کی حالت	۲۴	۱۲	اسلام اور ترقی	۴۵
۴	صلی علی البنی کا اثر	۲۹	۱۳	محبوب ترین چیزیں	۴۹
۵	سماع قرآن کا اثر	۳۱	۱۴	حقیقتِ حُب	۵۳
۶	حقیقی علم	۳۴	۱۵	حقیقتِ حیوۃ دنیا	۵۶
۷	آیت کریمہ کا شان نزول	۳۵	۱۶	مقام بزرگاں	۵۸
۸	مقصود بیان	۳۷	۱۷	احبیت اور محبوبیت کا فرق	۶۰

۱۰۳	مال کے حقوق	۱۲	۶۳	محبت کی علامت	۱۸
۱۰۶	مکافاتِ عمل	۱۳	۶۶	احییت کی علامت	۱۹
۱۰۷	سودی مال اور محق کی	۱۴	۷۲	رعونت کی علامت	۲۰
	حقیقت		۷۴	ضرورت کی چیزیں	۲۱
۱۰۸	رشوت کا اثر	۱۵	۷۷	تفسیری نکات	۲۲
۱۱۰	برکت کی حقیقت	۱۶		۱.۲ احکام المال	
۱۱۱	رشوت کی شرابی	۱۷	۸۵	معاملات میں معصیت	۱
۱۱۳	حضورؐ اور چندہ	۱۸	۸۶	ریوے کی حق تلفی	۲
۱۱۳	مقامِ ابو بکرؓ	۱۹	۸۸	ٹاٹھ کاٹنے کی سزا	۳
۱۱۴	چندہ میں بے احتیاطی	۲۰	۸۹	استعدادِ نفس اور	۴
۱۱۶	پیروں کی حالت	۲۱		نورِ فراست	
۱۱۷	معاشرتِ رسولؐ	۲۲	۹۱	کبیدِ نفس	۵
۱۱۹	قابلِ قدر عقل	۲۳	۹۳	دروغِ مصلحت آمیز	۶
۱۲۱	کورانہ تقلید	۲۴		کے معنی	
۱۲۲	ناسیائز آمدنی	۲۵	۹۴	نفس کی نگرانی	۷
۱۲۶	رائے اور مسئلہ کی قیمت	۲۶	۹۷	اہل علم کی بے احتیاطی	۸
۱۲۹	مشائخ کی حالت	۲۷	۹۷	فقہ اور اہل علم	۹
۱۳۲	حلال و حرام کی تمیز	۲۸	۹۹	منصور اور علماء	۱۰
۱۳۴	دین میں غلو	۲۹	۱۰۱	علماء اور امراء	۱۱

۱۸۷	رسم پرستی	۴۸	۱۳۶	شریعت میں چیزوں	۳۰
۱۹۱	اعتدال کی ضرورت	۴۹		کی اقسام	
۱۹۳	اخراجات کی حدود	۵۰	۱۳۹	مجتہد کا کام	۳۱
۱۹۶	نام اور کام کی اہمیت	۵۱	۱۴۳	شریعت میں وسعت	۳۲
	۳۔ احکام الحجاب		۱۴۶	اہل خصوصیت کا تقویٰ	۳۳
۲۰۱	تمہید	۱	۱۴۸	ہمارا تقویٰ	۳۴
۲۰۲	ایک اہم کوتاہی	۲	۱۵۱	نیوٹن کے مفاسد	۳۵
۲۰۳	شریعت کی آسانی	۳	۱۵۵	میراث کی خرابیاں	۳۶
۲۰۵	علماء سے وحشت	۴	۱۵۷	آمد و خرچ کے معاملات	۳۷
۲۰۷	شریعت پر تنگی کا الزام	۵	۱۵۹	مسلمانوں کی تباہی کا راز	۳۸
۲۱۰	خرگوش کی دانائی	۶	۱۶۲	زمین کی حقیقت	۳۹
۲۱۲	ہماری کم فہمی و بے عقلی	۷	۱۶۵	اسراف و تبذیر	۴۰
۲۱۴	آج کل کے محققین	۸	۱۷۰	ایک قابل عمل بات	۴۱
۲۱۶	تعلق باللہ	۹	۱۷۳	قرآن اور جمہوری نظام	۴۲
۲۱۹	تقرب الی اللہ	۱۰	۱۷۶	شیطان کا مکہ	۴۳
۲۲۰	شرط طلب و رضا	۱۱	۱۷۸	اہل اللہ کی معاشرت	۴۴
۲۲۳	تعلق بالخلق	۱۲	۱۸۱	ہر چیز میں نفاذ	۴۵
۲۲۵	اثر و جاہلست	۱۳	۱۸۳	یورپ کی اندھی تقلید	۴۶
۲۲۸	ترقی کی حقیقت	۱۴	۱۸۶	انگریزی طرز اخلاق	۴۷

۲۸۱	استحقاق اور فضل	۲	۲۳۲	قرآن فہمی	۱۵
۲۸۲	شغل اور اشتغاق	۳	۲۳۴	جاہ کی حدود	۱۶
۲۸۵	غم اور فکر	۴	۲۳۶	حکومت اور شریعت	۱۷
۲۸۸	محبت اور عمل	۵	۲۴۰	بادشاہت اور جمہوریت	۱۸
۲۹۲	نادان کی دوستی	۶	۲۴۳	جاہل واعظ	۱۹
۲۹۴	احکام و آثار	۷	۲۴۴	کنہہ ناتراش پیر	۲۰
۲۹۶	غزوہ احمد	۸	۲۴۸	شیخ کامل کا معیار	۲۱
۲۹۹	داخلہ جنت کی خوش فہمی	۹	۲۵۲	جذب منصب کی صورت	۲۲
۳۰۱	دین و دنیا کا تعلق	۱۰	۲۵۵	حضور کی بدنی قوت	۲۳
۳۰۴	اہل اللہ کی حالت	۱۱	۲۵۷	حضور کا اصلی مذاق	۲۴
۳۰۹	بذوق حلال کا اثر	۱۲	۲۵۸	جاہ طلبی	۲۵
۳۱۰	تعلق باللہ کا تعلق دنیا	۱۳	۲۶۱	جاہ کا مصرف	۲۶
	پیر اثر		۲۶۵	حکام اور میاں جی کے لئے دستور العمل	۲۷
۳۱۲	دین اور فہم	۱۴		نسب اور فخر	۲۸
۳۱۵	چند غلط فہمیوں کا ازالہ	۱۵	۲۶۶	باطنی تصرف	۲۹
۳۱۸	مذہب کا اثر	۱۶	۲۶۹	سفارش کا مسئلہ	۳۰
۳۲۰	کورانہ تقلید	۱۷	۲۷۱	مخیر المال للرجال	۳۱
۳۲۲	بعثت انبیاء کا مقصد	۱۸		علم اور عمل	۳۲
۳۲۶	کسب حلال اور حلال دنیا	۱۹	۲۷۸		

۳۸۰	خوارج اور معزولہ کا مذہب	۶	۳۲۸	علماء اور کسب دنیا	۲۰
۳۸۳	حُب اللہ و بغض اللہ	۷	۳۳۲	علماء اور امراء کے	۲۱
۳۸۸	حق تعالیٰ کے غنی ہونے کے معنی	۸		اختلاط کا اثر	
			۳۳۳	علماء اور تنخواہ	۲۲
۳۸۹	شیطان سے رعایت	۹	۳۳۶	آزمائش علماء	۲۳
۳۹۱	احتیاط کی ضرورت	۱۰	۳۳۹	اہل اللہ کا استثناء	۲۴
۳۹۳	مقام طالب و مطلوب	۱۱	۳۴۳	جمعیت قلب	۲۵
۳۹۵	کفار کی غلط فہمی	۱۲	۳۴۶	طریق تربیت	۲۶
۳۹۷	دولت اور کفار کی	۱۳	۳۵۰	طریق عمل	۲۷
	خصالت		۳۵۲	سختی و مشائخ کی حکمت	۲۸
۳۹۹	حُب مال کے اثرات	۱۴	۳۵۳	عادت اللہ	۲۹
۴۰۱	مال اور فخر	۱۵	۳۵۶	ذکر اللہ	۳۰
۴۰۵	عورتوں کا مذاق	۱۶	۳۶۰	عمل اور ایجہ	۳۱
۴۰۷	عورت اور زیور	۱۷		۵-خیر الاثبات للاناث	
۴۰۸	عورت اور حجب و عینیت	۱۸	۳۷۱	تمہید	۱
۴۱۰	عربیہ اور راحت	۱۹	۳۷۲	دو قسم کے امراض	۲
۴۱۳	ایک آسان مراقبہ	۲۰	۳۷۴	عورتوں کی قسمیں	۳
۴۱۵	شادی میں بربادی	۲۱	۳۷۶	عورتوں کی ناشکری	۴
۴۱۶	اہل اللہ کی کشش	۲۲	۳۷۷	عورت اور حجب جاہ	۵

۲۵۸	شفاعتِ انبیاء اور پیر	۱۹	۴- علاجِ الحرس	
۲۵۹	حرم کا طبع علاج	۲۰	تمہید	۱
۲۶۲	تعلق باللہ	۲۱	عورت اور حرم	۲
۲۶۶	توجہ الی اللہ	۲۲	موت اور اختیار	۳
۲۶۷	اعمالِ ظاہرہ	۲۳	نکاح بیوگان	۴
۲۶۹	مضید مستحبات	۲۴	فقاہت اور ضرورت	۵
۲۷۲	رج اور تجارت	۲۵	تفویض کی اہمیت	۶
	ع- وعظ میرٹھ		موت کے مشتاق	۷
۲۷۹	طلب اور ذریعہ	۱	راحت کی صورت	۸
۲۸۱	اسباب اور آخرت	۲	سباہ کی ہوس	۹
۲۸۳	اسباب اور اثر	۳	آدم اور انسان	۱۰
۲۸۵	طلبِ جنت کا ذریعہ	۴	آج کل کی ترقی	۱۱
۲۸۷	حال اور کمال	۵	ترقی خیر	۱۲
۲۸۹	حصولِ جنت کے طریقے	۶	ہوس اور موت	۱۳
	محتوت اور بے خودی	۷	گناہ اور طاعت کا کمال	۱۴
۲۹۳	بقیہ اور فتنی کا فرق	۸	ماہِ رمضان اور شیطان	۱۵
۲۹۵	طلبِ جنت کا گمراہ	۹	خود رانی کا علاج	۱۶
۲۹۸	افراطِ خوف اور کفر	۱۰	معادہ بیعت	۱۷
۵۰۱			ضرورتِ رہبر و دست گیر	۱۸

۵۳۶	نئی تراش و خواش	۲۷	۵۰۴	خوشبخت محمود	۱۱
۵۳۷	خواہش نفسانی کا علاج	۲۸	۵۰۶	ضرورت غور و فکر	۱۲
۵۴۰	طاہریت کی لذت	۲۹	۵۰۷	غریب نفس اور اتباع نفس	۱۳
۵۴۱	طاہریت کی تدبیر	۳۰	۵۰۹	اہل عرف اور فہم	۱۴
	۸۔ وعظ الحیاة		۵۱۳	احسانات اور کفران	۱۵
۵۴۷	فلاح کا طریقہ	۱		نعمت	
۵۴۹	ذکر اللہ اور دنیا	۲	۵۱۶	معصیت کی دنیاوی	۱۶
۵۵۲	جنت کی اہمیت	۳		معجزات	
۵۵۴	دنیا کی دمن	۴	۵۱۸	طاہریت کا اثر	۱۷
۵۵۶	راحت قلب	۵	۵۱۹	ریا اور عبادت	۱۸
۵۵۹	اہل حال و اہل مقام	۶	۵۲۱	معصیت اور محضرت	۱۹
۵۶۲	تغویض اور راحت	۷	۵۲۴	ایمانداری کی مثال	۲۰
۵۶۷	نعمت دنیا و آخرت	۸	۵۲۶	ایثار کی نادر مثال	۲۱
۵۶۸	ترجیح دنیا کی مذمت	۹	۵۲۷	اتباع فتویٰ	۲۲
۵۷۰	علامت حب اللہ	۱۰	۵۲۹	محبت الہی اور مصاحبت	۲۳
۵۷۵	اعمال کی حقیقت	۱۱		دنیوی	
۵۷۸	عبدیت اور رسالت	۱۲	۵۳۰	اتباع حق کی ضرورت	۲۴
۵۷۹	عمل اور جنت	۱۳	۵۳۲	اتباع کی چیزیں	۲۵
۵۸۱	محبت اور اطاعت	۱۴	۵۳۴	صحیح طریق تعلیم	۲۶

۱۵	کمالاتِ انبیاء	۵۸۲	۳۱	کچھ عورتوں کے متعلق	۶۱۵
۱۶	شانِ اولیاء	۵۸۷	۳۲	علاجِ شیخ کی اہمیت	۶۱۸
۱۷	حضرت سلیمانؑ اور سلطنت	۵۸۹	۳۳	مداومت کی ضرورت	۶۱۹
۱۸	ایمان اور تردد	۵۹۰	۱	تمہید	۶۲۵
۱۹	قرآن اور ترجمہ	۵۹۲	۲	مال اور مسلمان	۶۲۷
۲۰	وساوس اور اسباب	۵۹۳	۳	طلبِ منصب	۶۳۰
۲۱	فضیلتِ آخرت	۵۹۵	۴	مدح میں قدح	۶۳۳
۲۲	مومن اور دنیوی متاع	۵۹۸	۵	کمالاتِ انبیاء	۶۳۴
۲۳	تارکِ دنیا اور	۵۹۹	۶	بزرگوں کی قسمیں	۶۳۸
۲۴	متروکِ دنیا		۷	ترغیبِ اتفاق	۶۴۰
۲۵	حُبِ حق	۶۰۰	۸	ایک عجیب سوال	۶۴۲
۲۶	طریقِ اصلاح	۶۰۳		وجواب	
۲۷	بچوں کی تربیت	۶۰۴	۹	تدبیر و تدبیر	۶۴۴
۲۸	اہل اللہ کی اصلاح	۶۰۶	۱۰	حقیقت کی کنجی	۶۴۶
۲۹	علم اور اصلاح	۶۰۹	۱۱	مصیبت و راحت	۶۴۸
۳۰	ایہل اللہ کی قوتِ قلبیہ و جہانگیر	۶۱۱	۱۲	زیارتِ مال کے اثرات	۶۵۲
			۱۳	علماء کی کوتاہی	۶۵۵
		۶۱۲	۱۴	حفاظتِ دین کا انتظام	۶۵۷

۷۰۳	۲	۷۵۹	۱۵	سادگی اور عزت
۷۰۴	۳	۷۶۲	۱۶	سادگی کی چند مثالیں
۷۰۶	۴	۷۶۵	۱۷	طلب اور اتباع
۷۰۹	۵	۷۶۷	۱۸	بے جا گھبراہٹ
۷۱۴	۶	۷۷۰	۱۹	چندہ کی تحریک
		۷۷۱	۲۰	آیت متلوہ کا شان نزول
۷۱۷	۷		۲۱	طہارت ظاہری و باطنی
۷۱۹	۸	۷۷۵	۲۲	اہل اللہ کی اصلاح
۷۲۱	۹		۲۳	طہارت باطنیہ کے حصول کا طریق
		۷۸۰	۲۴	تزک معاصی کی ضرورت
۷۲۴	۱۰	۷۸۵	۲۵	نسبتِ راستہ کا اثر
۷۲۸	۱۱		۲۶	مجاہدہ کی ضرورت
۷۲۹	۱۲	۷۸۸	۲۷	مراقبہ موت کی ضرورت
۷۳۲	۱۳	۷۹۲	۲۸	خاتمۃ البیان
۷۳۳	۱۴	۷۹۴		انتائیس البیان
۷۳۴	۱۵	۷۹۵		تمہید
۷۳۸	۱۶	۷۹۷		
۷۳۹	۱۷	۸۰۱		

۱۸	مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ	۷۴۲	۲۶	مکان اور تقوسے	۷۴۲
۱۹	قرآنی طرز نصیحت	۷۴۴	۲۷	مکان اور ضرورت	۷۴۵
۲۰	تعمیری بنیاد	۷۵۰	۲۸	عشق اور وظیفہ	۷۴۷
۲۱	مکان کی اہمیت	۷۵۱	۲۹	تواضع اور زعم کا فقدان	۷۷۱
۲۲	قوم عاوی کی تقلید	۷۵۳	۳۰	عبادت اور نخوت	۷۷۴
۲۳	اہل فساد کے قلعی	۷۵۵	۳۱	تعمیر میں خلوص کا اثر	۷۷۶
۲۴	مدد اور کھالیں	۷۵۷	۳۲	قلب اور موت	۷۷۸
۲۵	تعمیر مساجد اور احتیاط	۷۵۹	۳۳

المال والجاه

مال و جاہ کی نسبت یہ وعظ ۱۱ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ کو باغیچہ مکان
عبدالباقی خاں صاحب الزآباد میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو
تین گھنٹہ میں منبٹ میں ختم ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی
نے قلمبست فرمایا

خطبة ماثوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمدًا واستعينه واستغفره واؤمن به ونتوكل
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
وشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وشهد
ان محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى آله
واصحابه وبارك وسلم اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان
الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم هُمُ الَّذِينَ
يَقُولُونَ لَا تَنْفِقُوا عَلَىٰ مِنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ
يَنْفَضُوا وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ
الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى
الْمَدِينَةِ لَخُيْرُ جَنَّ الْأَعْرَضِ مِنْهَا الْأَذَلُّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَ
لِرَسُولِهِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ

ترجمہ

یعنی یہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ
 رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو
 لوگ جمع ہیں ان پر کچھ خرچ مدت کر دیں
 تک کہ یہ آپ منتشر ہو جائیں گے۔ خدا تعالیٰ
 ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں کے
 اور زمینوں کے لیکن منافقین سمجھتے نہیں
 ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ
 کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت
 والے کو باہر نکال دے گا۔ اللہ ہی کی
 ہے عزت اور اس کے رسول صلی اللہ
 علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی لیکن منافقین
 جانتے نہیں! —————

فہم قرآن

حضرات! یہ آیتیں ہیں سورہ منافقون کی۔ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ نے بعض اقوال منافقین کے بیان فرمائے ہیں اور یہ فرقہ منافقین کا یعنی ان کا حکم اس وقت باقی نہیں رہا اور اس وقت تو کیا خود حضورؐ کے زمانہ کے بعد ہی یہ نفاق جو اصطلاح شرعی میں ہے رفع ہو گیا تھا۔ مگر نفاق بمعنی عدم اتفاق یا بمعنی مطلق ظاہر کا خلاف باطن ہونا موجود ہے مگر اس محاورہ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ کیونکہ اس وقت قرآن مجید کے ترجمہ چھپ گئے ہیں۔ اور لوگ دیکھتے ہیں اور اس میں کامیابی ہونا مشکل ہے کہ لوگ ترجمہ دیکھنا چھوڑ دیں۔ اور اس وقت بھی اس مضمون سے کہ ترجمہ نہ دیکھیں، شاید وحشت ہوتی ہو۔

مگر بات یہ ہے کہ ان امور میں تجربہ کو زیادہ دخل ہے اور تجربہ ان امور کا اہل علم کو زیادہ ہے۔ تو میں چونکہ ان واقعات کو مشبہ و روز دیکھتا ہوں

اس لئے عین بارگاہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ ترجمہ اگر دیکھنے کو جی چاہے تو اس کی صورت صرف یہ ہونا چاہئے کہ کسی عالم سے اس کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ہر فن کے ساتھ ایسا ہی عمل کیا جاتا ہے۔ تو علم تفسیر بھی بغیر کسی عالم سے حاصل کئے نہیں آ سکتا۔ تو عرض یہ ہے کہ اگر اول ترجمہ کسی عالم سے پڑھ لے اور پھر دوسری تفاسیر دیکھے تو غلطیوں سے بچ سکتا ہے اور اگر اول ہی سے ترجمہ دیکھے گا اور کسی عالم سے نہ پڑھے گا۔ تو اس کو مواقع مشتبہ کی تعبیر ہی میں سخت دقت ہوگی۔ کیونکہ مبادی و شروع کی باتیں جن پر آگے علوم کا جاننا موقوف ہو، اور اصول و قواعد کا اس کو علم نہیں اور اگر ہوگا، تو بے موقع ہوگا۔

اسی لئے اگر ترجمہ پڑھے بھی تو کسی متبحر عالم سے پڑھے۔ صرف عربی جاننے والے سے پڑھنا بھی کافی نہیں اور متبحر عالم سے بھی سبقاً سبقاً پڑھے۔ پھر ان ہی سے پوچھے کہ میرا فہم قرآن شریف کے مضامین کا متحمل ہے یا نہیں اگر وہ متحمل تباویں تو خیر ورنہ چند روز کے لئے چھوڑ دیا جاوے اور پھر علماء سے مبادی و اصول کو حاصل کرے اور پھر اس کے بعد ترجمہ پڑھے۔ تو قرآن مجید کا ترجمہ دیکھنے کے متعلق یہ تفصیل ہے۔ تو اگر دیکھا جاوے، تو اس طرح دیکھیں۔

لیکن ممکن ہے کہ اس پر کوئی عمل نہ کرے اور ایسا شخص اس میں منافق وغیرہ کا لفظ دیکھے جن میں لوگوں کی اصطلاحات بدل گئی ہیں تو اصطلاح بدلنے میں یہ خرابی ہوگی کہ جب آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ منافقین جہنم کے نیچے

کے وجہ ہیں اور منافقین کے معنی آپ سمجھیں گے نا اتفاق کرنے والے
تو آپ ان گنہگاروں کے لئے یہ حکم دیں گے جو کہ محض غلط ہے۔

اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے
میں حجرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ پوچھنے لگے کیا لکھتے ہو۔ میں نے کہا کہ
تصویر شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ تو تصویر شیخ کا لفظ سن کر کیا کہتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا
کا۔ انہوں نے عمر بھر سوائے بوعلی سینا کے اور کسی شیخ کا نام ہی نہیں سنا تھا
تو جہاں کہیں شیخ کا ذکر آئے گا، وہ تو یہی سمجھیں گے کہ بوعلی سینا مراد ہیں۔ تو
جو اصطلاح ذہن میں مچی ہوئی ہوتی ہے۔ ان الفاظ کو ہر جگہ اُسی پر محمول کیا جاتا

۶۳۱۱

اسی طرح ایسا نتیجہ دیکھنے والا شخص کرے گا۔ اور آج کل
حکماء و ائمہ
بڑی گنجشک کی وجہ سے خود توجہ دیکھتے ہیں۔ اور
شرعی اصطلاحات اور اصول سے واقف نہیں رہے۔ اس لئے لڑتے ہیں
اولاؤل خود لڑتے ہیں پھر علماء کو بھی شریک کر لیتے ہیں کہ ان سے اپنے مقابل
کے لئے فتوے لیتے ہیں۔ اگر علماء ان سے منسوب ہو کر ان کی اصلاح
کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کو سمجھتے ہیں کہ علماء ان سے منسوب ہو کر ان کی اصلاح
کی بدولت ہی یہ فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً کسی نے استفتاء کیا کہ ایک شخص نے ایسا کہا تو اس کا ایمان کیا یا
رہا جیسا کہ ایک شخص کا خط آیا ہے کہ زید نے فقہ کی فلافی کتاب کو پڑا کہا
تو زید کا ایمان رہا یا گیا۔ تو اگر میں اس خوش اخلاقی کو کام میں لاؤں جن کو وہ

خوش اخلاقی سمجھتے ہیں کہ بدذوق اس کے کہ اُن کے سوال میں جرح قدح کدوں کہ اُن کی مرضی کے موافق لکھ دوں جیسا ظاہری عنوان سوال کا مقتضایہ ہے۔ تو وہ دوسرے کو دکھلا دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دیکھنے والے کہیں گے کہ اس کو فلاں شخص نے کافر کہہ دیا۔ پس یہ کافر ہے۔ پھر اُس قائل کو خبر ہوگی۔ تو بات بڑھے گی تو خوش اخلاقی سے یہ فتنے برپا ہوئے اور عام طور پر یہی فتنے مولویوں میں پھیل رہے ہیں۔

ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مولوی لوگ بھی بادشاہوں سے کم نہیں جیسے اُن کے یہاں پلیٹن اور سائے ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے یہاں کتابیں اور رسالے ہیں۔

غرض عوام الناس ترجے اور کتابیں دیکھ دیکھ کر مولویوں تک میں یہ فتنے پھیلا دیتے ہیں۔ اس لئے محققین ان کو ایسے مطالعہ سے روکتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بعضی بات ظاہر میں تو معمولی سی ہوتی ہے مگر فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ حکماء اُمرت کو حق تعالیٰ نے ادراک ایسا عنایت فرمایا ہے کہ وہ ذرا سی بات کو سمجھ لیتے ہیں کہ نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ جو اوزوں کو آئینہ میں نظر آتا ہے اہل نظر کو اینٹ میں نظر آتا ہے۔ سو ایسے مصلحین کو آج کل متعصب کہا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ لوگ ایسی چیز کو جو بظاہر عبادت ہے رک دیتے ہیں تو ان کو خشک بتلایا جاتا ہے اور چاہا جاتا ہے کہ ایسے تر ہو جاویں کہ ڈوب ہی جاویں۔

خیال تو فرمائیے خود حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے بعض ایسے امور کو

روک دیا ہے جو کہ حضورؐ کے زمانے میں ہوتے تھے مثلاً عورتوں کا مسجد میں آنا کہ نصاً ثابت ہے اور صحابہ اُس کو دے دیتے ہیں۔ تو بظاہر یہ نص سے معارضہ ہے مگر حکماء امت نے اچھی طرح اس کا راز سمجھ کر اتفاق کر لیا۔ کسی نے سختی کے ساتھ اور کسی نے ذرا نرمی کے ساتھ۔

چنانچہ ہمارے امام صاحبؒ نے اس باب میں نہایت سختی فرمائی ہے کہ عجز و دُڑھیا، کو بھی مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں۔
 لکل ساقطۃ لا قطة
 ہر گئی پڑی چیز کا اٹھانے والا
 موجود ہے یعنی ہر عورت کی طرف کوئی نہ کوئی میلان کرنے والا
 موجود ہے۔

اور دوسرے علماء نے بھی اگرچہ کسی قدر نرمی کی ہو مگر اولیٰ اسی کو سمجھا ہے لیکن کسی نے اس انکار کو رد نہیں کیا۔

غرض علماء بوجہ اپنے تجربہ اور انجام بینی کے بعض ایسے امور کو روک دیتے ہیں جو بظاہر عبادت ہے لیکن چونکہ وہ معضی الی المعاصی دگنا ہوں کی طرف پہنچا بیٹا ہوتے ہیں اس لئے علماء روک دیتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس باب میں ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوا کرتی۔

مثلاً اگر پارلیمنٹ کے ممبر ایک رائے تجویز کریں اور ایک دیہاتی یہ کہے کہ میری رائے اس کے خلاف ہے تو دیکھئے کیا گت بنتی ہے۔ اور معتبر وہی ہوگا جو ممبروں کی رائے ہے۔

اسی طرح دنیاوی معاملات میں وکیل کے سامنے کوئی نہیں بولتا اور اسی

رائے کا اعتبار کرتا ہے جو وکیل کی رائے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر اپنی سمجھ میں وکیل کی رائے نہ بھی آوے جب بھی انہی کی رائے پر اعتبار کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم چونکہ قانون سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اس وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ دین میں ہر شخص اپنے کو ماہر سمجھتا ہے اور اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔ اور دین میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ چونکہ ہم اُس کے اصول اور مبادی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس لئے ہماری رائے قابل اعتبار نہیں ہے اور علماء کی رائے میں دخل دینا مناسب نہیں۔ غرض ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوتی جیسا اب نرا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو اہل الرائے سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک صاحب نے ترجمہ یاد کیا تھا اور ایک عالم کے پوچھنے پر مضامین کے معنی بہت جوش مارنے والے بتلائے۔ خیر یہاں تک تو خبریت تھی۔ آگے اُن عالم نے پوچھا، بہت کا ہے کے معنی اور جوش مارنے والے کا ہے کے معنی۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ نضا کے معنی بہت اور ختان کے معنی جوش مارنے والے۔

تو کیا ایسوں کی بھی رائے معتبر ہوگی۔ البتہ جو لوگ مبادی اور اصول کے ماہر اور علوم عربیہ سے اچھی طرح واقف اور متبحر عالم ہوں اُن کی رائے معتبر ہوگی۔ اور دوسروں کو ایسے لوگوں کی تقلید ضروری ہوگی نہ کہ اُن کے فتوؤں پر قیل وقال اور جواب و سوال۔ اور مصلحین کو بھی سچا ہٹے کہ ایسوں کے سوالات کے جوابات مضابطہ سے دیا کریں۔ عرفی خوش خلقی کو کام میں نہ لایا کریں۔

Marfat.com

عرض علماء اور حکماء امت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا اور ک
عطا فرمایا ہے۔ اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعض ایسی چیزوں
کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں
بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی
واقفیت کے جب تک امتداد سے نہ پڑھا جائے گا اُس وقت تک یہ
اندر لیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو

منافقین کی حالت

کافر ہوا اور خاص موقعوں پر اُس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو
اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے۔ اور گو حضور کو علم ہو گیا تھا اُن کے منافق ہونے
کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے
کہ اس میں مصلحت تھی۔ اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں۔ لہذا اگر دلیل
سے کفر ثابت ہو جاوے گا، اُس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس
مقام پر حق تعالیٰ نے منافقین کے مقولہ کو بیان فرما کر اُن کا رد کیا ہے۔ اول
میں ترجمہ عرض کرتا ہوں :-

وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر خروج مرت کو
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں
اور اللہ ہی کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

لیکن منافقین نہیں سمجھتے (اور) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ
 کر گئے تو ہم میں جو عزت والا ہے (یعنی ہم) وہ ذلت والے کو
 (یعنی صحابہ کو) نکال دے گا۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے عزت اور
 اُس کے رسولؐ کے لئے اور اہل ایمان کے لئے لیکن منافقین
 نہیں جانتے۔

قصہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین
 اور انصار وغیرہ سب تھے۔ اور غزوہ (جہاد) اور لڑائیوں میں منافقین بھی اکثر
 ساتھ جایا کرتے تھے اور اُن کی غرض کبھی تو یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اسرار و جہاد
 معلوم کر کے کفار کو اطلاع دیں جیسے جاسوس کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ
 وفیکم سمعون لہم۔ یعنی تم میں اُن کے کچھ جاسوس
 موجود ہیں۔

قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور کبھی غنیمت میں حصہ لینے کو جاتے تھے کیونکہ
 ظاہری اسلام کے سبب مال غنیمت میں اُن کو بھی حصہ ملتا تھا۔ اور حکمت اس
 کی یہ کہ لڑائی لڑنے والے اپنی ملک کی قوت پر لڑا کرتے ہیں۔ تو چونکہ یہ لوگ
 ظاہر میں بطور ملک کے جاتے تھے اُن کو بھی مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور اُن
 سے معاملہ مسلمانوں کا سا کیا جاتا تھا اور وہ جانتے بھی تھے کہ مسلمان ہم سے
 یہ بڑتاؤ کریں گے۔ اور بعض مرتبہ دونوں طرف سے لیتے تھے کہ کفار سے جا کر
 کہتے تھے کہ ہم نے تمہارے بھلے کی یہ رائے دی تھی۔ تو غرض یہ ہے کہ
 منافقین بھی جایا کرتے تھے۔ تو اس غزوہ میں بھی یہ لوگ شریک تھے اور

جہاں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔ بلکہ اچھوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھوں کو اس پر اصرار نہیں ہوتا۔ تو اتفاق سے دو شخصوں میں کچھ گفتگو پڑھ گئی۔

صل علی النبی کا اثر

ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ایک گندی بات ہے۔ تو وہ جوش اُن لوگوں کا فوراً کم ہو گیا۔

اور تعجب نہ ہو کہ اتنی سی بات میں کیوں کر جوش کم ہو گیا۔ تو اس کا نمونہ اب بھی موجود ہے کہ عرب سب سے زیادہ سخت مشہور ہیں۔ بالخصوص بدوی کہ اُن میں محسوسات کا بھی علم نہیں۔

چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ کسی قافلہ کی لوٹ میں بدوؤں کو ایک گھڑی ملی۔ اُس کی آواز سن کر کمیٹی ہوئی کہ اس میں کیا ہے۔ اخیر تشنیں یہ تھی کہ اس میں جن ہے۔ پھر اس کو توڑا تو وہ بند ہو گئی۔ تو کہتے ہیں کہ

نَحْنُ قَتَلْنَا الْجَنِّيَ۔ یعنی ہم نے جن کو مار ڈالا۔

تو ایسی قوم بہت ہی خطرناک ہوگی۔ اور اُن کو دین کی بھی اطلاع نہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ کنواں موجود ہے اور تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ بعض نماز ہی نہیں پڑھتے۔ غرض اُن میں نہایت ہی جہل ہے۔ غصہ میں فوراً تلوار نکل آتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ حالت ہے کہ کیسے ہی جوش میں ہوں اور ایک ادنیٰ سا آدمی پیچ میں جا کر کہہ دے کہ

یا ثانیہ صلی علی النبی

یعنی اے شیخ! رسول اللہ صلی

ایک مرتبہ میرے پاس ایک عہدہ دار کا خط آیا کہ کافر سے سو لینا کیوں
 حرام ہے۔ میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے اور خلاصہ
 اُن کے اس سوال کا علت کا سمجھنا تھا۔ تو سمجھ لیجئے کہ علت کا سمجھنا خواص
 کا کام ہے۔ تو اُن عہدہ دار صاحب نے علت پوچھی تھی۔ تو اگر میں خوش خلقی
 کو کام میں لاتا اور کچھ لکھ دیتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ ج

مغز یا خورد و خلق خود بدید

ہمارا مغز کھایا اور لپٹنا خلق پھاڑا۔ یعنی ہمارا دماغ بھی خالی کیا اور
 خود کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

تو میں نے یہ لکھ دیا کہ زنا کیوں حرام ہے۔ وہ بہت خفا ہوئے اور مجھ
 کو لکھا کہ علماء کو ایسا خشک اخلاق نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے اُن کو ردی میں ڈال دیا
 اس کے بعد اتفاق سے وہ مجھے ایک سفر میں ملے اور زبانی گفتگو سے سمجھ گئے
 اور پھر کبھی کوئی بات فضول نہیں پوچھی۔

اس پر میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اول ہی سے جواب میں ضابطہ کا پرتاؤ کیا
 جاتے تو سائلین کی جرأت کی یہاں تک نوبت کیوں آئے۔
 اسی طرح ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ افریقہ دارا الحرب ہے یا دارالاسلام
 اب اگر میں ان کے ساتھ خوش خلقی کرتا تو چار گھنٹہ تک مغز مارتا۔ اس لئے میں
 نے اُن سے کہا کہ اول یہ بتلا دو کہ اگر دارالاسلام ہونا معلوم ہو جائے، تو کیا
 کرو گے اور اسی طرح دارا الحرب ہونا بھی پس چُپ ہو گئے۔ تو ایسی باتوں کو اس
 طرح روکنا چاہئے۔

عرض علماء اور حکماء اُمت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا اور ک
عطا فرمایا ہے۔ اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعض ایسی چیزوں
کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں
بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی
واقفیت کے جب تک اُستاد سے نہ پڑھا جائے گا اُس وقت تک یہ
اندر لیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

منافقین کی حالت | اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع
کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو

کافر ہو اور خاص موقعوں پر اُس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو
اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے۔ اور گو حضور کو علم ہو گیا تھا اُن کے منافق ہونے
کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے
کہ اس میں مصلحت تھی۔ اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں۔ لہذا اگر دلیل
سے کفر ثابت ہو جاوے گا، اُس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس
مقام پر حق تعالیٰ نے منافقین کے مقولہ کو بیان فرما کر اُن کا رد کیا ہے۔ اول
میں ترجمہ عرض کرتا ہوں :-

وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر خروجِ مرت کو
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں
اور اللہ ہی کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔
 فوراً تلوار کو نیام میں کر لیتے ہیں اور اللہ صلی علی سیدنا — الخ
 پڑھنے لگتے ہیں۔

تو اب بھی ایک داعی (دین کی طرف بلائے والے) کے سبب جوش فرو
 ہو جانے کا ایک نمونہ موجود ہے اور یہ نمونہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل
 ہر واقعہ کو نظیر ہی سے مانا جاتا ہے۔

چنانچہ رام پور میں معراج کے متعلق ایک صاحب نے یہی سوال کیا کہ اس
 کی کوئی نظیر بھی ہے۔ حالانکہ اگر نظیر بھی نہ ہو لیکن نقل صحیح ہوا اور عقل کے خلاف
 نہ ہو تو بس مان لو مگر پھر بھی انکار ہوتا ہے۔ جیسا کہ محدثین کے حافظہ کا انکار
 ہے کہ دو ورق کی حدیث کیسے یاد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ایک
 مقدمہ کا ضمنی دعویٰ ہے کہ جو سمجھ میں نہ آوے وہ غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر
 سمجھ سے کسی خاص آدمی کی سمجھ مراد لی جائے تو کبریٰ اس قیاس کا غلط ہے کیونکہ
 کسی خاص کی سمجھ میں نہ آنے سے کوئی بات غلط نہیں ہو جاوے گی اور جو عام
 مراد ہو تو صغریٰ غلط ہے کیونکہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن
 تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بخیل شہد سے روٹی کھا رہا تھا
 اُس کے ایک دوست آگئے۔ تو بخیل نے یہ خیال کیا کہ یہ بھی کھانے میں شریک
 ہو جائے گا۔ کوئی ایسی صورت کرنی چاہئے کہ یہ نہ کھاوے۔ تو روٹی چھپا دی
 اور شہد اس خیال سے پیش کر دیا کہ خالی شہد کیا کھاوے گا۔ مگر وہ لگا چاٹنے تو

بخیل کہتا ہے کہ

یا اخی انہ یحرق القلب یعنی بھائی! یہ قلب کو جلا دیتا،

بخیل کے دوست نے یہ سنا اور نہیں کہہ سکتا ہے کہ

نعم ولكن قلبی ہاں یہ سچ ہے مگر آپ کے دل کو

تو جیسے بخیل کا یہ کہنا تو سچ ہے لیکن کس کا قلب۔ اسی طرح یہ تو ٹھیک ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کس کی سمجھ میں۔ ہماری تو سمجھ میں آتا ہے گو نمونہ بھی نہ دیکھا جاتا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس زمانہ میں ایک نمونہ اس کا بھی ظاہر فرما دیا۔

میں نے متعدد معتبر آدمیوں سے حافظ رحمت اللہ صاحب الہ آبادی کے حافظہ کے واقعات سنے ہیں۔ قاضی وصی الدین صاحب کا پورہ میں قرق ابن تھتے اور نہایت ثقہ (معتد) اور معتبر آدمی تھے۔ گو جنید بغدادیؒ نہ ہوں لیکن تاہم ایک ثقہ اور معزز آدمی تھے اور جو لوگ معزز ہوتے ہیں وہ عادتاً جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ حافظ صاحب کا پورہ میں آئے۔ میں نے درخواست کی کہ آپ کا حافظہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کوئی کتاب لاکر میرے سامنے طویل عبارت پڑھ دو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کتب خانہ میں سے افق المبین نکال لایا۔ جو بہت باریک لکھی ہوئی تھی اور بڑی تقطیع پر تھی۔ اور اس کے دو صفحے ان کے سامنے پڑھے۔ انہوں نے بعینہ تمام عبارت سنا دی۔

اور بھی بعض علماء کی اس قسم کی حکایت سنی گئی ہے۔ تو حق تعالیٰ کو سب قدرت ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ گو تمہاری سمجھ میں نہ آوے اسی طرح حق تعالیٰ نے صحابہؓ کے اخلاق کا نمونہ مکتوڑا سا اب بھی باقی رکھا ہے

کہ ایسے جاہل عرب بدوی جن میں علم بھی نہیں اور ایسے سخت اور جوشیلے کہ ذرا سی بات میں معمولی غصہ میں تلوار نکال لیتا اور آپس میں کشت و خون کر ڈالتا ان کے نزدیک ایک معمولی سی بات ہے مگر باوجود اس کے چاہے کیسے ہی غصہ میں بھرے ہوں جس وقت صل علی البقی دہی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوات بھیجی مشین فوراً غصہ کم ہو جاتا ہے۔ اور اللہم صل علی سیدنا۔ الخ پڑھنے لگتے ہیں۔ تو اب تعجب نہ ہوگا کہ دو صحابی جو آپس میں بگڑ رہے تھے حضور کے منع کرنے سے ان کا غصہ فوراً کم ہو گیا۔

سماع قرآن کا اثر | ہاں تو قصہ یوں ہے کہ وہاں ایک رئیس تھا عبداللہ ابن ابی منافق اُس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت حسد تھا اور وہ جو حسد کی یہ تھی کہ حضور کی تشریف آوری سے قبل لوگوں کا قصد تھا کہ اُس کو سردار بنادیں مگر جب حضور تشریف لائے تو گو آپ کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر منجانب اللہ آپ ہی کو سرداری ملی۔ یہ ہے۔

اگر شہرت ہو اس داری امیر دامت عزت ثرو
کہ در پروانہ دار و گوشہ گیری نام عنقا
یعنی اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ نشینی اختیار کرو۔ اس لئے کہ
گوشہ گیری ہی سے عنقا کی شہرت ہے۔

اور عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ من تو اضع اللہ فنع اللہ یعنی جو شخص اللہ کے لئے تو اضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے مراتب بلند فرما دیتے ہیں، حتیٰ کہ مکہ میں ایک مرتبہ کفار نے باہم مشورہ کر کے ایک شخص کو پیام دے

کر بھیجا اور یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو بُرا نہ کہئے۔ تو آپ جو کچھ کہتے اُس کے لئے ہم موجود ہیں۔ اگر آپ کو عورتوں کی تمنا ہو تو جن عورتوں کو آپ پسند فرمائیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہو تو جس قدر چاہیں ہم سے مال لے لیں۔ اور اگر آپ سرداری چاہیں تو ہم آپ کو سردار بنانے کے لئے موجود ہیں۔ اور اس رائے میں تمام بڑے بڑے کفار ابو جہل وغیرہ بھی شریک تھے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی اس درخواست کو نہایت تحمل سے سنتے رہے گو حضور کو سخت ناگوار ہوا۔ اس سے حضور کی کمال خوش اخلاقی بھی ثابت ہوتی ہے۔ آج ذرا سی بات خلاف مزاج ہو تو تحمل نہیں ہو سکتا جب کفار کہہ چکے تو حضور نے بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں شروع کیں۔

حم تنزيل من الرحمن الرحيم کتاب فصلت آیاتہ

قرانا عربیا لقوم یعلمون — الخ

حم، یہ کلام رحمن رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے۔ ایسے لوگوں کے واسطے مفید ہے جو دانشمند ہیں۔

جب اس آیت پر حضور پہنچے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم ضعة مثل ضعة عاد وثمود
یعنی پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی

آفت سے بچاتا ہوں جیسی عاوا اور ثود پر آفت آئی تھی۔

تو وہ شخص گھبرا گیا اور کہا پس کیجئے۔ اور وہاں سے بھاگا۔ اور اس کی بیٹی میں پہنچا
تو ابو جہل اتنا عاقل تھا کہ اس شخص کو دور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کیا تھا اور چہرہ سے
اور آڑٹا ہے اور چہرہ سے۔ اس کا تو خیال بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس
نے آکر بیان کیا کہ بھائیو، قرآن سن کر میری تو حالت بدلنے لگی۔ خصوصاً اس آیت
پر تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک بجلی گری اور میرا کام تمام ہوا۔ بڑی مشکل
سے وہاں سے نکلا۔

حقیقی علم | میں اس قصہ سے کہ ابو جہل نے اس شخص کے بشرہ (پیشانی)
سے کیا استدلال کیا۔ جو اس کے بڑے عاقل فلسفی ہونے کی
دلیل ہے۔ یہ امر بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ علم کو بہت
ترقی ہے۔ سو علم کو بیشک ترقی ہے مگر کون سے علم کو۔ یہی ریل، تار، فونو گراف
بس ان کو ترقی ہے۔ مگر حقیقت میں خود ان کو علم کہنا ہی غلطی ہے۔ اس کو صنعت
کہئے تدبیر کہئے گو بالمعنی الاعم (عام معنی کے اعتبار سے)، علم ہی یہی۔ یوں بعض
علوم وہ بھی ہیں جن کی نشان میں حدیث ہے۔

ان من العلم لجہلا | بعض علوم جہل ہوتے ہیں۔

مگر علم مطلوب واقعی میں تو وہی ہے کہ۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنایدت | رنگ گمراہی زد دل بز و آیدت

واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کی راہ پر لگا دے اور
تمہارے دل سے گمراہی کا رنگ دور کر دے۔

ایں ہوس کا ازسرت بیروں کند خوف و خشیت دولت افزوں کند
خواہشات نفسانی و شیطانی کو تمہارے سر سے نکال کر اللہ تعالیٰ
کا خوف و خشیت تمہارے دل میں زیادہ کر دے۔

اگر کہا جاوے کہ علم کے معنی جاننے کے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ کل ایک
ہنتر کو بھی حق ہو گا کہ وہ اپنے کو ذی علم کہے کیونکہ صحت کے لئے صفائی کی
ضرورت اور ہنتر صفائی کے فن کو جانتا ہے مگر آپ اس کو علم نہیں کہتے۔
جو جس طرح آپ اس کو علم نہیں کہتے ہم ریل، تار، فونو گراف وغیرہ جاننے کو
علم نہیں کہتے۔ ہاں صنعت ہے اور ضروری ہے۔ بس ایسا ہی الجھل فلسفی تھا
اور یہی الجھل معبر بھی ایسا ہی تھا۔ تو تعبیر بھی کوئی بزرگی کی بات نہیں ہے بلکہ
ایک قسم کی فراست ہے۔ تو باوجود ان علوم کی مخالفت کے سبب جس کا منشاء
علم مطلوب کا نہ ہونا تھا الجھل ہو گیا۔

غرض حضورؐ نے اہل مکہ کو یہ جواب دیا تھا
پس نہ مکہ میں حضورؐ نے سرداری کی نہ خواہست

اور نہ مدینہ میں مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بڑا بنائیں اس کو کون جھوٹا کر
سکتا ہے۔ تو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر آپ کی تشریف
واری پر لوگوں نے آپ کو سردار بنا لیا۔ تو عبداللہ بن ابی جہل مرا کہ میری سرداری
پس کی بدولت گئی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔

طلعة الشمس ما یغنیٰ
یعنی سورج کے طلوع ہونے
عن زحل۔
سے زحل سے بے پروائی برقی

جاتی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس وجہ سے سخت حسد تھا۔ اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ تو اس واقعہ سے اس کو سخت ناگواری ہوئی کہ شہری لوگوں کے مقابلہ میں ان پرسیوں کو اتنی دلیری ہو گئی۔ تو اس نے اپنی جماعت میں کہا کہ تم ہی سنے تو ان کو جبری کیا۔ تو اب مدینہ چل کر معاملہ کو بدل ڈالو۔ اور اس کی یہ صورت بتلائی کہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے پس اس کا پہلا مقولہ ہے کہ

ہم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ
حتی ینفصوا

یعنی کچھ خرچ مت کرو رسول اللہ کے ساتھیوں پر کہ سب متفرق ہو جاویں کیونکہ یہ سب روٹیاں کھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جب یہی نہ رہیں گی تو سب منتشر ہو جاویں گے۔
ایک مقولہ تو یہ تھا اور دوسرا یہ تھا کہ
لیکن جن الاعن منها الاذل کہ مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے۔ اور معزز اپنے کو سمجھتے ہیں۔

تو یہ عبداللہ بن ابی نے کہا اور آہستہ اپنی جماعت میں کہا۔ مگر زید بن ارقم نے یہ سن لیا اور جوش بیتابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ آپ نے فوراً عبداللہ بن ابی کو بلایا اور پوچھا۔ تو اس نے آکر قسم کھالی کہ غلط ہے میں نے ہرگز نہیں کہا۔ اسی کو تو کہتے ہیں کہ

اذا جازاك المنفقون قالوا نشهد انك لرسول الله

یعنی جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اُن کو ملامت کی کہ تم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا۔ یہ مارے رنج کے گھوٹے بیٹھ رہے کہ اب کیا منہ دکھاؤں۔ اللہ اکبر کیا غیرت تھی حق تعالیٰ کو اُن کی یہ حالت رنج کی گوارا نہ ہوئی اور اس وجہ سے یہ سورت نازل فرمائی۔ حالانکہ صرف ایک شخص کا قصہ تھا۔ مگر مقبول ہونا یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے ایک سورت نازل فرمائی جو کہ قیامت تک کے لئے نمازوں میں پڑھی جاوے گی اور عبد اللہ بن ابی کا وہ مقولہ بالمقترح (ظاہر طور سے) نقل فرمایا کہ اُس نے ضرور یہ کہا ہے تاکہ زید بن ارقم کی راست بیانی اچھی طرح ثابت ہو جاوے۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ارقم کو بلایا اور اُن کی تصدیق کے لئے سورت نازل ہونے کی اُن کو بشارت سنائی زید بن ارقم مکمل گئے۔ یہ خلاصہ تھا اس قصہ کا۔

اب میں یہ بیان کرتا ہوں کہ مقصود میرا اس قصہ کے ذکر سے کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر حکایت سے

مقصود بیان

ایک مقصود ہوا کرتا ہے اور یہی راز ہے کہ قرآن شریف میں قصے زیادہ مفصل بیان نہیں ہوئے۔ بہت لوگ قرآن سے مفصل قصے تلاش کرتے ہیں اور تار و پود سے دیکھ کر منطقی کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصہ مل جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور

اگر نہیں ملتا تو اس کو کمی سمجھ کر جواب کے طالب ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے گو قصہ ناتمام ہے مگر واقعہ تو مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود صرف نتیجہ ہے۔ جتنے جزو سے نتیجہ نکلے اور وہی مذکور ہونا کافی ہے۔ تو یہاں بھی چونکہ قصہ ذکر کیا ہے یہاں بھی کوئی نتیجہ ضرور ہوگا۔ اور اس کی تعیین اکثر قرآن ہی سے ہو جاتی ہے چنانچہ یہاں اس قصہ سے مقصود ایک علم ہے جو ساتھ ہی مذکور ہے۔ چنانچہ منہ فقیر کے پہلے مقولہ کے ساتھ فرمایا کہ

واللہ خزائن السموات و
الارض
کہ حق تعالیٰ ہی کے لئے سب
کچھ ہے۔

اور ان کے دوسرے مقولہ کے ساتھ فرمایا۔

وَاللّٰهُ الْعَزِيزُ الْوَسُوْلُ
اور اس کے رسول اور مومنین
کی ہے۔

ان دونوں آیتوں کے مضمون میں غور کرنے سے مفہوم ہوگا کہ مقصود کیا ہے تو پہلی آیت میں تو مقصود ہے مال کے ایک اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا اور دوسری آیت میں مقصود ہے عزت کے اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا۔ کیونکہ پہلی آیت میں منافقین کو مال کا دعویٰ تھا حق تعالیٰ نے اس کو رد فرمایا کہ منافقین مال کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کا دعویٰ غلط ہے کیونکہ آسمان و زمین کے سارے خزانے تو حق تعالیٰ کے پاس ہیں اور دوسری آیت میں منافقین کو عزت کا دعویٰ تھا وہ اپنے آپ کو معزز خیال کر کے کہتے تھے کہ

یعنی مدینہ چل کر معزز ذلیل کو

لیجن جن الاعز منها الاقل۔

نکال دیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس کو بھی رد فرمایا کہ عزت تو خدا اور رسول اور مومنین کے لئے ہے۔ تو خلاصہ ان دونوں آیتوں کے مضمون کا یہ ہوا کہ ایک آیت یعنی پہلی ال کے متعلق ہے اور دوسری سجاہ کے متعلق ہے۔

اب یہ بات کہ اس وقت میں نے اس کو کیوں ذکر کیا تو دل یوں سجاہ کرتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ بتلائی جاوے۔ تو آج کل جو امر زیادہ ضرور رساں اور زیادہ آزار دہ ہے وہ اختلافات ہیں جو باہم مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص جب کہ دونوں طرف بڑے بڑے لوگ ہوں کہ چھوٹے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے ہوں۔ اس لئے بڑا ضروری امر اس وقت اختلافات کا فیصلہ ہے۔

سو منجملہ ان اختلافات کے ایک بڑی جماعت کا **علماء اور مال و سجاہ** یہ اختلاف ہے کہ مال اور سجاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں یا نہیں۔ اور دونوں جانب بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک جانب تو وہ لوگ ہیں جو اہل الرائے اور معزز طبقہ کے کہلاتے ہیں اور دوسری جانب علماء ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں کی کچھ کچھ غلطیاں بھی ہوں اور کوئی زائد غلطی میں ہو۔ چنانچہ آج کل کے عقائد تو اس میں منہمک ہیں کہ مال اور سجاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں۔ ان کی ترقی ہونی چاہئے۔ اور علماء کی رائے یہ مشہور کی جاتی ہے کہ مال اور سجاہ اصلاً قابل تحصیل اور مطلوب نہیں اور ان کی ترقی کی کچھ ضرورت نہیں اور بعض مرتبہ

تو قول ہی ناتمام ہوتا ہے اور بعض مرتبہ ناتمام پہنچایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر علماء دین کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کیوں چاہتے ہیں کہ مسلمان جو تیار چٹھائے پھریں۔ چنانچہ عموماً ان پر یہی گمان ہے کہ یہ علماء ترک دنیا کرتے ہیں اور جب یہ گمان ہو گیا تو اس خیال کی بناء پر یہ بھی شبہ ہو گیا کہ علماء کی زیادہ سختی اس لئے ہے کہ یہ زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہیں۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ کس جگہ مال اور سجاوہ کو منع کرنے سے ترقی رکتی ہے اور اگر ان کو خبر ہوتی تو اتنی سختی نہ کرتے بلکہ اپنے فتویٰ میں اس کی رعایت رکھتے۔ ایسا نہ کرتے کہ ہر لو کو بھی لایحوز دیا نہیں، اور تجارت بھی ناجائز۔ تو ان کے نزدیک نہ حیات کے افعال جائز نہ موت کے افعال۔

چنانچہ فتوح میں ایک صاحب نے کہا کہ ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو، نہ رونے کی جگہ روؤ۔ میں نے کہا، سبحان اللہ، خوب سمجھے تو شریعت اس طرح بدنام کی جا رہی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض علماء کی تعلیم میں کہیں لفظی اجمال ہو مگر اس اجمال کا مضائقہ بھی نہیں کیونکہ مخاطب مسلمان کم و بیش مسائل دین سے ضرور تعلق رکھتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ممانعت تو اُنہی کی ہو گی جو حرام ہو مگر ان کی مناسبت کے اعتماد پر بعض جگہ عنوان میں کچھ ابہام رہ گیا ہو۔

مثلاً اگر کسی مریض کو طبیب مرتج سے منع کرے اور کچھ تفصیل نہ کرے، تو وہی درجہ ممنوع ہوگا جو مریض کے لئے مضر ہو۔ تو اس طرح سے بھی غلط فہمی ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف ہو گیا۔

پس ایک طبقہ تو حامی ہو گیا تعلیم دین کا جس کی غایت مال و سجاوہ نہیں ہے

اور ایک طبقہ حاتی ہو گیا تعلیم دنیا کا جس کا مقصود ہی صرف مال و جاہ ہے۔

اس طبقہ کی طرف سے پہلے طبقہ کی نسبت
جدید طبقہ کے خیالات

یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تو کھانے پینے کے ذریعہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سب سے اول یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر تعلیم دنیا کا اہتمام نہ ہو تو کھائیں کہاں سے اور علم دین کی ضرورت کا وہ انکار تو نہیں کرتے مگر علم دین صرف نماز روزہ ہی کے مسائل کو سمجھتے ہیں۔

مگر اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ قانون گورنمنٹ صرف یہ ہے کہ حکام کی تعظیم و تکریم کرو۔ پھر چاہے رات کو ڈکیتی ہی کا شغل ہو۔ لیکن تعجب ہے کہ ایسے شخص کا یہ اجتہاد تو کوئی نہ سنے گا مگر دین کے باب میں ایسی رائیں مسموع (سنی جانے والی) ہوتی ہیں۔

شاید کوئی شخص کتاب راہ نجات کے نام سے استدلال کرے کہ راہ نجات میں دیکھو نماز روزہ ہی کا بیان ہے اور پھر اس کا نام راہ نجات ہے اس سے معلوم ہوا کہ نجات کا راستہ ہی نماز روزہ ہے و بس۔ تو یہ تو ٹھیک کہ نماز و روزہ نجات کا راستہ ہے لیکن یہ کا ہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ وہی ہے اور کسی جزو کی ضرورت نہیں۔

جیسے کوئی شخص سڑک پر جا رہا ہو تو یہ سڑک اس کا راستہ ضرور ہے لیکن یہ کا ہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ ہی سڑک ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ دور کے بعد دوسری سڑک بھی ملے کہ نا پڑے۔ تو بہت لوگوں نے دین میں بس یہ اختصار کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ بعضے تو قرآن شریف پڑھنے کو بھی تفسیر اوقات سمجھتے ہیں

چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ تم اپنے بچے کو انگریزی کیوں نہیں پڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ ختم کر لے تو انگریزی پڑھاؤں۔ کہنے لگے کتنے دنوں میں کتنا قرآن ہوا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دو برس میں آدھا قرآن۔ تو آپ کہتے ہیں کہ دو سال تو ضائع ہو گئے دو سال اور بھی کیوں ضائع کرتے ہو۔

اور قرآن سے بے تعلقی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی ایک بیرسٹر کی نسبت فرماتے تھے کہ انہوں نے مولانا سے کہا کہ اس وقت تو علماء اگر سود کو حلال کہہ دیں تو مصلحت ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تو بہ کر جو چیز قرآن میں حرام ہے اس کو کون حلال کہہ سکتا ہے اور آیت پڑھی۔

احل اللہ البیع وحرام الربوا یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال

کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

تو کہنے لگے اے اللہ تو بہ! میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مولویوں نے مل کر اس کو حرام کر رکھا ہے۔ تو یہ حالت بے خبری کی ہو گئی ہے اور یہ برہمنی جاتی ہے۔

میں الہ آباد کا قصہ ہے کہ ایک بچہ کی انگریزی تعلیم بہت دور تک ہو گئی تھی مگر وہ الحمد للہ شریف دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکا۔ میں نے حروف پچنواسے تو معلوم ہوا کہ اس نے الف باتا بھی نہیں پڑھی اور میں نے ایک بہت بڑے شخص کے بچے کو دیکھا کہ وہ میم کی گود میں پلتا تھا اور باپ کو اس پر فخر تھا کہ وہ کلمہ

پڑھ سکتا تھا جیسے ہم اپنے طوطے کو کلمہ پڑھا دیں۔ تو اسلام سے یہ بے خبری کی نوبت ہو گئی ہے اور صاحب آپ نے تو پھر بھی چونکہ ایسے لوگوں کی اہموش میں پرورش پائی ہے جو پرانی روش کے محقے۔ آپ تو خیر اتنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بچے جو آپ کی اور میم کی گود میں پرورش پا رہے ہیں یہ تو اتنا بھی نہ سمجھیں گے۔ یہ حالت دیکھتے ہوئے مجھے تو خوف ہے کہ چند روز میں شاید لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی پسند نہ کریں گے۔ جیسا کہ اس وقت میں اکثر عربی طلباء کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے کو ایسی وضع سے رکھنا پسند نہیں کرتے جس سے طالب علم سمجھے جاوے۔ صاحب سن لیجئے۔

پاکش برہنہ نسل عاشقی یا فرو شو جاہم تقویٰ بہ نسل
یا تو محبوب حقیقی کے عشق کا دھوئے امت کروا اور اگر کرتے ہو، تو
عاشقوں کی وضع کو اختیار کرو۔

یا مکن یا پیلبا ناں دوستی یا بنا کن خانہ بر اندازہ پیل
یعنی یا تو فیلبان سے دوستی مت کرو یا اپنا مکان مٹھتی کے موافق
بناؤ۔ یعنی یا طلباء اور اللہ والوں میں امت داخل ہو۔ اگر داخل ہوتے
ہو تو ان کی وضع اختیار کرو۔

تو جب یہ کیفیت طلباء میں داخل ہو گئی تو اوروں کا تو کیا ٹھکانہ ہے۔
تو جس طرح طلباء کو ایسی وضع بنانے میں عار ہے جس سے لوگ ان کو طالب علم
کہیں گے۔ تو دیکھئے اب یہ اپنے کو طالب علم کہنا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح
اسلام کو بھی عجب نہیں کہ عار سمجھیں۔ چنانچہ نام تو بدلنے لگے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے

کہ یہ مسلمان ہیں۔ تو نام بدل گئے، وضع بدل گئی، خیالات بدل گئے مگر ان کے نزدیک وہ اسلام ہی کچھ ایسا لو ہے جو ا ہے کہ کسی طرح الگ ہی نہیں ہوتا۔

بس ایسا ہے جیسے مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے ایک سبق کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا کر بتلا دیا۔ غالباً ایک ماہ کے بعد پوچھا کہ نماز بھی پڑھتا ہے معلوم ہوا پڑھتا ہے۔ فرمایا وضو بھی کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کیوں اس دن کرا نہیں دیا تھا۔ تو جیسا اس کا وضو تھا ایسا ہی آج کل کا اسلام ہے۔

علماء اور کافر گری

پھر اس حالت پر اگر علماء کچھ کہہ دیتے ہیں تو علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ یہ بہت جلد کافر بناتے ہیں

مگر یہ الزام سراسر غلط ہے کیونکہ کافر بنانے کا مفہوم تو ایسا ہے جیسا مسلمان بنانے کا اور مسلمان بنانے کے معنی ظاہر ہے کہ یہی ہیں اسلام سکھانا، اسلام کی ترغیب دینا و تحریک کرنا۔ چنانچہ کہتے ہو کہ علماء کو حق تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ وہ کافروں کو مسلمان بنائیں۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو مسلمان کہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو اسلام سکھادیں۔ اسلام کی ترغیب دیں اور اسلام کی طرف بلائیں تو اسی طرح کافر بنانے کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ کافر ہونے کی تحریک کریں اور جب یہ معنی متعین ہوئے تو اب غم ہی بتلاؤ کہ کون سا عالم کفر کی تحریک کر رہا ہے۔ بس معلوم ہو گیا کہ علماء کافر نہیں بناتے۔ ہاں بے شک علماء بتاتے ہیں کہ فلاں بات سے کافر ہو گیا۔ تو کافر تو خود ہو گیا تھا مگر علماء نے صرف بتلا دیا۔

جیسے کوئی شخص امتحان میں فیل ہو جائے اور کوئی اس کو بتلا دے

کہ تم فیل ہو گئے۔ تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس بتلانے والے نے اس کو فیل کر دیا نہیں بلکہ فیل تو خود ہوا۔ اس شخص نے صرف بتلا دیا۔ ہاں اگر کوئی ناحق کفر کا فتویٰ دے تو بے شک وہ بُرا ہے۔ تو علماء پر یہ الزام محض اس لئے ہے کہ ان لوگوں کو بھی خبر نہیں کہ اسلام کیا ہے اور زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ بے خبر تو نہیں ہیں بلکہ اُن کو خبر سب ہے پھر بھی استہزا (سہی مذاق) کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی اُن کی ضرورتیں اُن کے خیال میں واجب الرعایت ہیں اور شریعت میں اُن کے نزدیک اُن کی کامل رعایت ہے نہیں۔ اس لئے کچھ تان کر اُن پر شریعت کو منطبق کرتے ہیں اور علماء اُن پر انکار کرتے ہیں۔ اس لئے وہ علماء سے اُلجھتے ہیں۔

اُن میں بعض ایسے ہیں کہ یورپ کی تحقیقات کو بھی صحیح اسلام اور ترقی | نہیں سمجھتے مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا تو اس جماعت نے دین عرف قوم کا نام رکھا ہے۔

چنانچہ افسوس ہے کہ آج کل ایک طبی وفد ترکوں کی مدد کو گیا ہے تو جہانہ میں سوار ہونے کے بعد آپس میں گفتگو ہوئی کہ ہم لوگوں کو وارڈھی رکھنا مناسب ہے یا نہ رکھنا۔ تو میں کیسے کہوں کہ یہ اسلام ہے۔ دیکھئے اول تو ایسے دینی کام کو جاری ہے تو یہ دین کے خلاف تجویز کیسی۔ دوسرے ممکن ہے کہ اُن کے ایک گولی آکر لگ جائے۔ تو کیا وہ چاہتے تھے کہ ایسی حالت میں خاتمہ ہو جو کہ اسلام کے خلاف ہو۔ تو اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس وقت مذہب

سے کوئی مطلب باقی نہیں رہا۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو کسی وقت یہ معلوم ہو جاوے کہ اس مذہب کو اختیار کر کے ہماری قومیت باقی نہیں رہ سکتی اور فلاں مذہب اختیار کرنے سے باقی رہ سکتی ہے، تو فوراً اس مذہب اسلام کو چھوڑ کر وہ دوسرا مذہب اختیار کر لیں۔

چنانچہ مکھنوں میں میرے ایک دوست میرے پاس روزانہ آتے ایک روز انہوں نے میں کچھ دیر ہو گئی۔ آنے کے بعد میں نے تائیر کی وجہ دریافت کی۔ تو انہوں نے بیان کیا کہ آج ایک کمیٹی تھی اس کے تماشے میں دیر ہو گئی اور گو میں اس کا ممبر نہ تھا۔ اور اس کا ممبر نہ ہونا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ بعض کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایک کمیٹی نبوت کی قائم ہوئی اس میں ملا دوپازہ بھی حاضر تھے۔ کوئی بنی بننا تھا، کوئی ابوبکر، کوئی عمر۔ یہ خاموش تھے۔ ان سے پوچھا گیا بھائی تم کیا بنو گے۔ انہوں نے کہا کہ میں ابوجہل بنوں گا۔ تم سب کی تکذیب کروں گا۔ سو واقعی بعضی مجلس کا ابوجہل ہی ہونا اچھا ہے۔ اسی طرح اس کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا تھا۔

سوا انہوں نے بیان کیا کہ اس کمیٹی میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں کی ترقی نہیں ہوتی۔ تو اخیر میں تحقیق کے درجے میں یہ طے ہوا کہ اسلام کو باقی رکھ کر مسلمانوں کی جماعت ترقی نہیں کر سکتی اور یہ رائے قائم کی کہ اگر ترقی مطلوب ہے تو اسلام کو چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس میں حلال و حرام کا بڑا قصہ ہے۔ مثلاً ایک انجنین نے تو ایک تجویز کی کہ مسلمانوں کو یہ کرنا سچا ہے تو مذہب اسلام

کی رو سے وہ حرام ہے تو اب اس چیز پر عمل کیسے ہو۔

چنانچہ ایک بار میں لاہور گیا تو وہاں کے عقلاء نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ علماء پر زور ڈال کر سود کو حلال کرانا چاہئے۔ جب علماء نے موافقت نہ کی تو وہ لوگ بولے بس صاحب اب ترقی کی کوئی امید نہیں۔

اسی طرح اس جماعت نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ساری خرابیاں اور مسلمانوں کی لپٹی اسلام کی قید اور حرام و حلال کی بدولت ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تجارت کرے تو شریعت میں تو روک ہے کہ ناجائز معاملہ نہ کرے، سود نہ لے پھر ترقی کہاں۔ اس لئے اس قید سے آزاد ہو جانا چاہئے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت کو چھوڑ بھی دیا مگر آزادی تو پھر بھی میسر نہ ہوئی۔ کیونکہ گورنمنٹ کے قوانین کی قید اب بھی ہے۔

اگر کہو کہ کچھ کچھ تو آزادی ہو گئی۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کچھ قید کچھ آزادی سے تو بالکل قید ہی ابھی۔ ایک طرف تو ہوئے۔ اس لئے چاہئے کہ جو خدا سے آزاد ہو وہ گورنمنٹ سے بھی آزاد ہو جاوے۔ پھر علاوہ حلال و حرام کی روک ٹوک کے ایک اور بات سے بھی ان لوگوں کو اسلام سے تو حسن و نفرت ہوا۔ وہ یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ بعض مسلمانوں میں تعصب اتنا ہے کہ کوئی آئین پر لڑتا ہے کوئی رفع یدین پر۔ تو جب اسلام ہی نہ ہوگا تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوگا جس سے قوم کو ضرر پہنچ رہا ہے۔

انہوں نے جھگڑوں کے اعتبار سے اسلام کو ایسا سمجھ رکھا ہے جیسے کسی بادشاہ کے بڑے بھائی محنت محذوب کہہ رہے ہوتے۔ بادشاہ نے کہا

کہ پاشجامہ تو پہن لیجئے۔ انہوں نے کہا، پھر کمرہ بھی لوں گا۔ بادشاہ نے کہا، وہ بھی حاضر ہے۔ وہ بولے پھر ٹوپی بھی لوں گا۔ بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے اسی طرح سلسلہ چلاتے چلاتے سلطنت کی ضرورت ظاہر کی۔ بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے۔ کہنے لگے تو میں پاشجامہ ہی پہن کر کیا کروں گا جس سے یہ سب جھگڑے پیدا ہوں۔

اسی طرح انہوں نے کہا کہ سارے قصے اسلام ہی کے ہیں تو مسلمان ہی کیوں رہیں اور یہ لوگ جو مسلمانوں کو الزام دیتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں جھگڑا کیے ہیں۔ چنانچہ آئین ہی پر دیکھئے کس قدر اختلاف اور جھگڑا ہو رہا ہے۔ تو واقعی اتنے اختلاف کو تو ہم بھی پسند نہیں کرتے مگر یہ دیکھئے اصل سبب اس اختلاف کا کیا ہے۔ تو اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان کی نظر میں دین کی تکمیل اتنی ضروری ہے کہ ذرا ذرا سی بات کو بھی وہ جانچتا ہے پھر اس میں کبھی نفاذ بھی آگئی جس کی وجہ سے اس میں زیادتی ہونے لگی۔ تو اصل میں خرابی یا ضرر جو کچھ لازم آیا وہ اسلام سے نہیں بلکہ نفاذیت سے۔ مگر انہوں نے اس ضرر کو بھی اسلام کی طرف منسوب کیا۔ تو انہوں نے یہ تجویز کر لیا کہ اسلام کو باقی رکھ کر ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر تجویز ہی تھی، اپنے نزدیک اسلام کو ابھی چھوڑا نہیں مگر صاحبزادے اسلام نے تو خود انہیں چھوڑ دیا۔ تو یہ لوگ مترکک الاسلام (اسلام کے چھوڑے ہوئے) تو ہو ہی گئے۔ عرض یہاں تک مذاق بدل گیا ہے۔

ایک اور قصہ ہے رڑکی کا۔ وہاں ایک کمیٹی میں ایک یہ تجویز ہوئی تھی کہ نکاح بھی فضول ہے۔ آزادی تو یہ ہے کہ جیسے اور سودے سلف کا معاملہ

ہوتا ہے کہ جس سے جو معاملہ ٹھہر جاوے۔ اسی طرح بیویاں بھی حاصل کر لی جاویں۔ یہ رائے بھی عقلاء کی۔

تو سبب اس کا فقط یہی ہے کہ اُن کی نظریں دنیا اصل چیز ہے۔ علماء نے اس مفسدہ کو دیکھ کر روکا اور روکنے کا مطلب یہ تھا کہ اس درجہ کی دنیا کو چھوڑو مگر اُس کے معنی غلط یہ سمجھے گئے کہ علماء کی رائے یہ ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو۔ اس لئے اختلاف ہوا اور یہ گفتگو ہونے لگی کہ آیا اصل میں دنیا مطلوب ہے اور دین بقدر ضرورت حاصل کرنا چاہئے یا اصل میں دین مطلوب ہے اور دنیا بقدر ضرورت ہونی چاہئے۔ یہ ہے وہ مسئلہ جو اس بیان سے اصل مقصود ہے۔ اور مجھے ان آیتوں سے بھی نتیجہ نکالنا ہے۔

محبوب ترین چیزیں | تو دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں، مال اور جاہ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو محبوب ہیں۔ چنانچہ کیمیا جو ہر ایک کو ایسی محبوب ہے کہ اگر کسی کو بتلائی جاوے تو اہل اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کہ اُس سے انکار کرے۔ تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں اور اس کے سوا دنیا میں بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ اُس میں مال اور جاہ دونوں جمع ہوں۔ اکثر سبب بدولت مال کے تلف کئے ہوئے نہیں ملتا اور اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں۔ اس لئے یہ اس درجہ کی محبوب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ دونوں چیزیں نہایت ہی محبوب ہیں اور انہیں کا نام دنیا بھی ہے۔ تو اب میرا یہ کہنا کہ دنیا مطلوب ہے یا نہیں۔ اس میں مالی و جاہ دونوں آگئے۔ تو اب دنیا سے مراد ان دونوں کا مجموعہ ہوگا۔ پس حاصل یہ ہوا

کہ مال و حجاجہ مطلوب ہیں یا نہیں حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ان آیات میں فرمایا ہے
پس منافقین کے اوّل مقولہ کے بعد فرماتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ
یعنی اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے
آسمانوں کے اور زمینوں کے۔

اس سے تو احکام مال کے بتلانا مقصود ہیں۔ اور دوسرے مقولہ کے بعد فرماتے ہیں
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ
یعنی اللہ ہی کی ہے عزت اور
اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی
للمؤمنین

اس سے احکام حجاجہ کے بتلانا مقصود ہیں۔

پس اب اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سو غور کرنے سے وہ باتیں
معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مال فی نفسہ محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ مال سے اگر کوئی
مفسدہ مرتب ہونے لگے تو مذموم ہے۔ مال کا فی نفسہ محمود ہونا تو اس لئے
معلوم ہوا کہ اپنے کو مالک الاموال (سب مالوں کا مالک) فرما رہے ہیں چنانچہ
ارشاد ہے۔ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کے
خزانے اللہ ہی کی ملک میں ہیں۔ پس اگر مال فی نفسہ کوئی بُری اور معیوب چیز
ہوتی تو جس طرح سے مخصوص کے ساتھ اپنے کو خالق الکلاب والخنایز نہیں
فرمایا، اسی طرح اپنے کو مخصوص کے ساتھ مالک الخزائن (خزانوں کے مالک)
نہ فرماتے۔ اور اس میں نقد و عروض (روپیہ و اسباب) سب داخل ہو گئے اور
مال کا باعتبار عارض کے مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ مال سے اُن کو یہ ضرر
ہوا کہ انہوں نے اُس کو بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ کہا کہ

لا تفتقروا علی من عند

یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ

رسول اللہ

ان پر کچھ مت خرچ کرو۔

سوائے تنہا کہ وہ اس طرح کام میں لائے کہ مسلمانوں پر خرچ کرنا متوفی
کر دیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی۔ تو یہ سود (بڑا) استعمال ہوا مال کا پس حق تعالیٰ
نے اس پر رد فرمایا کہ تم کیا چیز ہو خرچ کرنے تو سارے ہمارے پاس ہیں۔ پس
ان کی یہ مذمت سود استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس اس سے دوسری بات
بھی ثابت ہو گئی کہ جب مال کے ساتھ سود استعمال ہو تو وہ مذموم ہے۔

اسی طرح دوسرے مقولہ کے بعد فرمایا۔

وللہ العزۃ والرسولہ

یعنی عزت اللہ ہی کی ہے

وللمؤمنین

اور اس کے رسول کی اور

مسلمانوں کی۔

تو یہاں بھی بتلا دیا کہ جاہ فی نفسہ مذموم نہیں مگر سود استعمال کی وجہ سے
مذموم ہو جاتا ہے۔ پس اس سے بھی دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جاہ فی نفسہ
محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ جب سود استعمال ہو تو مذموم ہے۔ جاہ کا فی نفسہ محمود
ہونا تو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے وللہ العزۃ — الایۃ فرمایا۔ تو اپنے
لئے عزت ثابت فرمائی۔ اگر جاہ کوئی بڑی چیز ہوتی تو اپنے لئے ثابت نہ
فرماتے۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جاہ اچھی چیز تو ہے لیکن یہ ممکنات کے لئے نہیں بلکہ

حق تعالیٰ کے لئے ہے۔ تو سمجھو کہ اُس کے وللمؤمنین (اور مسلمانوں کی) بھی تو ہے
تو پس مسلمانوں کا ذی عزت ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ تو یہ شبہ نہ رہا
کہ شاید ممکنات کے لئے محمود نہ ہوا اور جاہ کا مذموم ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ
ساتھ ہی ساتھ منافقین کی اس بات پر مذمت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے
اُس کا بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ
لیخ جن الاعتراف بالاذل یعنی جو عزت والا ہے وہ

بدینہ سے ذلت والے کو نکال دے گا۔
تو ان کا یہ کہنا سوء استعمال ہوا جاہ کا کہ ذریعہ بنایا جاہ کو مسلمانوں کے
ضرر کا۔ اس پر حق تعالیٰ نے رد فرمایا کہ تم ہو کیا چیز معزز تو خدا اور سول و مسلمان
ہیں۔ پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس ان دونوں آیتوں
سے چار مسئلے ثابت ہوئے۔

ایک یہ کہ مال اچھی چیز ہے۔

دوسرا یہ کہ جاہ اچھی چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ مال کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

چوتھا یہ کہ جاہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

تو ان چاروں مسئلوں کو مان لینے سے اگر دونوں جانب انصاف ہو

تو سب اختلاف رفع ہو جاوے۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال بُری چیز

نہیں ہے تو اب مال کا مطلقاً بُرا کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اسی طرح جاہ کو بھی برا اور

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے تو وہ

لوگ باز آویں گے جو مال و جاہ کو علی الاطلاق محمود و مطلوب کہہ رہے ہیں۔ تو اتنے بڑے اختلاف کا فیصلہ ہو جاوے گا اور یہی مقصود ہے مجھے بیان کرنے سے اور یہ اجمال کے درجہ میں تو ثابت ہو گیا مگر میں تفصیل کے لئے کچھ اور بیان کروں گا۔ اور گو مقصود معلوم ہو گیا ہو مگر ابھی بہت مبہم ہے۔ اس لئے اس کا عنوان بھی واضح اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ پس دوسرے عنوان سے عرض کرتا ہوں۔

حقیقتِ حُب | ایک تو ہے مال اور ایک ہے حُب مال۔ اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حُب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں ہے بلکہ حُب مال کی ہے۔ جس سے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حُب مال اور حُب جاہ۔ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان و نعمت دینا، کے طور پر فرماتے ہیں۔

ان الذین امنوا و عملوا الصالحات
سجعل لہم الزحمت ودا

اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہماری تعظیم کریں۔ حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تمثیل ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور محبت ہو تو وہ صورتِ جاہ ہے۔ حقیقتِ جاہ نہیں اذیہ خود ہی اپنے

کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ اپنی نظریں بڑے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتنے اور سوڑ) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے۔

ایک مرتبہ دہلی میں بیان کیا کہ رات کا وقت تھا کہ کچھ آہٹ ہوئی جس سے لوگوں کو سانپ کا شبہ ہوا۔ بس سانپ کے ڈر سے سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ تو کیا یہ اس کی عزت تھی۔ ہرگز نہیں! تو جو تعظیم خوف کی وجہ سے ہو وہ جاہ نہیں ہے۔ جاہ تو یہ ہے کہ

صاحبِ وہ بادشاہ جسمہاست صاحبِ دل شاہِ دلہائے شہاست
یعنی گاؤں کا مالک جسموں کا بادشاہ ہے اور اہل دل دلوں کا
بادشاہ ہے۔

تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں ہے بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

سَجْعَلْ لِّہِمَا لِرَحْمٰنِ وِدَا اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت
پیدا کر دیں گے۔

پس معلوم ہوا کہ جاہ بڑی چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ

بطور اتقان (نعمت) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتا تھا۔ اسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

نعم المال الصالح للرجل النیک آدمی کے لئے نیک الصالح مال اچھی چیز ہے۔

پس مال اور جہا مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حُص مال اور حُص جہا ہیں۔ جس کی نسبت حضور فرماتے ہیں۔

ما ذنبان جائعان ارسلا یعنی حُص مال اور حُص شرف فی غنم بافسد لہامن حب آدمی کے دین کو ایسا تباہ کیتی المال والشرف الدین المرء ہے کہ اگر دو بھڑیٹے بھوکے بھی بکریوں کے گلہ میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کر سکتے۔

پس حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حُص کا لفظ تصریحاً فرمادیا ہے۔ تو حُص بڑی چیز ہے۔ اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حُص کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حُص کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرائن ایسے موجود ہوتے ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ حُص مال ہوتا ہے تو حُص مال بھی ہوتی ہے۔ پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حُص کے درجہ میں ہو۔

جیسے کوئی شخص پوچھے کہ رہن رکھنا کیسا ہے تو چونکہ عادت رہن سے

انتفاع کی ہے۔ لہذا یہ بھی گنجائش ہے کہ ہم جواب میں اس کو حرام کہہ دیں۔ تو بعض اوقات قرائن پر اعتماد کرنے کی وجہ سے قیود کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کی حدیث سے تائید لیجئے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

ليس من البر الصيام في

یعنی سفر میں ایسی حالت میں

روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

السفر

یہ آیت نے اس وقت فرمایا تھا جب کہ ایک شخص نے نہایت سختی کی حالت میں سفر کے اندر روزہ رکھا تھا اور گرجی اور پیاس کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ سفر میں روزہ ہی رکھنا نہ چاہئے ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں روزہ رکھنا اچھا نہیں۔ پس مراد خاص حالت ہے۔ مگر ایسی حالت کی قید تصریحاً نہیں فرمائی۔ کیونکہ قرینہ تخصیص موجود ہے۔ تو اسی طرح اگر کوئی مال کی مذمت کرے تو مطلب یہی ہوگا کہ خوب کے درجہ میں مذموم ہے۔

اسی طرح قرآن شریف سے اس کی تائید لیجئے

حقیقتِ حیاتِ دنیا

وما الحیوة الدنیا الا لعب ولهو۔ یعنی

دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز کھیل کود کے، اس آیت میں حیاتِ دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور دوسری جگہ اس کی مدح بھی کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

اولم نعلمکم ما یتذکر

یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ

دی تھی کہ سمجھ سکتا اس میں وہ

فیہ

بشخص جس کو سمجھنا ہوتا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حیات دنیا جب بُرے کاموں میں صرف کی جاوے
تو وہ لہو و لعب ہے۔ ورنہ اچھی چیز ہے بلکہ حیات تو وہ چیز ہے کہ اُس کی
فضیلت کے متعلق خود حضورؐ کا فتویٰ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دو شخص ساتھ ایمان لائے۔ اُن میں سے ایک
تو جہاد میں شہید ہو گیا۔ دوسرے کا اُس سے ایک ہفتہ بعد انتقال ہوا۔ صحابہ
نے اُس کے لئے دعا کی کہ اے اللہ! اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ لائق
کہ دیجئے۔ یعنی گو یہ اُس کے درجہ کا نہیں مگر اُس کے درجہ میں پہنچا دیجئے۔ حضورؐ
سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنا تو فرمایا کہ اُس کے اس ہفتہ کے عمل
کہاں گئے۔ واللہ اُس کے اور اس کے درجہ میں اتنا فرق ہے جیسے زمین اور
آسمان میں۔

تو دیکھئے کہ حیات دنیا ایسی چیز ہے کہ صرف ایک ہفتہ کی زیادہ زندگی
سے اُس نے اتنی فضیلت حاصل کر لی۔ مگر باوجود اس کے پھر بھی اس زندگی
کو لہو و لعب فرمایا۔ تو یہ اسی حالت کے اعتبار سے جب کہ اس کو بُرے
کاموں میں صرف کیا جاوے۔ تو دیکھئے حیات کی مذمت ایک خاص حالت
کے اعتبار سے ہے۔ حالانکہ وہاں اس قید کی تصریح نہیں ہے۔ پس قرآن سے
بھی اس کی تائید ہو گئی کہ بعض اوقات لغفلوں میں ایک قید نہیں ہوتی اور ارادہ
میں ہوتی ہے۔

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت چونکہ لوگ بہت بے خبر ہو
گئے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ مذمت کرتے وقت حُب کا لفظ بڑھا دیا

کریں۔ اور یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حضورؐ نے
حب الدنيا اس کل یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں
خطیئہ کی بڑ ہے۔

کیوں فرمایا اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ جہاں مطلق دنیا کو فرمایا ہے وہاں بھی یہی
مراد ہے۔ ورنہ ارشاد ہے۔

کسب الحلال فوریۃ بعد الفریضۃ
حلال کمائی فرض ہے، بعد
فرائض کے۔

ہاں یہ قید ہے کہ وہ فرض ہے بعد فرض کے۔ دیکھئے کسب الدنيا کو اس جگہ فرض
فرما رہے ہیں۔ پس اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دنیا کو جو ملعون کہا جاتا ہے، اس
سے مراد حب دنیا ہے۔

اب لوگ چونکہ اس کا مطلب نہیں سمجھتے اس لئے
مقام بزرگال کہتے ہیں کہ لو دنیا ہی کو ملعون کہتے ہیں۔ آپ اُن سے
خفا ہوتے ہیں لیکن خود دنیا اُن سے خفا نہیں ہوتی کیوں کہ دنیا خود اُن کے پاس
آتی ہے۔ تو خفگی میں کیسے آتی اور وہ دنیا طلب کرنے کے لئے کسی کے
پاس نہیں جاتے۔ کیا آپ نے کسی بزرگ کو بھی کسی بادشاہ کے دروازے پر
دیکھا ہے کہ مانگنے گئے ہوں۔

اگر کہئے کہ گئے ہیں تو وہ ایسے ہی بزرگ ہوں گے جیسے کہ میری تفسیر
لکھنے کے زمانہ میں ایک شاہ صاحب بھیک مانگنے آئے تھے بڑے ٹھاٹھ
کے ساتھ کہ ایک جہت پہنچے ہوئے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی اور گلے میں بھی سوراخ

پر کھڑے ہو کر آپ نے سوال کیا۔ مکان سے کوئی چیز بھیج دی گئی۔ آپ نے اس کو واپس کر دیا کہ میں کوئی معمولی فقیر نہیں ہوں۔ یہ لوں گا وہ لوں گا۔ غرضیکہ وہ جھگڑا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں کو کھٹے پر بیٹھا ہوا تفسیر لکھ رہا تھا۔ طبیعت پریشان ہونے لگی۔ آخر میں اُدھر سے اتر آیا اور میں نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ جھگڑا کیوں کرتے ہیں، جو توفیق ہوئی وہ پیش کر دیا۔ آپ دھمکا کر کہنے لگے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔
 ہر جنگلی میں یہ گمان نہ کہ وہ کہ خالی ہے ممکن ہے چیتا سویا ہوا ہو
 یعنی ہر شخص کی نسبت یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ یوں حقیر و معمولی شخص ہے۔

میں نے کہا حضرت میں بھی یہی شعر پڑھتا ہوں کہ ج
 ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست
 آپ کو بھی میری نسبت یہی گمان کرنا چاہئے۔ اس پر وہ بہت جھلائے اور چلے گئے اور پڑوس سے ایک رزائی یا ایک دری لے گئے۔
 تو ان کو یا ایسے لوگوں کو اگر کوئی بزرگ سمجھے تو اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ بزرگ تو یہ ہیں کہ حضرت غوث پاک صاحبؒ کے پاس ملک سنجر نے لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک جزو آپ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں آپ نے اس کو نا منظور کیا اور لکھ دیا۔

چوں چتر سنجرى رخ بختم سیاہ باد در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم

پتھر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہوا اگر میرے دل میں ملک سنجر کا
وسوسہ بھی ہو۔

زانکہ یافتہ خبر از ملک نیم شب من ملک نیمروز بیکت بونی خرم
مجھے جب سے ملک نیم شب کی سلطنت حاصل ہے نیمروز
کی سلطنت میری نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔

نیم شب اور نیم روز کا کیا اچھا مقابلہ ہے۔ پس بزرگ تو دنیا داروں
کے دروازے پر کبھی نہ آئے ہوں گے اور دنیا دار اپنی دنیاوی حاجتیں
کریچ پاس و فعا ان کے دروازے پر گئے ہوں گے۔ اب بتلایئے کہ ترک دنیا
کیسی چیز ہے کہ تارکین دنیا تو طالبین دنیا کے در پر نہیں جاتے اور طالبین دنیا
کو ان کے در پر جانا پڑتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزبان حال
دنیا دار خود اقرار کر رہے ہیں کہ ترک دنیا اچھی چیز ہے۔ اور
اتته الدنيا وهى راعشه ان کے پاس دنیا خاک ملتی
اور ناک رگڑتی آتی ہے۔

کے پہی معنی ہیں کہ دنیا دار ان کے پاس آتے ہیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ جو شخص دنیا کا طالب
ہو اور اس کو حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تارک دنیا ہو جائے۔ خبر یہ
اس پر یاد آگیا تھا کہ لوگ دنیا کو ملعون کہنے سے برا مانتے ہیں۔

اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ دنیا

احدیث اور محبوبیت کا فرق

مذمت نہیں ہے بلکہ حب

کی مذمت ہے۔ دیکھئے اس میں بھی شریعت کا کتنا بڑا احسان ہے کہ حُبِ دنیا کی قید لگا دی اور اُسی کی ممانعت کی اور مطلق دنیا کی ممانعت نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہوگی کہ اول تو ہمیں سے آنسو پونچھ دیئے پھر اور بھی سعادت کی کہ حُب میں بھی تفصیل کر دی یعنی حُب کے دو درجے قرار دیئے۔ اس میں سے صرف ایک درجہ کی ممانعت کی اور دوسرے درجہ کی ممانعت نہیں کی۔ اور یہ ایک آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْ اَبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ
وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا
وَمَسْكَنٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا اَحِبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَ

جِهَادِ فِي سَبِيلِهِ۔

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ
اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کینہ اور وہ
تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا غم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن
کو غم پسند کرتے ہو غم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ
میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو غم منظر رہو کہ اللہ تعالیٰ
اپنا عذاب بھیج دیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر دنیا کی چیزیں اللہ رسول اور ان کے احکام سے
زیادہ محبوب ہوں تو عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ
نے ان چیزوں کی احب ہونے پر وعید فرمائی اور محبوب ہونے پر نہیں فرمائی

پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس محبوبیت بھی مذموم نہیں ہے اور اس سے
اس حب دنیا کی بھی تفسیر کر دی جس کی حدیث

حب الدنیا راس کل یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں
خطیئہ کی جڑ ہے۔

وغیرہ میں مذمت فرمائی ہے کہ اس سے مراد اس حبیت زیادہ محبوب ہونا
کا دلہہ ہے۔ اس آیت میں تو یہ بات مہرح ہے کہ نفس حب مذموم نہیں اور
ایک دوسری آیت ہے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو استنباط
کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر
المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام
والحرمات ذلك متاع الحياة الدنیا واللہ عندہ حسن المآب
یعنی خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں
ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے
نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مویشی ہوئے اور زراعت
ہوئی۔ یہ دنیاوی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی
تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب سامان کسریٰ کا آیا تو کروڑوں روپے کا سامان
تھا۔ آپ نے دیکھ کر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں
ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے یعنی محبت ان کی طبعی امر ہے اور

یہ سب حیات دنیا کا سامان ہے۔ سو دنیا کی محبت کو امر طبعی فرمایا۔ پس حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ! اس پر تو ہم قادر نہیں کہ دنیا کی محبت نہ رہے کیونکہ وہ امر طبعی ہے لیکن اے اللہ! ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ محبت آپ کی محبت کی معین ہو جاوے۔ مزاجم نہ ہو۔ پس اس میں فیصلہ کر دیا ہے کہ احبیت (زیادہ محبوب ہونا) مذموم ہے نہ کہ نفس محبوبیت۔ اولہ احبیت کی تفسیر بھی کہ دی کہ جو تیری محبت کے معارض ہو۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ مال بھی اچھا، اُس کا کمانا بھی اچھا، اُس کی محبت بھی اچھی۔ اسی طرح جاہ بھی مگر ان کی احبیت بُری ہے۔ یعنی دنیا کو خدا و رسولؐ سے زیادہ محبوب نہ سمجھو۔

اس کی علامت یہ ہے کہ دین پر دنیا کو ترجیح نہ دو۔ اگر کسی صورت میں دنیا کے حاصل کرنے

محبت کی علامت

سے دین کا کوئی حرج ہوتا ہو اور خدا و رسولؐ کے حکم کے خلاف ہوتا ہو تو اس صورت کو چھوڑ دو سچا ہے دنیا کا کتنا ہی نقصان ہو کیونکہ خدا و رسولؐ کی محبت کی حقیقت کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ ہر فعل و ہر قول میں اُس کی خوشی کو مقدم اور مطلوب سمجھیں اور اُس کا نام محبت نہیں ہے کہ کسی مضمون کو سُن کر رونے لگے صرف رونے سے کیا ہوتا ہے۔

عربی اگر بگیر یہ تیر شدی وصال صد سال می نواں بہ تمنّا گر لستین

یعنی اگر رونے سے وصال محبوب ہو جایا کرے تو سو برس اس کی آرزو میں رو سکتے ہیں۔

سو یہ محبت نہیں ہے کہ مضمون سُن کر تو رو دیتے ہیں لیکن نہ اتباع ہے نہ

عمل ہے۔ ہاں یہ بھی محبت کا ایک درجہ ہے مگر یہ درجہ مطلوب نہیں۔

تقصی الرسول وانت تظہر حبہ هذا العمی فی الافعال
بدایع لوکان حباً صادقاً لاطعته ان المحب لمن یحب
یطیع۔

یعنی تم رسول کی محبت تو ظاہر کرتے ہو اور پھر ان کی مخالفت
بھی کرتے ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ ایسا کب ہو سکتا ہے اگر تم
کو واقعی محبت ہوتی تو تم ضرور ان کی اطاعت کرتے۔ کیونکہ جو
محب ہوتا ہے وہ محبوب کی اطاعت ہی کیا کرتا ہے۔

سو محبت نامور بہادر جس کا حکم کیا گیا ہو، یہ ہے اور جس کو آپ محبت سمجھ
رہے ہیں وہ تو فطری محبت ہے۔ ایسی محبت تو خدا اور رسول کے ساتھ ہر شخص
کو ہے حتیٰ کہ کفار کو بھی۔ اور یہ خدا کے ساتھ ہونا تو ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کو پہچانے
گا اُس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ فطری محبت ہوگی۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
ہونا، سو وہ اس لئے کہ جو لوگ دشمن ہیں وہ آپ کے اخلاق وغیرہ سے واقف
نہیں۔ اُن کو حضور کی سوانح عمری صحیح طور پر نہیں پہنچی۔ تو حضور کو بھی جو پہچانے گا
اُس کو آپ کے ساتھ محبت ضرور ہوگی۔ کیونکہ جو محبت کا منشاء ہے یعنی
اخلاق حسنہ وہ حضور میں اکمل اور اتم درجہ میں موجود ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ ایک
قسم کی محبت ہو جائے گی۔

مثلاً رستم سے ہم کو کیا تعلق ہے کچھ بھی نہیں۔ مگر بچپن میں جو ہم شاہنامہ پڑھا
کرتے تھے، اُس میں اُس کی شجاعت و بہادری کا ذکر دیکھ کر دل میں بے اختیار

محبت پیدا ہو گئی۔

سو کافر بھی اگر منصف ہو تو ضرور حضورؐ سے محبت کرے گا۔ پس اگر مسلمان نے بھی ایسی ہی محبت کی جیسی کافر بھی کرتے ہیں تو کیا کمال کیا مسلمان کی تو یہ حالت ہونی چاہیے کہ

زندہ کنی عطائے تو ورنہ کشتی فداۓ تو دل شدہ مٹائے تو ہر چہ کنی فداۓ تو
یعنی اگر زندہ رکھیں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر
قربان ہوں۔ دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں آپ سے
راضی ہوں۔

پس محبت ایسی ہونی چاہیے لیکن آج کل یہ بات کہاں ہے جب ہم
اقوال و افعال میں حضورؐ کی مخالفت کرتے ہیں تو پھر ہم کو محبت کہاں ہوتی جاوے
اگر کسی کسی پر عاشق ہو جاویں تو پھر دیکھٹے کہ کیا حال ہوتا ہے جو کچھ وہ کہے
کرنے کے لئے تیار، نہ مال کا خیال نہ عزت کی پروا۔ تو کسی کے عشق میں تو یہ
حال ہے۔

ترا عشق ہمچوں خودی ز آب و گل رہا بد ہی صبر و آرام دل
یعنی تمہارا عشق اپنے جیسے پانی اور مٹی سے بنے ہوئے کے ساتھ
دل سے آرام و صبر کو دور کر دیتا ہے۔
اُس پر ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ اپنے ہاتھ سے پیٹ لھی لے
تو گوارا ہے۔ اور کچھ رنج نہیں ہوتا۔ کیونکہ
نہ ساز و عشق را کینجہ سلامت خوشنار سواقی کوئے سلامت

عشق گوشتہ سلامتی کی موافقت نہیں کرتا بلکہ کوشے ملامت کو چاہتا ہے۔ سو محبوب کے کوچہ کی رسوائی بہت اچھی چیز ہے۔

سویہاں تو یہ حال ہے اور خدا اور رسول کی محبت میں یہ حالت ہے کہ زبان سے تو محبت کا دعویٰ ہے مگر اتباع نبوی میں ہزاروں خدشے کہ اگر ایسا کریں گے تو یوں ملعون ہوگا۔ سو یہ کسی محبت ہے۔

اگر واقعی محبت ہوتی تو مخالفت ترک کرنے کے لئے اتنی ہی بات کافی تھی کہ بعضی روایات میں آیا ہے کہ ہر ہفتہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو بار اُمت کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمت دعوت سے بھی بہت تعلق تھا تو بھلا اُمت احباب سے تو کتنا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جتنا تعلق ہوتا ہے ویسا ہی اُس کی تباہی سے صدمہ ہوتا ہے اور دل دکھتا ہے۔ تو اگر ہم کو حضور کے ساتھ واقعی محبت ہوتی تو ہم محض اس خیال سے کہ جب حضور کے سامنے ہماری نافرمانیاں پیش ہوں گی تو حضور کا دل دکھے گا اپنی ان حرکات سے باز آجائے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسول کی محبت مامور بہا یہ ہے کہ عمل اور اطاعت کی محبت ہو۔ پس جب یہ بات معلوم ہو گئی۔

احادیث کی علامت

تو اب یہ سمجھنا چاہئے کہ احادیث جو کہ مطلوب ہیں اُس کی علامت کیا ہے۔ تو اُس

کا فیصلہ یہ ہے کہ دو حالتیں ہیں۔ ایک تو وہ کہ جہاں دونوں کا اجماع ہو سکتا ہے یعنی دین و دنیا دونوں حاصل ہو سکتے ہیں۔ تو اس حالت میں تو معلوم نہیں ہوگا کہ

ان میں زیادہ محبوب اُن کے نزدیک کون سی شے ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ دین و دنیا میں تعارض ہو اور دونوں کا اجتماع نہ ہو سکتا ہو۔ تو اس حالت میں معلوم ہو جاوے گا کہ یہ کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

دیکھئے اگر آپ کو دو دوستوں سے محبت ہو اور آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان دونوں میں سے کس کی محبت زیادہ ہے تو یہ اُن وقت معلوم ہوگی جب کہ ان دونوں میں لڑائی ہو جاوے۔ جس سے زیادہ محبت ہوگی آپ اُنہی کے ساتھ ہو جاویں گے۔

اسی طرح دین و دنیا میں جب تعارض ہو کہ اگر دین کی رعایت کرتے ہیں تو دنیاوی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر دنیا کی طرف جاتے ہیں، تو دین کے خلاف ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں اب جس کا اتباع کرو گے اُسی کا احب ہونا متعین ہو جاوے گا۔ پس اگر اس صورت میں دین کو ترجیح دی تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دین زیادہ محبوب ہے۔ اور اگر دنیا کو ترجیح دی، تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دنیا زیادہ محبوب ہے۔ جس کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص پر یہی واجب ہے کہ ایسی صورت میں دین ہی کو ترجیح دے۔

لیکن اب ایک جماعت اس کے خلاف فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ دنیا کو لو اور دین کو چھوڑ دو۔ مسلمان کے قلم سے یہ فیصلہ نہایت ظلم کا فیصلہ ہے۔ اس پر شاید کوئی صاحبِ پرشبہ کہیں کہ نہیں، پہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا کے مقابلے میں دین کو چھوڑ دینا چاہیے مگر بعض مرتبہ مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے مثلاً

ایک نوکری ہے سو روپے کی اور ایک ہے پانچ سو روپے کی۔ مگر سو والی حلال ہے اور پانچ سو والی حرام۔ تو اب یہاں بوجہ اس کے کہ سو روپے میں اختراجات پورے نہیں ہوتے ہیں مجبوراً دین کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ دنیا دین سے زیادہ محبوب ہے بلکہ ضرورتوں سے مجبور ہو کر چھوڑتے ہیں۔ گو چھوڑتے ہوئے دل بہت دکھتا ہے۔ تو علماء سے جو اس کے متعلق کہتے ہیں سو وہ ایک فریاد ہے فیصلہ نہیں ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ فریاد عام نہیں بلکہ زیادہ تو وہ جماعت ہے کہ دین کے چھوڑ دینے سے اُن کا دل نہیں دکھتا اور نہ حسرت ہوتی ہے، نہ ندامت، نہ اپنے کو خطا وار سمجھتے ہیں بلکہ نہایت کوشش اور شوق سے یہ رائے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ اب معاملات کو وسعت ہو گئی ہے لہذا اب احکام کو بھی بدل دینا چاہئے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ اب اخباروں میں بھی اس قسم کے مضمون شائع ہونے لگے چنانچہ مصر سے ایک اخبار آتا ہے اُس میں بھی ایک مثنوی تھی۔

رعاية الاصلم فی الشوع شرع میں اصلاح کی رعایت

اور اس مثنوی کے ذیل میں ایک مضمون اسی قسم کا لکھا ہوا تھا اور اس کی عبارت عربی تھی تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ جب یہ عربی میں ہے تو ضرور صحیح ہوگا۔ مگر کیا عربی عبارت میں جو مضمون ہو وہ صحیح ہوتا ہے۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک ہمارے دوست تھے قاری مغیث الدین انہوں نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کیا کہ جب مکتبہ المصلیٰ پڑھتے تھے اُس وقت

انہوں نے یہ مسئلہ پڑھا کہ کلام ناس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے پس آپ نے کیا کیا کہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ امام کو سہو ہوا کہ پہلے قعدہ کو اخیر قعدہ سمجھ کر بہت دیر تک جلوس کیا۔ آپ نے سوچا کہ اردو میں بتلانے سے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ لاؤ عربی میں کہہ دو۔ پس آپ نے کہا قسم رکھ کر ہو جائی خیر اُن کے کہنے سے امام کو بھی یاد آگیا کہ یہ پہلا قعدہ ہے اس لئے وہ کھڑا ہو گیا اور سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ یہ قسم والے کون تھے۔ آپ بولے میں تھا۔ انہوں نے کہا تم نے نماز میں کلام کیوں کیا۔ آپ فرماتے کیا ہیں کہ میں نے تو عربی میں کہا تھا یہ کوئی کلام ناس بخوڑا ہی ہے جس سے نماز فاسد ہو جاوے۔ تب اُن کو کلام ناس کا مطلب سمجھایا گیا۔

سو بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جو عربی میں ہو وہ سب ٹھیک ہے اُجی عربی زبان میں تو گالیاں بھی ہیں تو گالیاں بھی ٹھیک ہیں۔ تو مضمون چاہے عربی میں ہو چاہے انگریزی میں اس میں سب یکساں ہیں کہ جو حق ہے حق ہے اور جو باطل ہے باطل ہے پس اس قسم کے پرچے نکلنے لگے ہیں۔

میں نے ایک زمانہ میں اخبار کے متعلق کچھ لکھا تھا کہ اخبار ہرگز نہ دیکھنا چاہئے۔ اس پر اعتراض ہونے لگے کہ جو صاحب اخبار کو بھی منع کرتے ہیں اولہ واقع میں میں اخبار کو منع نہیں کرتا بلکہ اُن انشادات کو جو ایڈیٹر صاحب کی مثلاً خاص الخاص تحقیقات ہوتی ہیں جو اکثر مذہب کے خلاف ہوتی ہیں چنانچہ میں نے ایک اخبار میں دیکھا کہ یہ رائے دی تھی کہ مذہب کے اختلاف کو تو بالکل اٹھا دینا چاہئے۔ اس طرح کہ ایک مذہب پیچ پیچ میں تجویز کیا جائے

جس میں ہر مذہب کی رعایت ہو اور اس کو تجویز بھی کر دیا کہ شاید اگلی نسلیں مان
لیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ صرف توحید لیں اور رسالت
کو جزو مذہب نہ بنائیں اور دوسرے مذہب والوں کو چاہئے کہ کم از کم
توحید کو ضرور مان لیں۔ اور لکھا تھا کہ اگر یہ مذہب عام ہو جائے تو یہ روزِ
کی لطائف کٹائی نہ ہو۔ سو ایسے لوگ بھی ہیں۔ میں تو ان کی نسبت کہا کرتا ہوں۔

گر بہ میر و نسک وزیر و موش را دیوال کنند

ایں چنین ارکان دولت ملک اویراں کنند

یعنی اگر بلی حاکم، کتا وزیر اور چوہا دیوان کر دیا جائے تو یہ ارکان
دولت ملک کو ویران کر دیں گے۔ یعنی نا اہلوں کو اگر دین کے
کام سونپے جاویں تو وہ دین کو برباد کریں گے۔

پس میں جو اخبار دیکھنے کو منع کرتا ہوں تو ایسے اخباروں کو۔ اور ان کو
دیکھنا واقعی مذموم ہے۔ اگر اخبار دیکھنے کا شوق ہو تو ان کے علمی مضامین جن
میں ایڈیٹر صاحبان کی تحقیقات اور مذاہب کے متعلق رائیں ہوتی ہیں، چھوڑ
دیا کرو۔ خیر اس کا ذکر تو استطراداً ہو گیا۔

اصل مقصود میر یہ تھا کہ زیادہ لوگ اسی قسم کے ہیں کہ وہ شوق سے ایسا
کہتے ہیں۔ ان کا دل نہیں دکھتا۔ پس ان کے دل میں تو دنیا کی احمیت ظاہر
ہے۔ پس اس کا یہ کہنا تو فریاد ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر کچھ لوگ پرانی وضع کے بھی ہیں
وہ البتہ اس کو نا جائز ہی سمجھتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ اگر اس صورت میں
دنیا کو چھوڑیں تو گاڑی اٹکتی ہے لیکن ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں

کہ جتنے اخراجات درحقیقت ضروری ہیں اُن کے موافق تو اُدنی ہے، مگر فضول اخراجات بڑھارکھے ہیں اور اُن کی ضرورت گھڑلی گئی ہے۔ اس کا اندازہ یوں ہوگا کہ گھر میں جا کر دیکھو کہ کتنی چیزیں جمع ہیں اور اُن میں کس قدر چیزیں کام کی آتی ہیں۔ عاقل شخص کو عرف کا پابند نہ ہونا چاہئے کہ آج کل منڈھے کر سیاں وغیرہ بھی ضروری ہو گئی ہیں۔ پس جب آپ اس نظر سے چیزوں کو دیکھیں گے تو اُدھی سے زیادہ چیزیں آپ کے گھر میں ایسی نکلیں گی کہ اُن کے ہونے کی خبر بھی آپ کو نہ ہوگی۔ تو اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا یہ چیزیں بھی ضروری ہیں۔ ضروری تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کے نہ ہونے سے تکلیف ہو اور اُن کا معیار اُسانی کے لئے بتلاتا ہوں کہ جتنی چیزیں سفر میں انسان ساتھ لیتا ہے پس وہ ہیں ضروری سفر میں کیا کوئی ضروری چیز کم ہو جاتی ہے۔ نہیں بلکہ بعض چیزیں اس میں بھی ضرورت سے زائد اور فضول ہو جاتی ہیں۔ پس یہ ہے ضروری سامان۔ سو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے گھر میں اتنا سامان نکلے گا جو اس مقدار سے بہت زیادہ ہوگا۔ اسی کو صائب کہتا ہے۔

حرص قانع نیست ورنہ اسباب معاش

آنچه مادر کار داریم اکثرے در کار نیست

یعنی حرص کی وجہ سے قناعت نہیں ہے ورنہ اسباب معاش جو

ہمارے پاس موجود ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہے

پس ضروری اخراجات تو معلوم ہو گئے۔ اب ان سے زائد جو کچھ ہو وہ

بیکار ہے۔ سو جن کو اتنا ملتا ہے، تو یہ سوال کہہ ہی نہیں سکتے۔ اب یہ

گئے جن کو اتنا بھی نہیں ملتا۔ اُن کی فریاد البتہ سُنی جاوے گی۔ اور کہا جاوے گا کہ میں آپ سے فی الحال اُس نوکری کے چھوڑنے کو نہیں کہتا مگر اتنا تو کیجئے کہ اپنے کو گنہگار سمجھئے اور استغفار کیجئے اور یہ دُعا کیجئے کہ اللہ مجھے اس سے نجات دے دے اور حلال نوکری کی تلاش میں رہئے۔ اگر آپ حلال نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پھر بھی اس میں مبتلا رہیں گے تو بھی کم سے کم اتنا تو فائدہ ہے کہ آپ دنیا کو ترجیح دینے والے تو نہ ہوں گے اور آپ کے اندر دنیا کی اُجدیت تو نہ ہوگی اب اس کے بعد ترجیح کا کیا عذر رہا۔ اب تو سارے عذر ختم ہو گئے اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیا کو ترجیح دینا کسی وقت بھی جائز نہیں۔

رعونت کی علامت | ایسے لوگ جن کو اتنا ضروری سامان بھی نہ ملتا ہو واقع میں بہت ہی کم ہیں ورنہ زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں کہ اُن کو ضرورت نہیں۔

میں نے ایک منصرم کو دیکھا ہے جن کی پچاس روپیہ تنخواہ لیکن کچھری ہمیشہ پیادہ جاتے اور لوگ فٹن میں جاتے تھے اور مدرسوں میں چنڈے اور رشتہ داروں کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں اور جب اُن کی پنشن ہوئی تو اخراجات بھی اُدھے کر دیئے اور جتنا مدرسوں اور رشتہ داروں کو دیتے تھے اُس کو بھی اُدھا کر دیا۔ آخر یہ بھی تو اپنی ضروریات تھوڑے میں انجام دیتے ہی تھے۔ باقی رہا فٹن وغیرہ پر سوار ہونا تو یہ کون سے ضروریات سے ہے۔

میں تو فٹن کو فتن (فتنوں) میں داخل سمجھتا ہوں اور اس قسم کی جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں کوٹ کوٹ کر اور رعونت بھری ہے۔ وضع بھی ایسی سواری بھی

ایسی غرض ہر سامان میں سے رعونت ٹپکتی ہے اور جو شخص چاہے اس کا احساس کر سکتا ہے۔ جو لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں ان کی حالت دیکھ لیجئے کہ ان کے اندر کسی رعونت آجاتی ہے۔

اس رعونت پر ایک قصہ یاد آگیا۔ ایک شخص ولایت سے پڑھ کر آئے تھے۔ وہ جب اپنے آبا جہان سے ملے تو کہتے ہیں ویل بڑھا تم اچھا ہے۔ پھر ایک قیسری بات اور بھی ہے کہ یہ فعل ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ نئے فیشن کی جتنی چیزیں ہیں اکثر اسی قسم کی ہیں کہ ان سے خود ہی منتفع ہو سکتا ہے۔ دوسرے کو اس کا نفع نہیں ہوتا۔ چار پائی اور کرسی ہی کا فرق دیکھ لیجئے کہ چار پائی تو ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک جماعت بیٹھی ہو اور ایک آدمی اور آجائے اس میں اس کی بھی گنجائش نکل آئے گی اور ایک کرسی ہے کہ اس میں اپنے ساتھ ایک کو بھی نہیں بٹھا سکتے۔ اسی طرح عامہ کہ اگر ہم چاہیں تو پھاڑ کر ایک حصہ اس میں سے اپنے بھائی کو دے دیں مگر آپ گلوبند میں سے تو پھاڑ کر دے دیجئے غرض نئے فیشن کی اکثر چیزیں وہ ہیں کہ ان میں سراسر خود غرضی ہے۔ تو خلاف ہمدردی ہی سمجھ کر چھوڑ دیجئے۔ یا اگر بالکل نہ چھوڑیں تو کم ہی کر دیجئے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم برا ہی سمجھ لیجئے۔

غرض کہ ان چیزوں میں بہت سے مفاسد ہیں اور سب سے بڑا مفاسد یہ ہے کہ اخراجات بڑھتے ہیں۔ پس یہ تو ان کا بیان تھا کہ دنیا و دین میں تعارض ہونے کے وقت کیا برتاؤ کرنا چاہئے اور اسی طرح سجاہ میں بھی معمول رکھنا چاہئے کہ جو صورتیں سجاہ کی خلاف شریعت ہیں ان سے بچنا چاہئے۔

ضرورت کی چیزیں

اب شکایت یہ ہے کہ بچنا تو درکنار اس کو

بڑا بھی نہیں سمجھتے۔ تو اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ ایک تو علم کی کیونکہ جب تک اُن کی بُرائی کا علم نہ ہوگا۔ تو اس وقت اُن کو بُرا کیسے سمجھے گا۔ پس علم دین سیکھنا چاہئے خواہ اردو میں ہی ہو اور ایک عمل اور ہمت کی۔ اس پر تو عقلاً موقوف ہے۔ اور ایک تیسری چیز کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ ضرورت عادی ہے۔ گو عقلاً وہ موقوف علیہ نہیں ہے اور وہ اہل اللہ کی صحبت ہے کیونکہ جس ہمت کی ضرورت مذکور ہوئی ہے۔ وہ ہمت اہل اللہ کی صحبت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت میں جاوے۔ پس علم دین بھی حاصل کیجئے اور اہل اللہ کی صحبت بھی اختیار کیجئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سب ابو حنیفہؒ اور حنیفہؒ بعد اویٰ ہو جاویں مگر ضروری علم دین تو حاصل کریں اور جب موقع ملتا جاوے اہل اللہ کی صحبت میں ملا کریں اس سے جذبات و جانہ میں ایک قسم کی قوت پیدا ہوگی۔ اس سے آپ اپنی بُرائی حالت پر آشوبہا میں گے اور اُن کے جاتے رہنے سے آپ کو تاسف ہوگا۔ اور اصلاح کی فکر ہوگی اور یہ بھی اللہ و رسولؐ کی صحبت ہے۔

غرض جاہ ہو یا مال ہو ان کی صحبت نہ ہوتی چاہئے۔ اسی پر وعید فرماتے ہیں فتر لیبوا کہ منظر ہو یہاں تک کہ کوئی دیال نازل ہو اور اس کا دیال دنیا میں تو یہ نازل ہوا کہ دنیا ہی سب سے اول برباد ہو رہی ہے۔ چنانچہ دنیا کو جس قدر طلب کرتے ہیں مگر وہی دنیا ہم سے چلی جا رہی ہے اور ہم تو کیا ہماری

سلطنتوں کی بھی یہی حالت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے برباد ہو رہی ہیں اور وہ خود بھی اس کو سمجھ رہے ہیں کہ یہ تباہی دین چھوڑنے کی بدولت ہے اور کیوں نہ ہو دین چیز ہی ایسی ہے کہ اس سے آخرت بھی درست ہوتی ہے اور دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

دیکھئے شیخ سنوسی ایک افریقی بدو تھے جو دین کی حمایت کے لئے آئے تھے۔ اب اُس کی بدولت صاحب سلطنت ہو گئے اور ایک وہ اسلامی قابہ سلطنت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے دینی چلی جا رہی ہے اور دین کا چھوڑنا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ میں نے سنا ہے کہ اُس کی پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ یہ گفتگو ہوئی کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہر فرقہ سے ہونے چاہئیں تاکہ رعایا میں مساوات رہے۔ پس جب کہ پارلیمنٹ کے اجزاء غیر مذہب کے لوگوں کو بتایا کہ جن پر خیر خواہی کا اطمینان بھی نہیں معن مساوات کے دعویٰ میں تو پھر ایسی سلطنت کو کیا عروج ہو سکتا ہے۔ بے شک شریعت مساوات سکھاتی ہے مگر مطلق مساوات نہیں بلکہ اس کی ایک حد مقرر ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کا میرٹھی ایک نصرانی تھا جب وہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے آئے تو آپؓ نے فرمایا کہ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی۔
لَا تَتَّخِذُوا الْبَاطِلَةَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
لَا يَأْتِيَكُمُ خَبَلٌ
یعنی غیر مذہب کے شخص کو اپنا ہمراز مت بناؤ۔ وہ تم کو

ضرر پہنچانے میں کمی نہیں کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ وہ حساب خوب جانتا ہے اس لئے ایسا کیا حضرت

عمر نے فرمایا کہ کیا کام اُس پر منحصر ہے۔ اگر وہ مرجائے تو پھر کیا کرے گا۔
آخر میں میں جا کر دیکھا کہ وہ مر گیا تھا۔ کیوں نہ ہو کوئی ایسی ویسی زبان ٹھوڑا ہی
تھی۔ وہ زبان تھی جس کی شان میں ہے۔

الحق ينطق على لسان عمر
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان
پر حق بات جاری ہوتی تھی۔

غرض کہ غیر مسلم کو ہمارا بنانے کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اور
خود عقل بھی تو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ دیکھئے کہ روزمرہ کے معاملات
میں کیا ہم پسند کرتے ہیں کہ اپنے راز پر غیر کو مطلع کریں، ہرگز نہیں۔ بعض اوقات
اپنے اسرار سے پیوی کو بھی مطلع نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کو چھوڑا اور اس کی ایسی برکت ہوئی
کہ مدتوں بھی اس کا خمیازہ نہ بھولیں گے۔ واللہ لوگ سمجھتے تو یہ ہیں کہ دین کو
چھوڑ کر ترقی ہوگی مگر خدا تعالیٰ دکھلا دیتے ہیں کہ وہ بھی حاصل نہ ہوا جس کے
لئے انہوں نے دین کو چھوڑا۔ سو اس قاہر سلطنت کی تو دین کے چھوڑنے
سے ایسی تباہی ہوئی اور ان بدوی کو دیکھئے جو دین کی حمایت کو آئے تھے
کہ وہ صاحب سلطنت ہو گئے اور یہ زندہ نظیریں ہیں اس امر کی کہ طالب دین
ہر طرح کی ترقی کر سکتا ہے۔ اور الحمد للہ کہ اب اس کو عقلا مان بھی گئے ہیں
لہذا تطویل کی ضرورت نہیں۔

پس احبیت دین کی اعتقاداً تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اگر
ممکن ہو تو عقلاً بھی ورنہ تاسف ہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑیے اور اگر

مجبوری کے سبب نہ چھوڑ سکیں تو بُرا تو کہئے۔ یہ ہے فیصلہ اس کا۔ اب میں اصل مقصود تو عرض کر چکا ہوں صرف آیت کے بعض اجزاء کا حل رہ گیا ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں۔

نفسیری نکات | کہ مال کے قصہ میں تو منافقین کے اس قول کے جواب کے ختم میں۔

لا تفتقوا علی من عند رسول
یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں
ان پر امت خروج کرو یہاں تک کہ وہ آپ منتشر ہو جائیں گے
دقیقہوں (وہ سمجھتے نہیں ہیں) فرمایا اور آگے جاہ کے قصہ میں اُن کے جواب
کے خاتمہ میں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں ہیں) فرمایا۔ اس میں ایک نکتہ
ہے کہ فقہ خاص ہے علم سے۔ فقہ تو خاص ہے امور خفیہ کے ساتھ اور علم عام
ہے جلی کے لئے بھی ہیں اب اُس کی وجہ سمجھیں آگئی ہوگی۔ کیونکہ مال کے
قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللہ خزائن السموات و
الارض
یعنی آسمان اور زمین کے تمام
خزانے خدا تعالیٰ ہی کے اختیار

میں ہیں۔

سوال کے لئے تو سمجھ کی ضرورت ہے کیونکہ بظاہر تو وہ ہمارے
ہاتھوں میں ہے۔ پس یہاں تاویل کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہمارے ہاتھوں
میں ہونے کے اسباب کس کے ہاتھ میں ہیں۔ پس چونکہ یہ ذرا خفی اور استدلال

کا محتاج تھا۔ اس لئے یہاں لا یفقهون فرمایا اور جاہ کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللہ العزۃ ولرسولہ و

یعنی عزت اللہ اور اس کے

للمؤمنین رسول اور مؤمنین ہی کیلئے ہے

اور یہ بالکل ظاہر تھا۔ خدا تعالیٰ کے لئے عزت ہونا تو اس لئے کہ عالم کے اندر جو تصرفات ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ مثلاً زلزلہ ہے اور بارش ہے۔ اب اگر کہتے کہ یہ سب کچھ صورت نوعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس بات کو تو وہ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ طبیعت اور نیچر ہی شعور نہیں تو میں کہتا ہوں کہ طبیعت کو فاعل قرار دینے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ دو شخصوں نے ایک خوبصورت گھڑی دیکھی۔ اس پر تو دونوں کو اتفاق ہوا کہ اس کو کسی نے بنایا ہے لیکن اس میں اختلاف ہوا کہ کس نے بنایا ہے۔ ایک نے تو یہ کہا کہ بالکل اندھے، لہجے، لنگڑے بے شعور نے بنایا ہے اور ایک نے یہ کہا کہ کسی بڑے عقلمند اور کامل گھڑی ساز نے بنایا ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ یہ دوسرا شخص حق کہتا ہے تو جیسا ان دونوں میں فرق ہے ایسا ہی مسلمان اور اہل اسلام میں فرق ہے کہ اہل اسلام تو ان تمام مصنوعات عجیبہ کا اللہ تعالیٰ کو فاعل کہتے ہیں اور اہل ~~طبیعت~~ ^{طبیعت} جس کو کچھ شعور تک بھی نہیں۔ وہ خدا کے قائل نہیں اور اگر وہ یہ کہیں، کہتے کہ ہم خدا کے بھی قائل ہیں اور طبیعت کے بھی۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کو فاعل مانتے ہیں تو اس کے ساتھ طبیعت کے فاعل ماننے کی ضرورت ہی نہیں

ورنہ اس کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی کہے کہ اس گھڑی کو ایک کال اور ایک
اندھے نے مل کر بنایا ہے۔ تو اس جملے سے کہا جاوے گا کہ کال کے ساتھ
اس اندھے کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پس ایک شخص جمع نہیں کر سکتا
خدا اور سائنس کو۔ پس خدا کا غلبہ تو اس سے ثابت ہو گیا۔ اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا غلبہ حضور کے واقعات سے ظاہر ہے۔ باقی وللمومنین یعنی
مومنین کا غلبہ تو اس کو جب چاہے تجربہ کر لیجئے کہ جتنا ایمان ہوگا اتنی ہی عزت
بھی ہوگی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس کا نمونہ ہیں۔ ان کے ایمان کی حالت یہ تھی کہ
حق تعالیٰ اُن کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں۔

الذین ان مکنا ہم فی الدن
اقاموا الصلوٰۃ
یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر
ہم ان کو دنیا میں حکومت دے

دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں۔

اور ان کے غلبہ کی یہ حالت تھی کہ تمام قومیں اس کی قائل ہیں کہ ان کے
برابر کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں ہوئی۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نمونے بہت بُرائے
ہو گئے ہیں تو اب بھی دیکھ لیجئے کہ جو مسلمان اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں اُن
کی کتنی عزت ہے خیر خواہان ترقی کی نگاہ میں بھی وہ معفی نہیں ہے اور وجہ یہ
ہے کہ اصل تو خدا کی عزت ہے۔ پھر جو لوگ اُن کے ساتھ وابستہ ہوں گے،
اُن کی بھی عزت ضرور ہوگی۔ اگر کسی کو خدا ہی کی عزت کی خبر نہ ہو، تو دوسری
بات ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مالک الاموال ہونا چونکہ کسی قدر محقق تھا اس لئے

وہاں لا یفقیہون (وہ سمجھتے نہیں) فرمایا اور صاحب عزت ہونا ظاہر تھا۔
اس لئے وہاں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں) فرمایا۔

نیز اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا کہ مال تو اس واسطے ہے کہ اس
سے انتفاع حاصل کیا جاوے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ
سے اپنے کو ضرر سے بچایا جاوے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں
پر وباؤ ڈال کر انتفاع حاصل کیا جاوے

اول کی تویہ دلیل ہے کہ جب منافقین نے کہا کہ مسلمانوں پر خراج مت
کرو تاکہ جب کھانے کو نہ ملے گا خود منتشر ہو جاویں گے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ
نے یہ رد فرمایا کہ خزائن کے مالک تو ہم ہیں تم اپنے مالوں سے اُن کو شفع
نہ کرو گے تو ہم اپنے خزائن سے اُن کو دیں گے تاکہ وہ اس سے شفع ہوں۔
اس سے معلوم ہو گیا کہ مال انتفاع کے لئے ہے۔

دوسری جزو کی یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اپنے جاہ سے مسلمانوں کو
ضرر پہنچانا چاہا تھا تو حق تعالیٰ نے اُس پر رد فرمایا کہ عزت تو اللہ اور
رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے یعنی چونکہ ہم نے اُن کو جاہ عنایت کی ہے
اس لئے تم ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ مومنین اس جاہ سے تمہارے ضرر کو
رفع کر دیں گے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جاہ دفع ضرر کے لئے ہے۔

اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جو مضمون بیان سے
مقصود تھا اُس کا اعادہ پھر کئے دیتا ہوں کہ اس آیت میں یہ بات بتلائی گئی
ہے کہ مال اور جاہ تو مذموم نہیں لیکن اگر ناجائز طور پر اُن کا استعمال ہو، تو مذموم

ہیں۔ پس جو لوگ مال اور جاہ کو علی الاطلاق مذموم کہتے ہیں۔ اُن کو چاہئے کہ اس میں یہ قید لگا دیں۔ جو لوگ علی الاطلاق اچھا کہتے ہیں وہ سودا استعمال کی صورت کو مستثنیٰ کریں یہ تو تحقیق علمی معنی۔

مگر چونکہ مقصود شمل ہے اس لئے اب طرز عمل سننا چاہئے کہ جہاں دین و دنیا میں تعارض نہ ہو وہاں خوب کماٹے اور جہاں تعارض ہو وہاں قدر ضرورت سے زیادہ کو چھوڑے اور جہاں یہ بھی نہ ہو سکے وہاں تاسف کرے پس اب آپس میں اختلاف بھی نہ رہے گا نہ گناہوں کے پورے جمع ہوں گے۔

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ عمل کی توفیق اور دین کی اہمیت عطا فرمائے۔ و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خدیج خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

تشمیر:- اور فرمایا کہ اول آیت میں

اللہ خزائن السموات

اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں خزانے

اسماؤں کے۔

فرما کر اموال کو اپنے ساتھ خاص فرمایا اور آیت ثانی میں عزت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے بھی ثابت فرمایا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا مالدار ہونا تو لازمی امر نہیں گو اتنا مال ہر ایک کو ملے گا جس سے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ اور اس قدر ملنا یہ بھی خود اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ مقصود روکا یہ ہے کہ انفضاض (منتشر ہونا) نہ ہو گا۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ سماجیات مرتفع ہو تو رہیں، ورنہ اُن منافقین کا مقصود حاصل ہو جاتا۔ اور

صاحب عزت ہونا کامل مسلمان کا لازمی امر ہے۔ فقط!

اشرف علی!

احکام المال

مال کی آمد و خرچ کے احکام کے متعلق یہ وعظ ۱۲ رجب ۱۳۲۶ھ
کو بھوپال ہاؤس مکینوں کی شہر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ ۵۰۰ کی حاضر
تھی۔ پوسٹے پانچ گھنٹے میں ختم ہوا۔ شہر یوسفنا ولد سردار علی سکندر صاحب
قاضیاں بجنور نے قلمبند کیا۔

خطبة النور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمد وآل محمد ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
من يهمل الله فلا فضل له ومن يهمل الله فلا هادى له
ونشهد أن لا اله الا الله وحده لا شريك له و
نشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله أما بعد
فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن
 الرحيم ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتداولوا
بها إلى الحكم لتأكلوا فريقاً من أموال الناس بالثمن
وانتم تعلمون

معاملات میں معصیت | یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے معاملت، مالیہ کی حفاظت اور اُس کی تصحیح کے متعلق مضمون ارشاد فرمایا ہے۔ ضرورت اس وقت اس کے اختیار کرنے کی یہ ہوتی کہ کم و بیش دنیا ہر شخص کے پاس موجود ہے اور اُس کو معاملہ کرنے کی ضرورت بھی واقع ہوتی ہے اور حق تعالیٰ نے معاملت، مالیہ کی تصحیح کا اہتمام فرمایا ہے پس ہر شخص کو تصحیح معاملت کی ضرورت ہے۔ مگر باستثناء شاذ کے کوئی اس کو ضروری نہیں سمجھتا اور یہ نہیں خیال کرتا کہ معاملات، مالیہ کی رعایت نہ کرنے سے بھی معصیت ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو معاصی پیدا ہوتے ہیں اُن کا ظاہر میں کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا اور اُن کے علاوہ جو معاصی ہیں اُن کا اثر ظاہر میں بھی محسوس ہوتا ہے۔ پس اگر کسی کی حقائق پر نظر ہے تو وہ ان معاصی کا اثر اور اُن کے قبائح دیکھ

کر مقبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک غیبت ہی ہے کہ اُس کا اثر ہے نا اتفاقی ہو جانا آپس میں مناقشات پیش آ جانا۔ اُس کی وجہ سے پریشانی ہونا۔ اس لئے اس میں مصیبت کا رنگ صاف نظر آتا ہے یا مثلاً ڈاکہ ہے کہ اس میں سزائیں ہوتی ہیں۔ یہ خرابیاں اس میں آنکھوں سے نظر آتی ہیں جو باعث ہو جاتی ہیں اُن کے قلع سمجھنے کا۔ اس لئے انسان اُن کو چھوڑ دیتا ہے اور معاملات مالیہ میں یہ صورت پیش نہیں آتی۔ اس لئے اُن کے معاصی ہونے پر مقبہ نہیں ہوتا۔ اگر حقوق مالیہ کے تلف ہونے پر بھی آثار ظاہر ہوتے اور رسوائی وغیرہ ہوتی تو اُن کے قلع پر بھی تنبیہ ہو جاتا جو محرک ہوتا اُن کے ترک پر۔ اگر دینی مصلحت کی وجہ سے ان سے محترز نہ ہوتا تو خیر دنیا ہی کی حفاظت کی غرض سے ہوتا مگر یہاں یہ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اور جتنے معاصی ہیں اُن پر تنبیہ ہونے کے اسباب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اکثر اُن پر تنبیہ ہو جاتا ہے اور یہاں یہ ہے نہیں اس لئے اُن کی ذمہ داری برابری پر وا نہیں کی جاتی۔

ریلوے کی حق تلفی | عوام الناس کا تو فتویٰ ہی ہے کہ کفار کا مال جس طرح بھی ملے لیا جائے سب روا ہے۔ چنانچہ ریل

میں بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرف توجہ ہی نہیں کہ تعداد سے زیادہ اسباب ریل میں ملے جانا چاہئے یا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری محض ہے مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی قانون ملکی نہیں ہے جو یہ غلط کیا جائے بلکہ یہ قانون اجازت کے متعلق ہے۔ اگر من حیث السلطنت اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہو تو من حیث الاستیجار تو ماننا ضروری ہے۔ شرائط اجازہ

میں سلطنت اور غیر سلطنت برابری میں جن شروط پر اجارہ قرار پائے۔ اُن کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے تو اُن کا قانون بحیثیت اجارہ تو واجب الاقتدار ہے۔ جب انہوں نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ کسی کو اسباب بلا کر ایہ لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر حقوق اچھی اس سے زیادہ ہوگا تو بوجہ اس کے کہ غیر کی حق تلفی ہے اس کا لے جانا نہ جائز نہ ہوگا۔ بہت لوگ یہ سمجھ ہوئے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ گھڑی ہے کہ بہت سے حقوق ہمارے گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں۔ ہمیں سبائز ہے کہ ہم خفیہ طور سے وصول کر لیں اول تو اس میں یہ بات ہے کہ ساری ریلیں گورنمنٹ کی نہیں ہیں۔ بہت سی ریلیں کمپنی کی ہیں۔ دوسرے اگر ساری ریلیں گورنمنٹ ہی کی ہوں تو کیا ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ ہوں بھی تو کیا اس کا حساب اُن کے پاس ہے کہ کتنے حق اُن کے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور کتنے گورنمنٹ کے اُن کے ذمہ ہیں۔ یہ سب شخص کی تاویل میں ہیں بلکہ اگر ثابت بھی ہو جاوے کہ اُس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے تب بھی حفاظت نفس کا مقتضی ایہی ہے کہ ایسا نہ کیا جاوے۔

راز اس کا یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے ویسی ہی پڑ جاتی ہے۔ اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو اس کا خوگر ہو جاوے گا اور آئندہ حد سے تجاوز کرے گا۔ جہاں قطعاً سبائز نہ ہوگا وہاں بھی اس عادت پر کار بند ہوگا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہیے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا

حدیث میں ہے۔ لعن الله السارق يسرق البغية
فتقطع يده ويسرق المحبل فتقطع يده۔ یعنی اللہ

چور پر لعنت کرے کہ وہ ایک انڈا چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے
اور ایک رسی چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

اس حدیث میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک انڈا چرانے سے یا رسی چرانے
سے ہاتھ کہاں کاٹا جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے کا نصاب تو اس سے زیادہ ہے اور
حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انڈے اور ایک رسی پر ہاتھ کاٹنے پر فرما رہے
ہیں۔ ہمارے دینی حنفیہ کے نزدیک قطع ید کا نصاب دس درہم ہیں۔ دوسرے
ائمہ کے نزدیک اس کی اور مقدار ہے۔ بہر حال اہل مذاہب متبوعہ میں کوئی ایسا
نہیں کہ جس کے نزدیک اس کا کوئی نصاب نہ ہو۔ اور انڈے اور رسی چرانے پر
اہل مذاہب متبوعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی قطع ید نہیں آتا۔ اس لئے اس
حدیث کا ماول کرنا واجب ہوا کہ اس کو ظاہر سے منصرف کیا جاوے۔ میں
بعض نے کہا کہ بیضہ سونے کا مراد ہے جس کی قیمت نصاب سے بھی زائد ہے
اور بعض نے کہا کہ بیضہ سے مراد خود ہے۔ خود دوسرے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کو
سر پہن لیتے ہیں تاکہ تلوار اثر نہ کرے۔ وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے جس پر
قطع ید آوے۔ اسی طرح بعض نے جل سے مراد جل سفینہ لیا ہے کہ وہ اتنی
قیمت کی ہو سکتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اتنی حقیر چیز پر قطع ید ابتدائے اسلام
میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ سب بعید تاویل ہیں۔ ہمارے استاذ نے جو تاویل
فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے اور ظاہر حدیث سے کچھ بعید بھی نہیں۔ تو جب

تک کہ قباور معنی بن سکیں غیر قباور کی طرف کیوں جائیں۔

میرے استاد فرماتے ہیں کہ حدیث میں بیضہ اور جل کے وہی معنی مراد ہیں جو متعارف ہیں یعنی انڈا اور رستی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس سے معصیت کی عادت ہوتی ہے اور بڑی معصیتوں کا باب کھلتا ہے۔ جو چور بد معاش ہوتے ہیں وہ اول چوری پیسہ پیسہ سے شروع کرتے ہیں۔ جب وہ کھپ گیا آگے جرات ہوتی۔ پھر اور آگے چلے یہاں تک کہ ایک روز اس کی نوبت پہنچی کہ ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ یعنی کسی زمانہ میں انڈا یا رسی چرائی تھی آج یہاں تک، نوبت پہنچی کہ اتنا مال چرایا کہ جس پر قطعید کا حکم آگیا یہ مطلب ہے اس حدیث کا۔

اسی وجہ سے مشائخ بعض کو روکا کرتے ہیں بعض مباحات سے اور مباحات

استعداد نفس اور نور فراست

کی تقلیل کراتے ہیں کہ کہیں نفس مباحات سے گزر کر آگے نہ چلنے لگے۔ گو بعض موقع پر توسع بھی کرتے ہیں۔ وہ تو طبیب ہیں کہیں زیادہ وسعت کرنے سے تزکیہ ہوگا نفس کا رذائل سے اور کہیں تنگی کرنے سے۔ اس لئے جہاں وسعت کا موقع ہوتا ہے وہاں وسعت کرتے ہیں اور جہاں تنگی کا موقع ہوتا ہے، وہاں تنگی کرتے ہیں۔ وہ ماہر فن ہیں۔ باقی دو چار لفظ کے جاننے سے کہیں دین کا فن ٹھوڑا ہی آسکتا ہے۔ اس کا موقع ہر ایک کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں وسعت کی حاجت ہے اور کہاں تنگی کی۔ مشائخ کی صحبت میں رہ کر خود اس کا مشاہدہ کرو گے اور ان کے یہاں مختلف واقعات دیکھو گے مثلاً کسی کو دیکھو گے کہ وسعت

دی جا رہی ہے اور دوسرے شخص کو دیکھو گے کہ اُن کو عمارت کی جا رہی ہے
اس کی وجہ یہی ہے کہ جو ان سے اصلاح کا طالب ہوتا ہے وہ اُس کے استعداد
نفس کو سمجھتے ہیں۔ اُن کو خدا تعالیٰ نے اس کی ایسی فراست عطا فرمائی ہے کہ
اس فراست میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ تمام عقلاء جمع ہو جاویں مگر وہ نور فراست
کہاں سے لائیں گے جو اُن کو عطا ہوا ہے۔ اُن کو یہ فضیلت ہے اور وہ اسے
جس کی وجہ سے وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کے لئے یہ مناسب ہے اور اُس
کے لئے یہ۔

وسعت ایسی جگہ کرتے ہیں جیسے حکایت ہے کہ کسی چور نے ایک رنگ
سے بیعت کی۔ اور چوری سے توبہ کر لی۔ اُن بزرگ نے اُس کو اجازت دے
دی خانقاہ میں رہنے کی۔ مرید صاحب روز رات کو کیا کرتے کہ لوگوں کے
جوتے لوٹ پوٹ کیا کرتے۔ کسی کا جوتا کہیں رکھ دیتے اور کسی کا کہیں اب لوگ
حیران کہ یہ کون جوتوں کو اول بدل کر جاتا ہے۔ آخر ایک روز اُن کو الٹ پلٹ
کرتے ہوئے دیکھ لیا اور پکڑ کر صبح کو شیخ کے سامنے لا حاضر کیا اور کہا کہ جوتوں کو
الٹ پلٹ کرنے والے یہ مرید ہیں آپ کے۔ شیخ نے اُن سے کہا کہ یہ کیا
حرکت ہے۔ مرید صاحب نے کہا کہ بات یہ ہے کہ مجھ کو چوری کی عادت
تھی۔ میں نے آپ کے ماتھے پر توبہ کر لی۔ جب رات آتی ہے تو طبیعت میں
تقاضا ہوتا ہے کہ چوری کر دوں۔ بے خدا تقاضا ہوتا ہے۔ ہر جہد سچا ہوتا ہوں کہ
جی سے بھلا دوں مگر نہیں جاتا۔ اور چوری سے کہ چکا ہوں توبہ۔ اس لئے میں
چوری کی نقل بنا کر جی کو بہلا دیتا ہوں کہ جوتے ادھر کے ادھر اور ادھر کے

ادھر کر دیتا ہوں اور کہا کہ لوگوں کو اس سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس سے میرے دین کی حفاظت رہتی ہے۔ یہ اندیشہ ہے کہ اگر ایسا نہ کروں تو شاید پھر چوری کرنے لگوں۔ شیخ نے اُس کو اجازت دے دی کہ اچھا تم کر لیا کرو اگر کوئی دوسرا شخص اس حرکت کو کرنے لگے تو اُس کو روکا جائے گا۔

اسی واسطے شیخ کے ساتھ مزاحمت نہیں چاہئے۔ وہ ماہر اور تجربہ کار ہے جو بھی فیصلہ کرتا ہے بصیرت سے کرتا ہے۔ ہر شخص اُس کو سمجھ نہیں سکتا اُس سے الجھنا کہ یہاں ایسا کیوں کیا اور وہاں ایسا نہ کیا۔ یہ مناسب نہیں شیخ کہیں تنگی کرتا ہے اور کہیں وسعت اور وہی اُس کو سمجھتا ہے کہ یہاں موقع تنگی کا ہے اور یہاں وسعت کا۔ دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا۔

بہر حال اگر ثابت بھی ہو گیا کہ گورنمنٹ کے ذمہ ہمارا حق رہ گیا ہے جب بھی زیادہ اسباب نہ لے جانا چاہئے کیونکہ ایسا کرنے سے نفس کو اس کی عادت پڑتی ہے اور عادت ہونے سے اپنا حق وصول ہو جانے پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ پس مقتضا معالجہ کا یہی ہے کہ گو ہمارے حقوق بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہوں تب بھی ایسا نہ کریں۔

میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن پر یا تو ڈاکخانہ کی مہر ہی نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو ٹکٹ سے بچی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر میری بڑی نیت ہو تو میں ان ٹکٹوں سے منتفع ہو سکتا ہوں کہ دوسرے خطوط پر لگا کر بھیج دوں مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ جو دو پیسے لغافہ کے دیئے گئے ہیں وہ اجرت کے طور پر ہیں اور وہ لغافہ کی شکل اصل

کی نفس

میں رسید ہے ان دو پیسے کی۔ پس جب ڈاک پہنچی تو وہ دو پیسے وصول ہو گئے
اب اس رسید سے دوسری بار وصول کرنا حرام ہے۔ پس میں ایسے ٹکٹوں کو
چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ باوجودیکہ مجھ کو اس کی عادت ہو گئی ہے مگر پھر
بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ شاید تقوے ظاہر کرنے کو ایسا نہ کرتا ہوں۔ حضرت نفس
کی کیفیت یہ ہے۔

نفس اثر در ہاست و کے مردہ است از غم بے آلتی افسردہ است

نفس کے کپڑے کبھی غافل نہ رہنا چاہئے۔ ہر وقت ہوشیار رہے۔

حضرت حاجی صاحب اس قول کے کہ الخمر سود المظن یعنی ہوشیاری

یہ ہے کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے عجیب معنی ارشاد فرماتے تھے کہ سودظن
سے مراد سودظن بنفسہ ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ دوسروں سے سودظن رکھے بلکہ
اپنے ساتھ تو یہ معاملہ ہو کہ ہر بات میں بدگمان رہے کہ کہیں اس میں نفس کی شرارت
نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ یہ کہ ہر شخص کو اپنے سے اچھا سمجھے۔ باقی شیخ سعدی
علیہ الرحمۃ نے بوستان میں جو فرمایا ہے۔

نگہ دارہ دآں شوخ در کیسہ دُر کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بر

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سودظن پر آمادہ کر رہے ہیں بظاہر ان کا

کلام قرآن و حدیث کے معارض معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے ان بعض الظن
اشمار و حدیث میں ہے ظنوا المؤمنین خیراً اور پھر ان کے کلام کے بھی
معارض ہے کیونکہ گلستان میں فرماتے ہیں۔

ہر کہ را جامہ پارنا بینی پارسا وال و نیک مرزنگار

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ظاہر اچھا ہو اُس کو اچھا سمجھو اور بوستان کے کلام سے یہ پایا جاتا ہے کہ سرب کو بُرا جانے۔ گلستان کی اور تعلیم اور بوستان کی اور یہ کیا بات ہے؟

جواب یہ ہے کہ شیخ کا مطلب یہ نہیں جو تم سمجھو۔ بدگمانی کے دو درجے ہیں۔ ایک بدگمانی ہے اعتقاد کے درجہ میں کہ دوسرے کو بُرا سمجھو اور ایک بدگمانی ہے عمل کے درجہ میں یعنی معاملہ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کرتا تو ممانعت تو ہے بدگمانی کی باعتبار اعتقاد کے اور مشورہ ہے بدگمانی کا باعتبار معاملہ کے۔ سو بوستان کے اس مصرعہ کے معنی کہ ع
داند ہمہ خلق را کیسہ بر

یہ ہیں کہ معاملہ سرب کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسا کہ بدگمانی میں کیا کرتے ہیں | داند اعتقاد کی رو سے نہیں بلکہ معاملہ |
دروغ مصلحت آمیز کے معنی کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً ایک شخص

سو روپیہ قرض لینے آیا مگر ہمیں تجربہ نہیں اس کا کہ یہ شخص معاملہ کا کیسا ہے تو ہمیں اس گمان کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ نہ معلوم یہ شخص کیسا نہیں کیسا ہے۔ دین دار ہے۔ یا نادہندہ۔ اگر ہم جھوٹ بھی بول دیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے تو بھی گناہ نہ ہوگا کیونکہ یہ شخص اپنے کو ضرر سے بچا رہا ہے۔ دوسرے کو ضرر نہیں نہیں دے رہا۔ اس جھوٹ سے گناہ نہیں ہوتا۔ یہی معنی ہیں۔ ع

دروغ مصلحت آمیز باز راستی فتنہ انگیز

کے اور یہ عام نہیں ہے کہ ہر مصلحت میں جھوٹ بول دیا کرے۔ مصلحت سے

مطلق مصلحت مراد نہیں بلکہ جس دروغ میں دوسرے کا ضرر نہ ہو اور اپنا یا کسی اور کا اس سے ضرر دفع ہوتا ہو شیخ نے اس کو مصلحت سے تعبیر کیا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کسی ظالم کے خوف سے چھپا ہوا ہے اور اس کو معلوم ہے اور وہ ظالم تلاش کرنے آیا اور اس سے پوچھا۔ اس نے کہہ دیا کہ مجھ کو خبر نہیں تو یہ جائز بلکہ واجب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں سے بدگمانی معاملہ کے اعتبار سے ہو نہ اعتقاداً ہاں اپنے نفس سے ہر حالت میں بدگمان ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ کوئی کتنا ہی شیخ کل کیوں **نفس کی نگرانی** نہ ہو جاوے مگر جب بھی ماموں نہ رہے نفس پر۔ اس کی

طرف سے ہمیشہ بدگمان ہی رہے۔ نفس کی حالت یہ ہے کہ نسبت راسخ ہو جانے کے بعد بھی وساوس گھیرتے ہیں اور وساوس کی مقاومت نہ کی جائے تو ان پر عمل ہو جاتا ہے۔ پس نفس کو وسعت ہرگز نہ دینی چاہئے۔ وسعت دینے سے عادت ہو جاتی ہے آگے بڑھنے کی۔ نفس کی روک تھام نہایت ضروری ہے اس لئے اگر پندرہ سیر سے زیادہ اسباب لے جانے میں گنجائش بھی ہو تو بھی اس مصلحت سے بچنا چاہئے کہ کہیں نفس کو عادت نہ ہو جاوے۔ عادت کے بعد نفس کو روکنا مشکل ہے۔ پھر اگر کہیں گنجائش نہ ہوگی تب بھی نفس نہ روکے گا۔ یہ نفس پڑا ہی شریہ ہے۔ اس سے تو کبھی غافل ہوتا ہی نہ چاہئے۔ اسی واسطے حضرات اہل اللہ باوجود نسبت راسخ ہو جانے کے بھی ہمیشہ نفس کی نگرانی کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے کون زیادہ ہو گا جن کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فی الجنة فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل سچا

ہے۔ آپ سے سُن لینے کے بعد میں ظاہر ہے کہ اُن کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا ہوگا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اگر ہمارے لئے ایسی بشارت ہو تو ایسے بے فکر ہو جاویں کہ کوئی گناہ نہ چھوڑیں۔ سمجھ لیں کہ جنت کے تو مستحق ہو ہی گئے۔ بس خوب مزے اڑائیں اور خیال کر لیں کہ اب ڈر کس بات کا ہے۔ دوزخ سے بچ گئے جنت مل گئی۔ گناہوں سے ضرور ہی کیا ہے مگر اُن حضرات کی شان دیکھئے کہ باوجود ایسی قطعی بشارت کے سُن لینے کے اُن کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عمرؓ نے مدح سے نفس میں ذرا سا تغیر دیکھا تو اُس کا علاج کرنے کے لئے پانی عوام کے گھروں میں بھرتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نفس کو اتنی مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اُج روم سے دو قاصد آئے تھے انہوں نے میری تعریفیں کیں کہ ہم نے آپ کے عدل کی بڑی ثناء سنی ہے۔ اس سے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے نفس میں عجب نہ پیدا ہو جائے تو نفس کے علاج کے لئے میں پانی بھر کر پلا رہا ہوں۔ نفس مجھ پر ظلم کرتا ہے میں نے اُس کی یہ سزا تجویز کی تاکہ اترانے نہ پائے۔

اب حضرت علیؓ کا قصہ سنئے۔ آپ نے ایک دفعہ کمر تاپہنا۔ اُس کے پہننے سے نفس میں کچھ تغیر ہوا۔ نظر میں بھلا معلوم ہوا۔ بس قینچی منگا کر ادھی ادھی آستینیں کاٹ ڈالیں۔ اُس کو بد شکل کر دیا۔ تاکہ نظروں میں پسندیدہ نہ رہے۔ ان حضرات کی نفس کی نگرانی میں یہ حالت تھی اور یہ احتیاط تھی کہ ذرا سا بھی تغیر پاتے تھے تو بے چین ہو جاتے اور اُس کا علاج کرتے۔ یہاں تو وہ درود کا سامعہ ہے کہ جو آوے کھپ جاوے۔ جیسے وہ درود میں نجاست کھپ جاتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی تاویلین کر کے کفار کا مال جائز کر لیتے ہیں۔
مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں سہارنپور سے کانپور جاتا تھا۔ میں نے
سہارنپور سے پونڈے ساتھ لے جانے کو خریدے۔ وہ تھے وزن میں زیادہ
میں نے ان کو تلوانا چاہا تا کہ محصول دے کر بے جاؤں۔ ریل کے بابو نے کہا،
مختورے سے ہیں بے بھی جاؤ۔ میں نے کہا کہ یوں تو آپ کی اجازت معتبر
نہیں اور پھر یہ کہ اگر راستہ میں کوئی توڑنے لگے۔ وہ بوسے کہ میں گارڈ سے کہہ دوں گا
میں نے کہا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہنے لگے کہ غازی آباد تک۔ میں نے
کہا کہ آگے کیا ہوگا۔ کہا کہ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا اور وہ کلکتہ
تک جائے گا اور کانپور راستہ میں پڑے گا۔ میں نے کہا کہ کانپور کے بعد کیا
ہوگا۔ اُس نے کہا کہ آگے تو آپ کو جانا نہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی سفر ختم نہیں ہوا
آخرت کا سفر باقی ہے اگر وہاں پکڑ ہوئی تو کیا ہوگا۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے
کہہ دے تو خیر لے جاؤں غرض میں محصول دے کر گنوں کو لے گیا۔

میں یہ واقعہ بیان نہ کرتا کبھی کوئی کہنے لگے کہ اپنے منہ میاں مٹھو جنتے ہیں
اپنی تعریف کرتے ہیں مگر میری غرض یہ ہے کہ واقعات کے سننے سے قلوب
میں اثر خوب ہوتا ہے۔ اس لئے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس کام کو کرنے
والا میں ہی نہیں۔ اللہ کے بندے بہت کثرت سے ایسے بھی موجود ہیں۔ میں تو
ادنیٰ سے بھی ادنیٰ شخص ہوں۔ مگر الحمد للہ مجھ کو اس کا خیال ہے۔ تو جو متقی اور
پرہیزگار ہیں وہ کیوں نہ خیال کریں۔

اہل علم کی بے احتیاطی | اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ بالکل ان امور میں احتیاط نہیں کرتے۔ جو عام الناس تو غفلت سے کرتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں کہ یہ ناجائز ہیں اور اہل علم اس کو جائز کر کے کرتے ہیں۔ چنانچہ میں اس کا ایک قصہ سناتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ میں اور ایک معقولی طالب علم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک شخص نے سنا کہ وہ اس ریل میں سوار ہیں۔ ہم تو درمیانہ درجہ میں تھے اور وہ تیسرے درجہ میں۔ یہ شخص محبت سے ہمارے پاس آ بیٹھے۔ دو ایک اسٹیشن تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ تم نے اتنی مسافت درمیانہ درجہ میں قطع کی ہے اور تمہارے پاس ٹکٹ ہے سو م کا۔ اتنی مقدار محصول کی تمہارے ذمہ دین ہے۔ تم اس کو ادا کر دینا اور آسان ترکیب بتلا دی کہ اتنی مسافت کا جس قدر محصول درمیانہ درجہ کا سوم سے زائد ہے اُس کا ٹکٹ اسی لائن کا خرید کر چاک کر دینا۔ بس ادا ہو جائے گا۔ اس پر وہ معقولی طالب علم صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

فقہ اور اہل علم | فقہ کا مسئلہ ہے کہ منافع غصب مضمون نہیں ہوتے مثلاً کوئی کسی کے گھوڑے پر زبردستی سوار ہو کر چل دے تو اُس کا کرایہ نہ دینا پڑے گا۔ ہاں اگر معصوب عین ہو اور اُس کو تلف کر دے تو ضمان لازم آتا ہے۔

انہوں نے جو یہ بات کہی مجھ کو سن کر حیرت ہوئی کہ جب اہل علم ہی ایسے

فتوے دیں گے تو پھر عوام کی کیا حالت ہوگی۔ ایسے ہی لوگ بدنام کرتے ہیں فقہ کو۔ اب جو شخص فقہ ہی کا قائل نہ ہو اُس سے تو ہماری گفتگو ہی نہیں اور جو فقہ کا قائل ہے تو وہ فقہ کی کتابیں کھول کر دیکھے کہ فقہا کا کیا مقصود ہے اصل یہ ہے کہ اس موقع پر دو مسئلے جدا جدا ہیں۔ ایک یہ کہ منافع منسوب کو تلف کرنے سے گناہ ہوگا یا نہیں۔ اور ایک یہ کہ اُس پر ضمان لازم آئے گا یا نہیں۔ تو فقہاء گناہ کی نفی نہیں کرتے صرف ضمان کی نفی کرتے ہیں یعنی یہ نہیں کہتے کہ گناہ نہ ہوگا۔ گناہ ضرور ہوگا لیکن ضمان لازم نہیں آئے گا۔

فقہاء کے پاس اس کی دلیل موجود ہے جس کو اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یوں کہتے ہیں کہ عقد اجارہ ایک عقد ہے اور عقد کا عقلی مقتضایہ ہے کہ بدلین میں تناسب ہونا چاہئے۔ اگر کوئی چیز خریدیں تو اُس چیز میں اور اُس میں جو اُس کے عوض میں دی گئی ہو تناسب ہو اور جہاں بدلین میں تناسب نہ ہو، تو قیاس کے مقتضی سے وہ مبادلہ صحیح نہ ہوگا۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سنئے کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے قیاس کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو عین ہے یعنی ثمن اور ایک طرف عرض یعنی منافع کسی چیز کے اور اعیان و اعراض میں تماثل نہیں ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ تو قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو مگر چونکہ عقد اجارہ میں اس مبادلہ کو نفی جائز بتلا رہی ہے اس لئے فقہاء نے عقد اجارہ کے اندر قیاس کو چھوڑا اور حدیث کو اختیار کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سامنے

ہمارا قیاس کوئی چیز نہیں اور جہاں عقد نہ ہو جیسے کہ منافع کے غصب کی صورت میں اس کے اندر کوئی نقص نہیں ہے جو اذ کی جو قیاس کے چھوڑنے پر مجبور کئے یعنی غیر عقد میں نقص ہی نہیں اس لئے وہاں بمقتضائے قیاس اس مبادلہ کی عدم صحت کے قائل ہوئے اور منافع منسوب کو مضمون نہ ٹھہرایا۔ یہ تحقیق ہے اس مسئلہ کی کہ منافع منسوب مضمون نہیں۔

ان مولوی صاحب نے اس مسئلہ سے کام لیا مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ گناہ بھی نہ ہوگا۔ اس پر تو انہوں نے نظر کی کہ ضمان نہیں آتا اور اس پر نظر نہ کی کہ گناہ ہوتا ہے اور اس گناہ کی تلافی یہی ہے کہ اس کا بدلہ ادا کر دے کیونکہ یہ گناہ حقوق العباد سے ہے جو مال کے متعلق ہے۔ اسی واسطے علم ہر ایک کے لئے نافع نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ اس پر نظر کرتے ہیں کہ کسی کے واسطے علم مضر ہوگا۔ جس کو مضر ہوتا ہے اس کو درسیات سے محروم رکھتے ہیں زبانی تعلیم بقدر فرض عین کے اس کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ اسی کے بارہ میں تو مولانا فرماتے ہیں۔

بدگہر را علم و فن آموختن دادن تیغ ست دست بہرین
یہ تو قاعدہ کلیہ فرمایا۔

اس کے بعد تفریع کے طور پر کہتے ہیں۔

منصور اور علماء

چون فلم در دست غدارے قمار لاہرم منصور بردارے قمار
یعنی دیکھو، بدگہر کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک غدار کو جب حکومت

کے اختیارات ملے تو اُن نے منصور کو وار پر پڑھا ہی دیا۔ اس شعر میں مولانا نے صرف ایک شخص کو غدار کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے علماء اہل فتوے مراد نہیں ہیں۔ ورنہ وہ تو متعدد علماء تھے۔ اس لئے درود ست غداراں کہنا چاہئے تھا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں غدار سے مراد خاص ایک وزیر ہے کیونکہ منصور کو صرف اسی نے قتل کرایا تھا، علماء اُن کے قتل میں شریک نہ تھے۔

یہ تو ایک تاریخی بات ہے۔ کتب تواریخ میں ان کی شہادت کا قصہ اسی طرح لکھا ہے کہ وزیر کو منصور سے عداوت تھی۔ چونکہ وہ بھی عالم تھا گو معتزاد نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اُن نے اپنی عداوت نکالنے کے لئے اس طور پر استغناء تیار کیا کہ علماء کو قتل ہی کا فتویٰ دینا پڑا۔ مثلاً یہ کہ زید نے ایک کلمہ کفر کا کہا اور اُس کی کوئی عذر کی بھی حالت نہیں اور اُن پر مصر ہے تو اُن شخص کا کیا حکم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ مرتد ہے اور صاحب القتل ہے۔ اس لئے علماء پر الزام نہیں۔ کیونکہ اُن سے تو جیسا سوال کیا جاوے گا اسی کے مطابق وہ جواب دیں گے۔ یہ تو سائل کے ذمہ ہے کہ سوال کے اندر کوئی بات واقعہ کے خلاف نہ لکھے تو چونکہ علماء بے قصور تھے اور قصور وار صرف وزیر تھا اس لئے غدار کہا۔

یہ میں نے اس لئے کہا تا کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ مولانا علماء کی طرف سے بدگمان ہیں اور اُن کو غدار کہہ رہے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ مولانا وزیر کو غدار کہہ رہے ہیں علماء کو نہیں کہہ رہے۔

بہر حال میرا مقصود پہلا شعر ہے کہ بدگہر کو علم نہ سکھانا چاہیے کیونکہ اس سے بڑا ضرر پہنچتا ہے۔ اُن معقولی طالب علم صاحب ہی کو دیکھئے کہ فقہ پڑھ کر انہوں نے اس سے یہ اشتقاق حاصل کیا کہ تمہارے ذمہ محصول نہیں چاہئے اور ضرورت نہیں کہ یہ دینے کی۔ میں نے کہا حفظت شیا وغایت عندک اشیاء تو مسئلہ یاد کر لیا کہ منافع مضمون نہیں ہوتے اتلاف سے اور دوسری بات یاد نہیں رہی کہ گناہ ہوتا ہے۔ آخر اس گناہ کا تدارک بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو اس کا سواٹے اس کے اور کیا طریقہ ہے کہ گناہ دے کہ صاحب حق کو راضی کیا جاوے۔ پس اس کو مٹن کر وہ چپکے رہ گئے حضرت جب اہل علم کی طرف سے یہ گنجائش ملے تو پھر عام لوگوں کی کیا شکایت ہے۔

علماء اور امراء | زیادہ تر ایسی گنجائشیں امراء کی خاطر نکالی جاتی ہیں اسی واسطے حدیث میں بڑی مذمت آئی ہے اس عالم کی جو امراء میں گھسا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تساہل ہو جاتا ہے مسائل کے اظہار سے جہاں پلاؤ فورمہ اور عمدہ مال کھانے کو ملے تو وہاں کیا پروا رہ سکتی ہے وہیں کی۔ وہاں تو یہ ڈر ہوگا کہ اگر حق بات کہیں گے تو پلاؤ فورمہ سے جاتے رہیں گے۔ ایسی جگہ امید

نہ نیز یہ حکم کہ منافع مضمون نہیں ہوتے ہیں اس وقت ہے جب کہ وہ شے معدا الاستغال نہ ہو۔ اور اگر وہ شے معدا الاستغال ہو تو اس وقت ضمان لازم ہے۔

ہی نہیں ہے کہ صحت بات کہیں بلکہ یہ کیفیت ہوگی کہ اگر امراء ناجائز فعل کو چھپیں گے تو تاویل کر کے جائز بتلا دیں گے۔

چنانچہ امراء کے یہاں شطرنج کا مشغلہ عموماً ہوتا ہے۔ اب جو ان کے ہاں حاضر باش علماء ہیں وہ تاویل کر کے جائز بتلا دیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہہ دیتے ہیں کہ شافعی کے نزدیک جائز ہے اور ان کے نزدیک بھی جو شرطیں ہیں ان کا نام تک نہیں لیتے۔ سو امراء کی مخالفت سے یہ حالت ہو جاتی ہے علماء کی اس واسطے حدیث میں ہے۔

العلماء اصناء الدين بالمخالطة الامراء فاذا خالطوا

الامراء فهم لصوم الدين فاحذروهم۔

یعنی علماء دین ہیں دین کے جب تک کہ وہ امراء سے مخالفت

نہ کریں اور جب امراء میں گھسنے لگیں تو وہ دین کے ڈاکو ہیں۔ ان

سے لوگوں کو بچنا چاہئے۔

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو علماء امیروں سے مخالفت رکھتے ہیں ان کی کیسی

خراب حالت ہے اور مانا اس کا یہ ہے کہ طبائع میں عموماً طبع غالب ہے۔

اس لئے امراء سے جب مخالفت ہوتی ہے تو طبع مانع ہو جاتی ہے اظہار

حق سے سو یہ ساری خرابی طبع کی ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں ۔

چوں غرض آمد ہنسز و شیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے بدہ شد

اور علماء کو اس سے دنیوی ضرر بھی پہنچتا ہے کہ ان کی غفلت امراء کے

قلب میں بالکل نہیں رہتی۔ دل میں وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہماری خاطر سے ایسا فتویٰ

دے رہے ہیں۔ پس وہ ایک اڑ بنا لیتے ہیں اُن کو ورنہ حقیقت وہ بھی جانتے ہیں۔ سو جب حالت یہ ہے تو پھر کیا امید ہے ان علماء سے اصلاح کی۔

بہر حال لوگ مال کے بارہ میں زیادہ گنجائش نکالتے ہیں۔ خواص اپنے لئے اور علماء اُن کے لئے اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے اور امور میں تو خیر کچھ احتیاط کرتے بھی ہیں جس میں احتیاط کرنے سے بظاہر کوئی ضرر نہیں ہوتا اور خالی مفت کرم داشتن ہے وہاں احتیاط سے کچھ کام لے لیتے ہیں بخلاف مال کے کہ اس میں احتیاط کرنے سے دس کے پانچ ہی رہ جاتے ہیں۔ یہاں احتیاط کرنا ذرا مشکل ہے اور نفس پر شاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے کم ہیں جو اس میں احتیاط کرتے ہوں ورنہ نفس تو گنجائش ہی کی طرف بلاتا ہے۔ اور عام طور پر ایسے ہی لوگ ہیں جو ان معاملات میں ذرا احتیاط نہیں کرتے۔ اس واسطے میں مطلع کرتا ہوں کہ مال کے بھی حقوق ہیں جن کی رعایت نہیں کی جاتی۔ چونکہ حقوق مالیر میں بے احتیاطی زیادہ کی جاتی ہے اس لئے میں اس وقت اس کا بیان کرتا ہوں۔

مال کے حقوق | شروع میں جو میں نے آیت تلاوت کی ہے اُس سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے روزہ کا مسئلہ ارشاد فرمایا ہے

جس کا شروع یہاں سے ہے۔ اَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَائِكُمْ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہو گا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں تو احکام روزہ کے بیان ہوئے ہیں۔ اور اس آیت میں فرماتے ہیں وَلَا تَاْكُلُوا اَمْوَالَكُمْ کہیں تو روزہ کا بیان اور

کہاں یہ کہ حرام مال سے بچو۔ اس میں جوڑ کیا ہے۔ لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑ ہے۔ روزہ میں فرماتے ہیں۔

وَحَلُّوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ

الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ط ثُمَّ أَتَمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔

یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اُس وقت تک کھاؤ پیو۔ اور

جب صبح صادق نکل آوے تو اُس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر

جب کہ سورج غروب ہو جائے اُس وقت روزہ کو ختم کر دو۔

سوروزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑائی گئی ہیں، وہ ایک وقت خاص

تک کے لئے چھڑائی گئی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت سے خاص

وقت تک حرام کر دی گئیں۔ مگر حرام مال سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا۔ خیال تو فرمائیے کہ

کتنا لطیف ربط ہے۔

غرض اس آیت میں حق تعالیٰ ہم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپس میں ایک

دوسرے کا مال نا حق مرت کھاؤ اور اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لا تاكلوا

اموالکم کہ اپنا مال مرت کھاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ لا تاكلوا اموال اخوانکم

کہ اپنے بھائیوں کا مال مرت کھاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے۔ قرآن شریف

کی تعلیم بھی حکمت اور عقل پر اس قدر منطبق ہے کہ کسی کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی

اس کی تعلیم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے کلام ہے جو بڑا حکیم ہے اور

شقیفانہ کلام ہے نہ اضابطہ کا کلام نہیں۔ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے باب

اپنے بیٹے کو خطاب کرتا ہے کہ اُس میں ہر پہلو سے شفقت کی رعایت ہوتی ہے اور ایک نصاب کا کلام ہوتا ہے جیسے کوئی منادی کرنے والا حاکم کی طرف سے اعلان کرتا ہے اُس میں نئے نصاب کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اُس میں اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مؤثر الفاظ ہوں اور بلیغ عنوان جو قلوب پر اثر کریں۔ نصاب کی منادی میں اس کا اہتمام کہاں ہوتا ہے۔ اور شفیقانہ کلام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے سننے سے دشوار کام بھی آسان ہو جاوے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسی طرح نصیحت فرمائی ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو یوں ہوتا ولانا کلو اموال غیرکم۔ یہ کلام ہوتا تو درست مگر اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو آیت کے الفاظ کا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اموالکم اس واسطے فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے دوسرے کے مال سے۔ اگر اپنا مال زیادہ محبوب نہ ہوتا تو پرانے مال کو اپنا مال بنانے کی کیوں کوشش کرتا۔ تو چونکہ انسان کو غیر مال سے چننا محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاوے جو دائمی ہو حفاظت کا اور اُس کی حفاظت کا داعی بجز اس کے اور کوئی لفظ نہ تھا کہ اُس کو اموالکم سے تعبیر فرمائیں یعنی غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا ہی ہے۔ اُس کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسے اپنے مال کی کسب کرتے ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو

غیر کے مال کو تو غیر ہی سمجھا جاوے گا۔ اُس کو اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ غیر کا مال تو غیر ہی کا ہے۔ واقعی

مکافاتِ عمل

اپنا نہیں مگر لا تا حلوا امواکم فرمانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو تمہارا مال تلف ہوگا۔ خواہ دنیا میں یا آخرت میں۔ اس معنی کو بھی دوسرے کا مال تلف کرنا اپنا ہی مال تلف کرنا ہے۔ اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں تو ضرور ہی ہوگا۔ حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ مال و جوہ باطلہ سے حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی اُن کا بھلا نہیں ہوتا۔

چنانچہ کانپور کا قصہ ہے کہ مسجد میں مدرسہ تھا۔ اُس کے لئے کچھ زمین کی ضرورت تھی۔ مسجد کے پاس ایک شخص رہتے تھے جو کہ چنداں مالدار نہ تھے مگر تھے خاندانی شخص۔ اُن کا بہت بڑا مکان تھا۔ اُن سے تھوڑی زمین مسجد کے لئے لینی چاہی۔ انہوں نے انکار کر دیا بلکہ کچھ اور مسجد کی زمین و بالی ایک مرتبہ وٹاں ایک بزرگ تشریف لائے۔ اُن سے اس کا ذکر کیا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ زمین اُن کی زمین کو لینے گئی ہے۔ اُن کی زمین کو اپنے ساتھ لے کر آوے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اُس شخص پر بہت عزت آگئی حتیٰ کہ اُس کو ساری زمین فروخت کر نی پڑی۔ جس کو مسجد والوں نے خرید لیا اور خرید کر مدرسہ بنا دیا۔

حضرت یہ کہیں نہیں ہے کہ آپ کسی کو نقصان پہنچائیں اور آپ کا

نقصان نہ ہو تو اس لئے بھی اموالکم فرمایا۔

اب وجوہ باطلہ کی کچھ مثالیں سنئے
سودی مال اور محقق کی حقیقت | سو اس میں سے ایک سودی معاملہ

ہے جس کے بارہ میں ہے یحییٰ اللہ الربوا۔ سودی مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مرٹ کر رہتا ہے۔ اور حقیقتاً تو مٹتا ہی ہے مگر صورتاً بھی مٹتا ہے۔ ایک دن بے طرح مارے جاتے ہیں اور اگر اتفاقاً کبھی نہ بھی مٹے تب بھی اس سے کلام الہی پر اعتراض نہیں آتا۔ کیونکہ یحییٰ اللہ الربوا قضیہ مہملہ ہے جو قوت میں جزئیہ کے ہوتا ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی مرٹ جائے تو وہ صادق آجائیکا معنی یہ ہیں کہ سود والے اکثر مٹتے ہیں۔ اور اس کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر کہیں ظاہراً نہ مٹے تو اور طریقہ سے مٹتا ہے۔

محنت کی قسمیں مختلف ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے۔ یہ تو ظاہری محنت ہے اور ایک محنت ہے معنوی۔ وہ یہ کہ سود والا مال سے خود منتفع نہیں ہوتا۔ فاقہ بھر بھر کر ختم ہو جاتی ہے۔ سود لینے کا سبب بخل ہے۔ جتنا سود لیتا ہے اتنا ہی بخل بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ یہ حالت ہوتی ہے۔

سختیاں زاموال برحق خورند۔ بخیلان غم سیم و زر می خورند
 ایک ماسٹر تھے۔ سود و پیسے ان کی تنخواہ تھی۔ اور پانچ روپیہ ان کا
 خرچ تھا۔ لوگوں نے کہا، میان تمہاری اتنی بڑی تنخواہ ہے، تم تکلیف کے

ساتھ کس لئے گزر کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو اس تصویر میں کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے ایسا حفظ اتنا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ وہ اسی میں مست تھے۔

غرض کہیں اس طرح بھی سود میں محنت ہوتا ہے کہ اپنے اوپر خرچ نہیں ہوتا تو یہ محنت برکت اور انتفاع کا ہوا۔

ایک وجہ باطلہ میں سے رشوت ہے کہ لوگ رشوت کا حشر

اس کا کیا حشر ہوتا ہے میرے ایک عزیز پولیس میں ملازم تھے۔ انہوں نے خوب رشوتیں لے لے کر روپیہ جمع کیا تھا۔ اتفاق سے سرکار کی طرف سے کسی معاملہ میں مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ جتنا کما یا تھا سب اس میں لگ گیا۔ حتیٰ کہ گھر کا زیور بھی نہ رہا۔ بالکل خالی رہ گئے۔ جب خدا خدا کر کے اس مقدمہ سے جان بچی۔ اس کے بعد پھر اسی طرح روپیہ جمع کیا اور اس روپیہ کے نوٹ خریدے اور ایک پرانے تکیہ میں سی دیئے۔ اس خیال سے کہ اسے چور کیا لیں گے۔ ایک روز اتفاق سے وہ تحقیقات میں گئے تھے۔ ان کے مکان میں آگ لگ گئی۔ گھر والوں نے قیمتی اسباب اٹھا اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا۔ اس تکیہ کا کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ وہ جب تحقیقات کر کے آئے تو معلوم ہوا کہ گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ پوچھا کہ میرا تکیہ کہاں ہے گھر والوں نے کہا کہ جو قیمتی چیزیں تھیں وہ مشکل سے بچائی ہیں۔ وہ پرانا تکیہ بھی کوئی حفاظت کے قابل تھا کہنے لگے میرے تو اس میں نوٹ تھے اور نوٹوں

کے غیر محفوظ تھے نہیں اس لئے سب کمائی جاتی رہی اور اس میں سے کچھ
جائداد خرید لی تھی۔ اس میں اس طرح کسر نکلی کہ کسی کا ششکار پر تاش کی تھی اس
مقدیر میں اس کا ششکار نے بن حضرت کو قتل کر دیا۔

یہ انجام ہوتا ہے ایسے مال والوں کا۔ دن رات ایسے لوگ فکروں
میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک شخص ہے جس کی یہ حالت ہے۔ شکلے زیر و شکلے
بالا۔ جس کی آمدنی بھی کم ہے بس معمولی سا کھاپہن لیتا ہے۔ اور مزے سے پاؤں
پھیلا کر رات کو سوتا ہے۔ وہ اچھا ہے یا ایسے لوگ اچھے ہیں۔ یہ رشوت
کے انجام ہیں۔

اسی طرح سے قمار ہے۔ نہ معلوم اس میں جیتنے والے کہاں جاتے ہیں
جس کو سونگے کہ ہار گئے۔ یہ کسی کو نہ سونگے کہ جیت گئے۔ اس کے متعلق کھلے
ہوئے واقعات ہیں۔ سینکڑوں کے اس میں گھر باد تباہ ہو گئے۔ ایسے مالوں
میں ذرا برکت نہیں ہوتی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رشوت والے ہزاروں جمع کر
لیتے ہیں مگر ایک دو پشت کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا بالکل محتاج ہو جاتے ہیں
آج ایک شخص نوکر تو بچپس روپیہ کا ہے مگر حرام مال خوب سمیٹا ہے اور اس
کے یہاں اولاد بھی ہے۔ یہاں بھی ہیں، دوست احباب بھی ہیں، تندرستی بھی
ہے مکان کی تعمیر بھی ہو رہی ہے۔ یہ اپنی حالت پر نہایت خوش ہیں۔ پھر
مختور سے دنوں میں کچھ نہیں رہتا۔ یہ کیا بات ہے؟ اصل یہ ہے کہ ایسے
مالوں میں برکت نہیں ہوتی ہے۔

برکت کی حقیقت

لوگ برکت کی حقیقت پر سمجھتے ہیں کہ تھوڑا پورا
بہت سا ہو جائے۔ حالانکہ یہ اس کی حقیقت

نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ہر چیز ایک خاص کام کے لئے موضوع ہوتی ہے
اُس کا اُس کام میں آنا تو برکت ہے اور اگر اُس کام میں نہ آئے تو بے برکتی
ہے۔

مثلاً روپیہ اس واسطے ہے کہ اُس کے ذریعہ سے کھائیں پینیں، دنیا کی
راحت حاصل کریں۔ تو اگر وہ کھانے پینے کے کام میں آئے اور اپنے تن
کو لگے تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ لگے بلکہ فضول اڑ جائے تو بے
برکتی ہے۔ تو ایسے مال اکثر اپنے تن پر صرف نہیں ہوتے۔ کہیں عطاروں کے
یہاں جاتے ہیں کہیں ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں کہیں بار دوست
کھا جاتے ہیں۔ اپنے تن کو کچھ بھی نہیں لگتا۔

ایک شخص تھے اسی قسم کے، اُن کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ اُن کے
صاحبزادے پلنگ پر سوار تھے۔ صد ہزار روپیہ دواؤں اور ڈاکٹروں اور طبیبوں
میں صرف ہوتا تھا۔ اور پھر لڑکر خوب کھاتے اڑاتے تھے۔ چاروں طرف
سے لوٹ ہو رہی تھی۔ یہ حالت تھی کہ مہینہ میں پانچ سو روپے آتے ہیں، وہ
تھوڑے اور ہزار آتے ہیں وہ تھوڑے۔ یہ اس قسم کے مال اتنی بڑی خوشی
کی چیز ہیں۔

دیکھئے ہر شخص کے لئے تعطیل راحت کی چیز ہے مگر اُن کے لئے مصیبت
ہے کیونکہ اُس روز لوٹ گھسٹ کرنے کی گنجائش نہیں ملتی۔ ایک رشتہ خور

نے لوگوں میں یہی تصویر کھینچوائی تھی جس کی شکل یہ تھی کہ وہ دیہی جیسوں میں جتوئیے
 کھڑا تھا۔ لوگوں نے یہ اس تصویر کو دیکھا تو بہت تعریف کی کہ یا ممکن اصل
 کے مطابق ہے۔ ایک گنوار نے دو تصویریں کھینچی اور کہا کہ یہ تصویر تو بالکل غلط
 ہے۔ لوگوں نے وہ بھی دیکھی تو ایک فرماستے ہیں کہ تصویر میں ہاتھ اپنی جیب
 میں رکھائے گئے ہیں، حالانکہ ان کے ہاتھ تو دوسروں کی جیب میں پھستے
 ہیں۔ دیہات کے لوگوں کا وہ مارغ بڑا احمد ہوتا ہے اسی واسطے بڑے
 بڑے علماء دیہاتی ہوتے ہیں۔ انا اللہ والشاہد! کسی گہری بات یہی کہ ان کے
 ہاتھ تو برائی جیب میں ہوتے ہیں۔

موتھیل کے دن برائی جیب ملتی نہیں اس لئے وہ ان کے لئے یوم
 ماتم ہے۔ انہیں انتظار لگا رہتا ہے کہ کب موتھیل کا دن ختم ہو۔ یہ کتنی بڑی
 نحوست ہے اس رشوت کی۔

رشوت کی خرابی | پھر اس میں ایک اور خرابی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں
 بڑی چیز جاہ ہے حتیٰ کہ مال بھی ایسا عزیز نہیں ہے
 دیکھئے مال کو جاہ کے واسطے صرف کر دیتے ہیں اور جتنی فضول خرچیاں کرتے
 ہیں اکثر اسی کے واسطے کرتے ہیں۔ سب اخراجات کی توجہ بھی ہے اور مواقع
 جاہ میں خرچ کرنے کی کوئی حد ہی نہیں۔ عرض زیادہ حصہ مال کا تلفاخر اور ناموری
 میں صرف ہوتا ہے۔ تو جاہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں مال کی بھی
 کچھ پروا نہیں کی جاتی اور وہ اس رشوت میں بڑی طرح برباد ہو جاتی ہے۔ سو
 اتنی بڑی نحوست عقلمند ہے اس رشوت میں۔ چنانچہ اللہ! آدمی رشوت

لیٹنے سے رشوت دینے والے کی نظر سے بالکل ہی گم جاتا ہے۔ وہ اس کو ایسا سمجھنے لگتا ہے جیسے خافصامہ اور پلہ وار کہ اب ہمارا سارا بوجھ ریٹھا بیگا پھر کیا وقعت ہوئی ایسے شخص کی بعض لوگ اٹھ آئے تک بھی نہیں چھوڑتے ایسے بذمیت ہوتے ہیں۔

ایک شخص ڈپٹی تھے اور قوم کے تھے برہمن۔ دورہ میں ایک زمیندار اُن کے پاس آیا اور تندر دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس کی جیب میں ایک روپیہ تھا اور ایک ادھنا۔ ڈپٹی صاحب چونکہ گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اُس نے جلدی سے ہاتھ اونچا کر کے تندر پیش کر دی اور یہ دیکھا نہیں کہ میں کیا دے رہا ہوں۔ جب گھر آئے تو دیکھا کہ جیب میں روپیہ موجود ہے۔ اب یہ بڑے شرمندہ ہوئے کہ میں نے اُس کو ادھنا دیدیا۔ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا۔ اب یہ دوسرے پڑاؤ پر پہنچا اور روپیہ پیش کیا اور عذر کیا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میرا وہ ادھنا دے دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم برہمن ہیں ہمارا کام ایسا ہی ہے یہ کہہ کر ادھنا بھی رکھ لیا۔

یہ اوقات ہے ان لوگوں کی خیال فرمائیے۔ بعض لوگ تاویل کر دیتے ہیں کہ لوگ خوشی سے دے جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے بھی کبھی خوشی سے رشوت دی ہے۔ اپنے اوپر قیاس کر لیں اور اگر فرغ کر لیا جاوے کہ خوشی ہی سے دیتے ہیں تو آخر ہمدی بھی کوئی چیز ہے۔ اسی کی وجہ سے ایسی رشوت سے انکار کر دیا ہوتا۔

حصن اور چندہ | دیکھئے رعایت وہ چیز ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چندہ آتا تھا۔ آپ بعض مواقع پر واپس کر دیتے تھے۔ ہر ایک کا چندہ آپ نہ لیتے تھے۔ کسی چندہ جمع کرنے والے کو ایسا دیکھا ہے۔ حضرت اُج کل تو مال حرام تک واپس نہیں کرتے اور حصن کے واپس کرنے کی یہ وجہ ہوتی تھی کہ اُس شخص کو دینے کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہاں اس بات کا اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کو فی الحال گرامی ہو یا بعد میں دینے سے بچتا دے یا تکلیف اٹھا دے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کا سارا گھر لے لیا کیونکہ وہ صدیق اکبر بھی تھے۔ وہاں نہ طبع پر ناگواری کا شائبہ تھا نہ تکلیف سے متاثر ہونے کا۔ اس لئے لے لیا۔ کیونکہ وہ تو آپ کے اندر فنا ہو گئے تھے۔ غیرت بالکل اٹھ گئی تھی۔ پھر ان میں یہ احتمالات کس طرح ہو سکتے تھے۔

مقام ابو بکرؓ و عمرؓ | یہی راز ہے اس کا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔ تو اس پر ظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ حصن نے اپنے بعد نبوت کا مستحق حضرت عمرؓ کو فرمایا حالانکہ حضرت ابو بکرؓ ان سے افضل تھے اس لئے ان کا استحقاق زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ تو اس کا راز ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ تو حصن کے اندر فنا ہو گئے تھے وہ من بعدی میں داخل ہی نہ تھے۔ وہ آپ کے غیر خوار اہی تھے۔ وہ تو صین ہو گئے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ نے اپنے بعد ان کو مستحق نہیں کیا کیونکہ وہ تو معنی تھے ان کو من بعدی کیسے کہا جاسکتا

یہی راز ہے اس کا کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنے پریشان نہیں ہوئے جتنے حضرت عمرؓ پریشان ہوئے۔ پریشانی تو بعد سے ہوتی ہے۔ جو فانی ہو چکنا ہے وہ بعید نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے پھر کیسی پریشانی۔ حضرت ابو بکرؓ کی تو بڑی شان ہے! دنیٰ اولیاء اللہ کی حکایات لکھی ہیں کہ ان کے اجزاء کے انتقال پر بالکل رنج نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک عورت تھیں۔ ان کی چند اولاد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ روئیں تک نہیں اور کہا کہ میں روؤں کیوں خدا نے تعالیٰ کی قسم میں تو ان کو دیکھتی ہوں میرا دل خوش ہے پھر میں کس لئے روؤں۔

تو جیسے ان کو اپنے عزیز کا مشاہدہ تھا حضرت ابو بکرؓ کو اس سے بڑھ کر حضورؐ کا مشاہدہ تھا۔ گو ان کو ظاہر بعد ہو گیا تھا مگر بعد باطنی نام کو نہ تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جزو کی مثل تھے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا سارا

چندہ میں بے احتیاطی

مال لے لیا کیونکہ وہ فانی ہو چکے تھے اور ایک غریب شخص مال لایا تو آپؐ نے واپس کر دیا اور فرما دیا کہ جاؤ اپنا مال اٹھاؤ۔ آج ایسے شخص کا چندہ فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے جو یوں کہے کہ میں نے اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ اور اس پر کہتے ہیں کہ ان میں ایسی حمیت تو ہے کہ سارا گھر لا کر رکھ دیا۔ ایسے اور ایسے ہیں۔

میں تو ایسے چندہ دینے والوں کو کہا کرتا ہوں کہ کام ہوش سے کرو۔

جوش سے مرت کر دو۔ (جوش میں سارا گھرا دیا اور بعد میں جب ضرورت واقع ہوئی تو ہوئے پیشانی) اگر جوش کو فضیلت ہوتی تو انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حصہ مجذوب ہوتا۔ اُن میں عقل نہ ہوتی۔ حالانکہ وہ اس قدر ذی ہوش اور صاحب عقل تھے کہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب یہ بات ہے کہ لوگ جوش میں آکر ایسا کر گزرتے ہیں تو اگر کوئی شخص لکچر دے یا وعظ کہے اور کسی کے پاس صرف دس ہی روپیہ ہیں اور اُس نے جوش میں آکر دس کے دس ہی دسے دیئے تو اس کا چندہ لینا درست نہیں اُس کو ہوش ہونے دو۔ اُس کے بعد اُس سے کہو کہ تمہاری آمدنی ایک مہینہ کی دس روپے ہیں۔ ابھی ایک مہینہ پڑا ہے تمہارے اہل و عیال ہیں اُن کے خرچ کو چاہئے۔ وہ اس سے مقدم ہیں اگر بڑا ہی شوق ہے چندہ دینے کا تو ایک روپیہ مہینہ کر دو۔

غرض تمہارے ہی مذاق پر قومی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے آج کل قومی ہمدردی کو ذبح کیا جاتا ہے۔ چکی پینے والے تک چندہ سے نہیں جھوڑے جاتے۔ بعض نے سل بٹہ بیچ کر چندہ دیا۔ ایسی بے جا رقموں میں کیا برکت ہوگی نیز چندہ میں بعض ناجائز صورتیں تجارت کی کر رکھی ہیں جو شریعت میں حرام ہیں۔

مثلاً کسی غریب سے ترکیب ہی کی نیت سے کہا، ایک روپیہ چندہ میں دے دینا۔ جب اُس نے ایک روپیہ دیا اب اس روپیہ کی بولی بولی گئی کہ اس متبرک روپیہ کو جو کہ نہایت جوش و خلوص سے اپنی حیثیت سے زیادہ دیا گیا ہے اور اس لئے متبرک ہے کون خریدتا ہے۔ اب کسی نے اُس کے دس لگا لئے اور کسی نے سو اور کسی نے ہزار۔ لوگ جوش میں آکر بڑی بڑی زمیں

ہوتے ہیں۔ تو یہ ربا ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

نیز اس لئے بھی کہ یہ پالیسی ہے۔ چندہ وصول کرنے والے کسی عریض کو خود کھڑا کر دیتے ہیں اور اس پالیسی سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیے جاتے ہیں۔ شریعت پالیسی کو جائز نہیں کہتی۔ شریعت گندہ سمجھتی ہے ان حرکتوں کو۔ وہاں تو دار و مدار صدق و خلوص و سادگی پر ہے کہ بات سچی ہو اور یہ چندہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ محض نمائش و سازش سے دیا جاتا ہے۔ لوگ جوش میں آکر ایک روپیہ کو ہزار روپیہ سے خریدتے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی خلوص سے دے رہا ہے تو وہ ایک روپیہ ہی برکت کا ہے۔ ایسی برکت کی چیز ہاتھ سے دے کر ہزار روپیہ لے لئے تو وہ اس کے مصداق ہیں۔ استبد لون الذی هو ادنی بالذی هو خبیط جب حقائق پر نظر ہو تو اس کی برائیاں محسوس ہو سکتی ہیں۔ حضرت چندہ میں یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔ یاد رکھو کہ ایسے جوش کی حالت میں جس میں آدمی مغلوب العقل ہو جائے اور بعد میں پچھتاوے خود چندہ لینا ہی ناجائز ہے۔ جوش سے جب کوئی دے تو مدت نو۔ ماں جب ہوش درست ہو جاوے اس وقت نو۔

پیروں کی حالت | انہی طرح آج کل کے پیروں کی حالت دیکھو۔ تو عجیب ہے۔ ان کو تحصیل مال میں بالکل احتیاط

نہیں۔ نذرانے معین ہیں۔ تقاضے کر کے وصول کرتے ہیں خواہ کسی کے پاس بھی نہ ہو۔ اور دل تنگ ہو کر قرض ادا کر کے لایا ہو اور دل میں چاہے

کو شاہی ہو مگر انہیں لینے سے کام معمولی دعوت بھی منظور نہیں کرتے۔ دعوت میں کم از کم مرغ تو ہو بلکہ خود فرمائش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو مٹی کی استغاثت ہو تو شاہ صاحب کے منہ میں نہ چلے۔ اس طرح خلق اللہ کے گلے گھونٹتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ لا یجوز مال امرء مسلم الا بطیب نفس غرض شاہ صاحب مریدین میں سجا کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔ انسان بھٹوڑا ہی رہتا ہے۔ لوگ اُن کو جوتا تک اٹھانے نہیں دیتے کیونکہ اُن کے ہاتھوں کو اتنا متبرک سمجھتے ہیں کہ جوتے کا اُن کے ہاتھوں کو مس ہوتا اُن کی نشان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر یہی ہے تو پاؤں سے بھی نکال لینا چاہئے۔ کوئی جوتا اُن کے پاؤں میں نہ چھوڑنا چاہئے یعنی جب جوتا بدل کر اوپر پاؤں میں سے نکال لینا چاہئے کیونکہ جیسے ہاتھ متبرک ہیں پاؤں بھی متبرک ہیں۔ لہذا جوتے کو اُن کے پاؤں کے ساتھ بھی مس نہ ہونے دینا چاہئے۔

یہ ساری خیالی اس کی ہے کہ پیر اپنے کو ہریات میں ممتاز رکھتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کا اُن کے ساتھ ایسا خیال ہو گیا ہے۔ جب وہ ہر چیز میں اپنے کو ممتاز رکھتے ہیں۔ اُن کا کھانا اور پہنا اور ہر چیز ممتاز ہے تو اُن کی جنت بھی اور ہی ہونی چاہئے۔ اگر کہیں جولا ہے تیلی کے ساتھ جنت میں رہے تو قیامت ہی قائم ہو جائے گی۔ خود کرنے کی بات ہے کہ آج کل شاہ صاحبوں کی تو یہ حالت کہ سب سے ممتاز ہو کر رہتے ہیں۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت کہ اس

طرح رہتے تھے کہ پتہ بھی نہ پہتا تھا کہ صدقہ کون

معاشرۃ رسول

ہیں۔ چنانچہ باہر کے ناواقف لوگ آتے تو ان کو پوچھنے کی ضرورت ہوتی اور وہ پوچھتے من محمد فیکم۔ صحابہ فرماتے۔ ہذا الابيض التکۃ کریم جو گورے چٹے تکبیر کٹے بیٹھے ہیں یہ ہیں محمدؐ۔ صحابہؓ کے بتلانے سے پتہ چلتا ہے یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ویسے پتہ نہ چلتا تھا۔ بیٹھتے میں تو آپ کی یہ حالت تھی۔

چلنے میں یہ حالت تھی کہ کچھ صحابہؓ آگے کر دیئے اور کچھ پیچھے کر دیئے کبھی کوئی آگے ہو گیا کبھی پیچھے ہو گیا۔ ملے جملے چلتے تھے۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ سو آپ کی تو یہ حالت اور آج بزرگی کے یہ معنی ہو گئے کہ سب سے ممتاز ہو۔

پھر حال یہ ہماری ہمدردی اور یہ ہماری محبت ہے کہ ایک شخص نے ہمارے سامنے سارا گھر لاکر رکھ دیا اور ہم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کیا یہی ہمدردی ہے کہ سب سنگوالو اور اس کو مفلس کر دو۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہوش سے کام لو ہوش سے مروت لو۔ چندہ دینے والے کو بھی نہ چاہئے کہ ہوش میں آکر اپنے کو بالکل خالی کر دے اور چندہ لینے والوں کو بھی اس کا خیال چاہئے کہ ایسا چندہ نہ لیں۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ ہوش میں آکر ایسا کہ گزرتے ہیں اور بعد کو پشیمان ہوتے ہیں۔ ہوش میں اکثر عقل مغلوب ہوتی ہے اس لئے جلدی نہ کرے۔ جب ہوش کا خاتمہ ہو جاوے اس وقت جو کام مناسب سمجھے کرے۔

قابل قدر عقل

عقل ایسی چیز ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اسے عمر خائن وقت کیا حال ہوگا جب قبر میں رکھے جاؤ گے اور فرشتے کہہ سکتے ہوئے کہ جتنے ہوئے تمہارے پاس آویں گے اور تم سے پوچھیں گے من ربک ما دینک اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلا دیجئے کہ عقل بھی اُس وقت رہے گی یا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل تو دنیا سے بھی زیادہ ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عقل ہمارے پاس ہوگی تو پھر کیا اندیشہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عقل سے کام لیں گے اور جواب صحیح دیں گے۔

تو عقل اتنی بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ آج کل لوگ عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں بے عقلی کی قدر کرتے ہیں۔ بزرگوں میں بھی لوگوں کو مجذوب ہی لپٹا۔ جس میں عقل نہ ہو۔ اور جو عقل سے کام لیتے ہیں اُن کو بزرگ نہیں سمجھتے بلکہ اُن کو عقل پرست کہتے ہیں۔ اسے صاحبِ عقل بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء عقل میں کامل ہوئے ہیں بتلائیے تو سہی انبیاء علیہم السلام میں کوئی مجذوب بھی ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ چندہ دینے والے بھی عقل سے کام لیں اور چندہ لینے والے بھی یہ انہماک جو چندہ میں ہونا ہے جس کے پیچھے عقل ہوش سے بھی گزر جاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ کام زیادہ پھیلا دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کی اصلاح کر دینی کام جتنا ہو سکے اور جتنی وسعت ہو اتنا کریں۔ جو نہ ہو سکے

نہ کریں۔ بہر حال چندہ میں اس کی ضرورت احتیاط نہ رہی چاہئے کہ ناجائز طریقہ سے وصول نہ کیا جاوے۔

اہل چندہ مسجد اور مدرسہ کے لئے بھی تو اس کی احتیاط نہیں کرتے انہیں اس سے غرض ہوتی ہے کہ چندہ ملے۔ چاہے جس طرح بھی ملے۔ اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح چندہ کرنا جائز نہیں۔ تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اپنی ذات کے لئے محفوظ رہا ہی کیے تھے ہیں۔ ہم تو خدا کے لئے کرتے ہیں۔ اور بعض چندہ وصول کرنے والوں کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے غیرت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے اور اہمیت سے بھی گزر گئے ہیں۔

چنانچہ جب علی گڑھ یونیورسٹی کا چندہ ہوا ہے۔ اس زمانے میں یہاں سے ایک برات قصبہ جھنجھانہ گئی تھی۔ ایک لیڈر صاحب چندہ وصول کرنے والے اس برات میں تھے۔ دستور یہ ہے کہ جب ڈھن کو ڈولے میں سوار کرتے ہیں تو ڈولے پر بکھیر ہوتی ہے اور بھنگی اس کو لوٹتے ہیں اور عرفاً انہیں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ جس وقت پیسوں کی بکھیر ہوتی تو لیڈر صاحب پیسے لوٹنے کے لئے بھنگیوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تین آنے کے پیسے اکٹھے کئے۔ تعجب ہے کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اس کو وحشی اور دولہا بہت شہار کریں۔ اور ان کا ہر فعل تمدن و ترقی سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ انہوں نے بھنگیوں کے ساتھ شامل ہو کر پیسے لوٹے۔ پر اس نے لوگوں کو ان کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی۔ اتفاق سے نماز کا وقت آگیا۔ نماز کے لئے یہ مسجد میں گئے اور جماعت کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ مگر جماعت میں ایک

ظریف بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ذرا ہٹ کر کھڑے ہو۔ اس لئے کہ جس وقت آپ پیسے لوٹ رہے تھے تو بھنگیوں کا بدن آپ سے ملتا تھا اور پسینہ آپ کو بھی آ رہا تھا اور ان کو بھی یہ بڑا الگ کھڑے ہو۔ یہ تو کیفیت تھی ان کی کہ لوگ اپنے پاس بھی کھڑا نہ ہونے دیتے تھے اور ان کو اس پر بڑا فخر تھا۔ اگر ایسی ہی بے حسی ہے تو ایسے موقع پر بھنگی ہی کیوں نہ بن جائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے یہ افعال کون سے اصول پر مبنی ہیں۔ یہ ساری خرابیاں اس کی ہیں کہ علماء کی تقلید کو تو چھوڑ رکھا ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کو رانہ اختیار کر لی ہے۔

کورانہ تقلید | کورانہ تقلید پر مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صوفی سیاح تھے۔ وہ کسی خانقاہ میں آکر ٹھہرے۔ وہاں اہل توکل اور اہل تامل دونوں قسم کے لوگ تھے۔ ان شاہ صاحب کی سواری میں گدھا تھا۔ اس کو تختان پر باندھ دیا۔ سائیں کو حفاظت کے لئے وہاں چھوڑ دیا اس پر جو نیند کا غلبہ ہوا تو وہ پڑ کر سو رہا۔ اہل خانقاہ نے کیا کیا کہ اس گدھے کو وہاں سے کھولا اور بازار میں لے جا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے کھانا تیار کیا کھانے کے بعد سماع شروع ہوا اور سماع میں ان لوگوں نے یہ شرارت کی کہ حال لانا شروع کیا اور اس میں کہنے لگے۔ ج

خبر برفت و خبر برفت و خبر برفت

شاہ صاحب اس کا مطلب خاک نہ سمجھے اور ان کے دیکھا دیکھی آپ نے بھی یہی کہنا شروع کیا کہ خبر برفت و خبر برفت و خبر برفت۔ اب سائیں کی

جو آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ گدھا نڈارو۔ وہ گھبرا یا ہوا شاہ صاحب کو خبر کرنے
 دوڑا تو انہیں یہ کہتا ہوا پایا۔ خبر برفت و خبر برفت و خبر برفت۔ وہ سمجھا کہ انہیں
 گدھے کے چلے جانے کی پہلے ہی سے خبر ہے۔ وہ یہ سمجھ کر اپنی جگہ جا کر
 سو رہا۔ اب صبح کو جو شاہ صاحب نے تھان پر اپنا گدھا نہ پایا تو غل جھپایا
 کہ میرا گدھا کہاں گیا۔ اہل خانقاہ نے کہا کہ ہم کو کیا خبر۔ شاہ صاحب بولے
 کہ مجھ کو کیا خبر تھی۔ پھر ساتیس یہ خفگی شروع کی کہ تو نے کس واسطے خبر نہیں کی اس
 نے کہا کہ میں تو خبر کرنے کے لئے آیا تھا۔ یہاں آکر دیکھا تو آپ خود ہی فرما
 رہے تھے کہ ج

خبر برفت و خبر برفت

میں سمجھا کہ آپ کو پہلے ہی خبر ہو گئی۔ پھر میں کیا خبر کرتا۔ رونے لگے
 مجھ کو تو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ سب کہہ رہے تھے میں بھی کہنے لگا۔
 بہر حال ایک تو کورائہ تقلید ہوتی ہے جس کے یہ نتائج ہیں اور ایک تقلید
 علماء کی ہے جس پر مدار ہے دین کا۔ تو ان لوگوں کو علماء کی تقلید سے تو عار آتی
 ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کورائہ کرتے ہیں اور یہی جڑ ہے تمام خرابیوں کی
 میں اس قسم کے لوگ جس طرح چندہ میں غیر قوموں کی تقلید کرتے ہیں، اسی طرح
 قومی ہمدردی میں بھی غیر قوم کے مقلد ہیں۔

جس زمانہ میں جنگ طرابلس اور اٹلی ہو رہی تھی ان حضرات نے طرابلس
 کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہی تو اس میں بھی غیر قوموں کے مقلد بنے غیر قوموں
 کا یہ طریقہ ہے کہ جب اپنے طرف دار کے ساتھ کوئی لڑتا ہے تو مخالف کا

مال جو ان کے ملک میں آتا ہو اس کو خریدنا موقوف کر دیتے ہیں تاکہ اس کو ضرر پہنچے تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا، کہ لڑکی کی ٹوپی جو اٹلی سے آتی تھی اس کی خریداری بند کر دی تاکہ اس کی تجارت میں کمی واقع ہو اور اس سے اس کو ضرر پہنچے اور جو ٹوپیاں پہلے کی خریداری ہوئی تھیں ان کو آگ میں جلا دیا مگر یہ خوب بات ہے کہ غصہ تو اٹلی پر اور اس میں ناس کریں اپنا نیز ان کی خریداری بند کر لینے سے اس کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ یہ میں ہی کیا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شور بہ۔

ہم میں اور ان غیر قوموں میں بڑا فرق ہے۔ اور قوموں میں اتفاق ہے۔ وہ جب خریداری چھوڑتے ہیں تو ایک دم سے سب چھوڑتے ہیں اور ہمارے اندر اتفاق نہیں ہم اگر خریداری چھوڑیں گے تو خاص ہی خاص لوگ ہوں گے جو اس میں ساتھ دیں۔ لہذا وہ قومیں جو ایسا کرتی ہیں تو ان کا فعل موثر ہے اور ہمارا فعل کچھ بھی موثر نہیں بلکہ ہمیں الٹا ضرر پہنچتا ہے۔ یہ لوگ عقل کے مدعی ہیں اور پھر ایسی حماقتیں کرتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ عقل کے کیا معنی ہیں۔ بس آج کل کی عقل دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

ازمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را
ایسے لوگوں نے چندہ میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے اور معاشرت میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے۔ ہر بات میں غیر قوموں کے متقلد ہیں۔ اب ایسے جوش کے چندہ کے متعلق ایک

مسئلہ سنو۔ خوب یاد رکھو کہ جو شخص خوش میں آکر اپنی حیثیت سے زیادہ چندہ دیتا ہے وہ مغلوب العقل کے حکم میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اُس سے چندہ لینا اور اُس کو خالی کر کے چھوڑ دینا دین کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ کیوں کہ یہ اُس کو فقیر کر دینا ہے۔

ناجاؤز آمدنی | میں رشوت کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ درمیان میں چندہ کا بھی ذکر آگیا۔ ذکر یہ تھا کہ رشوت ایسی ذلیل چیز ہے کہ اس سے آدمی نظر سے گر جاتا ہے۔ یہ نحوست عقلی ہے اس میں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قومی ہمدردی کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اگر شریعت کے حکم کو نہ دیکھا جائے تو خود عقل بھی اُس کو ناجاؤز بتلاتی ہے۔ اور یہ بالکل غلط بات ہے کہ لوگ خوشی سے دیتے ہیں۔ جو لوگ رشوت دیتے ہیں تو نقصان پہنچنے کے خیال سے دیتے ہیں خوشی سے کوئی نہیں دیتا۔ جو دیتا ہے مجبور ہو کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔

اسی طرح بیرسٹری کی آمدنی ہے کہ قطع نظر اس کے کہ شریعت کے نزدیک یہ کیسی ہے خود ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ اس کی تو یہاں تک کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی دکانداری ہو گئی۔ کسی پر مقدمہ ہو جاوے اور وہ اُن کو وکیل بنانا چاہے تو کہتے ہیں کہ ہر پیشی پر پہلے اتنا لے لوں گا جب کام کروں گا۔ اس کا مطلق خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس بیچارے کو اتنی مقدار دینے کی گنجائش بھی ہے یا نہیں بلکہ اگر وہ کہتا ہے کہ کچھ کم لے

لیجئے۔ تو ہر سٹر صاحب کہتے ہیں کہ نرخ بگڑتا ہے۔ یہ تو ہمدردی ہے۔ پھر مذہبی حالت ان حضرات کی قابل دید ہے۔

میرٹھ کا واقعہ ہے کہ ایک ہر سٹر صاحب کے پاس کچھ لوگ عید کے دن ملنے گئے تو آپ کہتے ہیں کہ دیکھ آج آپ لوگوں کا عید ہے مطلب یہ ہے ہماری عید نہیں۔ ہم اسلام ہی میں داخل نہیں۔ یہ ان لوگوں کی مذہبی حالت ہے۔

پھر مقدمہ کی پیروی پر تو لیتے ہی ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ذرا آٹے دے دی اور پاترخ سو روپیہ لے لئے۔ شریعت میں رائے پر محنت نہ لینا جائز بھی نہیں۔ یہ رشوت محض ہے۔ اس بارہ میں میرا ایک رسالہ بھی ہے اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ شریعت نے جس چیز کو مستقیم نہیں قرار دیا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا حق شفعہ تھا۔ آپ نے سو روپیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا تو یہ سو روپیہ واجب الرد ہیں اور حق شفعہ بھی نہیں رہا۔ کیونکہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی یا مثلاً کسی نے حاکم سے سفارش کر دی اور پچاس روپیہ لے لئے۔ یہ پچاس روپیہ حرام ہیں۔ اکثر لوگ رشوت بمقامات میں کچھ لینے کو کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب بھی رشوت میں داخل ہیں۔ حاکم سے سفارش کرنا بھی ایسا ہی فعل ہے کہ شریعت نے اس کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی۔ اور اگر یہ سب مستقیم ہیں تو ان پیر کا مذاق بھی معتبر ہونا چاہئے جن کا قندہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ میں بنگالہ میں تھا۔ وہاں ایک شاہ صاحب کی دعوت کی گئی اور کھانے کے بعد اُن کو پچاس روپے دیئے گئے۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے آخر مشکل سے دوسو روپیہ پر صلح ہوئی۔ بس دعوت کھانا بھی ایسی محنت و مشقت کا کام ہے جس کے کھلانے والوں کو ابھرت دینی پڑتی ہے۔

ایک شخص تھے وہ مولود شریف پڑھا کرتے تھے اور پانچ روپیہ اُن کا نذرانہ تھا۔ ایک مرتبہ کہیں مولود شریف پڑھنے گئے اور کرتہ اُن کا بہت پرانا ہو چکا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ کسی طرح نیا کرتہ لینا چاہئے۔ بس انہوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک شعر پڑھا اور اُس پر حال طاری کیا اور پھر سے اپنا کرتہ پھاڑ ڈالا میرا کرتہ کو شرم معلوم ہوئی کہ بلا کرتے کے رخصت کیسے۔ اس لئے اُن کو نیا کرتہ بنا کر دینا پڑا۔ اُن حضرت نے پانچ روپے تو الگ لئے اور کرتہ الگ لیا۔ نقصان اپنا اس لئے کیا تھا کہ آمدنی ہو جائے گی۔ بجائے پرانے کرتے کے نیا مل جائے گا۔ یہ ترکیب ہے وصول کرنے کی۔

تو جیسے انہوں نے کرتہ پھاڑنے کا عوض لیا۔ اسی طرح اُن شاہ صاحب نے دعوت کھانے کا عوض لیا۔ خوب سمجھ لو کہ ایسے اعمال کی قیمت لینا رشتہ میں داخل ہے۔

رائے اور مسئلہ کی قیمت

اسی طرح سے رائے دینا بھی ہے کہ اُس کی قیمت لینا جائز نہیں۔ اگر رائے کی قیمت ہے

تو جو بھی کوئی رائے دے دے قیمت لے لیا کرے۔ اگر کہو کہ اوروں کی رائے میں اور ہماری رائے میں فرق ہے کہ ہم قانون دان ہیں۔ ہماری رائے

سے لوگوں کا کام چلتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کوئی رائے دے دی تو اس میں کون سی محنت پڑی اور اگر کہو کہ اس میں محنت یہ ہے کہ سوچنا پڑتا ہے۔ یہ دماغ خرچ کرنے کی قیمت ہے تو میں کہوں گا کہ اگر محنت اس کا نام ہے تو پھر مال میں روپے باندھنے پڑیں گے اور پھر گھر تک لائے پڑیں گے، پھر ان کو صندوق میں رکھنا پڑے گا۔ ان سب باتوں کی بھی قیمت ہونی چاہیے کیونکہ ایسی محنت ان کے اندر بھی ہے۔ بس اس کا سارا گھر لے لو۔

اسی طرح مسئلہ بتلانے کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں دین فروشی ہے اور وہ حرام ہے۔ البتہ تعلیم دین بطرز تدریس پر اجرت لینا جائز ہے کیونکہ اس میں مشقت ہے لیکن مسئلہ بتلانے کی کیا اجرت۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پانچ روپے لاؤ جب مسئلہ بتلائیں گے۔ یہ جائز نہیں۔ ایک شخص نے تو کہا ہی کہ دیا کہ ایک فتویٰ دیا اور ہزار روپیہ لے لیا۔ فتویٰ میں عجیب تماشا یہ کیا کہ پھر پھار کے ایسی صورت نکالی کہ ساس سے نکاح کرنا جائز کر دیا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک شخص ساس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ایسی مشہور بات تھی کہ عامی تک جانتا ہے کہ ساس سے نکاح حرام ہے۔ اس لئے اس کی جرات نہ ہوئی۔ وہ شخص ایک دکاندار مولوی کے پاس جو کہ اتفاق سے غیر مقلد بھی تھے پہنچا۔ اور ان سے کہا کہ کوئی ترکیب ایسی بتلائیے کہ ساس حلال ہو جاوے اور ایک ہزار روپیہ سامنے رکھ دیا۔ شیطان تو بڑا اُتھاوے اپنے فن کا بڑا عالم ہے۔ اس نے ایک ترکیب سمجھائی۔ آپ نے فتویٰ لکھا کہ ساس وہ ہوتی ہے جو منکوحہ

کی ماں ہو تو اس کی بیٹی اگر منکوحہ ہو تو یہ سانس ہوگی ورنہ سانس نہ ہوگی لیکن اکثر
سباہل عورتیں بعض اوقات کلمات کفریہ بک دیا کرتی ہیں۔ اسی طرح اس کی بیوی
نے بھی نکاح سے پہلے کلمات کفریہ ضرور کہے ہوں گے۔ اور نکاح کے وقت
تجدید ایمان کرائی نہ تھی پس اس عورت کا نکاح صحیح نہیں ہوا۔ اس لئے یہ
منکوحہ نہیں ہوتی۔ جب یہ منکوحہ نہیں ہوتی تو وہ سانس نہ ہوتی۔ پس نکاح جائز
یہی یہ بات کہ زنا اور مس بالمشہوت سے حرمت مصاہرت تو ثابت ہو
جاتی ہے۔ تو یہ صرف حضرت ابو حنیفہؒ کی رائے ہے جس کو ہم نہیں مانتے۔ کیا
تذکیب ہے۔ واللہ! یہود نے بھی ایسی تحریف نہ کی ہوگی۔

یہ ہے دین فروشی۔ رشوت بھی لی تو کتنے بڑے طریقہ سے۔ سچا مسئلہ
بتلا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں ہے جاسیکہ دین میں تحریف کر کے۔ ہاں کتابت کی
اجرت لینا جیسے فرائض لکھنے میں، یہ جائز ہے۔ مگر اس کے اثر پر بھی اگر نظر
کیجئے تو یہ بھی بُرائی سے خالی نہیں۔ وہ اثر یہ ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگ
مفتی سے فرائض کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھئے گا۔ ایسی فرائض
اس لئے کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں ورنہ کیوں ہمت ہو۔

ایک شخص نے میرے سامنے فرائض پیش کی اور یہ کہا کہ جلدی مل جائے
اور ایک روپیہ دو روپے میرے سامنے پھینکا اور کہا کہ یہ اس کا حق اللہ
ہے۔ میں نے کہا کہ اپنا کاغذ اٹھا لیجئے اور جالیئے۔ وہ جلدی اس لئے مچا
رہے تھے کہ ایک روپیہ بھی دیا تھا ورنہ کیوں جلدی مچاتے۔ مجھ کو ان کے
جلدی مچانے پر رنج نہیں ہوا بلکہ اپنے بھائیوں پر رنج ہوا کہ نہ وہ لیتے نہ

لوگوں کو ایسی جرأت ہوتی۔

ایک صاحب رئیس بطور مہمان میرے یہاں تشریف لائے۔ انہوں نے ایسی حماقت کی کہ مجھ کو حیرت ہو گئی جب معمولی بات کی بھی سمجھ نہیں، تو زیادت کیا کرتے ہوں گے۔ تو ان حضرت نے حرکت یہ کی کہ جب کھانا کھا چکے تو کھانے کے بعد ایک روپیہ نکال کر میری طرف پھینکا کہ لیجئے۔ جیسے بھٹیاریے کے یہاں پھینک دیتے ہیں۔ اس وقت ایک بزرگ مولوی صاحب بھی مہمان تھے۔ ان کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں میں ہی منٹ لوں گا۔ آپ خاموش رہئے میں نے وہ روپیہ ان ہی پر کچھ مارا اور میں نے کہا کہ جناب تہذیب سیکھئے۔ آپ کو اتنی تمیز نہیں۔ مجھے ان سے زیادہ اپنے ہم طبقہ لوگوں پر افسوس ہوا کہ ان کے سینے ہی کی وجہ سے یہاں تک نوبت پہنچی ہے۔

مشاریح کی حالت | آج کل کے مشاریح نے ناس کر رکھا ہے۔ حالت ہے کہ ایک درویش میرے یہاں آئے۔ ان کے ایک خلیفہ بھی ان کے ساتھ تھے جو کہ اہل علم میں سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر قرضہ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیسے ہو گیا۔ وہ بولے کہ مرید کھا گئے۔ دو دو مہینے بڑے رہے اور وصول ان سے کچھ ہوا نہیں۔ میں نے اس توقع پر قرض لے کر کھلا دیا کہ نذرانہ دیں گے۔ نذرانہ دیا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ بھی سوچا تھا کہ دوں گا کہاں سے۔ کہنے لگے کہ نذرانے کی امید پر آیا کہ تارک۔ اس کے بعد کہا کہ آپ پریذیڈنٹ بہاولپور کو سفارشی خط

لکھ دیجئے کہ وہ مجھ کو چھ ہزار روپیہ قرض دے دیں۔ میں نے کہا کہ آپ اولاً کہاں سے کریں گے۔ کہنے لگے کہ مریدوں سے جو ملے گا اُس سے ادا کروں گا۔ میں نے کہا کہ اللہ! ابھی آپ مریدوں کو نہیں بھولے۔ اُن کی وجہ سے تو یہ نوبت پہنچی۔ پھر جب انہوں نے میرے عذر کرنے پر بھی اصرار کیا تو میں نے اُن کی وجہ ہرت کی وجہ سے خط لکھ دیا اور اُن کو دے دیا۔ پھر میں نے دوسرا خط بذریعہ ڈاک پریڈنٹ کے پاس بھیج دیا کہ ایسا ایسا خط لے کر ایک صاحب آپ کی خدمت میں آئیں گے۔ اس پر عمل نہ کیجئے گا بلکہ جیسی آپ کی مصلحت ہو ویسا کیجئے گا۔ چنانچہ اُن کے پاس سے میرے ہاں جواب آگیا کہ آپ اطمینان رکھیں جو مناسب ہو گا وہی کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مشارع کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ مجھے ایک بزرگ کا قول پسند آیا۔ ایک شخص اُن کے پاس روپیہ لایا اور کہا یہ میرے بھائی کا بھیجا ہے اور رسید لینے کو لکھا ہے سو رسید دے دیجئے۔ اور بات یہ تھی کہ بھیجے والے کو اپنے بھائی پر اعتماد نہ تھا۔ اُن بزرگ نے کہا کہ لو اپنا روپیہ۔ کہیں رشتہ کی بھی رسید ہوتی ہے۔

جیسے لوگ سررشتہ دار کو دیتے ہیں کہ کچھ کر دیں گے ایسے ہی ہمیں سمجھا ہے کہ اگر انہیں دیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ سے کچھ کہہ دیں گے۔ ہے تو یہ ایک لطیفہ مگر ایک نتیجہ خیز بات ہے۔ سو نذرانہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

بعض لوگ اس خیال سے دیتے ہیں کہ پیروں کہیں گے کہ کیسا مرید ہے۔ نذرانہ ہی نہیں دیا۔ اب تو پیروں کے ہینہ اور فضلا نے اوششما ہی معین ہیں۔

بڑے ثقہ لوگ کہتے ہیں کہ پیر کے یہاں خالی جاوے خالی آوے۔ یہ ایک جملہ بنایا ہے۔ معنی تو اس کے صحیح تھے مگر بے محل اس کا استعمال کرتے ہیں۔ صحیح معنی اس کے یہ ہیں کہ جو خالی جاوے غلوں سے تو وہ خالی آوے گا فیوض سے اور یہ معنی نہیں کہ جو خالی جاوے فلوں سے۔ بلکہ ایسا قصداً کرنا چاہیے کہ شیخ کو کبھی دو اور کبھی نہ دو۔ اگر ایسا کرو گے تو اُن کی نسبت بھی نہ بگڑے گی۔ ورنہ یہ حالت ہوتی ہے کہ مرید کی صورت دیکھی اور خیال ہوا کہ اب کچھ دینگا مرید کے ذمہ بھی یہ امر ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے شیخ کے اخلاق خراب ہوں۔ اگر پیر میں حرص پیدا ہو گئی مرید کے عمل سے تو اُس نے پیر کا ناس کر دیا۔

پھر تو وہ ایسی پیری مریدی ہو گئی جیسے کسی مرید نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہار میں بھری ہوئی ہیں اور میری نجاست سے۔ پیر نے کہا کہ تم تم ہی ہو اور ہم ہم ہی ہیں مرید نے کہا کہ ابھی خواب شتم نہیں ہوا آگے بھی تو سینے۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں۔ اس پر پیر صاحب بہت بگڑے اور مرید کو بہت بُرا بھلا کہا۔ مرید نے کہا کہ حضرت آپ بُرا مائیں یا بھلا مگر دیکھا تو اسی طرح ہے۔

اب اس میں دو احتمال ہیں یا تو دل لگی کے طور پر اُس نے یہ بات گھڑی تھی یا واقعی خواب تھا اگر خواب تھا تو اُس کی تعبیر یہ ہے کہ مرید نے تو پیر سے دین کے لئے تعلق رکھا تھا اور پیر نے مرید سے دنیا کی غرض سے تعلق رکھا

تھا اور اگر یہ خواب گھڑا ہوا ہے تو یہ ایک تمثیل ہے، ایسے شخص اور مرید کے تعلق کی۔ اور تمثیل بھی نہایت غضب کی ہے۔ واقعی نذرانہ کی پیری مریدی کی بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔ ایسے پیروں سے بڑا ضرر پہنچتا ہے۔ مرید نذرانے کو دین سے بالکل سبکدوش ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہم نے سب حق ادا کر دیا۔ یہ لوگ ڈاکو ہیں دین کے اور اس دین کے ڈاکو سے وہ ڈاکو اچھے ہیں جو جراثیم کے بدوق و تلوار سے لوٹ مار کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور یہ اپنے کو بے جرم جانتے ہیں اور وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بالکل بے خطر ہوتے ہیں اس لئے وہ اچھے ہوں گے اور شاید قیامت میں ایسا ہی معاملہ ہو تو کچھ بعید نہیں جیسا کہ سماوی کا ارشاد ہے۔

گنہ آمرزہ زندان قدح خوار بلاعت گیر پیرانِ دیا کار
خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں آمدنی کے یہ ابواب ہیں جن کو میں نے بیان کیا اور یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔

اموال کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی
حلال و حرام کی تمیز بالکل تمیز نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قلب میں نور نہیں ہوتا۔ نماز پڑھتے ہوئے مدتیں ہو گئیں مگر قلب میں نورانیت نہیں۔ ان میں سے بعض کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ حلال دنیا میں مغرور ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ حلال کی فکر ہی نہیں کرتے۔ شیطان نے ان کو یہ پیٹی پڑھائی ہے اور اپنے نزدیک بڑے مستحق

ہیں کہ کسی چیز کو حلال ہی نہیں سمجھتے۔ مگر اس کا انجام یہ ہے کہ پھر ایسے لوگ بالکل احتیاط نہ کریں گے۔ جو چیزیں حرام ہیں ان سے بھی پرہیز نہ کریں گے سمجھیں گے کہ حلال کا تو وجود ہی نہیں اور حرام حرام سب برابر۔ اس لئے کسی چیز کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ بقولیکہ ح

چو آب از سرگزشت چو یک نیرہ چو یک بخت

شیطان کی مٹی بڑھانے کا یہ نتیجہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ محض غلط ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں نہیں اور یہ صرف شیطانی دھوکا ہے کہ وہ اس طریقہ سے حرام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ میں حرام و حلال کا معیار بتلاتا ہوں۔ اس کو سمجھ لینا چاہئے۔ معیار یہ ہے کہ فتویٰ فقہی جس چیز کو کہہ دے کہ یہ حلال ہے تو وہ حلال ہے اور جسے کہے کہ یہ حرام ہے تو وہ حرام۔ یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ چیز کو بھی حلال کہا جاتا ہے نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے۔ میں یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فتویٰ فقہی حلال کہہ دے اس وہ حلال ہے اصل میں بعض واعظین نے ایسی ایسی حکایات بیان کر کے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے۔

ایک حکایت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے۔ ان کا کھیت تھا۔ اتفاق سے ان کا بیل دوسرے کے کھیت میں گھس گیا اور اس کے کھریں اس کھیت کی مٹی لگ گئی۔ پھر وہ ان کے کھیت میں آگیا اور وہ مٹی ان کے کھیت میں مل گئی۔ تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا

بھوڑ دیا۔

بس لوگ اس قسم کی حکایت کو سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ جب یہ حالت ہے تو حلال کا وجود ہی نہیں نہ ہم سے ایسا ہو سکے گا نہ حلال نصیب ہوگا پھر خوب حرام پر مانتے مارتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ حکایت صحیح نہیں اور اگر صحیح بھی ہو تو وہ بزرگ مغلوب الحال تھے اور مغلوب الحال مجنون کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس کا فعل قابل تعلیل نہیں ہوتا۔

دین میں غلو | میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ شریعت کے برابر کسی قانون میں وسعت نہیں دیکھئے، شریعت دین میں

غلو کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ ارشاد ہے یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم اور ارشاد ہے لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم اور دیکھئے حدیث میں ہے کہ تین شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے اور بعض ازواج مطہرات سے حضور کے مصولات دریافت کئے اور جب انہیں بتلائے گئے تو انہوں نے اس کو کم سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے کو حضور پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں۔ حضور کے تو اگلے پیچھے سب زلات معاف ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ بات کب نصیب ہے۔ اس لئے ہم کو بہت زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ پس ایک نے ان میں سے کہا کہ میں اتنی عبادت کروں گا کہ سوؤں گا نہیں۔ ایک نے کہا میں نکاح ہی نہ کروں گا۔ ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ ہی سے رہوں گا افطار نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکان پر تشریف لائے تو آپ

کو ان تینوں کی باتیں معلوم ہوئیں۔ آپ کو ناگوار ہوا اور فرمایا، یاد رکھو میں سوتا بھی ہوں، جاگتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں، کھاتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں خوب سمجھ لو۔ یہ میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقہ کو چھوڑے گا اُس سے مجھے کوئی علاقہ نہیں۔

دیکھئے ان لوگوں پر آپ نے غلو فی الدین کی وجہ سے کتنا بڑا تشدد فرمایا کہ ایسے شخص کا مجھ سے کوئی علاقہ نہیں۔
ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے کہ آپ ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان میں ایک رسی بندھی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ رستی کیسی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ رستی زنیٹ نے باندھی ہے جس وقت اُن کو نوافل پڑھتے پڑھتے نیند سٹاتی ہے تو رکسل رفع کرنے کے لئے، اس پر سہارا لگا لیتی ہیں۔ آپ نے یہ سن کر فوراً اُس کو توڑ ڈالا اور فرمایا کہ نفس پر اتنا تشدد نہ سچا ہے اور فرمایا کہ جب نیند آئے سو رہو۔ جب رکسل رفع ہو جاوے پھر مشغول ہو جاؤ۔ شریعت تو یہ ہے۔

ان آیتوں اور احادیث کو فقہار نے خوب سمجھا ہے۔ ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تقویٰ طہارت اختیار کر دو بلکہ تقویٰ طہارت میں تو خوب کوشش کرو مگر حد سے آگے مت بڑھو۔ اہل ادب نے تو یہاں تک کیا ہے کہ بعض افعالی کو اس لئے نہیں کیا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ نہ ہو جائے۔ مگر ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا کہ کس بات سے مساوات ہوتی ہے اور کس بات سے نہیں ہوتی۔ یہ کام علماء باطن کا ہے اس

کو وہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبندیؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی نظر سے یہ حدیث گزری کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جھلی نہ تھی اٹا چھانا نہ جاتا تھا۔ پس یہ کرتے تھے کہ جو کا اٹا پیسا اور پھونک ماری، بجوسی اڑ گئی اور روٹی پکالی۔ یہ طریقہ تھا۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے خدام سے فرمایا کہ اب سے اس سنت کے موافق عمل درآمد ہونا چاہئے کہ اٹا جو کا ہو اور چھانا نہ جاتے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور روٹی پکائی گئی اور سب نے کھائی۔ اس کے کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا۔ سوئیاں سی چھنے لگیں۔ حضرت کے پیٹ میں بھی درد ہوا۔ اگر ہمیں یہ صورت پیش آتی، تو یوں کہتے کہ سنت پر عمل کیا تھا اس سے یہ ہوا۔ اگر ادب کی وجہ سے بولتے نہیں تو دل میں تو یہی خیال ہوتا اور یہی کہتے کہ اب کبھی سنت کا اتباع نہ کریں گے مگر اہل ادب کے قلب میں نورانیت ہوتی ہے۔ ان حضرات کا ادب دیکھئے آپ نے فرمایا کہ ہم نے بے ادبی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ کیا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کو کیسے پہنچ سکتے ہیں ہم ضعیف کمزور ناقواں ہیں۔ آپ سے نچلے ہی درجہ میں رہنا چاہئے پھر خدام سے فرمایا کہ کھائیں گے تو جو مگر چھان کر۔ ادب دیکھئے کہ سنت میں کوئی نقص نہیں نکالا بلکہ اپنے کو سنت کے قابل نہ سمجھا۔

اب میں اس مسئلہ کا حل عقلی طور سے کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ

شریعت میں چیزوں کی اقسام

شریعت میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جو مقصود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مقصود نہیں ہیں زائد ہیں مگر محمود ہیں لیکن یہاں مجتہد کی ضرورت ہوگی کہ وہ تمیز کرے کہ کون مقصود ہے اور کون مقصود نہیں۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب نے ایک مریض کو اجازت دی کہ شلجم کھاؤ اُس نے مع پتوں کے پکا کر کھائے اور اُس کو نفع ہوا۔ اب اس کا فیصلہ کرنا کہ قتلوں سے نفع ہوا یا پتوں سے یا دونوں کے مجموعہ سے۔ یہ طبیب کا کام ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک قتلے اور ایک پتے۔ ممکن ہے کہ مقصود قتلے ہوں اور مریض پتوں کو مقصود سمجھ لے یا مقصود پتے ہوں اور مریض قتلوں کو مقصود سمجھ لے۔ اس لئے اس میں فیصلہ کرنا مریض کا کام نہیں بلکہ یہ کام طبیب کا ہے۔

اسی طرح سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے اور غیر مقصود کون ہے۔ یہ کام مجتہدین کا ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے

چنانچہ حضرت علی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے۔ اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے کہ رفع مقصود ہے اور ترک رفع جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد عدم رفع کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہئے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نماز میں کا ہنڈا اٹھاتے ہو یعنی سلام کے وقت نماز میں سکون اختیار کرو پس

مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لئے فرمایا۔ اب جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا یہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ صحابہ جب نماز کا سلام پھیرتے تو اٹھا اٹھا کر کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ ممانعت حضورؐ نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارہ میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے، اس لئے وہ مقصود ہوگا۔

اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔ مثلاً آئین کہنا، ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آئین پکار کہ کہنا ہے اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود اخفاء ہے کیونکہ یہ دعا ہے اور دعائیں اخفاء مقصود ہے۔ اگر پکار کہ کہی دیا ہے تو وہ اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ آئین بھی کہا کرتے ہیں۔ اگر کہی پکار کرتے کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آئین بھی آپؐ کہا کرتے ہیں۔ جیسے کہی بھی حضورؐ علیہ السلام نے اسی حکمت کے لئے سری نماز

میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے۔
 ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے۔ یہ اختلاف کا ہے
 سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے
 دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی بھگڑے ہی
 کا خاتمہ ہو جائے۔ پس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بناء پر تمام افعال
 میں اختلاف ہوا ہے۔

یہ بیان انتظار ادا ہو گیا۔ عرض یہ کہ رہا تھا کہ شریعت میں دو چیزیں ہیں
 مقصود اور غیر مقصود اور یہ مجتہد کا کام ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ مقصود کیا ہے
 اور غیر مقصود کیا ہے۔

پس سمجھ لیجئے کہ جو کی روٹی کھانا مقصود نہیں ہے۔ کوئی
 شرعی مصلحت اس کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہاں بعض مواقع
 پر معین ہوتی ہے مقصود میں۔ اس لئے جہاں ایسا موقع ہوتا ہے وہاں بتلائی
 جاتی ہے اور بعض طوائف ہیں ضعیف، وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے
 انہیں یہ مفید نہیں ہوتی بلکہ مقصود میں مشغول ہونے سے مانع ہو جاتی ہے ایسے
 مواقع پر اس سے منع کیا جاتا ہے۔

مثلاً ہم نے جو کی روٹی کھائی اور کھا کر پیٹ میں ہوا درو۔ تو جو ہم کو
 محبت تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشن سے وہ اس حالت میں
 باقی نہ رہے گی بلکہ وحشت ہوگی اور خطرہ آئے گا کہ اچھا سنت پر عمل کیا کہ
 پیٹ میں درد ہو گیا۔ آج متشددین ہی کی بدولت شریعت سے لوگوں کو نفرت

ہو گئی۔ لیکن مشائخ ہر شخص کی قابلیت دیکھ کر اس کے مناسب تعلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے مقام پر کہتے ہیں کہ جو کی روٹی مرت کھاؤ۔ اور پہلے چور کی حکایت ایسی ہی گزری ہے کہ شیخ نے اس کو خاتقاہ کے جوتے الٹ پٹ کر کے اسے اجازت دے دی تھی۔ اس کے مناسب حال وہی بات تھی۔ دوسرے شخص کو اس کی اجازت مختوڑا ہی دی جائے گی۔

ایک رئیس تھے۔ انہوں نے میرے پاس آنے اور قیام کرنے کا ارادہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ میرا جی گاڑے کے کپڑے پہننے کو چاہتا ہے۔ اس لئے میرے واسطے وہ بھی تجویز کے سبب میں نے ان کو لکھا کہ آپ کو مرعین ہونے کی حیثیت سے حق نہیں فرمائش کا۔ میں جس طرح چلاؤں ویسے چلنا پڑے گا۔ اور اس میں ایک راز تھا۔ وہ یہ کہ شریعت میں یہ اصل مقصود تو ہے نہیں۔ پھر ان رئیس کے گاڑے کے کپڑے پہننے سے ایک بڑا ضرر ہوتا۔ وہ یہ کہ اگر ایسا شخص گاڑے کے کپڑے پہنے گا تو دل میں عجب پیدا ہوگا کہ ہم کتنے متواضع ہیں کہ رئیس ہو کر ایسے کپڑے پہنتے ہیں۔ ہم ایسے اچھے ہیں۔ ہم میں ایسی مسکنت ہے اور مقصود ہے عجب کا ازالہ اور یہاں وہ پیدا ہوگا۔ اس لئے ایسے موقع پر گاڑے کے کپڑے پہننے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ یہ ہے حقیقت اس کی۔

ایسے شخص سے زیب و زینت چھڑانی جائے گی جو زیب و زینت میں مشغول رہتا ہو اور کام نہ کرتا ہو۔ بناؤ سفکار میں وقت گزارتا ہو۔ اس سے کہا جائے گا کہ لوگ جہاں راستہ چلتے ہوں وہاں جا کر جھاڑو دیا کرو تاکہ کپڑوں پر اور جسم پر گرہ پڑے اور زیب و زینت کو چھوڑے اور کام میں لگے تو ایسے

شخص سے اس طرح زیب و زینت چھڑا دی جاتی ہے۔

غرض سادے کپڑے اور جو کی روٹی یا اس کی مثل سنن عادیہ میں سے ہیں اگر کہیں ان کی وجہ سے مقصود فوت ہونے لگتا ہے تو ان کو چھڑا دیا جاتا ہے کیونکہ سنن عادیہ کوئی مقصود نہیں ہیں بلکہ بعض موقع پر سنن عبادت تک چھڑا دی جاتی ہیں اگر ان سے ضرر ہوتا ہو۔

مشکوٰۃ یہ سنت ہے کہ تہجد کی آٹھ رکعت پڑھے۔ اب کسی کو نیند زیادہ آتی ہے اور وہ تہجد کے واسطے زیادہ دیر جاگا اور پھر ایسا سو یا کہ صبح کی جماعت فوت ہو گئی تو اس سے کہا جائے گا کہ تم دو رکعت پڑھ کر جلد سو رہو تاکہ صبح کی جماعت نہ جائے۔ اگرچہ آٹھ رکعت سنن عبادت میں سے ہیں مگر جب اس سے بڑھ کر مقصود فوت ہوتا ہے تو اس کو چھڑا دیں گے۔ غرض یہ کام مجتہدین کا ہے کہ وہ مقصود اور غیر مقصود کو جان سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ترجمہ قرآن کا دیکھ کر اسے مشکوٰۃ پڑھ کر اجتہاد کرنے لگیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دار و سکندری داند نہ ہر کہ چہرہ برافروخت لبری داند
سویہ راز ہے اس حکایت میں کہ جب شیخ نے دیکھا کہ جو کا آٹا بے چھنا کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا تو فوراً اس سے منع کر دیا اس خیال سے کہ یہ کوئی سنن عبادت تو ہے نہیں اور اس سے اندیشہ ہے دینی ضرر کا کہ کہیں سنت سے وحشت نہ ہو جائے اس لئے ہمارے لئے اس کا ترک ہی مناسب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کی بابت اس کے مجموعی حالات سے ثابت

ہو جاوے کہ حج کے راستہ میں اس سے نماز کی پابندی نہ ہو سکے گی تو اس کو حج نفل سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک نماز کے بھی قضا ہونے کا گمان غالب ہو تو اس کو حج نفل کرنا جائز نہیں۔ اسی کے بارہ میں عارف مسعود بک کہتے ہیں۔

اے قوم! حج رفتہ کجا ئید کجا ئید
معتشوق درینجا ست بیایید بیایید
یعنی تم کہاں چلے حج کرنے تمہارا محبوب یعنی اللہ میاں تو یہاں ہیں۔

اس شعر میں مطلق حج مراد نہیں جس سے شبہ پڑے کہ حج سے روک دیا ہے ہیں بلکہ حج نفل جس سے کوئی فرض چھوٹتا ہو وہ مراد ہے۔ جنہوں نے اس کو مطلق سمجھ لیا۔ اعتراض کرنے لگے کہ لو حج ہی سے منع کرتے ہیں، جو ایک بڑی عبادت ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ ان لوگوں کو کہہ رہے ہیں جنہیں حج سے دینی ضرر پہنچتا ہے کہ نفل کو تو ادا کرتے ہیں اور فرض کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ ایسوں کو حج سے قرب نہیں بڑھتا بلکہ اور بُعاہ ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں۔

اے قوم! حج رفتہ کجا ئید کجا ئید
معتشوق درینجا ست بیایید بیایید

یعنی تم کہاں چلے تمہارا محبوب تو یہیں ہے۔ تمہیں محبوب کا قرب یہیں رہ کر حاصل ہو سکتا ہے وہاں نہیں حاصل ہوگا۔ عرض یہ کہ سنن عادیہ اور سفر عبادت ایسے شخص کے واسطے ناجائز ہیں جس کا یہ نتیجہ ہو کہ کوئی دینی ضرر پہنچ جائے۔ اسی واسطے حضرات مشائخ کسی کو کچھ بتاتے ہیں اور کسی کو کچھ بتاتے ہیں۔

جو جس کے مناسب ہوتا ہے اس کو وہی بتلاتے ہیں۔ یہ کام ہر شخص کا نہیں اس کام کے وہی حضرات ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ لوگوں کو ایسی حکایات دجیسے بیل کے کھڑے مٹی لگ جانے کی حکایت سابق میں گزری، نہ سنانی چاہئیں۔

بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ شریعت میں وسعت ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کسی

شریعت میں وسعت

مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف بھی ہو مگر آج کل کے مجتہدین کا اختلاف نہیں اور اس میں ابتلا عام ہو تو اس کو بھی جائز کہنا چاہئے۔

وجہ یہ ہے کہ معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں۔ اگر مختلف فیہ امور کو حرام بتلایا جاوے گا تو اگر اس پر کوئی کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا۔ اور اگر عمل نہ کرے گا تو وہ ان کو اور محرمات اجماعیہ کو برابر سمجھے گا۔ اور دونوں میں مبتلا ہو جائے گا اس لئے غلو نہیں چاہئے تنگی میں بلکہ وسعت کرنی چاہئے۔ فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے۔ لوگوں کا تو گمان یہ ہو گیا ہے کہ شریعت میں تو سوائے لایحوز کے اور کچھ ہے ہی نہیں حالانکہ شریعت میں لایحوز بہت کم ہے، یحوز کثرت سے ہے۔ جو فقر سے واقف ہے وہ اس کو خوب جانتا ہے غرض یہ کہ وسعت دینے میں ایک تو شریعت سے محبت ہوگی دوسرے جو اس سے منتفع ہوگا، آرام سے رہے گا۔ اس سے حق تعالیٰ کی محبت

غالب ہوگی۔

حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشقِ احسانی ہیں ہم لوگوں کو جو خدا تعالیٰ سے محبت ہے وہ احسانات کی وجہ سے ہمیں اسی واسطے ہمارے حضرت کا مسلک یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے آرام سے رہو مگر حد سے نہ نکلو۔ ساری دنیا کے مشائخ گھٹی دودھ چھڑاتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ اور اس سے کام لو۔ وہ اس صورت میں خوب کام کرے گا۔ ع

کہ مزدور خوش دل کند کارِ ریش!

ورنہ کہے گا کہ میاں کس برتہ پر کام کریں۔

حضرت حاجی صاحب ایک دفعہ میرا نام لے کر فرمانے لگے کہ میاں اشرف علی پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو۔ ٹھنڈا پانی پیو گے تو ہر بنِ مؤمن سے الحمد للہ نکلے گا اور اگر گرم پیو گے تو الحمد للہ دل سے نہ نکلے گا بلکہ زبان ہی تک رہے گا۔

میں تو حضرت کے یہاں دن رات دیکھتا تھا کہ حضرت کا قصداً یہ تھا کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھے اس واسطے کہ بعض کو جب خوف غالب ہوتا ہے تو طاعت کم ہوتی ہے۔ خوف کی صورت میں صرف ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے۔ اسی کو تو عرفائی کہتے ہیں۔

صنارہ قلندر مسرور ابنِ نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ رسمِ پارستانی

رہ قلندر محبت کی راہ ہے اور رہ و رسمِ پارستانی ضابطہ کی طاعت ہے

محبت ایسی چیز ہے کہ اس میں آدمی ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا ہے
چنانچہ کہتے ہیں ۔

نا خوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من
محب کی روح کو راحت ہوتی ہے گو جسم کو تکلیف ہو۔ اور یہ حالت
ہوتی ہے جیسے ایک عارف کہتے ہیں ۔

زندہ کنی عطائے تو در بکشتی فدائے تو

جاں شدہ بتلائے تو ہر چہ کنی رعنائے تو

جب محبت ہوتی ہے تو پھر کوئی چیز گراں نہیں ہوتی۔ بعض لوگ رات
بھر تو جاگتے ہیں اور تختیں اٹھاتے ہیں اور پھر بٹاش بٹاش رہتے ہیں۔ تو کیا
بات ہے؟ یہی محبت ہے اس کی کچھ گرائی نہیں ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ
کہ جس کو محبت کا مل ہو گی اس سے معاصی ہرگز نہ ہوں گے۔ بس جب کسی کو
دودھ بھی پیس رہا ہو تو خوب کھائے پیئے بشرطیکہ معاصی کی حد تک نہ پہنچے۔ حد
کے اندر رہ کر جتنی چاہے وسعت کرے۔ اس سے محبت بڑھے گی، تو
معاصی آپ ہی چھوٹ جائیگی۔

اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنی چاہئے۔ جائز تک
رکھے تو غنیمت ہے۔ اولیٰ پر تو کہاں پابندی ہو سکتی ہے۔ اختلافی مسئلہ
میں اگر ابتلائے عام ہو تو اس کو بھی جائز ہی بتلائیے۔ مگر یہ معاملات ہیں
ہے نہ کہ شطرنج وغیرہ میں۔ کیونکہ معاملات میں تنگی کرنے سے تو تکلیف ہوتی
ہے اور شطرنج وغیرہ سے روکنے میں کیا تکلیف ہے۔ اس تقریر سے معلوم

ہو گیا ہو گا کہ حلال کے ابواب کثرت سے موجود ہیں۔

مگر افراط و تفریط نہ کرنی چاہئے۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ افراط و تفریط کرنے لگتے ہیں۔ اہل

اہل خصوصیت کا تقویٰ

حالی کی حکایات دیکھ کر اپنے کو اُن پر قیاس مت کرو۔ وہ ہوتے ہیں مصائبین اُن سے ذرا سی بات میں گرفت ہو جاتی ہے۔ اور ہم لوگ ایسے ہیں، جیسے ریشیوں کے کاشتکار۔ مصاحب اگر دربار میں بلند آواز سے بھی بولے تو آنکھیں نکال لی جاویں اور کاشتکار اگر باہم گالیاں بھی بکین، تو چشم پوشی کی جاتی ہے ہر ایک کا معاملہ جدا ہے۔ اہل خصوصیت کی باتیں ہی الگ ہیں۔ اُن کا تقویٰ بھی جدا ہے۔

ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک طالب علم تھے۔ وہ کہیں پڑھتے تھے۔ اُن کے والد اُن سے ملنے آئے۔ بیٹے تو اُس وقت موجود نہ تھے، ایک اور طالب علم تھے جو اُس حجرہ میں اُن کے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ یہ وہاں بیٹھ گئے۔ اتفاق سے حجرہ میں بازار کی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے جو دیکھا کہ بازار کی روٹیاں رکھی ہیں تو بہت ہی برہم ہوئے۔ اتنے میں وہ طالب علم بھی آگئے اور اپنے والد کو سلام کیا۔ اُنہوں نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ تم بازار کی روٹی کھاتے ہو۔ علم دین کا نور اور اُس کی برکت تمہیں کیسے حاصل ہوگی۔ بازار کی روٹی منظر عام پر رکھی جاتی ہے اور ہر قسم کے لوگ اُس کو دیکھتے ہیں۔ اُن میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی یہ حالت ہوتی ہے۔

کہ بازار چست رائے آگندہ تہ ہنہی درست را دل پراگندہ تہ
روٹی کو دیکھ دیکھ کر ان کا دل لگیا تھا ہے اور پاس کچھ ہوتا نہیں۔ اس
لئے پریشان ہوتے ہیں اور بعض قحط زدہ ہوتے ہیں کہ ان کا دل روٹی کو دیکھ
کہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے اور خالی ہاتھ ہونے سے کھا نہیں سکتے۔ بس دل
ہی دل میں گھٹے کر رہ جاتے ہیں۔ تو یہ بازار کی روٹی سبب ہے بعض مسلمانوں
کے دل پریشان ہونے کا اور اس سے مسلمانوں کا دل دکھا ہے۔ وہی روٹی
جس نے دل دکھایا ہے مسلمانوں کا ان کو تم کھاتے ہو۔ اس طالب علم نے
عرض کیا کہ یہ روٹیاں میری نہیں ہیں بلکہ میرے شریک حجرہ کی ہیں۔ اس پر
ان کے والد نے کہا کہ تم ایسے حجرہ میں کیوں رہتے ہو جس میں بازار کی
روٹیاں کھانے والا رہتا ہو۔

دیکھئے، یہ ہے اہل خصوصیت کا تقویٰ۔ آج کل بتا بیٹے ایسا کون ہے
جو بازار کی روٹی نہ کھاتا ہو۔ جس سے مسلمانوں کا دل دکھا ہوتا ہے ہر ملہ
قوم کے اصل میں یہ حضرات ہیں۔ آج جو ہمدرد قوم کہلاتے ہیں اب ان
کی حالت دیکھئے۔ ان کو ہمدرد کیا ہمہ درد کہنا چاہئے۔
ایک جٹلمین صاحب کا قصہ ہے کہ انہوں نے اسباب اٹھانے کے
لئے اسٹیشن پر ایک قلی کیا اور مزدوری میں ان کو دو ٹنی دی۔ وہ سختی کھوٹی۔
قلی نے کہا کہ اس کو بدل دیجئے نہیں چلے گی۔ انہوں نے کہا کہ چلے گی کیوں
نہیں۔ ان نے کہا کہ صاحب کیسے چلے گی۔ یہ تو بہت کھوٹی ہے۔ اس کا
انہوں نے کیسا ظالمانہ جواب دیا کہ جیسے ہم نے چلا دی تم بھی چلا دینا

تم نے تو ظلم اور زبردستی سے چلا دی اُسے کون سا شخص ایسا ملے گا جس پر ظلم اور زبردستی کر سکے۔ بس وہ روتا ہوا چلا گیا اور یہ فرعون کی طرح بیٹھتا ہے پروا بھی نہیں کی۔ خدا جانے یہ کیسی ہمدردی ہے۔ بس ان لوگوں میں ہمدردی کے الفاظ الفاظ ہی ہیں۔ ظاہر کچھ ہے باطن کچھ ہے۔

وجاہدۃ دعوی المحبة فی الہوی

ولکن لا یغنی کلام المناق

یہ لوگ تقلید کرتے ہیں یورپ کی مگر اہل یورپ اتنے بے درد نہیں ہیں جیسے یہ لوگ ہیں۔ ایک عادت ان کی یہ بھی ہے کہ یہ لوگ عموماً ہر بات کے اندر مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر اقوام کے طریقہ کو ترجیح دے کر ان کی تقلید کرتے ہیں مگر فضول باتوں میں۔ جیسے کوٹ پتلون پہننے ہیں۔ حضرت جو اہل کمال ہیں وہ ان فیشنوں کے مقید تھوڑا ہی ہیں اور جن لوگوں کے اندر کچھ کمال نہیں وہ ظاہر کی لیب پوت کرتے ہیں۔

عرض بازار کی روٹی کھانے کا قصہ تھا کہ اُن طالب علم کے والد صاحب نے ایسے حجرہ میں رہنے کی بھی تو اجازت نہیں دی جس میں بازار کی روٹی لکھائی جاتی تھی۔ یہ بھی ایسی ہی حکایت ہے جیسے پہلے گزری۔ مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ ہم اس حکایت کے مخاطب نہیں ہیں۔

ہمارا تقویٰ ہمارا تقویٰ ہے۔ فتوے پر عمل کر لیں میں یہی ہمارا تقویٰ ہے۔ فتوے سے جو چیز حلال ہو اس کو حلال سمجھو

لیکن اتنی وسوسہ بھی نہیں کہ ہر چیز جائز ہو۔ نہ سود کی پروا ہو نہ رشوت کی

پروا ہو۔

مال کے متعلق ایک امر پر اور مطلع کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ لوگ میراث میں بہت زیادہ بے احتیاطی کرتے ہیں کیونکہ خود مالک تو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا نہیں اس لئے بے تک قبضہ میں آتا ہے۔ مرنے والا تو مر گیا اب جس کی لالچی اس کی بھینس۔ بس جس کے ہاتھ میں کبھی ہوئی وہ مالک بن بیٹھا۔ مال میراث میں لوگوں کو ذرا احتیاط نہیں۔ اکثر تو مخفی کر لیتے ہیں دوسرے وارثوں کو پتہ بھی نہیں دیتے۔ اکثر زبردست ہونے کی وجہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور زیادہ بے فکری وٹاں ہوتی ہے کہ جہاں قانون سے بھی انہیں کو ملتا ہے۔ جیسے کہ اودھ میں قانون ہے کہ میراث کا مالک فرزند اکبر ہے اور دوسرے و خلیفہ خوار۔

خوب سمجھ لو کہ یہ مطلق حرام ہے۔ شریعت نے میراث کے احکام خود مقرر کئے ہیں۔ کوئی قانون شریعت کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ شریعت نے جس جس کا حق رکھا ہے اس کو پہنچانا واجب ہے۔ دوسرے کے حق سے خود ملتفع ہونا یا کسی اور کو دینا حلال نہیں ہے۔ مصلحت کو دیکھئے ایسے اموال میں کتنی احتیاط کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ چراغ کی روشنی میں مال وقف کا حساب لکھ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے ان کو آتے ہوئے دیکھ کر آپ نے چراغ گل کر دیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اس میں کیا مصلحت تھی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چراغ بیت المال کے

تیل کا ہے۔ اگر روشن رہنے دیتا اور آپ سے باتیں کرتا تو باتوں میں اس کا حرف کتنا درست نہ تھا اور اگر آپ سے باتیں نہ کرتا تو مروت کے خلاف تھا۔

اسی طرح میراث میں سلف سخت احتیاط کرتے تھے۔ ایک بزرگ ایک دوست کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں گئے تو اُن کو نزع کی حالت میں پایا۔ چنانچہ کھوڑی دیر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہاں چراغ جل رہا تھا۔ آپ نے فوراً اُسے گل کر دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگوا یا اور اُس سے چراغ روشن کیا اور فرمایا کہ وہ تیل مرحوم کی ملک اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ زندہ تھے اور انتقال کر گئے ہی تمام ورثاء کی ملک ہو گیا۔ جس میں بعض ورثاء یتیم ہیں بعض غائب ہیں۔ اس لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔

سو یہ تھی اُن حضرات کی احتیاط۔ اب تو تیل کیا مانتی کے ہاتھی نکل جائیں اور خبر نہ ہو۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اہل علم بھی اس کی پروا نہیں کرتے مدارس تک میں اس کی احتیاط نہیں۔ مدارس میں قیمتی قیمتی اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں مجھ کو یاد نہیں کوئی خط کسی مدرسہ کی طرف سے اس مضمون کا گیا ہو کہ یہ اسباب جو بھیجا ہے تو سب ورثاء کی اجازت سے بھیجا ہے یا نہیں یا اگر کوئی بچہ میت کا نابالغ ہے تو اُس کا حصہ نکال لیا ہے یا نہیں۔ اس پر یہ حال ہے کہ مال آیا اور رکھ لیا۔

سو جب خواص کی یہ حالت ہے تو عوام الناس کو کیا کہا جائے۔

عوام الناس سے کہو بھی تو کہتے ہیں کہ جب اہل علم ایسا کرتے ہیں تو بھلا ہم کس شمار میں ہیں۔ اہل مدارس دل کو یوں سمجھا لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے دینے میں کون انکار کرتا ہے۔ اس لئے سب ورثہ کی طرف سے اجازت ہی ہے اور اگر کوئی نابالغ بھی ہے تو وہ پھر بڑا ہو کر معاف کر دے گا۔ بعض کی بلکہ اکثر کی یہ حالت ہے کہ میت کی فاتحہ اور کھانا وغیرہ مشترک مال سے کرتے ہیں جن کے اندر نابالغ بچوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ جو شخص اس منصوب مال کو کھائے گا وہ مغضوب ہوگا۔ جی کو یوں سمجھا لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتے ہیں پھر اس میں ہم پر الزام کیا ہے۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کوئی شخص مر گیا۔ بس سارا مال بیوہ کو دے دیا۔ بی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ اب وہ مالک الملک ہے۔ یتیم بچوں کا مال خوب ٹٹا رہی ہے کہیں شادی میں کہیں بیوہ میں۔

بیوہ کے مفاسد | اول تو بیوہ کی رسم ایک رسم ہے یہود وہ اس میں اگر خالص اپنا مال ہوتا بھی نہ لگانا چاہئے اور پھر یہ تو مشترک مال ہے اگر کوئی کہے کہ صاحب بیوہ تو نہایت عمامہ رسم ہے

۱۔ رسم بیوہ کبھی پہلے بطریق ہمدردی و امداد پر اور نہ مٹتی اب وہ عام طور سے بصورت قرضہ ہو گیا ہے۔ دور کا کیا ذکر قریبی تعلقات اور واسطہ داریوں میں بھی اسی نیت سے اس کا لین دین ہے کہ آج ہم اُن کے دیں گے تو کل کسی تقریب میں ہمارے یہاں واپس آجائے گا۔ اور خصوصاً تقویات (القیہ حاشیہ بر ص ۱۵۲)

مختور اخٹور ادا دینے میں شادی والے کا کام ہو جاتا ہے اور دینے والوں میں سے کسی پر بار نہیں ہوتا، تو مستحسن کو قلع کیسے کہہ دیا۔ غریب کو دیا اس کی شادی ہو گئی۔ یہ مختوری بات ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے ایک فائدہ کو تو دیکھ لیا اور دوسرے مفاسد جو اس کے اندر ہیں ان کو چھوڑ دیا۔ اس میں اگر ایک فائدہ ہے، تو مفاسد کتنے ہیں۔ ان مفاسد کو بھی تو دیکھنا چاہئے۔ اور اقل تو جو فائدہ اس میں سوچا گیا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ آج کل کی شادیوں میں خرچ اتنا کیا جاتا ہے کہ نبوتہ اس کے لئے کافی نہیں ہوتا اور مفاسد اس کے اندر بہت ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک مفسدہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی کے

رہیقہ حاشیہ از ص ۱۵۱) میں قصداً وہی لوگ نہ جو کئے جاتے ہیں کہ جن کے ذمہ اپنا نبوتہ واجب ہے، کسی تقریب کا تخمینہ خرچ کرتے ہوئے یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ اتنا روپیہ اپنے نبوتہ کا بھی اُجائے گا اور پھر جب دوسری جانب سے وصول میں توقف و تساہل ہوتا ہے تو بر ملا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ اور اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں کے ذمہ اتنا نبوتہ چاہئے تھا نہ تو خود اُس نے نہ ہمارے نبوتہ کا روپیہ بھیجا۔ اور بعض جگہ تو اُسندہ تقریب تک انتظار بھی نہیں کرتے درمیان میں ہی پیام اُجاتا ہے کہ ہمارے نبوتہ والے روپے بھیج دو ہمیں ضرورت نہیں پس ایسے صریح و مسلمہ قرضہ کی حالت میں انتظام ادائیگی قطعی نہیں۔ اکثر جگہ تو مالک خانہ کی زبانی

(رہیقہ حاشیہ بر ص ۱۵۲)

یہاں نبوتہ دیتے ہیں تو نبوتہ لینے والا اتنے لوگوں کا مقروض بنتا ہے۔ حدیث میں صاف موجود ہے کہ مقروض جنت میں نہ جائے گا۔ تا وقتیکہ اہل حق کا حق ادا نہ ہو جائے۔

دوسرا مفسدہ تو بالکل لاعلاج ہی ہے۔ اُس کا علاج ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس رسم کو چھوڑا جائے اور وہ میراث کے ایک مسئلہ پر متفرع ہے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ ایک شخص مرا۔ اُس نے دو بیٹے چھوڑے اور اُس نے مثلاً پانچ روپے نبوتہ میں دیئے تھے تو پانچ روپے بھی مردہ کی میراث میں جب وصول ہوں گے تو اُن کا ورثا پر تقسیم کرنا واجب ہوگا۔ اب وہ آئیں گے کس طریقہ سے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ جب اُن کے یہاں

رہقیہ حاشیہ از ص ۱۵۲) یادداشت پر حساب کتاب ہے۔ خود کو بھی سہولت ہے اور پھر اپنے بعد اپنے ورثا کو اس کی بابت کوئی ہدایت یا وصیت نہیں۔ پیمانندگان میں سے جس کسی کو جس قدر یاد آیا یا دوسری جانب سے اُن پر تقاضا ہوا تو خیر کچھ ادائیگی ہو گئی اور اگر دوسری جانب بھی اصل نبوتہ کا انتقال ہو گیا اور اُس کے چند وارث ہیں تو ایسی صورت میں اول تو خبرے نباشد اور اگر دیا بھی تو کسی ایک وارث کو دے کر باقی ورثا کا مطالبہ یا حق بالکل سوخت۔ نہ اُن کی تلاش کہ وہ کہاں کہاں ہیں اور ہر ایک کا کیا حصہ ہوا۔ جہاں کہیں اس نبوتہ کا انتظام تحریری ہے وہ بھی لینے کے واسطے ہے دینے کے واسطے کبھی اُس کی میزان بھی نہیں دیتے کسی ساہوکار (بقیہ حاشیہ پر ص ۱۵۲)

کوئی شادی ہوگی تو وہ بطور نیوتہ کے دیئے جائیں گے۔ اب ایک بیٹے کی شادی ہوئی اور وہ پانچ روپے آٹے تو وہ پورے پانچ روپے اس کے نہیں بلکہ صرف اڑھائی روپے کا مستحق ہے اور باقی اڑھائی روپے دوسرے بھائی کا حصہ ہے لہذا وہ اس کو دینے لازم ہیں مگر وہ اس کو نہیں دیئے جاتے۔ اس لئے دینے والے کے ذمہ سے پانچوں روپیہ ادا نہ ہوئے بلکہ صرف اڑھائی روپے ادا ہوئے اور دوسرے بیٹے کے اڑھائی روپے رہ گئے۔ پھر وہ مر گیا۔ تو اب ان اڑھائی روپے کی میراث چلے گئے۔ اسی طرح آگے اولاد ہوگی اور یہی سلسلہ چلے گا۔ تو اس اڑھائی روپیہ کے ہزاروں آدمی مستحق ہو گئے قیامت میں اس شخص کی جان پر بنے گی۔ اس لئے ایک ایک پیسہ اور کوڑی

بقیہ حاشیہ از ص ۱۵۳، مہاجن کا یا کسی دوسری قسم کا قرضہ ہوگا تو اس کا شمار بھی کریں گے کہ ہم کو اس قدر دینا ہے لیکن ان کے ذیل میں کبھی نیوتہ کا قرضہ نہیں گنا جاتا۔ ایسی حالت میں اس نیوتہ کا لینا دینا مذموم اور باعث ہلاکت ہے کہ ایک زمانہ اس میں مبتلا ہے۔ اور مقروض اور پھر بے فکر اور حساب آخرت سے نڈر۔ اگر لیتے دیتے وقت قرض حسنہ کا اظہار و اقرار ہو، تو بھی اس کا عمل درآمد چند خواص تک محدود ہوگا۔ عوام میں اس کا اہتمام نہاد و سب میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس رسم کو قطعی بند کر دیا جائے اور جس کے ذمہ جس کسی کا اب تک یا فقی ہے اپنی حیات میں بلا انتظار کسی تقریب کے ادا کر دیا جائے۔ ورنہ نہ فرصت بے خبر وہ ہر چہ باقی زود باش نہ نیوتہ میں

(بقیہ حاشیہ بر ص ۱۵۵)

کا دعویٰ ہوگا۔ آخر اس کا علاج کیا سوچا ہے؟ اس نبوت سے تو تا نبوت اچھا۔ یہ مفاسد ہیں اس نبوت خبیث میں۔ مگر چونکہ لوگوں کو شریعت کا علم نہیں، اس واسطے ان خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

میراث کی خرابیاں | غرض یہ کہ میراث میں بڑی خرابی ہو رہی ہے بیوہ کو اگر سارا مال مل جاتا ہے تو وہ اس کو اس طرح لٹاتی ہے اور یتیم بچوں کا بھی حصہ نہیں چھوڑتی ہے۔ اور اگر کسی اور کا قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ مالک بن بیٹھتا ہے۔ دوسرے وارثوں کو نہیں دیتا۔ رہیں گھر کے برتنے کی چیزیں سو وہ تو مشترک ہی رہتی ہیں۔ کبھی تقسیم ہی

دقیقہ حاشیہ از ص ۱۵۴) نقد روپیہ کے علاوہ پارچہ کا بھی لین دین ہے اور یہ اس نقد سے بدتر ہے۔ بیشتر یہ باعث بے لطفی سبائین ہوتا ہے کہ ہماری بری کا کیسا اچھا تھا اور ہمیں کیسا ذلیل دیا۔ اس حجت کی بنا پر بعض گھروں میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس بری آنے والی کو بدستور رکھ چھوڑتے ہیں اور جب دینے والے کی کوئی تقریب ہوتی ہے خواہ کسی مدت میں ہو وہی بری پوشیدہ رکھی ہوتی دیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بری جائیں میں سے کسی کے مصروف کی نہ ہوتی اور رکھے رکھے بیکار ہو گئی۔ کیسا افسوس اور نازیبا عمل ہے۔ اس کو بھی بالکل مسدود کیا جاوے اور جس کسی کی چاہتی ہو فوراً اسے دی جاوے۔ فقط ۱۲۔ جامع۔

نہیں کی جاتیں۔ یہ گڑبڑ ہو رہی ہے میراث میں۔

میں ان سے بچنے کی اُسان صورت یہ ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو جتنا مال اور اسباب ہو سب تقسیم کر لو اور دیر بالکل نہ کرو۔ دیر کرنے میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ کے چند واقعات سناتا ہوں۔

میرے والد صاحب کے پاس ایک قلمدان تھا۔ بعد اُن کے انتقال کے میں نے لے لیا۔ کیونکہ سارے ورثا بالغ تھے اور میرے لینے سے سب خوش تھے۔ مگر پھر مجھے کھٹکا ہوا کہ میرے فعل سے دوسروں کو سند ہوگی جس میں نے قیمت کر کے ورثا کو تقسیم کی اور میں نے کہہ دیا کہ چاہے قلمدان لے لو چاہے پیسے لے لو اور وجہ یہ تھی کہ مجھے اُس کو مفت لینے ہوئے غیرت آئی کہ کیوں ورثاء کی منت لوں کہ اُن سے معاف کراؤں۔

ہر کہ نان از عمل خویش خورد منتِ حاکم طائی نہ بُرد
دوسرے مجھے سبق سکھانا تھا کہ یوں کیا کرتے ہیں۔

میرے والد کے اسباب میں چکن کے دو چوغے تھے جو لکھنؤ سے لائے تھے۔ ایک میرے لئے اور ایک بھائی کے لئے۔ مگر دینے نہ پائے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ اگر میں لے لیتا تو الحمد للہ! کوئی اُن کا مطالبہ کرنے والا نہ تھا اور اُن کے کس کام کے تھے۔ خوشی سے سب مجھ کو دے دیتے مگر میں نے کہا کہ ان میں بھی میراث جاری ہوگی۔ یہ میں نے اس وجہ سے کہا کہ اس سے اوروں کو سبق ملے گا۔ برتن وغیرہ سب کی تقسیم شرع کے موافق کی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں تمام ترکہ تقسیم ہو گیا اور ذرا نزاع نہیں ہوا۔ اس لئے میری رائے

ہے کہ ترکہ مرتے ہی تقسیم ہو جاوے۔ بعد میں بڑے قسطے پھیلتے ہیں۔ اب نسیم برسوں کے بعد ہوتی ہے۔ بڑی خرابیاں پڑتی ہیں۔ بس خدا سے ڈرنا چاہئے۔
 ران معاملات کو درست کرنا چاہئے۔

مد و خرچ کے معاملات | خلاصہ یہ کہ لوگوں نے آمد مال کے ابواب میں سخت بے احتیاطیاں کر رکھی ہیں۔ یہ

مجھے ہیں کہ بس شریعت کا تعلق صرف نماز روزہ سے ہے۔ حالانکہ شریعت معاملات اور اموالوں سے بھی پورا تعلق ہے۔ قنات کے روز ایک لکھ کے عوض میں سات سو مقبول نمازیں لے جاؤں گے۔ پھر حضرت اگر ایسا یا تو تیل ایسے ہمارے پاس کیا پیچھے گا۔ خدا کے لئے معاملات درست کرو جائز آمدنی کو چھوڑو۔ رشوت بھی حقوق عباد سے ہے۔ سود بھی حق عباد سے ہے۔ سب سے احتیاط رکھو اور حقوق الہی کا بھی خیال رکھو۔

رشوت کے بارہ میں یہ کہنا کہ اُس نے تو خوشی سے دیا، یہ محض غلط ہے۔ اپنا مال خوشی سے نہیں دیتا۔ اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھئے کہ اگر آپ کو بھی حاق پڑے تو کیا آپ خوشی سے دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ اگر معلوم ہو جائے کام دے بیسے ہی ہو جائے گا تو کبھی نہ دیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ تحصیل مال کے متعلق تھا جس کو میں نے تحصیل سے عرض کر دیا۔ اب دوسری شق مال کے خرچ کرنے کی باقی رہ گئی

لے فائدہ ایک دانگ تین پیسے کا ہوتا ہے۔

کہ اس میں بھی لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں۔ اور مال میں وہی تصرف ہیں ایک
اس کا حاصل کرنا دوسرے اس کا صرف کرنا۔ ایک جزو کا تو بیان ہو چکا۔ اب
دوسرے جزو کو بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ خرچ میں بے احتیاطی و تقسیم کی ہونا
ہے۔ ایک تو یہ کہ کھلے معاصی میں مال خرچ کیا جائے۔ دوسری صورت
یہ ہے کہ کھلی معصیت میں تو مال خرچ نہیں کیا مگر خرچ حد سے زیادہ کیا۔
شہوات میں منہمک ہو گئے۔ تنعم اور تفاخر میں اڑانا شروع کر دیا۔
خوب سمجھ لو کہ تنعم اور تفاخر کا انجام ذلت ہے۔ کیونکہ اموال غیر قنای
تو ہیں نہیں کہ کتنا ہی خرچ کرو اور وہ کم نہ ہوں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ مکان تک
بکنے کی نوبت آ جاتی ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کا ستواؤں بھرا کرتے تھے اور لوگ
اُن کو نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے کہا، یہ نواب کیسے ہیں معلوم ہوا
کہ واقعی نواب تھے۔ اپنے آپ کو تباہ کر کے اس اوقات پر آ گئے ہیں
نے کہا، شاہباش! یہ انجام ہے مسلمانوں کا۔ حدیث امراء اور رؤسا فضول خرچوں
کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں۔ جائیدادیں ہندوؤں کے قبضہ میں جا رہی ہیں۔
کانپور میں ایک رئیس کا انتقال ہوا۔ ساری جائیداد اُن کے بیٹے کے
ہاتھ آئی۔ اُس نے اڑانا شروع کی۔ اُس کے والد کے ایک دوست نصیر
کرنے کے لئے آئے اور اس کو بھٹا کر بہت دیر تک سمجھایا۔ وہ چپکے
گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہوئے
کہ اُس پر میری نصیحت کارگر ہوئی۔ جب یہ سمجھا چکے تو اُس نے کہا کہ میرا

آپ کہہ چکے یا ابھی کچھ اور کہنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بس جو مجھے کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ وہ اٹھا اور طاق میں سے ایک لنگوٹی اٹھا لایا اور کہا کہ سنئے فضول خرچی کا زیادہ سے زیادہ انجام یہ ہے۔ میں نے جس روز سے فضول خرچی شروع کی اُسی روز سے میں اس کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں اور یہ بنا کر رکھ چھوڑی ہے وہ بیچارے اس کا منہ دیکھتے رہ گئے کہ کم بخت نے بیکار ہی میرا دماغ خالی کرایا۔

غرض یہ کہ بعض فضول خرچ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ لنگوٹی سے اُگے تو اور کچھ نہیں۔ لنگوٹی باندھ لیں گے۔ سو ایسے باہمت لوگ بھی ہیں۔

مسلما نوں کی تباہی کا راز | میں یہ سچ کہتا ہوں کہ مسلمان دوسری قوم کے ہاتھ سے کبھی تباہ نہیں ہوتے جب

تباہ ہوتے ہیں اپنے ہاتھ سے ہوتے ہیں۔ اسلام ایک قلعہ ہے۔ آہنی دیوار ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بسایا ہے۔ اس دیوار کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اب اس کا کیا علاج کہ کوئی خود ہی دشمن کے لئے پھاٹک کھول دے۔ اگر یہ طریقہ سے رہیں تو کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو حزب اللہ ہیں جن کے بارہ میں ہے فان حزب اللہ هم الغالبون۔ یہ تو غالب ہی رہیں گے مگر خود ہی اپنا ناس کر لیں تو اور بات ہے۔ مسلمانوں پر جب تباہی آئی ہے اپنے ہاتھوں آئی ہے۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں نہیں آئی۔ چنانچہ رؤساء کی عموماً یہ حالت ہے کہ چانڈا اور گانچہ اور عیاشی میں اپنی جائیدادوں کو ختم کر دیتے ہیں اور پھر فقیر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک نواب تھے۔ کسی ملک کے نواب نہیں تھے بلکہ
فضول خرچی سے نواب مشہور تھے۔ یہ حالت تھی فضول خرچی کی کہ نوچندی کا
میلہ ہے اور مصاحبوں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ ہمارے پاس کچھ ہوتا
تو ہم بھی جانتے۔ بس یہ سن کر سو سو روپیہ سب کو دے دیا۔ اور یہ کیفیت
تھی کہ جلیبیاں منگالی ہیں۔ مصاحبین میں سے کسی نے کہہ دیا کہ تیل کی ہیں بس
بیلوں کو ڈلوادیں۔ وہ جلیبیاں بیل کھا رہے ہیں۔ اور عنداً قسم کی فضولیات
اُن کے یہاں رہتی تھیں۔

انجام یہ ہوا کہ مجلس تلاش ہو گئے۔ ایک حالت تو وہ تھی پھر دوسری
حالت فاقہ کی ہوئی۔ اُس میں یہ کیفیت تھی کہ میرے پاس، تمہارے پاس
پہنچتے ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ آٹھ آنے پیسے دے دیجئے۔ بہت
ضرورت ہے۔ جو لوگ پردیس سے آتے اُن کے پاس پہنچ جاتے میرے
والد کے پاس بھی اکثر آئے۔ میں اُس زمانہ میں پڑھا کرتا تھا۔ میں اُن کی یہ
حالت دیکھتا۔ مگر لوگ کہاں تک دیں۔ اُنہوں نے تو پیشہ ہی یہ کر لیا تھا
اُنہوں کا کہہ دینے۔

جس وقت اُن کے پاس جائداد تھی اُس وقت اگر کوئی اُن کو نصیحت
کرتا کہ اس طرح فضول خرچیاں مت کرو۔ جائداد کو بیچ بیچ کر مدت اڑائے
ڈالو۔ دیکھو تمہارے باپ نے کس طرح یہ جائداد خریدی تھی تو آپ فرماتے
ہمارے باپ ہر وقت تھے کہ چاندی دے کر مٹی لیتے تھے یعنی روپیہ
دے کر زمین خریدتے تھے، ہم مٹی دے رہے ہیں اور چاندی خرید رہے ہیں۔

ہیں یعنی زمین بیچ رہے ہیں اور روپیہ لے رہے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی حالت سے یہ نہ سمجھا کہ مٹی تو چاندی کی بھی ماں ہے۔ جس کے پاس زمین ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔

حضرت علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائداد ہو اور اس کو کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے کیونکہ روپیہ میں برکت نہیں ہوتی (یعنی وہ رہنے والی چیز نہیں) اور واقعی ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں سو اس حدیث میں تو جائداد کی حفاظت کی رغبت دلائی جا رہی ہے اور ایک اور حدیث ہے اس میں جائداد خریدنے سے حضرت عائشہ کو مانعت فرمائی ہے۔ وہ پیغمبر ایک جگہ رغبت دلا رہے ہیں جائداد رکھنے کی اور وہی حضرت عائشہ سے فرما رہے ہیں کہ اسے عائشہ جائداد امت خریدنا۔ تو مطلب یہ ہے کہ نہ ہو تو لو امت اور ہو تو دومت۔ بجز نبی کے کوئی پیشوا ایسا ہے جس کی ایسی تعلیم ہو۔ بس دوسرے پیشوا دو قسم کے ہیں یا تو دنیا کو چھڑائیں گے یا اس میں مبتلا کر دیں گے اور یہاں یہ کیفیت ہے۔

یہ کتب جام شریعت برکت سندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باطن

اور خاص اس تعلیم میں ایک راز ہے وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو ذلت سے بچاتے ہیں اور یہ امر شاہد ہے کہ جس کے پاس جائداد ہو اس کی عزت تو جائداد سے ہوتی ہے۔ وہ اگر جائداد بیچ دے گا تو اس کی وہ عزت ہرگز نہ رہے گی۔ اس لئے اس کو رکھنے کے

واسطے فرمایا۔ یہاں تک کہ اگر کسی مصلحت سے فروخت کرے تو پھر دوسری فوراً لے لے اور جس کے پاس جائیداد نہ ہو تو اس کی جو عزت ہوگی وہ ویسے ہی ہوگی۔ پھر جائیداد خرید کر کے کیوں جھگڑے میں پڑے۔ یہ خوبی ہے اس قانون میں۔ کوئی قانون ہے شریعت کے سوا جسے جو عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے موافق ہو۔

خلاصہ یہ کہ جائیداد ایسی چیز ہے کہ حضور اس کے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ دیکھا آپ نے زمین کتنی قدر کی چیز ہے۔ اس سے عزت اور جاہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور اس کی برکت دیکھئے کہ جس کے پاس یہ ہے اس کے پاس سب کچھ ہے اور خوبی یہ کہ آمدنی کھاتے رہو اور ویسی کی ویسی بنی رہتی ہے۔ اس میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔

تو ایسی چیز کے لئے ان خرچیلے لوگ اب نے کہا کہ مٹی دے کر ہم جائیداد خریدتے ہیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اب میں اس کی تاثیر میں ایک حدیث کی شرح کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ زمین کیسی چیز ہے۔

وہ حدیث یہ ہے کہ حضور نے فرمایا ہے کہ زمین

زمین کی حقیقت

میں سب سے پہلی غذا زمین کی روٹی ہوگی۔

تعالیٰ زمین کی روٹی بنا کر جنت والوں کو کھلاویں گے۔ ظاہراً اس حدیث پر کوئی ہنسے گا کہ اچھے جنت میں گئے کہ ڈھیلے اور پتھر کھانے کو ملے اس سے تو دنیا ہی میں اچھے تھے۔ وہاں تو روٹی کھاتے تھے اور یہاں ڈھیلے

پتھر نصیب ہوئے۔ کسی کے حصہ میں کوہ منصور کا پتھر اور کسی کے حصہ میں کوہ شملہ کا۔ اچھے جنت میں آئے کہ ایسی چیزیں کھانی پڑیں۔ اس حدیث کی شرح بجز اہل ابرار اور اہل اللہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی شرح سن کر آپ کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہوگی کہ حق تعالیٰ نے ان کو کیسا فہم دیا ہے۔ حقیقت میں ظل اللہ فی الارض کا لقب پورا ان ہی حضرات پر صادق ہے سو وہ حضرات یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں اچھی سے اچھی کھا رہے ہیں اور اچھے سے اچھے کپڑے پہن رہے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے۔ زمین ہی سے تو نکلے ہیں۔ اگر اونی کپڑے ہیں تو اونی ہوتی ہے حیوانات سے اور حیوانات نے زمین ہی کے تو اجزا کھائے ہیں جن سے وہ اونی پیدا ہوئی ہے۔ عرض جس چیز کو بھی لیجئے گا اجزائے زمین ہی اس کی حقیقت نکلے گی۔ زمین میں پانچ سمیر گیہوں ڈالے تھے اور پیدا ہوئے پانچ من۔ تو وہ پانچ سمیر سے زیادہ جو پیدا ہوئے وہ زمین ہی کے تو اجزا ہیں۔ انہی کی تو صورت بدل گئی ہے۔ یا آم کا درخت نکلا اور اس میں ہزاروں آم پیدا ہوئے یا غلہ پیدا ہوا یا کسی قسم کا پھل اترا سب زمین ہی کے تو اجزا ہیں، عناصر سے مرکب ہو کر جس میں جزو غالب ارضی ہے، اس شکل سے نمودار ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر سب چیز موجود ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہو گیا کہ زمین میں بس ڈھیلے اور پتھر ہی ہیں۔ زمین میں انار بھی ہیں، آم بھی ہیں، انگور بھی ہیں، کھٹائی بھی مسٹائی بھی۔ سب چیزیں زمین کے اندر موجود ہیں۔ ہر طرح کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی مادہ ہے جو ان رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے

ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ زمین کے اندر سب کچھ ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو کر جاتا ہے تو اس کو بے چھنا آٹا تک نہیں کھلاتے۔ اور لوگ جہاں گئے خدا کے مہمان ہو کر۔ تو اللہ تعالیٰ پر یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کو بے چھانے کھلا دینگے پس وہ اپنی قدرت کی مشین سے شملہ اور منصوری کے پتھر سے جو فضلہ ہے وہ الگ کر دیں گے اور ان میں جو اجزا قابل کھانے کے ہیں وہ رہنے دینگے۔

اب اس تقریر سے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا دیں کہتا ہوں کہ زمین کی روٹی کے برابر کوئی چیز مزیدار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ دنیا میں جتنے بھی منزے ہیں، سب زمین ہی کا طفیل ہے۔ خوشبو میں جس قدر بھی ہیں زمین ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے جو روٹی تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اٹھ میں ہزاروں قسم کے تو منزے اور ہزاروں قسم کی خوشبو میں ہوں گی۔ لہذا اس کی روٹی سے کون سی چیز مزہ دار ہو سکتی ہے۔ جامع

اب ایک بات اور رہ گئی۔ وہ یہ ہے کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی کہ اس زمین کی روٹی بنائی جائے۔ یہ جنت کی نعمتوں کے برابر تو ہو گی نہیں پھر جنت ہی کی چیز کھلا دیتے۔

اس کا راز بھی حضرات اہل اللہ ہی نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ میں سے بعض ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دنیا کی لذت کبھی تک نہیں یا تو قصداً یا سیر نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ موازنہ نہ کر سکتے تھے جنت اور دنیا کی نعمت میں۔ اور حجب کہ دونوں کا تفاوت معلوم نہ ہوتا تو جنت کی نعمتوں کی قدر بھی

پوری نہ ہوتی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے پہلے دنیا کی چیز کو کھلا دیا کہ سب سے زیادہ لطیف غذا دنیا کی یہ ہے اب ہمارے یہاں کی غذا کھاؤ۔
اگر کوئی کہے کہ پھر ایسے ہی لوگوں کو کھلا دیا ہوتا جن کو دنیا کی لذات نہیں ملیں۔ سب کو کیوں کھلایا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کریم کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ بعض کو کھلائیں اور بعض کو محروم رکھیں۔ اس لئے ہم سوائیوں کو بھی اُن کے ساتھ شامل کر دیا یہ راز ہے اس حدیث کا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ زمین کیا چیز ہے کھانے اس میں، پیوے اس میں، کپڑے اس میں، سب چیزیں زمین ہی میں ہیں۔ اس لئے یہ بڑی قدر کی چیز ہے۔

اسراف و تبذیر | اگر کسی مسلمان کی زمین کسی کافر کے پاس دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دکھتا ہے۔ کسی کے اچھے مکان کو دیکھتا ہوں تو پوچھتا ہوں کہ کس کا ہے۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا ہے تو خوش ہوتا ہوں۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا نہیں تو قلق ہوتا ہے۔
میں ایک ضرورت سے نظام آباد کیا تھا۔ وہاں سے حیدر آباد قریب تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو بہت ثروت ہے۔ غیر قوموں سے بھی ثروت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں وہاں سے حیدر آباد بھی گیا تاکہ مسلمانوں کو عزت کی حالت میں دیکھوں۔

میں گو مسلمانوں کے لئے فی نفسہ مالدار ہونا پسند نہیں کرتا مگر اور مل کے مقابلہ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ احتیاط کریں۔ اسی لئے جس کو بھی

مال اڑاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کو کیا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو حلاوتِ معصیت ہونے کے دنیا کی مصلحت سے بھی اسراف کو پسند نہیں کرتا۔ دنیا کے مصالح بھی تو اسی میں ہیں کہ اس کو بے جا صرف نہ کیا جائے۔

میں سفیان ثوریؒ کا قول عرض کرتا ہوں جو انہوں نے مال کے بارہ میں فرمایا ہے۔ اود یہ بزرگ وہ ہیں جو دنیا اور دنیا داروں سے انتہا و رہبر کی نفرت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ہارون رشید تخت پر بیٹھے تو ان کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا جس میں علماء اور فقراء کو بہت کچھ ہدایا دیئے گئے مگر آپ ملنے کو بھی نہیں گئے۔ حالانکہ آپ کی ہارون الرشید کے ساتھ بچپن کی دوستی تھی۔ دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ اگر ہم سوال ہوتے تو یوں کہتے کہ اس میں ضرر کیا ہے۔ ہارون رشید ایسے نہیں ہیں کہ ان سے ملنے نہ جائیں، دینار یا دشاہ ہیں۔ مگر وہ جا کہ بھی نہ پھرے۔

ہارون رشید جب تخت نشینی کے قصوں سے فارغ ہوئے تو سفیان ثوریؒ کی خدمت میں بڑے ادب سے خط لکھا کہ بھائی سفیان کو یاد ہو گا جو مجھ میں اور تم میں علاقہ تھا۔ تم میرے بھائی ہو۔ میری تخت نشینی سے تمہارا جی خوش ہونا چاہئے تھا مگر تم ملنے بھی نہیں آئے۔ تم آئے تو مجھے خدمت کرنے کا بھی موقع ملا۔ عرض انہوں نے بڑے ادب سے خط لکھا۔ مگر جس وقت سفیان ثوریؒ کے پاس خط گیا ہے تو انہوں نے اس کو ماتھ بھی نہیں لگایا بلکہ اس کو ایک لکڑی سے ٹکھولا اور اسی کی پشت پر جواب لکھوا دیا۔ جس کے شروع میں

یہ مضمون تھا کہ ظالم مارون رشید کو واضح ہو جس نے مسلمانوں کے حق پر قبضہ کیا۔۔۔۔۔ جس وقت قاصد نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ بادشاہ کے خط کی ان کے یہاں یہ قدر ہے تو اُس پر بے حد اثر ہوا اور وہ دربار میں پہنچا اور خط مارون رشید کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ میرا استعفاء منظور ہو۔ مارون رشید اُس خط کو دیکھ کر رو پڑے اور کہا کہ افسوس پیام لے جانے والا تو کامیاب ہو گیا اور پیام بھیجنے والا محروم رہ گیا۔

سو جن کو اتنی بڑی نفرت تھی دنیا اور اہل دنیا سے، وہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس پیسہ ہو تو اُس سے چاہتے کہ اُس کی قدر کرے اڑائے نہیں۔ یہ حضرات مرتبی تھے۔ حدود کے سمجھنے والے تھے۔ آپ فرماتے ہیں الحلال لا یقتل السوف یعنی مال حلال میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ اُس کو فضول خرچ کیا جاوے۔ اور آپ اُس کی مصلحت بھی بیان کرتے ہیں۔ لولا ہذہ الدراہم لتمتلد بناھولاء الامراء۔ یعنی اگر ذرا ہم نہ ہوتے، تو یہ حکام ہم کو دشمال اور پا مال کر دیتے۔ واقعی جس کے پاس مال ہوتا ہے اُس پر حکام درست اندازی نہیں کر سکتے۔ مال والا آن بان کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کی وہ عزت ہوتی ہے جو بے پیسے والے کی نہیں ہو سکتی۔ اُس کو سر نیچا کرنا نہیں پڑتا۔ بھائی اسی واسطے مال بڑی قدر کی چیز ہے۔ سو آپ نے یہ اُس کی حکمت بیان فرمائی۔

اب آپ کو معلوم ہوا کہ مال کیسی چیز ہے۔ کیا یہ نعمت نہیں خدا تعالیٰ کی کہ جیسے غریب سقہ بہشتی وغیرہ پر امرار و دست اندازی کر سکتے ہیں، مال

والے پر نہیں کر سکتے۔ متول ہی تو اس کا سبب ہے۔ پس ایسی چیز کو برباد کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں۔

اے بسا امساک کنز انفاق بہ مال حق را جز بامر حق مدہ
خوب سمجھ لو کہ یہ مال تمہارا نہیں ہے خدا تعالیٰ کا ہے۔ پس اُن کا مال جب دو اُن کی اجازت سے دو جب تک کہ اُن کی اجازت نہ ہو ہرگز نہ دو۔
نہ کسی مصاحب کو نہ اور کسی کو۔ اگر فضول خرچ کرنے سے تباہی آگئی تو کیا اس وقت کوئی تمہارا ساتھ دے گا۔ جو آج حضور حضور کرتے ہیں، وہی اُس وقت گالیاں دیں گے۔ پس اس کو بہت حفاظت سے رکھنا چاہئے۔ ماں جو واقعی موقع ہو خرچ کرنے کا وہاں خرچ بھی کرنا چاہئے۔

حضرت حاجی صاحب کے پاس کہیں سے چھ ہزار روپیہ آیا تھا آپ کو ایک شریف آدمی کے متعلق معلوم تھا کہ اُن کو حاجت ہے پس آپ نے اُن کو بلا کر چیکے سے تمام روپیہ حوالے کر دیا۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ کا ایک پونین ایک جگہ سے آیا۔ ایک نواب آپ کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ نے اُن کو دے دیا اور فرمایا کہ یہ پونین میرے کام کا تو ہے نہیں کیونکہ پونین ایسا قیمتی ہو تو باقی لباس بھی ویسا ہی ہونا چاہئے اور آپ کے کام آجائے گا۔ کیونکہ آپ کا سارا لباس ایسا ہی ہوتا ہے۔

مولانا اس طرح نہ رہتے تھے کہ کسی نواب یا امیر سے گردن بھی کرنی پڑے بلکہ ایسا بڑا وکرستے تھے کہ اوروں ہی کو گردن بھی کرنی پڑتی تھی اور جب

کبھی آپ عمدہ قسم کا لباس پہنتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی والی ملک اور نواب ہیں۔ بے محل ہزاروں روپیہ بھی نہ لیتے تھے اور ویسے روپیہ دو روپیہ بھی قبول فرما لیتے۔

ایک بادشاہ نے ایک دفعہ شاید دس ہزار روپے بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ ضرورت کے لائق میرے پاس روپیہ بہت کچھ موجود ہے۔ میں اس قدر روپیہ لے کر کیا کروں گا۔ سو امیروں کے ساتھ یہ پتاؤ تھا اور غریبوں سے ایک دو روپیہ بھی لے لیتے تھے۔ ہم خود تو ایسے نہیں ہیں مگر الحمد للہ ایسوں کو پسند تو کرتے ہیں۔

میں ایک اپنا قصہ بیان کرتا ہوں۔ ایک رئیس نے میرے پاس دو سو روپے درسمہ کے لئے بھیجے اور لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے یہاں بلانے کی تحریک کروں۔ اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو میں لے لیتا۔ میں نے لکھ دیا کہ روپوں کے ساتھ بلانے کی درخواست کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روپے بھیجنے سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ میں اُن سے متاثر ہو کر آپ کی درخواست کو منظور کر لوں۔ اس لئے میں نے وہ روپے نہیں لئے۔ ڈاک خانہ میں جمع کرادیئے ہیں۔ اگر آپ کے جواب سے یہ شبہ رفع ہو گیا تو لے لوں گا ورنہ واپس کر دوں گا۔ آخر اُن کا خط آیا کہ مجھ سے بے تمیزی ہوئی۔ اب میں آپ سے

لے یہ حضرت کی تواضع ہے ورنہ حضرت اس امر میں تمام مشائخ زمانہ سے بڑے ہوئے ہیں۔ کاتب

یہ درخواست نہیں کرتا۔

سو میرا بلو جی چاہتا ہے کہ کسی کا احسان رکھ کر نہ لیا جاوے ہمارے
بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ اپنی کسی بات سے دین کی عزت میں ذرہ برابر
فقر نہ آوے۔ جو بات کی جاتی ہے اس میں نیت یہ ہوتی ہے کہ دین کی
عزت ہر طرح محفوظ رہے۔

ایک قابل عمل بات

ایک بات یہ بھی قابل عمل ہے کہ اگر مسلمانوں
کے ساتھ احسان کرنا ہو تو اس کی یہ صورت

نہیں کہ دسترخوان بڑا وسیع ہو۔ آج بریانی پک رہی ہے۔ آج پلاؤ اور قورمہ تیار
ہو رہے ہیں۔ ذرا سے کھانے میں ایک بڑی رقم لگ گئی۔ اس سے تو چار
غریب مسلمانوں کا بھلا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ کیا کہ بے حاجت قورمہ بریانی
پکائے جا رہے ہیں۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو بس روپیہ
نقد دے دیا۔ یہ نہیں کہ جوڑے عمدہ عمدہ دو۔

ایک ڈپٹی صاحب تھے۔ تین سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی مگر وہ ان کو
کافی نہ ہوتی تھی۔ ان کے یہاں یہ کیفیت تھی کہ کوئی عزیز دو مہینے سے
پڑا ہے۔ پھر تنخواہ کس طرح سے کفایت کرتی۔ مجھے اس کی اطلاع ہوئی۔
میں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ کیا بکھیرا کر رکھا ہے۔ ان سب کو ترک کرو
اگر ایسا ہی عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہے تو سب کی تنخواہ کرو۔ ان
کے بعض عزیز چو لہے میں شامل تھے۔ میں نے کہا سب کے چو لہے لگ کر
سوائے میاں بی بی کے۔ اور میں نے یہ کہہ دیا کہ دیکھو میرا نام مرث ظاہر کرنا

کہ یہ اُن کی رائے ہے۔ مگر اس پر عزیزوں نے اُن کا بہت پیچھا کیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے میرا نام لے دیا کہ یہ میں نے اُن کی رائے سے کیا ہے۔ تب کہیں وہ لوگ چُپ ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے اعزہ کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے تو نقد سے کھانے وغیرہ کا قصہ نہ پھیلاتے۔ اس میں بڑی خوابیاں پیش آتی ہیں۔

ایک دوست نے مجھے لکھا، تیس روپے میری تنخواہ ہے اور وہاں بکثرت آتے ہیں۔ تنخواہ میں خرچ پورا نہیں ہوتا۔ میں بہت پریشان ہوں میں نے لکھا کہ عرف کو تو طاق میں رکھو جو تمہارا کھانا ہے وہ سب کے سامنے رکھ دیا کہ وہ اور کہہ دیا کہ بس یہی کھانا ہے سب مل کے کھا لو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بس سب نے اُٹا چھوڑ دیا۔ اور میں نے لکھا کہ اہل اللہ کا مذہب رکھو۔ ورنہ لوگوں کا مٹ رکھو۔ اُن کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

نہ یہ بارندہ درختاں کہ ثمر بارند اے خوشامرو کہ از بند عم آزاد آمد

اہل اللہ بالکل آزاد ہیں۔ رسم و رواج کے ذرا متقید نہیں۔ اُن کا بڑا اچھا مشرب ہے۔ ہر ادا اُن کی محبوب ہے۔ بس میں نے لکھ دیا کہ اپنا کھانا سب کے سامنے رکھ دیا، پیٹ بھرے چاہیے نہ بھرے۔ آدمی ارادہ کر لے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور اس کے بعد لکھا کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے بڑی اچھی تدبیر بتلائی۔ میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

ہم تو یہی تعلیم کریں گے کہ بلا ضرورت مفروض مت ہو۔ گو رسم و رواج

کے خلاف کرنا پڑے۔ مقروض ہوتے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے۔ اہل اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس میں بڑی راحت ہے۔ ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے۔

امرار کو ایک بات یہ چاہئے جس سے المراف سے نجات ہو اور انتظام درست ہو کہ سب سے اول اپنے اسباب کا انتخاب کریں کہ کون سا ضروری ہے اور کون سا فضول ہے۔ امرار میں یہ آفت ہے کہ جو چیز پسند آتی خرید لی۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کی حاجت بھی ہے یا نہیں؟ ہر چیز کے خریدار ہو جاتے ہیں۔ جب کسی دکان پر جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور خریدتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ عار کی بات ہے کہ کوئی یوں کہے کہ دکان پر آئے اور لیا کچھ بھی نہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کہ بیکار رکھی رہتی ہیں۔ عمر بھر بھی کسی کام میں نہیں آتیں کسی نے خوب کہا ہے۔

حرم قانع نیست صاحب زر نہ اسباب معاش

انچہ مادر کار و ارم اکثرے دکان نیست

پس سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو حلتی چیزیں کام میں آتی ہوں کہ وہ اور حلتی کام میں نہ آئیں خارج کردو یا مساکین کو دے دو۔ نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی میں دے دو۔

میں ایک اور مضید ترکیب بتلاتا ہوں فضول خریدی نہ ہونے کی۔ وہ یہ کہ گھر کا معائنہ کیا کرو۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں کسی کو دیکھ لگ رہی ہے۔ پس ایسی چیزوں کو اپنی ملک سے الگ کر دو۔

تاکہ گھر میں رونتی ہو۔ ایک دفعہ ایسا کر گزرو گے تو آئندہ ایسی چیزیں کبھی نہ خریدو گے۔

ایک بات یہ ہے کہ روزمرہ کی معاشرت میں یہ مفروضہ کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو، بے تاثر مرت کر ڈالو۔ اور ایک بات یہ کہ کسی کے کہنے سے کوئی کام مرت کر دو۔ بس اپنی رائے پر عمل کرو میرے ایک مامول صاحب تھے۔ انہوں نے نظم گل بکاؤلی میں یہ شعر پسند کیا تھا۔

سُن لاکھ کوئی تجھے سناوے کیجو وہی جو سمجھ میں آوے

قرآن اور جمہوری نظام | قرآن شریف میں مشورہ کی تاکید ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کرنا وہی جو اپنی

سمجھ میں آجائے۔ حضرت قرآن شریف میں سب کچھ ہے۔ اس کی شان ہے تبیاننا حل شئی۔ کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو اس کے اندر نہ ہو۔ چنانچہ دیکھئے قرآن شریف میں مشورہ کا بھی امر ہے و شاورہم فی الامر کہ آپ مشورہ کیجئے اور آگے یہ بھی ہے۔ فاذا عزمتم فتوحا حل علی اللہ یعنی جب خود آپ کا قصد ہو جائے تو آپ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کر ڈالئے۔ یہ نہیں فرمایا فاذا عزموا کہ وہ جب عزم کریں یا فلا عزم الاثر بہ کہ ان میں سے اکثر عزم کریں۔ مطلب یہ ہے کہ مشورہ تو ان سے کیجئے اور عزم اپنا ہو کہ مشورہ کے بعد جس بات پر آپ کی رائے قرار پائے وہ کیجئے۔

یہاں سے سلطنت جمہوری کا قلع قمع ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں

کہ جدھر کثرت رائے ہو اس جانب کو لیا جاوے۔ سو قرآن شریف کی تعلیم اس کے خلاف ہے ورنہ یوں ہوتا فاذا عزم اکثرتھم۔ مگر یہ نہیں فرمایا بلکہ فاذا عزمتم۔ فرمایا کہ جب آپ کا عزم ہو تب کیجئے۔ خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مشورہ تو سب کا ہوا اور عزم آپ کا ہو مشورہ کے بعد جو آپ کی رائے ہو وہ کیجئے۔ دوسروں کی رائے پر عمل کرنا آپ کو لازم نہیں ہے اگرچہ وہ اہل ہی ہوں اور آج کل کے تو اہل الرائے ماشاء اللہ اہل بھی نہیں ہوتے۔

کانپور میں ایک صاحب نے ایک مہاجن سے کہا کہ فلاں بات کی ہم کمیٹی میں تحریک کریں گے تم اس کی تائید کرنا۔ اس نے کہا کہ میں کیسے تائید کروں گا۔ مجھ کو تو تائید کرنی آتی ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ جب میں کہہ چکوں تو بس تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں۔ اس کا خوب سبق یاد کر دیا۔ کمیٹی میں پہنچے تو مہاجن صاحب کو سہم چڑھا۔ اُن لفظوں کو بیچارہ دل ہی دل میں گھونٹ رہا تھا کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ غرض اُن صاحب نے تحریک کی۔ اس کے بعد مہاجن صاحب کھڑے ہوئے۔ گھبراہٹ میں وہ لفظ یاد دہانہ نہیں۔ آپ کہتے تھے، صاحبو! میں بھی تائید کرتا ہوں۔ اُن صاحب نے اُن کی طرف دیکھا، تو آپ کہتے ہیں کہ میں تردید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے بتلایا کہ یوں کہو میں تائید کرتا ہوں۔ تو آپ کہتے ہیں، صاحبو! میں تاکید کرتا ہوں۔ آج کل ایسے ایسے اہل الرائے ہوتے ہیں کمیٹیوں میں۔ ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک جاہل مجسٹریٹ ہو گیا اسے کچھ

جاتا خاک نہ تھا۔ اس لئے آپ کو فکر ہوئی کہ میں فیصلہ کس طرح کروں گا۔ آخر آپ فیصلہ دیکھنے کے لئے ایک اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں پہنچے جو کہ اُن کے برابر کا تھا۔ اتنے میں دو شخصوں نے عرضیاں پیش کیں۔ اتفاق سے اُن نے ایک کو منظور کر کے دائیں طرف دے دیا اور ایک کو نامنتظر کر کے بائیں طرف دے دیا۔ اُنہوں نے دل میں یہ کہا کہ بس فیصلہ اسی طرح ہوتا ہے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ میں بھی اسی طرح فیصلہ کر دیا کروں گا۔ پس آپ بھی فیصلہ کرنے کے لئے اجلاس پر جا بیٹھے۔ اب جو عرضیاں پیش ہوتی ہیں، تو آپ طاق نمبر میں تو کہہ دیتے ہیں منجور اور دائیں طرف رکھ دیتے ہیں۔ اور جفت میں نامنجور اور بائیں طرف رکھ دیتے ہیں۔ بس ایک کو منجور اور ایک کو نامنجور۔ عرضی پیش کرنے والوں کی کم بختی آئی۔

سو ایسی ایسی بیاقت کے لوگ پریدہ نڈنٹ ہوئے ہیں۔ غریب کے قابل ہیں ایسے لوگ۔ کمیشنوں میں ایسے ایسے ممبر ہوتے ہیں جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی۔ واقعات بتلا رہے ہیں کہ آج کل کی کثرتِ رائے تو بالکل ہی مہمل ہے اور اُن میں اتنا غلو ہوا ہے کہ اب تو امراد کے یہاں کھانا بھی مکٹی ہو کہ کھایا جاتا ہے۔ جب کھانا آتا ہے اور بھوک نہیں ہوتی تو مصاحبین سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت کھانا چاہئے یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ حضور مٹوڑا سا تو کھا لیجئے۔ بالکل نہ کھائیے گا تو ضعف ہو جائے گا۔ اور اُن کی عرض یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ کھائیں گے تو ہمیں بھی مل جائے گا۔ بس وہ دوسروں کے ہاتھ میں پھنس گئے ہیں جیسے بچے ہوتے ہیں۔

مصاحبین کی یہ حالت ہے کہ ہر بات میں بجا اور درست کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں خواہ بے جا ہی ہو۔ حتیٰ کہ اگر امیر صاحب کا وضو ٹوٹتا ہے جس کو محاورہ میں وضو ٹوٹنا کہتے ہیں۔ تو اس پر بھی مبارک باد دی جاتی ہے۔ جہاں ایسے مصاحب ہوں پھر عقل کیسے ٹھکانے رہ سکتی ہے۔ بس سب سے منظم کام یہ ہے کہ ایسے مصاحبوں کو بالکل حذف کر دو۔

شیطان کا حکم

میں صرف امراء کو ہی نہیں کہتا بلکہ یہی حالت مشائخ اور علماء کے یہاں بھی ہو رہی ہے۔ پیروں کی عقل تو مریدوں نے لے لی۔ اور علماء کی عقل شاگردوں نے۔ پیر صاحب بلا مریدوں کے کوئی کام نہیں کر سکتے اور مریدوں کی یہ حالت ہے کہ پیر صاحب کسی کی غیبت کرتے ہیں تو وہ آئنا و صدقا کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ مصاحبین نے پیروں کو خواب کر رکھا ہے۔ امراء کی ہم کیا شکایت کریں، پیروں اور علماء کے یہاں بھی ایسے ہی مصاحب ہوتے ہیں۔ بعض خدام کو اپنا مقرب بنا لیتے ہیں۔ پھر وہ مزاج میں ایسے دخیل ہو جاتے ہیں کہ جس سے جاہل راضی کرا دیں اور جس سے جاہل ناراض کرا دیں۔ بس پیر صاحب بالکل اُن کے قبضہ میں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تقریب کا نتیجہ خود ان مقربین کے لئے یہ ہوتا ہے کہ اور لوگ اُن سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ مقرب ہو کر کیا کرتے ہیں کسی کی تعریف کر دی۔ کسی کی بُرائی کر دی۔ اور پیر صاحب ایسے بھولے بھالے ہیں کہ جو انہوں نے کہہ دیا اُنسی کو مان لیا۔

خوب سمجھ لو کہ بزرگوں میں زیادہ کاٹل وہ ہے جس کی حالت نبیؐ کے

زیادہ مشابہ ہو۔ سوینی کوئی بھولا نہیں ہوا۔ جتنے پی ہوئے ہیں سب نہایت شیار اور بیدار مغز تھے۔ پس زیادہ کامل وہی ہوگا جو نہایت ہو شیار اور دقیق ہو بھولا ہونا کوئی کمال نہیں۔ بھولا آدمی بھی سمجھے گا کسی کے مکر کو۔ جب انسان ہی کے مکر کو نہ سمجھے گا تو شیطان کے مکر کو کیا خاک سمجھے گا۔ کیونکہ شیطان کا مکر تو انسان کے مکر سے زیادہ سخت ہے۔ یوں وظیفہ پڑھنا اور بات ہے۔ باقی تربیت جس کا نام ہے یہ بھولے شخص سے نہیں ہو سکتی۔ تربیت اور اصلاح دوسروں کی وہی کر سکتا ہے جو نہایت ہو شیار اور بیدار مغز ہو۔ لہذا بیعت بھی انتخاب کر کے ایسے ہی شخص سے کرنی چاہئے۔

بعض لوگ بھولے پن سے ہر شخص کا نذرانہ قبول کر لیتے ہیں۔ اُن کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نذرانہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ اس میں دینے والے کی کوئی غرض فاسد ہوتی ہے، اس لئے بلا تامل ہر شخص کا نذرانہ نہ لینا چاہئے۔

ایک شخص بیدار میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھ کو پچیس روپے دیئے ہیں۔ اُن میں سے دس روپے تولے لئے۔ باقی واپس کر دیئے۔ وہ تو چلے گئے اور بعض لوگ اُن کے ساتھ آئے تھے وہ رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب آپ نے دس روپے قبول کئے اور عجیب بات ہے کہ دس ہی روپے اول انہوں نے تجویز بھی کئے تھے مگر پھر کہنے لگے کہ اتنے روپے نہ میری شان کے لائق ہیں اور نہ اُن کی شان کے۔ اس لئے پندرہ اور نکالے۔ بس دس روپے تو انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اور پندرہ وضع داری سے۔ اور

خدا تعالیٰ کی قدرت کہ جتنے اُنہوں نے خلوص سے نکالے تھے اتنے ہی میرے لئے۔

اس کی ظاہری وجہ یہ ہوئی کہ میں نے اس روز دس روپیہ کی لکڑیاں خرید لی تھیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ان کو ادا کر دیجئے۔ میرے ذہن میں اس کے دینے کے وقت یہ بات آئی کہ تو نے دس روپے کے لئے دعا کی تھی اُس کا بندوبست خدا تعالیٰ نے کر دیا۔ اس سے کم لینا ناشکری ہے اس خیال سے میں نے دس لئے باقی واپس کر دیئے۔ اُس میں یہ بات بھی نکل آئی کہ دس ہی اُنہوں نے خلوص سے دیئے بھی تھے۔

عرضِ نذرانہ قبول کرنے میں بہت ہوش سے کام لینا چاہئے اس وقت جو میں نے دس روپے لئے تھے اور باقی واپس کر دیئے تھے اُس کی زیادہ وجہ تو وہ تھی جس کو میں نے بیان کیا باقی میرا مذاق بھی یہی ہے کہ زیادہ نذرانہ قبول کیا جاوے۔ چنانچہ میرا اکثر معمول ہے کہ ایک مہینہ کی آمدنی میں سے ایک روز کی پیش کرے تو خوشی سے لے لیتا ہوں اور پھر دوسری بار اگر نذرانہ دینے لگے تو اُس کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا فاصلہ ہو۔ یہ ہے میرا مذاق۔

میرے امراء پر بہت رحم آتا ہے کیونکہ اُن کے اخراجات ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ

اہل اللہ کی معاشرت

ہیں کہ اُن کی آمدنی اُس کے لئے کافی نہیں ہوتی پھر اُن پر یہ مصیبت ہے کہ دعوت بھی کریں گے تو ایسی کہ بدون قرض لئے نہ ہو سکے۔ بھلا گھر کا معمول

کھانا کس طرح کھلا دیں تا وقتیکہ رنگ برنگ کے کھانے دسترخوانوں پر نہ ہوں دعوت ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف رنگ کے کھانوں سے ساداکھانا زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مختلف رنگ کے کھانے عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔ دوسرے متعدد کھانے طبیعت کو مشوش کر دیتے ہیں۔

موجز میں صراحت لکھا ہے کہ کثرة الالوان محیر لبطبیعة یعنی کئی قسم کے کھانوں سے طبیعت کو حیرت ہوتی ہے۔ ہضم میں طبیعت حیران ہوتی ہے کہ پہلے کس میں عمل کروں۔ یہ حیرت تو کھانے کے بعد ہوتی ہے اور ایک حیرت کھانے سے قبل بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر کھانا کہتا ہے کہ اول مجھے کھاؤ۔ اس میں سوچنا پڑتا ہے اجتہاد کر کے متعین کرنا پڑتا ہے کہ کس کو پہلے کھائیں اور کسے بعد میں۔ بعض کھانوں میں طبعاً ترتیب ہوتی ہے اور ہر شخص اس سے واقف نہیں ہوتا۔ اس لئے ترتیب کے خلاف کھائے جاتے ہیں۔ جو کہ مضر ہوتا ہے پس سب سے اچھی دعوت یہ ہے کہ جو گھر میں ہوا وہ کھلا دیا۔

اہل اللہ کی معاشرت دیکھئے۔ مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کا قصہ ہے کہ آپ دہلی میں ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ اُن سے مولانا مظفر حسین صاحب کا ندھلوی نے فرمایا کہ مولانا آپ دہلی سے جب وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں کیونکہ کا ندھلہ راستہ ہی میں پڑتا ہے، انہوں نے منظور کیا مگر شرط یہ لگائی کہ میری منزل میں حرج نہ ہو۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے اس کو منظور فرمایا۔ مولانا مملوک علی صاحب جب دہلی سے تشریف لاتے

احکام المال

تو مولانا مظفر حسین صاحب سے راستہ میں ضرور ملتے اور مل کر سوار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ کا قعدہ ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب دہلی سے آرہے تھے جب کا ندھلہ پہنچے تو مولانا مظفر حسین صاحب سے ملتے کے لئے سواری ٹھہری اور سواری وہیں چھوڑ کر مولانا سے ملتے گئے۔ مولانا مظفر حسین صاحب کا ندھلوی گھر کے رئیس تھے۔ مگر آپ کی سادگی دیکھتے کہ آپ نے پوچھا کہ کھانا کھا چکے ہو یا کھاؤ گے۔ مولانا مملوک علی صاحب نے کہا کھا میں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہے وہی لے آؤں۔ مولانا مملوک علی صاحب نے فرمایا کہ جو موجود ہو وہی لے آئیے۔ پس آپ مٹی کی رکابی میں کھجڑی کی کھجوریں لے آئے اور کھا رکھا ہوا تو یہ ہے۔ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ پس انہوں نے انہی کو کھا لیا اور پانی پی کر رخصت ہو گئے۔ یہ حالت تھی ان حضرات کی کہ جو ہوا وہ سامنے رکھ دیا۔

ایک دفعہ مولانا مظفر حسین صاحب لنگوہ تشریف لے گئے۔ مولانا گنگوہی کے یہاں ہوئے۔ صبح جب رخصت ہونے لگے تو مولانا گنگوہی نے کھانے کے لئے عرض کیا۔ مولانا مظفر حسین صاحب رام پور جانے والے تھے۔ فرمایا کہ میری منزل کھوٹی ہوگی کیونکہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لا دو۔ مولانا نے ماش کی وال اور یا سی روٹی لا دی۔ آپ نے رکابی کی وال روٹی پر الٹ کر پلے ہیں باندھ لی اور رخصت ہو گئے۔ حالانکہ آپ رئیس تھے۔ جب رام پور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولوی رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ہاں واقعی بڑے نیک آدمی ہیں۔

ہیں۔ آپ فرمانے لگے کہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں اور آپ کہتے ہیں بڑے بزرگ ہیں۔ میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اگر خود نہیں سمجھتے تو پوچھ ہی لو۔ انہوں نے کہا کہ اچھا حضرت فرمائیے۔ آپ نے کہا کہ دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے دکھانے کے لئے کہا۔ پھر میرے کہنے سے جو کھانا رکھا ہوا تھا بے تکلف لا دیا میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج ان افعال کو ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صاحبزادے اگر وقت پر یا سی روٹی مل جاوے تو وہ پلاؤ اور زدہ اور قورمہ سے اچھی ہے اکثر ہمارے قصبات کے رئیسوں میں بھی سادگی ہے۔ چائے تک کے حادی نہیں۔ بعض جگہ تو اس قدر تکلف ہے کہ ایک جگہ دعوت ہوئی۔ صبح کو چائے پلائی اس میں اس قدر تکلف کیا کہ بیس روپے تک گئے۔ پھر کھانے میں اتنا بکھیرا کیا کہ عصر کے وقت کھانا ملا۔ بھلا کیا نفع ان باتوں سے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ دیان کے چھوڑنے سے دنیا کی بھی تکلیف ہوتی ہے اور عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا سے تو بڑا کھاؤ بڑا پہنو۔ میں اچھا کھاؤ اچھا پہنو مگر حد کے اندر رہو۔ حضرت اسب تو ہر

پیر چیز میں تفاخر

چیز میں تفاخر ہے۔ کپڑا تفاخر کے لئے پہنتے ہیں۔ کھانا۔ ہے تو تفاخر کے لئے مکان۔ ہے تفاخر کے واسطے۔ بعض نئے فیشن کے شیدائی ہیں۔ ان کو کپڑے بھی نوکر ہی پہنا تا ہے۔ بٹن تک اپنے ہاتھ سے نہیں لگتے۔ روزمرہ ان کے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ فیشن ہی میں گزرتا ہے۔

ایک شخص ہر وقت جوڑے ہی بدلا کرتے تھے۔ ہر وقت کے لئے ایک جوڑا انگ کر رکھا تھا۔ سواری کے وقت کا جوڑا اور دوستوں سے ملنے کا اور حتیٰ کہ پاخانہ میں جانے کا جوڑہ اور تھا۔ ایک مرتبہ میں بھائی کے پاس گیا اتفاق سے وہ بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں انہیں ہر وقت اسی مشغلہ میں لگا ہوا دیکھتا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ نیچا کرتہ اور اس کے نیچے جانتگیا پہنے ہوئے پاخانہ میں جا رہے ہیں اور گھٹنے اور رانیں سب کھلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ویسے مہذب شخص تھے۔ ایک روز مجھ سے بھی ملنے آئے اور عذر کرنے لگے کہ مجھ کو فرصت نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے آپ سے نہ مل سکا۔ میں نے کہا جی ہاں میں خود دیکھتا ہوں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس پر بہت شرمندہ ہوئے۔

آج کل یہ حالت ہے کہ لباس بھی دوسری قوم کا، کھانا بھی دوسرے ہی لوگوں کا۔ ہر بات میں دوسری قوم کی تقلید کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! آپ کے گھر میں سب کچھ ہے۔ دوسرے کے گھر سے لینے کی آپ کو مطلق ضرورت نہیں ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔

ایک سید چڑناں تڑا برفرق سر تو ہمیں جوتی لب ناں دریدر
ایک اور نیا طرز نکلا ہے جو امراء میں بہت شائع ہو گیا کہ خالی برتن سامنے رکھ دیئے اور ایک ڈونگے میں کھانا لاکہ پیچ میں رکھ دیا۔ اب وہ ایک ڈونگا ساری مجلس میں گھوم رہا ہے۔ جن کا یہ اصل میں طرز ہے ان کے یہاں خود کھانا پہنچاتے ہیں۔ یہاں یہ بے تمیزی کہ جو مانگے اُسے دے دو اور جو نہ مانگے

اُسے مت دو۔ اس میں یہ تو جیہہ گھڑی ہے کہ کھانا خراب نہیں جاتا۔ جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے لے لیتا ہے۔ جو کھا کھانا نہیں بچتا۔ حالانکہ یہ تو جیہہ بالکل لغو ہے کیونکہ اُس کا دوسرا طریق ممکن ہے کہ محفوظ محفوظ رکھا جائے اور جس کے سامنے نہ رہے اور دے دو۔ اسی طرح لباس میں تو جیہات گھڑی ہیں۔ چھری کانٹے میں یہ وہ گھڑی ہے کہ انسان کے ناخن میں زہر ہوتا ہے اس لئے ہاتھ سے نہیں کھاتے۔

یورپ کی اندھی تقلید | میں کہتا ہوں کہ تاویل میں کیوں کی جاتی ہیں سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ اہل یورپ

کا جو طرز ہے وہ پسند ہے۔ اُسی کے تقلید ہیں۔ اگر آج اہل یورپ اس طرز کو بدلیں تو یہ بھی فوراً بدل دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جو فیشن وہ اختیار کرتے ہیں اُسی کو یہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک نسبت پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی فیشن کا کوٹ وغیرہ سلوایا اور ابھی پہنا نہیں کہ فیشن بدل گیا تو وہ کوٹ بیکار ہو گیا اب دوسرے فیشن کا تیار کیا کے پہنا جائے گا۔ جوتے ہیں تو وہ چھ چھ جوتے دار بھی صاف کرانے کا فنشا اہل یورپ ہی کی تقلید ہے۔ اگر آج وہاں وار بھی رکھ لی جائے تو یہ بھی اپنے طرز کو بدل دیں۔

ایک مرتبہ یہ خبر سنی گئی تھی کہ دارھی منڈانے کے نقصانات دیکھ کر اب اہل یورپ کی یہ رائے ہو رہی ہے کہ دارھی رکھ لینا چاہئے ہیں نے ایک وعظ میں کہا کہ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ دارھی جلد رکھ لیں۔ کیونکہ لندن سے دارھی رکھنے کا فتوے آنے والا ہے۔ اگر بعد میں رکھی تو طعن ہو گا کہ

خدا رسول کے فتوے کو تو نہ مانا اور اہل یورپ کے فتوے پر عمل کیا۔ اس سے پہلے ہی رکھ لوثا کہ کسی کو طعن کی گنجائش نہ ملے۔ میں تو کہتا ہوں کہ غیر قوم کا طرز اختیار کرنے میں قطع نظر اس سے کہ کفار کے ساتھ تشبہ ہے جو حرام ہے دنیا کا بھی کتنا بڑا نقصان ہے۔ اس فیشن کی بدولت حالت یہ ہو رہی ہے کہ دوسو کی آمدنی ہو وہ خرچ کو کافی نہیں پانسو کی آمدنی ہو وہ کافی نہیں۔ اس فیشن میں بے طرح روپیہ برباد ہوتا ہے۔ کسب اسراف نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے لوگ دیکھے کہ پانسو کے ملازم ہیں۔ مگر اس فیشن کی وجہ سے مفروض ہیں۔

ایک جٹلمین صاحب تھے۔ وہ ہمیشہ بی بی کے بے طور سر رہتے کہ تم کپڑوں میں اتنا صرف کرتی ہو، زور میں اتنا صرف کرتی ہو۔ تمہارے خرچ کیوں سے آمدنی کا پتہ ہی نہیں لگتا۔ بی بی کو سنتے ہوئے مدت ہو گئی۔ کہاں تک سنے۔ بکھی کو بھی پتا ہوتا ہے۔ آخر ایک روز اس کو بھی غصہ آگیا۔ اور اس نے خوب لٹاڑا کہ تم ہمیشہ میرے پیچھے نوپڑے رہتے ہو کہ یہ معمول خرچی کرتی ہے اور یوں کرتی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ فیشن میں کتنا صرف ہوتا ہے۔ چھ جوڑے جوئے ولایتی کتنے کے ہوتے ہیں۔ کوٹ پیلوں میں کیا لگتا ہے۔ مکان کی سجاوٹ کا انگریزی ساناں کتنی قیمت میں آتا ہے۔ ایک ایک چیز اس نے ان حضرت کو گناہی۔ چونکہ جواب معقول تھا ان کو خاموش ہونا پڑا۔ جب کہیں اس بیجاری کا پیچھا چھوٹا۔ پس ان کے مقتدا تو اہل یورپ ہیں۔ انہی کی تقلید میں انہوں نے اپنے

دین کا بھی نام کیا ہے اور دنیا کا بھی۔

بعض عورتوں نے سایہ پہننا شروع کیا ہے۔ میم صاحب بنتا چاہتی ہیں۔
ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں، کان ننگے، اُن میں بالیاں تک نہیں۔ جو طرز میموں کا ہے
وہ اختیار کیا ہے۔ یہ نیا فیشن نکلا ہے عورتوں میں۔

میں کہتا ہوں کہ قطع نظر اس کے کہ تشبہ ناجائز ہے اخلاق پر اس کا بہت
پُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔ جو سبب ہو تکبر کا اور
یہی ناجائز ہوگا۔ اور اس تشبہ میں کبر کی یہاں تک خاصیت ہے کہ حضرت پلنگ
اور کرسی پر بیٹھنے تک میں تفاوت ہے۔ جو وہ ان سے مد رک ہے۔

ایک ڈاکٹر کہتے تھے کہ جب ہم حاجی صاحب کی خدمت میں رہ کر
واپس ہوئے تو اپنے دل میں ایک نور لے کر آئے تھے منظر نگہ جب آئے
تو ایک شخص فٹن لے کر آئے کہ ہمارے مرین کو چل کر دیکھ لیجئے۔ انہوں نے
فٹن میں بیٹھنے سے بہت انکار کیا مگر اس کے اصرار کرنے پر آخر بیٹھنا پڑا۔ کہتے
تھے کہ جس وقت فٹن میں قدم رکھا ہے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ نور سلب ہو گیا۔ وچہ اس
کی یہ ہے کہ ان چیزوں کو نسبت ہے دوسری قوم سے۔ اس لئے ایسا ہوا۔
یہ دوسری قوم کی وضع سمجھی جاتی ہے، اس لئے اس میں بیٹھنے سے وہ نور سلب
ہو گیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غیر قوم کی ہر چیز ناجائز ہے بلکہ وہ ناجائز ہے جس کو
مخصوصیت ہے دوسری قوم کے ساتھ۔ اور جس کو خصوصیت نہیں دوسری
قوم کے ساتھ وہ جائز ہے۔ موندھے کرسی میں اقتیازی شکل نہیں رہی۔ وہ کسی

خاص قوم کی وضع نہیں سمجھی جاتی اس لئے جائز ہے اور سایہ وغیرہ میں انتہائی شکل باقی ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دیکھ کر طبیعت کھٹک جائے کہ یہ تو فلاں قوم کا طرز ہے تو تشبہ ہے ورنہ تشبہ نہیں چنانچہ سایہ وغیرہ دیکھ کر فوراً دیکھنے والے کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ یہ تو میموں کا طرز ہے اور کرسی موڈھے میں ایسا نہیں ہے۔ اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لو۔

انگریزی طرز اخلاق | غرض یہ ہے کہ یہ طرز اخلاق کے اعتبار سے بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس کا اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو پڑا اور دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ خاص کر ملائوں کو، اُن کو تو ان لوگوں نے نیم وحشی کا خطاب دے رکھا ہے۔ حاصل یہ کہ یہ طرز اخلاقی لحاظ سے بھی اچھا نہیں مگر پھر بھی اس میں مصالح گھڑی جاتی ہیں۔

ایک شخص ریل میں تھے اور آپ کی وضع یہ تھی کہ کوٹ، تپلون پہنے ہوئے اور کتا بغل میں۔ اسی گاڑی میں بقول اُن کے ایک نیم وحشی بھی آکر سوار ہوئے مگر انہوں نے اُن کو سلام نہیں کیا تو آپ کہتے ہیں مسلمان کو کم از کم سلام تو کر لینا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو مسلمان ہی نہ سمجھا تھا، اس لئے سلام نہ کیا۔ خطلمین صاحب نے کہا کہ میرے اندر ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ انہوں نے کہا کہ تم نے ساری وضع تو کافروں کی ہی بنا رکھی ہے پھر میں تمہیں مسلمان کیسے سمجھتا۔ انہوں نے کہا کہ کیا لباس سے مسلمان

ہوتا ہے۔ اس لباس میں تو مصلحت ہے اس لئے ہم نے اس کو اختیار کیا ہے وہ یہ کہ ڈھیلے یا جامہ میں گر پڑنے کا خوف ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اس میں تو یہ مصلحت ہے اور کتا بغل کے اندر لینے میں کیا مصلحت ہے؟ خٹلمین صاحب کہنے لگے کہ اس میں بڑی مصلحت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتہ نہیں آتا۔ اس لئے ہم کتے کو ساتھ رکھتے ہیں تاکہ عزرائیل سے بچے رہیں۔ اُن صاحب نے اس کا خوب ہی جواب دیا۔ کہا کہ آخر کوئی کتے کی جان بھی تو قبض کرتا ہوگا، وہی آپ کی قبض کرے گا۔ اس پر بڑے سے جھلائے۔

میں لباس کے بارہ میں ایک فتویٰ عجیب نقل کرتا ہوں۔ حضرت **رحمہم اللہ** ابو حنیفہؒ وغیرہ کا فتویٰ نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ابو حنیفہؒ کا فتویٰ کا ہے۔ کو ماننے لگے ہیں جب کہ اللہ و رسولؐ کا فتوے نہیں مانتے بلکہ وائسرائے کا فتویٰ نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک صاحب وائسرائے سے ملنے گئے اور گئے اپنے ہی وضع میں۔ وائسرائے نے اٹھائے گفتگو کہا کہ مولوی صاحب اس لباس میں آپ شاہزادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں۔ اس لئے ایسا لباس نہیں پہن سکتے ورنہ ہم بھی اسی کو پہنتے۔ خوش نما بھی ہے اور راحت بھی اس میں ہے۔ لیجئے جناب اب تو وائسرائے کا فتوے بھی ہو گیا اللہ رسولؐ کا فتویٰ نہ مانو تو وائسرائے ہی کا مان لو۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ یہ لوگ لباس وغیرہ میں تو غیر قوم کی تقلید کرتے ہیں اور بعض باتیں جو غیر قوموں میں خوبی کی ہیں اُن سے کوسوں

دور ہیں۔ مثلاً ہمدردی قوم کی یا خروج کا ایک حد سے باہر نہ ہونا، معاملہ کا صاف ہونا۔ اس کے پاس بھی نہیں جاتے۔ بس آج فخر اس پر ہوتا ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ چار روپیہ کا ٹو کوٹ کا کپڑا ہے اور سولہ روپیہ اس کی سلامتی دی۔ ایک یورپین نے اس کو سیاہ ہے۔ خواہ تکلیف ہو اور سراسر مالی کا نقصان ہو مگر انہیں نقل سے کام۔

ایک مولوی صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس گاڑی میں ایک جٹنمیں صاحب بھی تھے اور چلے کے جاڑے کا موسم تھا۔ ایک انگریز نے برف ڈال کر سوڈے کا پانی پیا۔ اس کی ریس میں آکر آپ نے بھی پیا۔ اور کوئی گرم کپڑا آپ کے پاس تھا نہیں کیونکہ یہ بھی فیشن ہے کہ سفر میں لیٹر بچھونا ساتھ نہ لے جائیں اور وہ کپڑے بھی کچھ گرم نہ پہننے ہوئے تھے گبروں کے کپڑے پہننے ہوئے تھے جو کچھ ایسے گرم نہیں ہوتے۔ بس پیتے ہی کانپنے لگے۔ بڑی حالت ہوئی۔ مولوی صاحب کو رحم آیا اور اپنی رزائی ان کو دی اور کہا کہ حد کے اندر رہئے۔ دوسروں کی ریس نہ کیجئے۔

وہی مثل ہے کہ کو اچلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ ریس تو کہیں اہل یورپ کی اور مزاج اور قوت ویسی ہے نہیں۔ مگر کچھ بھی ہو، انہیں نقل سے کام وہ لوگ غذا میں بھی ایسی کھاتے ہیں کہ ان پر ایسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر شراب پیتے ہیں اور پھر ان میں قوت اور ان کے مزاج بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایک قصہ اور سیٹھ۔ ایک مولوی صاحب ریل میں سوار تھے۔ ایک

جنتلمین صاحب بھی اسی درجہ میں تھے۔ مولوی صاحب کے پاس مٹی کی صراحی تھی۔ اس میں پانی تھا۔ جنتلمین صاحب بولے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن رکھ چھوڑا ہے۔ مولوی صاحب نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا اس خیال سے کہ موقع پر جواب دوں گا۔ اگلے چل کر ان جنتلمین صاحب کو پیاس لگی۔ اتفاق سے اسٹیشن پر بھی پانی نہیں ملا۔ اب پیاس بڑھی۔ مولوی صاحب نے قرآن سے معلوم کر لیا کہ پیاس کا غلبہ ہے۔ چونکہ ان حضرات پر شان کرم غالب ہوتی ہے اس لئے انہیں ان پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کسی طرح یہ پانی پی لیں انہوں نے یہ تدبیر کی کہ اپنے آپ کو سوٹا بنا لیا جنتلمین صاحب اوپر تختہ پر بٹھنے اب ان کا عروج سے نزول ہوا اور مولوی صاحب کو جھک کر دیکھا کہ انکھیں کھلی ہیں یا بند ہیں۔ انہوں نے قصداً بند کر رکھی تھیں۔ جب خوب اطمینان ہو گیا کہ سو رہے ہیں تو صراحی منہ سے نکالی۔ یہ کچھ بولے نہیں اس خیال سے کہ پی لیتے دو پیاسے نہ رہیں۔ جب صراحی رکھنے لگے تو فوراً ہاتھ بیکر لیا اور کہا کہ آپ نے بھنگیوں کے برتن میں کیوں پانی پیا اور پھر خوب تھارٹا۔

میں ایک دفعہ ریل میں تھا۔ ایک جنتلمین صاحب کا ساتھ ہو گیا میرے پاس لوٹا تھا میں نے اس میں پانی لے لیا۔ یہ لوگ تو اپنے ساتھ کچھ لیتے ہی نہیں۔ یہ بھی فیشن ہے۔ جب سٹیشن قریب آیا تو آپ بولے کیا میں اس بوتلے کو لے سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ لے سکتے ہیں۔ آپ نے اسی وقت اس کو اٹھا کر اس کا پانی پھینک دیا۔ اس پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے دل میں کہا کہ پانی نہ ملے تو خوب تماشا ہو۔ اتفاق سے پانی کہیں نہیں ملا تو آپ کہتے ہیں

کہ بڑی غلطی ہوئی جو میں نے پانی گرا دیا۔

بس ان لوگوں میں رسم پرستی ہے اور کچھ نہیں۔ غیر قوم کی تقلید میں ان لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر وہ ناک کھٹانے لگیں تو یہ بھی کھٹا دیں گے۔ دارٹھی بھی غیر قوم کی تقلید میں ہی صاف کراتے ہیں حالانکہ دارٹھی ایسی چیز ہے کہ جن کی تقلید میں یہ منڈاتے ہیں خود وہ اس کو پسند کرتے ہیں۔

ایک کوچوان کو ایک انگریز چار روپیہ ماہوار صرف دارٹھی کے دیتا تھا کہ اس کو خوب بناؤ سنوارو۔ دارٹھی بہت لمبی تھی، جب ہوا میں اڑتی، تو وہ انگریز دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔

مولانا اسماعیل شہید سے ایک دہری شخص نے کہا کہ دارٹھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے کیونکہ پیدائش کے وقت نہیں ہوتی۔ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو پیدائشی ہوتی۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر یہی ہے تو دانت بھی نکلا دینے چاہئیں۔ وہ بھی تو پیدائشی نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب اس کو سن کر فرمانے لگے۔ واہ مولانا خوب دندان شکن جواب دیا۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ دارٹھی رکھنے میں کیا حکمت ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں عقلی حکمت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ و رسول کا حکم ہے۔ ہمارا مذہب تو یہ ہے۔

زبان تازہ کر دن باقرار تو بیگلختن علت از کار تو!

ایک حکمت انگریزی لباس سے منع کرنے میں یہ ہے کہ اس کو پہن کر جی لوں چاہتا ہے کہ دوسروں کو دکھائیں۔ اگر عورتیں ایسا لباس پہنیں گی تو

لازمی بات ہے کہ پردہ کم ہو جاوے گا۔ کیونکہ وہ چاہیں گی کہ دوسروں کو دکھائیں اور عورتوں کو دکھا کر ان کے حفظ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ عیب سمجھتی ہیں، اس لئے لامحالہ سرووں کو دکھانا چاہیں گی اور بے پردگی اختیار کریں گی۔ یہ ساری خرابیاں تفاخر اور فضول خرچی سے پیدا ہوئی ہیں پس تفاخر اور فضول خرچی کے چھوڑ دینے سے ساری خرابیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔

میں اسراف کا بیان کر رہا تھا کہ مسلمان سمجھ ہوئے ہیں کہ آمد و خرچ کے متعلق کوئی قانون نہیں۔ خوب سمجھ لو جیسے نماز روزہ کا قانون ہے اسی طرح اس کا بھی قانون ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی مسئلہ کو حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے کا مال آپس میں مت کھاؤ۔ اس سے حرام آمدنی کو روکتے ہیں۔

اعتماد کی ضرورت | آگے فرماتے ہیں کہ مت لے جاؤ حکومت کی طرف یعنی مقدمات مت کرو۔ آج کل اس کی بھی بڑی کثرت ہے۔ ذرا سی کوئی بات ہوتی اور مقدمہ دائر۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حاکم کسی کو دوسرے کا حق ثبوت ظاہری ہونے سے دلا بھی دے تو واقع میں وہ اس کا حق نہیں ہو جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کا حق کسی کو دلا دوں تو وہ خوب سمجھ لے کہ میں اس کو آگ کی چنگاری دلاتا ہوں۔ پس سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی حاکم کسی کا حق دوسرے کو دلا دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔ ملک ہونے نہ ہونے کی یہاں بحث نہیں دلاتا کھلو اموالکم

بیشک بالباطل میں ناجائز آمدنی کو روکا جائے یہاں خرچ کا ذکر نہیں ہے۔ مگر یہ بھی نہیں ہے سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ ناجائز طور پر جو مال حاصل کیا جاتا ہے اکثر اُس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ خرچ اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ حلال آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ پس جب کہ ناجائز طور پر مال حاصل کرنے سے روکا تو جو اُس کا باعث ہے یعنی اسراف اُس کی بھی مانعت ہو گئی۔ پس اس آیت سے تو یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری آیات و احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حدیث میں ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کھڑا کر کے دریافت فرمائیں گے کہ جو مال کا ہے میں خرچ کی اور مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اور راند اس کا یہ ہے کہ مال اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا مال ہے۔ کسی نوکر کو اگر آپ خزانہ سپرد کر دیں تو کیا وہ مالک اور خود مختار ہو گیا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے اپنا مال آپ کو بطور خزانہ سونپی کے دیا ہے۔ پس جب تک کہ اجازت شرعی نہ ہو آپ کو دینے کا اختیار نہیں۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی فہرست بھی دی ہے کہ اس موقع پر خرچ کرنے کی اجازت ہے اور اس موقع پر نہیں اور غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اصل حق ہمارا تو صرف اتنا تھا کہ ہم کو بقدر ضرورت ملنا۔ اب جو ضرورت سے زیادہ مل رہا ہے تو وہ حق اور دن کا ہے اور لوگوں کو پہنچانا منظور ہے۔ مگر وہ قواعد کے موافق ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ جس کو چاہا دے دیا اور جہاں چاہا خرچ کر دیا۔ حد سے زیادہ خرچ کا کچھ اختیار نہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ آدمی اپنا خرچ شرع کے موافق منضبط

کرے۔

اخراجات کی حدود | شادی بیاہ میں لوگ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کچھ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس موقع پر خرچ

کرنا چاہئے بھی ہے یا نہیں۔ سو سمجھ لو کہ خرچ کرنے کے بھی حدود ہیں، جیسے نماز روزہ کے حدود ہیں۔ اگر کوئی نماز بجائے چار رکعت کے چھ پڑھنے لگے یا کوئی روزہ عشر تک رکھنے لگے تو گنہگار ہوگا۔ اسی طرح مال کو حد سے زیادہ خرچ کرنے سے بھی گنہگار ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں۔ پس حدود کو معلوم کرنا چاہئے۔ علماء سے پوچھو۔۔۔ ایک بات تو یہ یاد رکھو۔

دوسرے یہ یاد رکھو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو۔ اگر ان دونوں باتوں پر عمل کرو گے تو حقوق ضائع نہ ہوں گے اور جس میں لوگوں سے زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں وہ حقوق مالی ہیں اس کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔

ایک خرابی مسلمانوں میں یہ ہے کہ قرض لے کر ادا نہیں کرتے۔ قرض ادا کرنے کی بالکل عادت ہی نہیں۔ اس لئے ان کا اعتبار نہیں رہا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہر ایک سے قرض مانگتے ہیں اور کوئی نہیں دیتا۔ حالانکہ قرض دینے کا بڑا ثواب ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپ نے حضرت جبرائیلؑ سے وجہ پوچھی تو انہوں

نے فرمایا کہ قرض وہی مانگتا ہے جسے سخت حاجت ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے پھر واپس کرنا پڑتا ہے، بخلاف صدقہ کے۔ تو قرض دینے کا اتنا بڑا ثواب ہے۔۔۔!

مگر جب کوئی لے کر ادا ہی نہ کرے تو پھر کون دے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرض دے کر وصول نہیں ہوتا حتیٰ کہ قرض دار سامنے آنا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا سبائی فرماتے ہیں۔

مدہ شان قرض و مستان نیچ حبه فان القرض مقراض المحبة
ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ سی مقدمہ میں مظفرنگر آئے۔ اتفاق سے جتنا روپیہ پاس تھا سب ختم ہو گیا۔ اب بہت پریشان۔ آخر وہیں کے ایک صاحب کے پاس گئے اور اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ دس روپیہ قرض دے دیجئے میں گھر پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ انہوں نے ترس کھا کر دے دیئے انہوں نے گھر پہنچ کر خبر بھی نہ دی۔ کچھ دنوں کے بعد پھر کہیں ان سے ملاقات ہو گئی تو انہوں نے تقاضا کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ابھی دو ایک روز میں ادا کر دوں گا اسی طرح مدتوں تک ٹال مٹول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا۔ پھر جو تقاضا کیا تو کہتے ہیں کہ کیا آپ کے پاس کوئی رقعہ ہے۔ یہ حالت ہے مسلمانوں کی۔ اس کو ہلکی بات سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اس میں بہت ہی تساہل ہو رہا ہے۔

ایک مانگی ہوئی چیز میں بڑا تساہل ہے۔ یہ حالت ہے کہ چیز متگانی اور کام بھی ہو گیا مگر یہ توفیق نہیں ہوتی کہ واپس کر دیں۔ جب دینے والا

خود طلب کرتا ہے تب دیتے ہیں اور اگر خود بھی دیں گے تو مدت کے بعد اس میں بہت چیزیں گم بھی ہو جاتی ہیں۔ خراب بھی ہو جاتی ہیں، بعض جگہ چینے گزر جاتے ہیں واپس ہی نہیں ہوتیں۔ اگر کسی نے طلب کیا تو دسے دی، ورنہ پیر و ابھی نہیں ہوتی۔ نیت مارنے کی نہ ہو مگر تساہل اس قدر ہے کہ حد سے زیادہ۔۔۔

ایک اس بابہ میں سب احتیاطی ہے کہ کھانے کے ساتھ جو برتن چلے جلتے ہیں انہیں واپس کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ بس اپنے یہاں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح مدت ہو جاتی ہے۔ جب خود منگاتے ہیں، تب ملتے ہیں۔ خود میرے گھر میں تساہل ہے۔ حالانکہ شرح نے اس میں اتنی احتیاط کی ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ کھانا کوئی بھیجے تو اس برتن میں کھانا حرام ہے۔ اپنے برتن میں اٹھ لو تب کھاؤ۔ ہاں ایک صورت میں جائز ہے کہ وہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلتے سے خراب ہو جاتا ہو یا اس کی آب جاتی رہے۔ تو اگر ایسا کھانا ہو تب اس برتن میں کھانا جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ہاں اگر مالک استعمال کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔

دلیل فقہاء کے اس قول کی یہ حدیث ہے کہ لا یحل مال امیر مسلم الا بطیب نفس منہ۔ کھانا بھیجنے والوں کو اس برتنوں کا استعمال ناگوار ہوتا ہے اور جب کہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلتے سے خراب ہوتا ہو یا اس کی آب جاتی رہتی ہو تو وہاں دلالت اذن ہے، اس برتن میں کھانے کا۔ پس خلاصہ فقہاء کے کلام کا یہ ہوا کہ جہاں اجازت ہو قرآن سے تو جائز اور اگر

قرآن سے اجازت نہ ہو تو جائز نہیں۔

عرض لوگ اموال کے بارے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں کتنی سخت وعید ہے اس پر۔ میں پھر اصل مسئلہ کا اعادہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ناجائز آمدنی سے احتراز کریں اور خرچ گھٹائیں۔ امراء اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے۔ اس پر عمل ہو گا تو زندگی بڑے عیش و آرام سے کٹے گی۔

رومار شادی وغیرہ میں بڑی بے احتیاطی
نام اور کام کی اہمیت کرتے ہیں۔ دیوبند میں ایک رئیس تھے انہوں نے شادی کی اور بے انتہا خرچ کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب ان کے یہاں آئے اور کہا کہ ماشاء اللہ! آپ نے بہت ہی خرچ کیا۔ آپ کی مالی وصلگی میں کچھ شبہ نہیں۔ مگر صرف اتنی کسر ہے کہ آپ نے اتنا خرچ کر کے ایسی چیز خریدی کہ اگر حاجت کے وقت اس کو فروخت کرنے لگیں تو اسے کوئی پھوٹی کوڑی کو بھی نہ لے۔ وہ کیا؟ نام! باقی ویسے بڑا کام کیا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حقیقی نام کی کوشش کیے ہیں اتنی ہی بدنامی ہوتی ہے۔

ایک مہاجن نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی۔ بہت خرچ کیا مگر اس کے یہ بھی کیا کہ برائیوں کوئی کس ایک اشرفی بھی دی۔ جب رات واپس ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ ہر گاڑی میں میرا ہی تذکرہ اور تعریف ہو رہی ہوگی۔ اس کو کسی جیلہ سے سننا چاہیے۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر پوشیدہ کھڑے ہو گئے۔ رات وہیں کو گزری مگر کسی پہلی میں اپنا تذکرہ نہ پایا۔ آخر ایک پہلی میں انہوں نے دیکھا کہ دو شخص میرا تذکرہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے بڑے

شوق سے کان لگائے۔ ایک نے کہا کہ دیکھو تو کیسے نام کا کام کیا کہ ایک ایک اشرفی سب کو دی۔ یہ کام کسی نے نہیں کیا۔ دوسرے نے کہا کسٹری نے ایک ایک دی کون سا کمال کیا۔ اگر وہ دیتا تو کیا مریجاتا۔

عرض یہ کہ نام کے لئے مال برباد کرتے ہیں مگر وہ بھی میسر نہیں ہوتا اور جن کے واسطے خرچ کرتے ہیں جس وقت مصیبت آتی ہے ان میں سے کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا بلکہ تباہی ہونے پر یوں کہہ دیتے ہیں کہ مال برباد کرنے کو کس نے کہا تھا۔ اپنے ہاتھوں برباد ہوئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ آسودگی میں یہ کہتے تھے کہ جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں ہم خون گرانے کو تیار ہیں۔ جس وقت تباہی آتی ہے ان میں سے ایک بھی پاس کھڑا نہیں ہوتا۔ سب آنکھیں بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے حال پر بڑا افسوس ہے کہ وہ کچھ آگے پیچھے کا خیال نہیں کرتے۔ بے طرح فضول خرچی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تباہ ہو جاتے ہیں بے غول کے ٹکڑی بندہ سبائی ہے۔ یہ حالت مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہوئی کہ انہی قلم (اسلام) کا پھاٹک خود کھول دیا ورنہ اسلامی اصولوں پر چلنے سے کبھی ذلت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ حقوق مالیہ کی حفاظت نہایت ضروری ہے اور شرع نے اس سے بھی تعرض کیا ہے۔ اور اس کی تاکید کی ہے حفاظت نہ کرنے پر مواخذہ ہوگا۔

اب وقت بھی بہت جا چکا ہے اور بفضلہ تعالیٰ بیان بھی بقدر

ضرورت کافی طور سے ہو گیا۔ دُعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیقِ عمل کی مرحمت فرماوے
آمین یا رب العالمین!

اشرف علی!

احکام الحجاب

حجاب کے منافع و مضار کے متعلق یہ وعظ ۱۵ اردیجب ۱۳۳۷ھ کو
 بارہ بنکی میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ پوسٹ نے چار گھنٹہ میں ختم ہوا
 تینینا ایک ہزار کی حاضری تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب بکھوری
 نے قلمبند فرمایا

خطبة ماثورة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به و
نتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن
سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن
يضلله فلا هادي له وشهد ان لا اله الا الله
وحده لا شريك له وشهد ان محمدا عبده ورسوله
صلی الله تعالی علیه وعلى آله واصحابه وبارک وسلم
انا بعد فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم الاكلکم
راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

تہذیب

یہ ایک بڑی حدیث کا ٹکڑا ہے جس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہوا ہے جس کی ہر وقت ہر شخص کو کم و بیش ضرورت ہے۔ اول تو اس وجہ سے یہ مضمون ضروری ہے کہ ارشاد فرمودہ ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کی ہر فرد اور ہر فرد کا ہر جہ و ضروری ہے۔ پھر حضور کے فرمودہ مضامین میں بھی بعض وجوہ سے باہم تفاوت ہوتا ہے پھر اوقات مختلفہ کے لحاظ سے بھی بعض مضامین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ کسی وقت کسی مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور کسی وقت کسی مضمون کی غرض ضرورت کے اسباب مختلف ہیں۔ اور جیسے اسباب ضرورت میں سے کسی مضمون کے منافع کا زیادہ ہونا یا مضرت سے زیادہ محافظ ہونا ہے ایسے ہی اسباب ضرورت میں سے ایک تو ہی سبب غفلت بھی ہے یعنی کوئی مضمون واقع میں تو ضروری ہے مگر پھر بھی اس سے غفلت ہے

اس سے بھی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں یہ وجہ بھی موجود ہے کہ اس وقت اس عارض کی وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ جو مضمون اس مقام پر اس حدیث کا مدلول ہے وہ ایسا ہی ہے کہ باوجود ضروری ہونے کے ہم لوگوں کو اس کی طرف التفات نہیں اس وجہ سے بھی اس کا بیان کرنا زیادہ ضروری ہو گیا۔ یہ تو ضرورت کے اصل اسباب ہیں۔

ایک اہم کوتاہی | باقی اس وقت ایک اتفاقی نکتہ اور لطیفہ بھی ہو گیا۔ وہ لطیفہ یہ ہوا کہ اس سے قبل جو لکھنؤ میں بیان ہوا تھا اُس میں میں نے حقوق مالیہ کو بیان کیا تھا یعنی یہ بتلایا تھا کہ مال کے حقوق کیا ہیں اور اس کے متعلق ضرورت کے موافق بیان ہو گیا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ آج کل مسلمانوں کو مال کے حقوق سے اس حیثیت سے غفلت ہے کہ مال کہاں سے حاصل کرنا چاہئے اور کہاں استعمال کرنا چاہئے۔

علماء سے اگر احکام پوچھے جاتے ہیں تو نماز روزہ کے پوچھے جاتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھا جاتا کہ ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ ہے آیا یہ حلال ہے یا حرام۔ یا میں نوکری کرتا ہوں اور میرا فرض منصبی یہ ہے اور منصب کے علاوہ میں فلاں فلاں کام منافع حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں۔ یہ وسائل آمدنی کے ہیں آیا یہ حلال ہیں یا حرام۔ یا میں زراعت کرتا ہوں اور زمیندار سے یہ معاہدہ کرنا پڑتا ہے آیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔ یا میں زمینداری کرتا ہوں اور میرا

کاشتکاروں سے یہ معاملہ ہے۔ فلاں فلاں صورتیں پیش آتی ہیں، آیا یہ صورتیں جائز ہیں یا ناجائز۔ ان امور کی طرف کسی کو التفات نہیں الا ما شاء اللہ! بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دنیا کی کارروائی ہے، اس میں شریعت سے کیا واسطہ؟ شریعت نے تو صرف نماز روزہ سکھلایا ہے۔ اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد تو نہیں کہ شریعت کو ان امور سے تعلق نہیں مگر وہ یہ گمان پکائے ہوئے ہیں کہ پوچھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حکم تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ لایحوز کا فتویٰ ملے گا۔ (مطلب یہ ہے کہ اگر ہم علماء سے پوچھیں گے بھی تو وہ بھی بتلائیں گے کہ جائز نہیں۔ پھر پوچھنے سے کیا نتیجہ۔ یہ تو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں۔)

خیال تو فرمائیے کہ یہ کتنا بڑا غلط گمان ہے اور لوگوں نے شریعت کو کیسا دشوار سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ شریعت بہت آسان ہے۔ وہ تو سرتاسر رحمت ہی رحمت ہے خدا تعالیٰ کی۔

چنانچہ ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ یہ آیتیں
یعنی یا ایہا الذین امنوا اذا تداینتم بدینکم

جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں، یہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ معاملہ کبھی نقد نقدی ہوتا ہے کہ اس کا نقد دیا اور اس کا نقد لیا۔ اور کبھی تداین کے طور پر ہوتا ہے کہ نقد وام نہیں دیئے جاتے یا قرض لیا جاتا ہے۔ تو اس آیت میں دونوں کو ظاہر فرما دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں واشہدوا اذا تبایعتم کہ نقد نقدی معاملہ میں گواہ

ضرور کر لیا کرو۔ کیونکہ اگر کسی وقت نماز عمت واقع ہو تو چار آدمی فیعدہ لوگوں کے
اور جو معاملہ دین کا ہو تو مزید ارشاد یہ ہے کہ اُن کو نکلے بھی لیا کرو تاکہ غلطی سے
امن ہو۔ خیال تو فرمائیے کہ جب حق تعالیٰ نے ایک پیسہ اور ایک روپیہ کا
ضرر دنیوی اپنے بندوں کے لئے گوارا نہیں فرمایا حالانکہ ساری دنیا پھر کے
پرو کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی تو اپنے بندوں کے لئے بڑے بڑے
ضرر اُن کو کیسے گوارا ہوں گے۔ پھر یہ کیا تھوڑی دلیل ہے رحمت کی۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے حق تعالیٰ کے احکام دیکھے ہی نہیں جو معلوم
ہوتا کہ اُن میں کتنی سہولت اور کس قدر مصالح ہیں۔ ابواب فقہ کو نہیں دیکھا قرآن
و حدیث کو نہیں دیکھا۔ قرآن شریف کا ترجمہ علماء سے پڑھئے تو معلوم ہو کہ
احکام میں کس قدر سہولت ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ صاف صاف ارشاد
فرماتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یُزِیْدُکُمْ اِلَیْهِ
بِکُمُ الْعُسْرُ ۚ

کہ حق تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی
چاہتے ہیں اور تنگی کرنا نہیں چاہتے

اور فرماتے ہیں۔

مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ
حُجٍّ

کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی
تنگی نہیں کی۔

اور حدیث میں ہے۔ الدین یسیر کہ دین آسان ہے۔ اجمالاً یہ نصوص کافی
ہیں۔ باقی اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا وقت اس کی تحقیق میں صرف
کیجئے۔ مگر آپ تو رات دن دنیا کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ آپ کو اس طرف

تو جبر ہی نہیں۔ اور تو جہ اس واسطے نہیں کہ اس کے لئے آپ کو ایک دوسرے
مجمع میں آنا پڑے گا۔ یعنی مجمع علماء میں۔ ایسوں کے پاس اس کے لئے آپ
کو جانا ہو گا جن سے آپ کو وحشت ہے جس کے اسباب مختلف ہیں۔

چنانچہ بعض کو تو علماء سے اس لئے وحشت ہے
علماء سے وحشت کہ شاید کچھ چندہ مانگنے لگیں۔ اور بعض کو اس لئے

کہ ہمارے اوپر کفر کا فتویٰ لگا دیں گے۔ اس لئے وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھتے
ہیں یا اپنی جماعت کے ساتھ رہتے ہیں۔ بعض کو اس لئے وحشت ہوتی
ہے کہ وہ زراعت و تجارت حرام طریقہ سے کرتے ہیں۔ اس لئے کسی عالم
کے پاس نہیں سباتے کہ وہ اس کو حرام بتلائے گا۔

صاحبو! میں کہتا ہوں کہ علماء کے ساتھ جو آپ کو بدگمانی ہے تو دیکھنا
یہ ہے کہ علماء مسائل کو نقل کرتے ہیں یا اختراع کرتے ہیں (یعنی گھڑتے
ہیں) اختراع کا گمان تو غلط ہے کیونکہ ان کے پاس ہر فتویٰ کی دلیل شرعی
موجود ہے۔ اور اگر یہ گمان نہیں تو پھر ان کی طرف سختی کا گمان کیسا۔ یہ
گمان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے کیونکہ احکام تو حضور
کے بیان فرمائے ہوئے ہیں نہ کہ علماء کے، اور حضور کی طرف اس گمان
کا غلط ہونا حرافظا ہر ہے۔ آپ کا تو لقب رحمة العالمین ہے۔ آپ
تو رحمت مجسم بنا کر بھیجے گئے ہیں تمام جہان کے واسطے۔ پھر یہ کیا غضب
ہے کہ خدا تعالیٰ تو آپ کو رحمت فرمائیں اور یہ شخص آپ کو رحمت سمجھے
حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم
يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة
حق سبحانه تعالى اس آیت میں احسان جتلاتے ہیں کہ ہم نے تمہاری
طرف ایک رسول بھیجا جن کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ کی آیتیں
سناتے ہیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تم کو پاکیزہ
بناتے ہیں۔

پس اگر معاذ اللہ آپ کے احکام موجب زحمت ہیں۔ جیسا بعض
لوگوں کا خیال ہے تو پھر حضور کے ارسال میں کیا منت ہوئی جو عن اللہ
میں مذکور ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں حق تعالیٰ۔

يحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث وليضع عنهم
اصوبهم۔

کہ ہم نے ایسا نبی بھیجا ہے جس کی شان یہ ہے کہ طہیات کو
حلال اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ آپ گندی اور مضر چیزوں کو حرام کرنے آئے ہیں اور
سختیوں کو موقوف کرتے ہیں۔ جب آپ کی یہ شان ہے تو پھر آپ
پر سختی کا گمان کیسا؟

اس غلطی کے دفع ہونے کی سہل تدبیر یہ ہے کہ کسی شجر عالم سے قرآن
و حدیث پڑھئے۔ زیادہ نہیں تو ان سے اردو ہی کے رسالے دیکھ لیجئے
مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اس کام کے لئے آپ کو ایسوں کے پاس جانا پڑے گا۔

جن سے آپ کو وحشت ہے لیکن اگر اپنے دین کی حفاظت چاہتے ہو تو ایسے لوگوں کے پاس جاؤ، خواہ تھوڑے ہی زمانے کے لئے جاؤ پھر یہ حالت ہوگی کہ تمام عمر وہاں سے کسی اور جگہ جانا پسند نہ کرو گے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

خواب را بگذار امشب ار لیسر یک شبے در کوٹے بخواباں گذر
ایک رات کے لئے ذرا سونا چھوڑ دو اور اللہ والوں کے پاس جا کر رہو تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ رات کو کیا کرتے ہیں۔ ان کی شب بیداری کا لطف دیکھ کر اپنی نیند کا لطف بھول جاؤ گے اور غفلت بھی خواب ہی کے حکم میں ہے اور اعتقاد سے نہ آؤ تو امتحاناً ہی آکر دیکھ لو ان حضرات کی صحبت میں رہ کر معلوم ہوگا کہ کتنی وسعت ہے شریعت میں۔

باقی آج کل جو بعض لوگوں کو شریعت میں تنگی کا گمان ہے۔ ان کا بھی ایک

شریعت میں تنگی کا گمان

منشا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ وہ مولانا کے پاس مسئلہ پوچھنے گئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ یہ جائز نہیں۔ کوئی تجارت یا زراعت کی صورت پیش کی تو انہوں نے لایحوز کہہ دیا۔ کسی نے چار مسئلے پوچھے تو انہوں نے ہر دفعہ لایحوز ہی فرمایا۔ اس سے انہوں نے سمجھا کہ بس شریعت میں لایحوز ہی ہے اور کچھ نہیں۔

اس واقعہ کی تکذیب کوئی نہیں کر سکتا مگر اس کی حقیقت سمجھنا چاہئے کہ مولوی صاحب نے آپ کے سوالات کے جوابات میں جو لایحوز کہا

ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ آیا اس کا سبب شریعت کی تنگی ہے یا
آپ کے طرز معاشرت کی خرابی اور آپ کی آزادی و وارستگی ہے۔ سو
تحقیقت یہ ہے کہ آپ کے معاملات اکثر فاسد ہو گئے ہیں۔ آپ ایسے
حال میں پھنسے ہوئے ہیں جس کو کوئی عاقل بھی پسند نہیں کر سکتا۔ اب شریعت
ہاں کو ناجائز نہ کہے تو کیا کرے۔ اب فرمائیے تنگی آپ کے اندر ہے
یا شریعت میں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بیمار حکیم کے پاس آیا اور حکیم سے
کہا کہ مجھے کھانے کو بتلا دیجئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ بکری کا گوشت
کھاؤ۔ مریض نے کہا کہ وہ تو ہمارے گاؤں میں ہوتا نہیں۔ حکیم نے کہا کہ
کنوڑ کھاؤ، فاختہ کھاؤ، کدو لکڑی کھاؤ، پالک کھاؤ۔ غرض جو چیز حکیم بتلاتا
رہا اس کے جواب میں مریض کہتا رہا کہ یہ چیز ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتی
اور ہمارے یہاں تو بیگن ہوتے ہیں، آلو ہوتے ہیں، بھینس کا گوشت ہوتا
ہے۔ غرض تمام مضر چیزیں گنا ڈالیں۔ حکیم صاحب نے ان سب کے
جواب میں بھی یہی کہا کہ تو ان چیزوں کے پاس تک نہ جانا۔ اب اگر یہ
مریض یوں کہنے لگے کہ طب یونانی اس قدر تنگ ہے کہ اس میں میرے
واسطے ایک غذا بھی جائز نہیں۔ اس میں تو لایجوز ہی ہے۔ ہم تو اب
ڈاکٹری علاج کریں گے۔ تو کیا اس کا یہ کہنا درست ہوگا۔ ہرگز نہیں! کیونکہ
منشاء اس کا قواعد طبیہ کی تنگی نہیں بلکہ اس کے گاؤں کی پیداوار کی تنگی ہے۔
یقیناً اس شخص سے یوں ہی کہا جائے گا کہ قواعد طبیہ میں تو تنگی نہیں، اس میں

تو صدہا قسم کی جائز غذا میں موجود ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جانے کہ اس ظالم کے گاؤں میں تمام مضر ہی مضر چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تنگی کا الزام طب پر جب ہو سکتا ہے جب کہ طب کی کتابوں میں دیکھو کہ کوئی غذا اس کے مزاج کے موافق ملے ہی نہیں۔ جب یہ نہیں تو تنگی کا شبہ طب پر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح شریعت کا قانون تنگ نہیں۔ کتابیں دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت نے معاملات کی کتنی صدہا صورتیں جائز کی ہیں اور متعدّد سے چند چیزوں کو ناجائز کہا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں معاملات کو دیکھئے۔ کتاب البیع دیکھئے۔ خیارات شرط ملاحظہ کیجئے۔ کتاب الشرف پر نظر ڈالئے۔ کتاب الدعویٰ دیکھئے۔ کتاب المساقات مطالعہ کیجئے۔ ان سب کی تحقیق کر کے پھر شمار کیجئے کہ کتنے واقعات میں مجوز ہے اور کتنے میں لایجوز۔ یقین کیجئے اگر آپ سو معاملات دیکھیں گے تو ساٹھ میں مجوز اور چالیس میں لایجوز نکلے گا۔ اگر ہم کتابوں سے دکھائیں کہ شریعت نے اتنے ذرائع آمدنی کے جائز کئے ہیں اور چند کو ناجائز کیا ہے، تو پھر شریعت پر تنگی کا الزام کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی معاشرت ہی خراب ہے۔ آپ نے حلال طریقہ چھوڑ کر زیادہ تر حرام ہی ذرائع آمدنی کے اختیار کر رکھے ہیں۔ تو یقیناً شریعت یہی کہے گی کہ اگر کوئی کسی پر ظلم کرے، کسی کا مال زبردستی پھینے، سود لے، رشوت لے، تو یہ حرام ہے ناجائز ہے۔ مگر اس حالت میں یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ شریعت میں تنگی ہے بلکہ یہ تنگی تو ہماری طرف سے ہے۔ وہ یہ کہ سب نے مل کر آمدنی کے وسائل وہی اختیار کئے ہیں

جو کسی طرح جائز نہیں ہو سکتے ہم نے ان کو اپنی طرز معاشرت کا جزو بنا رکھا ہے۔ اب جب اس کے خلاف شریعت میں نکلتا ہے تو کہتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے۔ انصاف سے بتلایئے کہ تنگی کدھر سے ہوئی۔ افسوس ہے کہ تنگی ہمارے افعال سے جا سہ ہوئی اور الزام ہے شریعت پر۔ ہماری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود مے کنی لے سادہ رُ ہچو آں شیر نے کہ بر خود حملہ کرد

خزگوں کی دانائی | مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی جنگل میں ایک شیر آگیا تھا اور اُس نے

پنجیروں کو یعنی شکار کے جانوروں کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ جانور یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور جمع ہو کر اُس کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضور کو تکلیف کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ یہیں حضور کے واسطے ہم میں سے ایک جانور روزانہ بلاناغہ نمبر وار آجایا کرے گا۔ چنانچہ معاہدہ ہو گیا اور ایک جانور روزانہ آتا رہا۔ ایک دن ایک خزگوں کی نوبت آئی۔ یہ جانتا نہ تھا۔ دوسرے جانوروں نے کہا کہ خدا کے لئے تو چلا جا کہیں معاہدہ کے خلاف کر کے سب پر آفت نہ آجائے۔ بالآخر جبراً و قہراً چل چل کر گیا چونکہ جانے میں بہت دیر ہو گئی تھی، شیر بھوک کے مارے غصہ ہو رہا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی کہنے لگا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم سے عہد پورا نہ ہو سکے گا۔ اب میں سب کو خوب ٹھیک کر دوں گا۔

خزگوں پہلے ہی سے شیر کی ہلاکت کی تدبیر سوچ کر گیا تھا۔ بولا حضور

پہلے قصہ تو سن لیجئے۔ آپ اپنے خسر ہی میں تل رہے ہیں۔ آپ کو خبر ہی نہیں کہ یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔ آج ایک بڑا زبردست واقعہ ہو گیا ہے میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔ اسی واسطے دیر بھی ہو گئی۔ چلا تو تھا میں وقت ہی پر مگر اس جنگل میں ایک دوسرا شیر آگیا ہے۔ آج ہم حضور کے واسطے دو بھائی آئے تھے۔ راستہ میں حملہ کر کے اُن نے ایک کو تو پکڑ لیا اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ تک پہنچا ہوں میں نے حضور کا نام لے کر اُن کو ڈرایا بھی دھمکایا بھی مگر اُن نے ذرا پروا نہ کی اور کہا کل سے ہمیں رات ب دیا کرو اُن کو نہ دیا کرو۔ بس پہلے آپ اُن کا انتظام کیجئے ورنہ کل سے آپ کا روزینہ بند ہے۔ وہ راستہ ہی میں آپ کا رات ب چھین لیا کرے گا۔

شیر نے غصہ میں آکر کہا کہ اُن کو ہمیں بتلاؤ۔ خرگوش راستہ میں ایک کنواں دیکھ کر گیا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہاں بے گیا اور کہا، حضور! وہ شیر اس میں رہتا ہے۔ مجھ کو تو خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھ کو اپنی آغوش میں لے لیں۔ تو میں اُن کو دکھا دوں۔ چنانچہ شیر نے ایسا ہی کیا۔ خرگوش نے کہا کہ کنوئیں میں جھانک کر دیکھئے۔ اُن خرگوش کو آغوش میں لے لئے ہوئے وہ کھڑا ہے۔ کنوئیں میں شیر نے جو جھانکا تو اُن کا عکس پڑا۔ دیکھا کہ ایک شیر خرگوش کو آغوش میں لے لئے ہوئے ہے۔ شیر شجاع تو ہوتا ہی ہے اُن کو پھینک کنوئیں میں کود پڑا۔ جب خرگوش نے دیکھا کہ اُن کا کام تمام ہو گیا ہے تو آپ کہتے ہیں تسلیمات، آداب، غرض ہے شیر پانی میں ڈوب

کر مر گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں :-

حملہ بر خود سے کنی اسے سادہ و ہم چو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
شیر نے اپنے نزدیک دوسرے پر حملہ کیا تھا مگر حقیقت میں وہ
حملہ اپنے اوپر تھا۔

ہماری کم فہمی اور بے عقلی | جیسے ایک حبشی کی حکایت ہے کہ راستہ
میں چلا جا رہا تھا۔ ایک آئینہ پڑا ہوا ملا

اُسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی شکل نظر آئی۔ سیاہ رنگ، موٹے موٹے ہنٹ
آپ اپنی شکل کی زیادت سے تمام عمر میں اسی وقت مشرف ہوئے تھے
خفا ہو کر آئینہ کو پتھر پر دے مارا اور کہا کہ کم بخت! جب تو ایسا بد شکل تھا
جب ہی تو تجھ کو راستہ میں کوئی پھینک گیا۔

اسی طرح ایک احمق کی حکایت ہے کہ اُس کا لڑکا ہاتھ میں روٹی
کا ٹکڑا لے رہا تھا۔ اتفاق سے وہ ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے لوٹے میں گر
پڑا جس میں پانی بھی تھا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا تو اُس کو اپنی شکل نظر
پڑی تو وہ کہتا ہے ابا ابا، اس نے میرا ٹکڑا پھین لیا۔ باپ نے جو اُس
میں جھانک کر دیکھا تو اُس کو اپنی شکل نظر پڑی۔ دیکھا کہ ایک شخص ہے
بڑی سی داڑھی والا۔ آپ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی داڑھی لگا کر نیچے کا ٹکڑا پھینتے
ہوئے شرم تو نہ آئی۔

ایک اور حکایت ایسی ہی یاد آگئی۔ متعدد مثالوں سے مضمون خوب
واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے بیان کی جاتی ہیں۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ لوگ چاند

دیکھ رہے تھے اور اس وقت ایک عورت بچہ کو پاخانہ کرا رہی تھی۔ جلدی جلدی اُس سے فارغ ہو کر بچہ کو پونچھ پانچھ کر وہ بھی چاند دیکھنے لگی۔ اتفاق سے اُس کی انگلی میں پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ خورقوں کی عادت ہوتی ہے کہ ناک پر انگلی رکھ کر بات کرتی ہیں۔ تو وہ عورت چاند دیکھتے ہوئے ناک پر انگلی رکھ کر کہتی ہے اے اے ہے! آج ایسا سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ یہ خبر نہیں کہ وہ خود ہی سڑی ہوئی تھی۔

صاحبو! اسی طرح شریعت میں جسے تنگی نظر آتی ہے وہ خود تنگ ہے پھر میں اخیر بات کہتا ہوں کہ اگر فرض کر لو شریعت میں تنگی ہوتی بھی تو سوال یہ ہے کہ آپ کو اس صورت میں کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ جس گورنمنٹ کی عملداری میں رہتے ہیں اگر وہ گورنمنٹ کوئی سخت قانون مقرر کر دے تو آپ کیا کریں گے۔ اس صورت میں تین شکلیں ہیں یا تو اس قانون کو تسلیم کر لیا جائے یا گورنمنٹ سے لڑو یا اُس کا ملک چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تینوں شکلوں میں سلامتی کی بات یہ ہے کہ تسلیم کر لو۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کے احکام اگر کسی کو سخت یا تنگ نظر آتے ہیں تو یا تو حق تعالیٰ سے لڑے یا خدا کا ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاوے۔ مگر یہ بتلاؤ کہ لڑو تو کیسے لڑو اور وہ کون سا ملک ہے جہاں چلے جاؤ گے۔ تو یہ دونوں شکلیں یہاں محال ہیں۔ پس تیسری ہی شکل رہ گئی کہ تسلیم کر لو۔ باقی آپ نے جو تجویز کر رکھا ہے کہ جو قانون سمجھ میں نہ آیا اُسے چھوڑ دیا۔ یہ تو بالکل ہی بے عقلی ہے۔

آج کل کے محققین | آج کل بعض لوگوں نے کہا ہے کہ انگریزی کے

بی اے، ایم اے ہو کر شریعت مقدسہ کے محقق بن جیتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ جس نے پچاس برس دین کی خدمت میں صرف کر دیئے ہوں اور چراغ کا دھواں سیروں اٹھ کے دماغ میں سما گیا ہو تو وہ محقق نہ ہو اور یہ حضرت تھوڑی سی انگریزی پڑھ کر محقق ہو گئے۔

آج کل کے محققین اور محققین کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص گلستان دیکھ کر اٹھ کر محقق ہو گیا تھا۔ اتفاق سے دو شخصوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک اُن میں سے ان حضرت کے دوست تھے۔ وہ پیٹ بھی رہے تھے اور پیٹ بھی رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ انجام یہ ہوا کہ اُن کے دوست صاحب خوب بیٹے اور آپ اپنی اس حرکت پر بڑے خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے گلستان میں جو پڑھا تھا۔

دوست اُن باشند کہ گرو دست دوست دو پریشاں حالی و در ماندگی
آج اُس پر عمل کرنے کا اچھا موقع ملا اور اپنے نزدیک دوست کا پول
حق ادا کر دیا۔ تو جیسے وہ گلستان کے محقق تھے، ایسے ہی یہ لوگ آج کل قرآن
و حدیث کے محقق ہیں۔

ان ہی میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ انہوں نے امام مقیم کے سامنے
نماز پڑھی۔ جب امام دو رکعت پڑھ چکا آپ دونوں طرف سلام پھیر کر بیٹھ
گئے۔ امام نماز میں ہے اور مقتدی پہلے ہی فارغ ہو گیا۔ میں دیکھ کر سمجھا تھا

سے کوئی حذر ہوگا جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں مگر میں نے دیکھا ہر رکن میں بیٹھ ہی نظر آتے ہیں۔ اب میں سمجھا کہ آپ نے امام مقیم کے ساتھ بھی قصر کیا ہے نماز سے فارغ ہو کر میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے پوری نماز کیوں نہیں پڑھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر تھا۔ آج کل کے ایسے محققین ہیں جنہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ اگر امام مقیم ہو تو مقتدی مسافر کو بھی امام کے ساتھ چار ہی رکعت پڑھنی چاہئیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے ایک بڑے لیڈر کا۔ مگر آج کل کے لیڈر کیا ہیں، گیدڑ ہیں۔ وہ سفر میں تھے، پانی ملا نہیں۔ تیمم کا ارادہ کیا مگر کبھی تیمم کرتے ہوئے کسی کو دیکھا تھا نہیں۔ اجتہاد شروع کیا۔ تقدم تو اس جماعت کے لازم سے ہے۔ ہر بات میں سب سے پہلے ٹانگ اڑاتے ہیں۔ آپ نے کیا کیا کہ مٹی لے کر پہلے ہاتھ کو ملی۔ پھر چلو میں مٹی لے کر منہ میں دی۔ غرض وضو کی طرح تیمم کیا۔ وہ اب بھی زندہ ہیں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اُن کا اقتدار کرنے کو تیار ہیں۔

افسوس ان لوگوں کو دین کی تو خبر نہیں اور پھر لیڈران قوم بنے ہوئے ہیں۔ ایسوں ہی پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

اذا كان الغراب دليل قوم
سيهدى هم طوليقي الها لكينا

اور دین سے واقفیت کا ذریعہ صرف یہی تھا کہ علماء سے سبق حاصل کیا جائے مگر اس سے ان کو عار ہے۔

تعلق باللہ | میں عرض کر رہا تھا کہ جب کوئی قانون نافذ ہوتا ہے، تو تین حالتیں ہوتی ہیں۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ تینوں میں سلامتی کی بات یہی ہے کہ اس کو تسلیم کر لو۔ خاص کر جب کہ حاکم سے دوسرا تعلق بھی ہو۔ اور ہمیں اتنا بڑا تعلق ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ اگر وہ منکشف ہو جائے تو خدا کی قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں کہ ہم احکام الہیہ سے ایسے منصف اور رنگین ہو جاویں کہ دوسرا رنگ ہی نہ رہے۔

وہ تعلق کون سا ہے۔ وہ تعلق محبت اور محبوبیت کا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو محبت کی تا لازم نہیں؟ کوئی مسلمان ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ ہاں لازم نہیں ہے۔ اگر کسی کو ایسی ہمت ہو تو میں کہتا ہوں کہ اُس کو دنیا میں کسی سے بھی محبت ہے یا نہیں۔ بی بی سے، بچوں سے، مکان سے، معشوق سے، عورت سے، لڑکے سے، یقیناً کسی ایک چیز سے تو محبت ضرور ہوگی۔

اب یہ سوچو کہ بناد کیا ہے اس محبت کی جو بنیاد محبت کی کبھی فضل و کمال ہوتا ہے جیسے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ میں فضل و کمال کی شان ہے کہ وہ اُن سے محبت کا باعث ہوا ہے۔ اسی طرح حضرات شیخین سے محبت ہے یا اہل بیت سے محبت ہے۔ تو اُن کے ساتھ بھی فضل و کمال کی وجہ سے محبت ہے۔ کبھی محبت ہوتی ہے عطا و مال کی وجہ سے۔ جیسے محسن سے محبت ہوتی ہے۔ کبھی حسن و جمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔

جیسے کسی لڑکے یا عورت سے محبت ہو اور ایسی محبت ہوتی ہے کہ عشق کے مرتبہ کو پہنچ جائے۔ بس یہ اسباب ہیں محبت کے۔

ایک فضل و کمال — ایک عطا و نوال — ایک حسن و جمال
اب اگر کہیں یہ تینوں اسباب جمع ہوں تو پھر محبت نہ ہونے کے کیا معنی؟ اب بتلائیے اللہ تعالیٰ میں کس چیز کی کسر ہے۔ کیا اُن میں فضل و کمال نہیں یا عطا و نوال نہیں یا حسن و جمال نہیں۔ اُن میں تو سب چیزیں موجود ہیں۔ عطا کی تو یہ کیفیت ہے کہ آپ کو دل دیا، عقل دی، زبان دی، آنکھ ناک دی۔ اگر خدا تعالیٰ قلب نہ دیں، زبان نہ دیں تو کوئی آپ کو یہ چیزیں کیونکر دے سکتا ہے۔ معطی حقیقت میں وہی ہیں۔ اگر کسی میں فضل و کمال علم کا ہے تو وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔ انہی کا دیا ہوا حسن و جمال بھی ہے جب اُن کے بنائے ہوئے ایسے ہیں تو وہ خود کیسے ہوں گے۔ اُن کی تو یہ شان ہے۔

حسنِ خویش از رشتے خوباں آشکار کردہ

پس بہ چشم عاشقان خود را تماشا کردہ

واقع میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے آفتاب نکلا اور دیوار پر دھونڈی مگر ایک احمق کو آفتاب کی خبر نہیں۔ اُس کی نظر دیوار پر ہی ہے اور اُس کو دیکھ دیکھ خوش ہو رہا ہے۔ شیخی بگھار رہا ہے کہ میرے گھر کی دیوار کسی جھک رہی ہے۔ مگر شام ہونا چاہتی کہ دھوپ سمٹنا شروع ہوتی ہے اور آفتاب اپنے ساتھ اس کو لے جاتا ہے تو دیوار تاریک کی تاریک رہ جاتی ہے۔ نور صفت اصلی آفتاب کی ہے دیوار کی نہیں۔ اگر وہ حسن و جمال دیوار کی اصلی صفت

احکام الجاہ

ہوتی تو اس سے زائل کیوں ہوتی۔ ایسی ہی چیزوں کے بارہ میں کہ جن کا حسن و جمال اُن کی اصلی صفت نہیں مولانا فرماتے ہیں۔

عشق بامردہ نباشد پایدار
عشق را با جی و با قیوم دار
عاشقی بامردگان پائندہ نیست
زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
عشق ہائے کو پستے رنگ بود
عشق بنود عاقبت ننگ بود
آگے فرماتے ہیں۔

عزق عشقے شو کہ غرق سرست اندری
عشق ہائے اولین و آخرین
پس عشق حق تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ اُن سے ہی عشق کرنا چاہئے۔ مگر اس میں بعض اوقات یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ محب و محبوب میں مناسبت ہونی چاہئے اور ہم میں اور حق تعالیٰ میں مناسبت ہی کیا۔ پھر وہاں تک ہماری رسائی کیونکر ہوگی۔ مولانا آگے اسی شبہ کو رفع فرماتے ہیں۔

تو گو مارا بدایں شہ باز نیست
بر کہیمایں کار مارا دشوار نیست
یعنی یہ مرت سمجھ کہ اس شاہنشاہ کی بارگاہ میں تیرا کیونکر دخل ہوگا۔ اس لئے کہ
بر کہیمایں کار مارا دشوار نیست

یعنی کرمیوں پر یہ کام دشوار نہیں۔ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ رسائی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تم خود وہاں پہنچو اور ایک یہ کہ وہ تم کو پہنچا دیں سو کہتے ہیں کہ گو تم خود وہاں تک نہیں پہنچ سکتے مگر انہیں تو پہنچانا مشکل نہیں ہے۔ جب یہ ہے تو پھر مایوسی کیسی؟

نقرب الی اللہ

چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ من تقرب الی

شبرا تقرب الیہ ذراعاً ومن تقربت الی

ذراعاً تقربت الیہ باعاً۔ الخ کہ جو میری طرف ایک بالشت آتا

ہے میں اس کی طرف ایک ذراع جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ذراع

آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل

کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ راستہ تو غیر

قناعی ہے کہ کسی کے قطع کرنے سے قطع ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نگر و قطع ہرگز جادہ عشق از دوید نہا

کہ می بالہ بخود این راہ چون تاک زبرد نہا

یہ ہمارے چلنے سے قطع نہیں ہوتا بلکہ ادھر ہی سے عنایت ہوتی ہے

تو قطع ہوتا ہے۔ اسی کی نسبت حدیث میں بشارت ہے من تقرب

الی شبرا۔ الخ کہ جو ایک ذراع ہماری طرف آتا ہے ہم اس کی طرف

ایک باع جاتے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کبھی عنایت ہے کیسا کرم ہے؟

مگر طلب شرط ہے۔ جس کی خاصیت مولانا فرماتے ہیں۔

آب کم جو تشنگی آورد بدست تا بخوشد آب است از بالا و پست

مطلب یہ کہ بدون پیاس پانی نہیں ملتا۔ پیاسے بنو تو پانی تم تک خود

ہی آجائے گا۔ راز اس کا کیا ہے۔ راز یہ ہے۔

تشنگاں گر آب جو نید از جہاں آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

یعنی پیاسا ڈھونڈتا پھر تا ہے پانی کہ۔ اسی طرح پانی بھی ڈھونڈتا

ہے پیار سے کو۔

یعنی حق تعالیٰ خود تم کو اپنی طرف بلا تے ہیں اور بلا نے کے ساتھ نہیں
 بھی ہیں۔ کوئی محبوب ایسا ہے کہ محب کو خود بلائے اور خود پہنچائے۔ غور
 کیجئے کہ عاشق کو محبوب خود بلا رہے ہیں۔ یہ عنایت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ
 عنایت پر شبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ہماری رسائی خدا تک کیسے ہو گی۔
 ایک بزرگ تھے۔ اُن کو بادشاہ نے کچھ دریافت کرنے کی غرض
 سے بلانا چاہا۔ بادشاہ محل کے اوپر تھے اور یہ نیچے سے گزر رہے تھے۔ بادشاہ
 نے اوپر سے کند پھینک دی۔ اُس کے ذریعہ سے محل پر پہنچ گئے۔ بادشاہ نے
 پوچھا کہ بندہ کی رسائی خدا تک کیسے ہو سکتی ہے۔ کہاں خدا کہاں بندہ۔ انہوں
 نے برحسبہ فرمایا کہ ایسے ہو سکتی ہے جیسے میری رسائی آپ تک ہو گئی۔ اگر
 میں دروازہ سے آتا تو کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے۔ کہیں دروازوں سے
 واسطہ پڑتا۔ کہیں مصاحبین سے کہنا ہوتا۔ کتنے درجے طے کرنے پڑتے۔ اس
 کے بعد کہیں آپ تک رسائی ہوتی اور شاید نہ بھی ہوتی اگر دربان روک دیتا۔
 غرض ایک صورت تو آپ تک پہنچنے کی یہ تھی کہ میں آپ کو تلاش کرتا اور
 سو فتنے اٹھا کر کہیں آپ تک پہنچتا۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ خود آپ
 نے مجھے پہنچ لیا۔ پس جیسا اس وقت آپ نے کیا اسی طرح خدا تک رسائی
 ہو سکتی ہے۔

مگر طلب شرط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کھینچتے اسی
 کو ہیں جو کھینچنا چاہے اور جو اعراض کرتا ہے

مشرط طلب و تقاضا

اس سے وہ بھی اعراض کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

انلزمکموها وانتم لہا
کارہون
یعنی تم کو راہت کرو تو ہمیں کیا
غرض پڑی ہے جو خواہ مخواہ

اپنی رحمت کو تم پر لا دیں۔

ن اگر کوئی طلب کرے تو اس کی طرف نہایت توجہ اور رحمت فرماتے

اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ ماں کی آغوش میں دوڑ کر آنا چاہتا ہے
گھٹنوں سے چلا نہیں جاتا۔ وہ ہمت کر کے کھڑا ہوا اور گر پڑا۔ اس کا
ہاتھ کہ ماں نے دوڑ کر خود اٹھا لیا۔ پس اس کا کام تو اتنا ہی ہے کہ اپنی
ہمت کے موافق چلے اور گر پڑے۔ جب وہ اپنا کام کر سکتا ہے تو فوراً
اس آغوش میں اٹھا لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ ایسا نہ کرے تو اس کی طرف ماں
ایسا تقاضا نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نفیست عالم را پدید
خیرہ یوسف ار می باید دوید

تاناہ گرید طفل کے جو شد لب
تاناگرید ابر کے خند و چین

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا مکان میں لے گئیں تو سات
فل سات دروازوں میں ڈال دیئے تھے تاکہ نکلنے نہ پائیں۔ جب انہوں
نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اپنا کام مجھے کرنا چاہئے پھر حق تعالیٰ اپنا
کام کریں گے۔ دروازہ کھلنا نہ کھلنا میرا کام نہیں۔ پس خدا پر توکل کر کے
دروازہ کی طرف بھاگے۔ دروازہ کے پاس پہنچنے نہ پائے تھے کہ سب

دروازے کھلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساتوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ گو بھاگنے کا راستہ تو نہیں ہے لیکن بھاگنا تو بہتر قبضہ میں ہے۔ چنانچہ اس قصد سے بھاگے اور ان کے اثر یہ ہوا کہ باہر نکل گئے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رختہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف داری باید وید
غرض یہ تو مسلم ہے کہ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہ ہے جو منظور خدا ہوتا ہے مگر پھر بھی کوشش شرط ہے۔ جیسے وضو نماز کے لئے شرط ہے گو تنہا وضو سے کچھ نہیں ہوتا جب تک نماز نہ پڑھے۔ لیکن بدو ان وضو کے نماز بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی خدا تعالیٰ محض اس کی کوشش سے نہیں ملتے وہ اپنی مرضی سے ملتے ہیں۔ مگر کوشش شرط ہے۔
ان ہی دو مثالوں کو بیان کر کے میں کہتا ہوں کہ قرآن میں اسی لئے اِشْاٰ فرمایا ہے۔

جزاء بھاگنا لیا یعلمون اور جزاء کہ عمل کرنے والے اپنے عمل کا
بھاگنا لیا یعلمون۔ بدلہ دیئے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل ضروری ہے اور یہ جو حدیث میں ہے کہ بدو ان محبت کے کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل عادت تا مری نہیں ہے مگر شرط ہے۔ اس کے بعد میں قرآن شریف ہی سے یہ مسئلہ ثابت کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
ان رحمت اللہ قریب من کہ اللہ کی رحمت محسنین سے

المحسنین

قریب ہے۔

پس اتنی طلب تو چاہئے کہ عمل میں مشغول ہو جائے اور خلوص کے ساتھ مشغول ہو جاوے۔ جس سے محسن کا مصداق ہو جائے۔ اس کے بعد یہ مشاہدہ ہو جائے گا۔

باکریاں کارٹا دشوار نیست

تمہارے عمل کرنے پر خدا تعالیٰ کی رحمت منور ہوگی۔ پس کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے جب رسائی ممکن ہے تو پھر خدا تعالیٰ سے کیوں نہ محبت کی جائے بلکہ اُن سے محبت کرنا واجب اور فرض ہے اور میں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی محبوب ہے ہی نہیں تعجب ہے کہ عشق مجازی کو دین و ایمان سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے عشق کی طرف ذرا دھیان بھی نہ ہو۔

تعلق بالخلق | بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو خدا سے پوری محبت ہی نہیں۔ اس لئے اس کے احکام کے تسلیم کرنے میں تاثر ہوتا ہے۔ جو خدا کا عاشق ہوگا وہ تو ہر حکم کو سراور آنکھوں پر رکھے گا۔ اور جو حالت بھی اُس کو خدا کی طرف سے پیش آئے گی اُس میں خوش ہوگا۔ اُس کی تو یہ کیفیت ہوگی۔

زندہ کئی عطائے تو دیکھتی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کئی رخصائے تو

اور اس کا یہ مذہب ہوگا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من
دل فدائے یار دل رنجان من

بلکہ یہ حالت ہوگی ۔

بجرم عشق تو ام جی کشند و غوغائیت
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ییت

یہ ہوتا ہے اثر تعلق عشق کا مگر افسوس ہے ہمارے حال پر کہ محبت کا تو
دعویٰ اویا تنا بھی تعلق نہیں کہ اگر احکام سخت نازل ہوں تو ان کو دل سے مائل
لیا جائے۔ معلوم ہوا کہ برائے نام ہی محبت ہے۔ پھر اگر ہم یہ دیکھتے کہ آپ
سخت احکام کے نہ ماننے میں ایسے پختہ ہیں کہ دنیا میں کسی کے ہی سخت
احکام نہیں مانتے، تو ہم بھی سمجھتے کہ یہ لوگ اصول کے بڑے پابند ہیں۔ اس لئے
ان پر الزام نہیں مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ مخلوق کے تعلق ہی میں یہ لوگ ان اصول
کو نوٹ دیتے ہیں۔

چنانچہ طبیب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیجئے
اُس نے ایسا کر ڈوا نسخہ لکھا کہ جس کا منہ تک جانا بھی دشوار ہے تو اس سے یہ
نہیں کہتے کہ ایسا کر ڈوا نسخہ کیوں لکھا۔ علیٰ ہذا۔ کتنا ہی قیمتی لکھا ہو، یہ کبھی نہیں کہتے
کہ اتنا قیمتی کس واسطے لکھا ہے بلکہ بعض اوقات اس سے فرمائش ہوتی ہے
کہ اچھا نسخہ لکھئے گا۔ قیمت کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اور باوجود ان سارے قصوں
کے پھر بھی تندرستی کے بعد کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا احسان ہوا جس کا ہم شکریہ ادا
کرتے ہیں۔ اور کر ڈوے نسخہ کو عنٹ عنٹ پی جاتے ہیں۔ سب طرح کی مشقت
گوارا کرتے ہیں۔ اگر حکیم کہے کہ عصر کے وقت کچھ ٹری کھانا تو اسی کو خوشی کے
ساتھ کھاتے ہیں۔ غرض وہ جو بھی بتلائے خواہ نفس پر کیسا ہی گراں ہو، سب

بول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ کے یہ اصول کہ سخت احکام
 نہ مانا جائے وغیرہ وغیرہ کہاں گئے۔ طبیب کے ساتھ یہ معاملہ نہ کیا، جو خدا
 کے ساتھ کرتے ہو۔ معلوم ہوا کہ صرف بہانہ ہے نفس کا اور کچھ نہیں۔ پس آپ کا
 مذہب یہ ہے کہ جس طرح دنیا کا کام بنا اسی طرح کر لیا۔ اصول کے اختیار کرنے
 سے کام چلایوں کر لیا اور جو اصول کے چھوڑنے سے کام چلا تو ایسے کر لیا۔ یہ
 نہیں سوچتے کہ اس بے ڈھنگے پن کا انجام کیا ہوگا۔

بہر حال اول تو احکام شرعیہ سخت نہیں اور اگر سخت ہوئے بھی تو ان کو
 برداشت کیجئے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو بجا لائیں جیسے دنیا کے احکام
 اور آقاؤں کے سخت احکام برداشت کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح احکام
 خداوندی کے ساتھ معاملہ کیجئے۔ پس اگر شریعت میں حقوق مالیہ سخت بھی
 ہوں تب بھی ان پر عمل کرنا چاہئے مگر اس کی طرف کسی کو التفات ہی نہیں۔
 نماز روزہ کے مسائل تو کبھی پوچھ بھی لیتے ہیں حقوق مالیہ کو کوئی پوچھتا ہی نہیں
 کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ اس سے پہلے بیان میں ان حقوق مالیہ کا بیان
 بقدر ضرورت ہوا تھا۔ دیکھئے اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔

اب اسی کے ساتھ اس کا ایک قرین ہے جس کا نام
انزو جاہست جاہ ہے یا انزو جاہست۔ اور یہ اس کا قرین اس لئے
 ہے کہ جیسے مال حوائج کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اسی طرح جاہ بھی حوائج
 کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اور اصل غرض حوائج کا پورا ہونا ہے اور چونکہ
 یہ دونوں چیزیں اس کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے لوگ رات دن اپنی کی طلب

میں سرگرم رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ حوائج کے پورا ہونے میں مال و جاہ دونوں کو دخل ہے۔ بعض کام مال سے چلتے ہیں اور بعض جاہ سے اور بعض اعتبار سے بلکہ غور کیا جائے تو جاہ اثر میں مال سے بھی بڑھی ہوئی ہے کیونکہ بعض اوقات جاہ سے بلا مال کے ہی کام چل جاتا ہے۔ بعض کام جاہ کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں جو مال سے ہو ہی نہیں سکتے۔ بعض لوگوں کی مالی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی مگر ان کی جاہ زیادہ ہوتی ہے۔

قصبات میں بعض رئیس ہوتے ہیں کہ ان کا قصبہ میں اثر ہوتا ہے کہ چار پانی پر پہنچتے ہیں، حقہ سامنے رکھا ہے، تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔ کسی شخص کو دوسرے بلانا ہے۔ مزدور بھیجنے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ بس کوئی ان کے سامنے سے سر پر گٹھڑی لٹے ہوئے نکلا۔ اس کو کہا گٹھڑی کو تو یہاں رکھ دے اور فلانے کو بلا لا۔ اگر مزدور بھیجنے تو دوا آنے خرچ ہوتے۔ بس ان کا کام مفت میں ہی چل گیا۔ تو یہ کیا ہے، جاہ کا اثر ہے کہ اس سے بدن پیسہ خرچ کئے ہوئے کام چل رہا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ مثلاً اہل کمال ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کو عیش و آرام ہوتا ہے۔ لوگوں کو ان پر حمد بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس مال کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو یہ کیا ہے جاہ ہی کا تو اثر ہے۔ ان حضرات کی جاہ پہلے عند اللہ ہوتی ہے اور پھر عند المخلوق ہوتی ہے۔

محمد کو اس وقت اس سے بحث نہیں کہ جاہ کیسی چیز ہے اور اس کا کیا حکم ہے بلکہ یہ بیان کرنا ہے کہ جاہ بھی ایک ذریعہ ہے حوائج کے پورا

ہونے کا جیسے مال ایک ذریعہ ہے اور حوائج دو قسم ہیں جلدب منفعت و دفع مضرت اور مال کے یہ دونوں اثر ہیں اسی طرح جاہ کے بھی یہ دونوں اثر ہیں گو غالب اور زیادہ مال میں جلدب منفعت ہے اور جاہ میں دفع مضرت، مگر ایک امر مشترک تو دونوں میں ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ مالی و جاہ دونوں میں تعارض ہے۔

چونکہ پہلے مال کے متعلق بیان ہو چکا ہے تو جی یوں چاہا کہ اس کی قرین کا ذکر بھی ہو جائے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔ اس جلسہ میں بعض لوگ تو وہ ہیں جو پہلے بیان کو سن چکے ہیں۔ اس لئے ان کے تواذمان میں دونوں مضمونوں کا اقتران اسی وقت ہو جائے گا۔ اور جو لوگ ایسے نہیں تب بھی چونکہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، دونوں اشاعت کے بعد دیکھتے وقت ان کا اقتران ہو جائے گا۔ اور چونکہ یہ حدیث (جو شروع و عطف میں پڑھی گئی ہے) اس کے لئے کافی تھی اس لئے اس حدیث کو اس وقت اختیار کیا گیا۔

سو سینے جاہ کے معنی ہیں قدر و منزلت (کمافی القاموس) جس کا حاصل اور لازم ہے اثر۔ چونکہ صاحب جاہ کا قلوب میں اثر ہوتا ہے اسی لئے عربیہ نے اس کی حقیقت ملک القلوب بتائی ہے۔ چونکہ اثر کا لفظ مشہور ہے، اس لئے جاہ کو لفظ اثر سے تعبیر کرنا سمجھنے کے لئے زیادہ سہل اور مناسب ہو گا۔ پس میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں اسی اثر مذکور کے متعلق بحث ہے۔ تو اب سمجھ لیجئے کہ مال کے جیسے دو حق ہیں ایک مالی کا حاصل کرنا، ایک مال کا صرف کرنا، اور شریعت میں دونوں کے جدا جدا احکام ہیں۔ بعض احکام تحصیل

مال کے متعلق ہیں اور بعض استعمال مال کے متعلق ہیں، اسی طرح اس اثر کے متعلق دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اثر کے حاصل کرنے کا کیا حکم ہے۔ ایک یہ کہ اس کے استعمال کا کیا حکم ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ اس کے متعلق بھی احکام ہیں پھر بھی آج کل اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں میں اس جاہ کے احکام سے زیادہ غفلت ہے۔ بلکہ عجب نہیں کہ بعض لوگ جو شریعت کو صرف نماز روزہ ہی میں منحصر سمجھ رہے ہیں، دلی میں یوں کہتے ہوں گے کہ کیا شریعت میں اس کے بھی کچھ احکام ہیں۔

نہنی کی حقیقت | صاحبو! مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھوٹل سب کچھ ہے مگر ہمیں خبر نہیں۔ اس لئے کثرت سے احکام کی خبر نہیں۔ اسی باب میں ہماری وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں:

ایک سید بڑناں نہا بد فرق سر تو ہی جوئی لب ناں در بدر
ایک شخص روٹیوں کا ٹوکرا سر پہ رکھے ہوئے ہے اور در بدر یوں کہتا پھرتا ہے کہ خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو۔ میں بھوکا ہوں حالانکہ ٹوکے میں اتنی روٹیاں ہیں کہ اگر یہ شخص سارے محلہ میں تقسیم کر دے جب بھی مکی نہ پڑے مگر اس کو خبر نہیں۔

بس ایسی ہماری حالت ہے کہ ہمارے قانون شرع میں سب ہی کچھ موجود ہے یعنی ضروریات دیں مگر ہمیں خبر نہیں۔ اور یہ قید ضروریات کی اس لئے لگائی کہ شاید سب ہی کچھ کا لفظ سن کر کسی کو یہ خیال ہو کہ پھر شریعت کے علم سے ہم کو ریل چلاتا بھی آجائے گا۔ اس میں اس کی ترکیب بھی لکھی ہوگی کہ

اس طرح اوزار ڈھالو اور ایسے انجن بناؤ، گاڑیاں تیار کرو۔ اس قید سے یہ چیزیں خارج ہو گئیں و مطلب یہ کہ دین کے متعلق جتنی باتیں ہیں وہ شریعت میں سب موجود ہیں، باقی یہ گمان جو بعض لوگوں کا ہے کہ شریعت میں تجارت کے طریقہ بتلائے گئے ہیں کہ اس طرح کماؤ، کارخانے جاری کرو، محض غلط ہے۔۔۔!

چنانچہ اس مذاق کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن شریف نے دنیا کمانے کے متعلق بھی سب کچھ سکھایا ہے۔ ان میں ایک قوم وہ بھی ہے جس کو قرآن شریف میں صرف یہی حکم پسند آیا ہے احل اللہ البیع کہ اللہ نے بیع یعنی تجارت کو حلال کیا ہے جس میں سب ذرائع تجارت کے آگئے۔ بھلے مانسوں نے یہ نہ دیکھا کہ جیسے احل اللہ البیع فرمایا اسی طرح وحکم اللہ لہا بھی تو قرآن ہی میں موجود ہے اور اُسی جگہ موجود ہے۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حریص سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی تمہیں قرآن شریف میں کون سا حکم پسند ہے تو اُس نے کہا کھلوا و شربوا کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا کہ دُعا کون سی پسند ہے تو کہا، ربنا انزل علینا مائدة من السماء کہ اے ہمارے رب ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرما۔

تو جیسے اس حریص کو تمام احکام میں سے کھانے اور پینے ہی کا حکم پسند آیا تھا اور تمام دعاؤں میں سے کھانے پینے ہی کی دُعا پسند آتی تھی اسی طرح اُن کو صرف احل اللہ البیع ہی پسند آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ترقی کی

اجازت دی ہے۔ یہ حاشیہ چڑھایا ہے قرآن شریف پر۔ اور ترقی کے معنی
 بھی وہ لئے جو انہوں نے خود ہی سمجھے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ شریعت
 نے ترقی کی اجازت دی ہے مگر سوال یہ ہے کہ ترقی کے معنی کیا ہیں۔ آیا وہ
 جو انہوں نے سمجھے ہیں یا کچھ اور۔ اگر ترقی کے صحیح معنی بیان کئے جائیں گے
 تو ہم تسلیم کریں گے کہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن کسی چیز
 کا نام ترقی رکھ لینے سے اس کی حقیقت مٹوڑا ہی پائی جائے گی۔ کوئی شراب
 کا نام شراب الصالحین رکھ لے تو اس سے وہ حلال مٹوڑا ہی ہو جائے گی۔ کسی
 گل جس چیز کا نام ترقی رکھا گیا ہے اس کی حقیقت ہے حرم طول امل، خود غرضی
 اور قطع نظر شریعت سے یہ چیزیں تو عقلاً بھی ناجائز ہیں۔ مگر لوگوں نے حرم وغیرہ
 کا ایک خوبصورت نام ترقی رکھ لیا مگر صرف نام رکھ لینے سے کیا ہوتا ہے
 اس سے حقیقت تو نہ بدلے گی۔

میں اس کو مفصل بیان کرتا مگر یہ جلسہ اس کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے
 خاص طور پر مستقل جلسہ کی ضرورت ہے لیکن میں اجمالاً ایک مختصر بات کہتا ہوں
 وہ یہ کہ عقلاً و اول اس کا فیصلہ کر لیں کہ ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ پس خوب سمجھ لو
 کہ ترقی کی حقیقت وہی ہے جس کی قرآن شریف اجازت دیتا ہے یعنی حلال
 طریقہ سے بڑھنا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ جائز ترقی محدود ہے یا غیر محدود
 ہے۔ اگر محدود ہے تو اس کی حدود بیان کیجئے اور انشاء اللہ شریعت سے
 بہتر اس کی حدود کوئی بھی نہ بیان کر سکے گا۔ اور اگر غیر محدود ہے یعنی اس میں کوئی
 قید نہیں ہے۔ اگر اس میں مضرتیں بھی ہوں تو اس کی بھی اجازت دی جاوے

تو کیا خدا تعالیٰ سے جو کہ بوجہ علیم وخبیر ورحیم و حکیم ہونے کے سبب سے زیادہ
نصائح عباد کی رعایت فرماتے ہیں اس ترقی غیر محدود کی اباحت کی توقع رکھ سکتے
ہو حالانکہ گورنمنٹ سے بھی جس کی نظر نصائح کو اس قدر محیط نہیں غم اس کی توقع
نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر گورنمنٹ صرف محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے اور
آپ کو مقید بناتی ہے ترقی غیر محدود کی کوئی گورنمنٹ اجازت نہیں دے سکتی
تو خدا تعالیٰ کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ کو مقید کریں اور اگر کوئی عدم اساطط واقعات
کے سبب یہ کہے کہ گورنمنٹ تو غیر محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ
بہت سے ذرائع غیر مشروع کی قانون میں اجازت ہے تو چاہے آج سے ڈکیتی
کیجئے، دوسروں کے مال چھین چھین کر خوب اپنا مال بڑھائیے۔ اس کے بعد اگر
آپ عدالت میں پکڑے ہوئے جاویں تو عاف کہہ دیں کہ ہم تو ترقی کرتے
ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا عدالت اس کو قبول کرے گی۔ اگر نہیں قبول کرے گی، تو
پھر ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ نے ترقی کی یہ حد قائم کی ہے کہ ڈکیتی نہ ہو چوری
نہ ہو غصب نہ ہو۔

پس جب گورنمنٹ ترقی کے لئے حدود قائم کر سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ
حدود قائم نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ گورنمنٹ سے تو غیر محدود ترقی کی امید نہ
رکھیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ امید ہو کہ ترقی غیر محدود کی اجازت دیں اور اگر
ترقی غیر محدود مطلوب ہے تو اجازت دیجئے کہ میں آپ کا کمرہ اتار لوں اور
آپ کا مکان اور جائداد چھین لوں۔ کیونکہ آپ کے نزدیک ترقی کے لئے
کوئی حد تو ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کو یہ گوارا ہو تو میں ادب سے عرض کروں گا

کہ آپ میرے خطاب کے قابل نہیں۔ ایسا شخص تو مجنون ہے جس کو ڈاکٹر سے جنور کا سرٹیفکیٹ لینا چاہئے۔ عرض یہ کہ ترقی اور تمدن کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور اس میں شریعت نے تنگی نہیں کی۔ شریعت نے اجازت دی ہے ترقی کی مگر اس کے حدود ہیں۔

قرآن فہمی

میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ شریعت میں ضروریات ہیں۔ مذکور ہیں۔ ان ضروریات میں خصوصاً جاہ کے متعلق بھی تھا۔ اس کے لئے بھی شریعت کے احکام ہیں۔ اس پر ایک سوال کے ہیں کہ کیا جاہ کے متعلق بھی احکام ہیں، یہ گفتگو درمیان میں آگئی تھی کہ ہاں احکام سب چیزوں کے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے قرآن شریف کو ہم نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ اس میں کس کس چیز کی تعلیم ہے۔ پس اس میں سرسری نظر سے بھی دیکھ لیا کہ نماز روزہ ہے۔ حجت و ذکا کا بیان ہے۔ لوگوں نے ساری شریعت کا یہی حاصل سمجھ لیا اور یہی خلاصہ نکال لیا۔ حالانکہ قرآن میں ضروریات میں سے سب کچھ موجود ہے مگر قرآن کا سب سے ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

نہ ہر کہ آئینہ دار و سکندری داند نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت بیری داند
یہ کافی نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا اور قرآن کو سمجھ لیا۔ قرآن کا سمجھنا خاص درجہ کے علماء کا کام ہے۔ وہ درجہ حاصل کرو تو معلوم ہو کہ اس میں سب کچھ ہے مگر فہم کی ضرورت ہے ورنہ بد فہم لوگوں نے محض ترجمہ دیکھ کر تو بہت سی باتیں کا مدلول غلط سمجھ لیا ہے۔

مثلاً ایک آیت ہے۔

فلیضحکوا قليلا وليبکوا كثيرا
کہ ہنسنا کم چاہئے اور رونا بہت
چاہئے۔

اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے
حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں۔ یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے انہی کے
متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے۔ فلیضحکوا میں ہمد کی ضمیر منافقین کی طرف
ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں ٹھوڑے
دلوں ہنسنے رہیں۔ پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے۔ اس آیت میں منافقین کی
آخری حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دلوں کو ہنس لیں پھر آخرت
میں رونا ہی رونا ہے۔ یہ مطلب تھا آیت کا، نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور
ہنسنے کی مذمت۔ جیسا آج کل کے مدعی سمجھ رہے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی
مراد ہے اور اس کے مقابل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے مطلب یہ
ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا جزاء
بہ اکالوا یعملون خود اس کا قرینہ ہے۔ عزمین یہ آیت آخرت کے متعلق ہے
فلیضحکوا وليبکوا امر ہے لفظاً اور خبر ہے مستثنیٰ۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا
شروع کر دیا۔ نہ ماقبل کی خبر ہے نہ مابعد کی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن
کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت ہے ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین

سبیلہ۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہیں آئیں گے۔ پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہر کافر انکار۔ مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے۔ یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں، یہ تو آخرت کے متعلق ہے۔ کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے۔ ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ طویل یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلہ۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مؤمنین کی ہوگی اور منافقین ہاریں گے خود فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ طبتلارہا ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے۔ اب کوئی اشکال نہیں۔

جاہ کی حدود | اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شریعت میں جاہ کے احکام بھی ہیں اور اس میں دو درجے ہیں ایک تحصیل جاہ یعنی جاہ کا حاصل کرنا اور ایک بذل جاہ یعنی اس کا صرف کرنا۔ جیسے مال میں دو درجے تھے۔ ایک اس کا حاصل کرنا اور ایک اس کا صرف کرنا۔ اور اس کا جامع فیصلہ یہ ہے کہ جاہ کے چند مراتب ہیں۔

ایک مرتبہ یہ ہے کہ جاہ بدول حاصل کئے حاصل ہو گئی ہے وہ تو خالص نصرت ہے خدا تعالیٰ کی۔ جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی جاہ ہوتی ہے کہ وہ خود کرتے چلے جاتے ہیں اور لیتی اختیار کرتے ہیں مگر وہ جتنے کرتے

میں اُتتے ہی بلند ہوتے ہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔
 من تواضع لله دفعه الله۔ کہ جو شخص اللہ کے واسطے تواضع

اختیار کرے گا، اللہ اُس کو بلند کرے گا۔

اس کو جو سجاہ ملی ہے اُس نے خود حاصل نہیں کی بلکہ اللہ کی طرف سے
 ملی ہے۔ اس سجاہ کے مخالف نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔
 ایک یہ صورت ہے کہ سجاہ اُس نے تو حاصل کی نہیں یعنی اس کے اسباب
 کا استعمال خود اُس نے نہیں کیا مگر دوسروں نے کیا ہے اور اُس سے اس کو
 سجاہ حاصل ہو گئی۔ مثلاً سچا آدمیوں نے مل کر اس کو بادشاہ بنا دیا۔ اب یہاں
 سجاہ تو حاصل ہوئی اسباب سے مگر اُس نے وہ اسباب جمع نہیں کئے بلکہ اور
 لوگوں نے اسباب جمع کر کے اس کو بادشاہ بنا دیا ہے۔

پہلی صورت اور اس صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو اسباب
 ظاہری جمع ہی نہیں کئے گئے نہ اس کی طرف سے نہ اوروں کی طرف سے
 بلکہ محض وہی طور سے سجاہ مل گئی۔ اور یہاں گو اُس نے اسباب کو جمع نہیں کیا
 مگر دوسروں نے تو جمع کیا ہے

دوسرا فرق یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب سجاہ انکار کرنے سے سجاہ
 سے بچ سکتا ہے بخلاف پہلی صورت کے کہ وہاں بچ نہیں سکتا کیونکہ وہ غیر
 اختیاری ہے اور یہاں قبول کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ
 اس کو اس سجاہ سے متمتع ہونا جائز ہے مگر دو باتوں کا دیکھ لینا ضروری ہے۔
 ایک تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچا سکے گا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنا دین تو

کسی سال میں برباد اور تباہ نہ ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر نظر کر کے اس جاہ کا قبول کرنا اور اس سے قنقوع ہونا جائز ہے۔ اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جاویں تو قبول کرنا حرام ہے۔

تیسری قسم جاہ کی یہ ہے کہ نہ کسی نے بادشاہ بنایا ہے نہ قدرتی طور پر جاہ لی ہے بلکہ خود کوشش کرتا ہے جاہ کے حاصل ہونے کی جیسے عالمگیر نے حصول سلطنت کی کوشش کی تھی۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بجز خاص خاص حالات کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

بلکہ اصل قانون تو یہ ہے کہ اپنے لئے خود حکومت اور شریعت کوئی منصب تجویز کرنا اور اس کی خواہش کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی میں سب عہدے حکومت کے داخل ہیں درحالیکہ وہ فی نفسہ شرعاً جائز بھی ہوں۔ سو جائز ہونے کی صورت میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی خواہش کی جائے کیونکہ حکومت کی درخواست اور خواہش کرنا جائز نہیں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو حکومت کی درخواست کرے ہم اس کو کبھی حکومت نہ دیں گے۔ راز اس میں یہ ہے کہ حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے اور بڑا بوجھ اٹھانا ہے۔ اگر دس پر حاکم ہے تو دس کا بوجھ اٹھانا اور پچاس پر حاکم ہے تو پچاس کا بوجھ اٹھانا اور ایک پر حاکم ہے تو ایک کا بوجھ اٹھانا ہے اور یہ بوجھ اٹھانا اور ان کی راحت کی فکر کرنا نہایت دشوار کام ہے جس سے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ ایک مقام پر پہنچے۔ آپ کو ایک خیمہ جنگل میں نظر آیا۔ آپ اس خیمہ کے باہر کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ اُس میں بچوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اور گویہ تجسس تھا مگر امام وقت کو تفتیش اور تجسس جائز ہے۔ دوسرے کو جائز نہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہوا کہ ایک خاندان باہر سے آکر ٹھہرا ہے۔ اُن کے بچے بھوک سے چلا رہے ہیں۔ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ بی بی نے ایک خالی دیگی چڑھا رکھی ہے اور بچوں سے کہہ رہی ہے کہ سو جاؤ کچھ دیر میں کھانا پکا کر تمہیں اٹھالیں گے۔

اس حالت کو دیکھ کر آپ بے حد دلگیر ہوئے۔ پھر آپ اُن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہاں کوئی فیشن تو تھا نہیں جس سے شناخت ہوتی معمولی وضع سے جو کھڑے ہوئے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون ہیں۔ آپ نے اُن سے خود فرمایا کہ عمر کے پاس جا کر اپنے حال کی اطلاع کرو۔ وہ تمہیں کھانے پینے کا سامان دیں گے۔ تو وہ عورت کہتی ہے سبحان اللہ! یہ ہمارے ذمہ ہے یا اُن کے ذمہ ہے کہ وہ خود ہماری خبر رکھیں۔ اُنہوں نے خلافت کیوں اختیار کی ہے جب اُن سے انتظام نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کہا کہ عمر غیب دان نہیں ہے۔ ایک شخص تمام باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اُس عورت نے کہا کہ پھر کیوں خلافت کا منصب اختیار کیا ہے چھوڑ دیا ہوتا۔ بس یہ سن کر آپ واپس ہوئے اور رات ہی کو بیت المال کا قفل کھولا۔ اور کچھ اٹھا اور جس اپنے ساتھ لیا۔ غلام نے کہا کہ یہ سامان میرے حوالے کیجئے۔ میں لے چلوں گا۔ تو آپ فرمائے ہیں۔

لا تذر وازرة و ذرا خدی فرمایا یہاں کا بوجھ اٹھانا سہل ہے آخرت کا بوجھ اٹھانے سے۔

آپ نے کہہ دیں تہنچہ اور ان سے کہا کہ اس کو کھا ڈیو۔

میں نے ایک تاریخ میں دیکھا ہے کہ اسی طرح آپ شب کے وقت ایک بار گشت کرتے پھر رہے تھے۔ ایک خیمہ دیکھا اور اس میں سے درونگ آواز سنی۔ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک عورت کے دروازہ ہوتا ہے آپ نے کہا کہ تم نے کسی وایہ کو نہیں بلایا۔ وہ لوگ بولے ہم پر ویسی ہیں ہمارے پاس کون ہے بلا نے والا۔ میں آپ فوراً اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی کو وہاں لائے اور ان سے کہہ دیا کہ یہ ظاہر نہ کرنا کہ میں خلیفہ کی بیوی ہوں۔ اس کے جملہ نے کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض یہ کہ بچہ پیدا ہوا اور ان کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔

ابشعریا امیر المؤمنین بشارت ہو آپ کو یا امیر المؤمنین!

اس سے ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ یہ خلیفہ کی بیگم ہیں۔

میں حاکم ہونے کا اس کو حق ہے جو دوسرے کی راحت رسانی کی تلقین ذمہ داری کر سکے۔ نہ یہ کہ نام لکھا لیا اور حاکم ہو گئے۔ حاکم پر بڑی ذمہ داری ہے اور بڑی مشقت ہے جس کو کوئی شخص خوشی سے اپنے لئے گوارا نہیں کر سکتا پھر باوجود اس کے جو شخص درخواست کر رہا ہے حکومت کی تو ظاہر ہے کہ اس کی غرض جلب مال اور جلب جاہ وغیرہ ہے۔ راحت رسانی خلق مقصود نہیں۔

نہیں۔

مثلاً ایک رئیس ہیں جو تحصیلدار بنے ہوئے ہیں۔ حالت ان کی یہ ہے کہ کسی کو جیل خانے بھیج دیا، کسی پر جرمانہ کر دیا، کسی کے بید لگا دیئے۔ باوجودیکہ اپنے گھر کی آمدنی پانچ سو اور ہزار ماہوار کی ہے مگر پھر در خواست ہے تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹری کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلب جاہ یا جلب مال مقصود ہے اور کچھ بھی نہیں اور اکثر غریب کو حکومت سے جلب مال مقصود ہوتا ہے اور امراء کو جلب جاہ۔ اور حکومت کے حقوق سینے۔

حضرت عمرؓ نے انتظام کیا تھا کہ میری خلافت میں بنی عدی میں سے کوئی حاکم نہ بنایا جائے (بنی عدی حضرت عمرؓ کا قبیلہ اور خاندان ہے) کیونکہ وہ میرے اثر سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے مگر ایک شخص کو بیاقت کی وجہ سے حاکم بنا دیا تھا۔ اُس نے کچھ اشعار کہے تھے جس میں اپنی بیوی کو خطاب تھا کہ واماں میں گے اور عیش و عشرت کریں گے۔ وہ اشعار آپ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اُس کی حاضری کا حکم دیا اور پوچھا کہ یہ تمہارے اشعار ہیں۔ اُس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت یہ ہے کہ خوب عیش و عشرت کریں گے۔ اُس نے کہا کہ حضرت یہ تو نہ بانی شاعری تھی۔ دل سے کوئی واقعی مضمون نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ زبان پر کسی بات کا تذکرہ اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک دل میں نہ ہو۔ تم قابل حکومت نہیں ہو اور معزول کر دیا۔ اسی واسطے قانون ہے شریعت کا کہ صاحب عزل کو حکومت نہ دی جائیگی کیونکہ ایسے شخص کی عزل جلب مال اور جلب جاہ ہوگی۔ راحت رسائی خلق مقصود

نہ ہوگی۔ تو جو مقصود ہے حکومت سے وہ حاصل نہ ہوگا۔

اب لوگ اپنے اپنے دلوں میں ٹوٹ کر دیکھ لیں کہ عہدوں کی ذمہ داری
کون سے کیا عرض ہوتی ہے۔ آیا یہ مقصود ہوتا ہے کہ مال و جاہ حاصل ہو
یہ کہ خلق کو آرام پہنچے۔ اگر یہ ہوتا تو اس کے آثار بھی تو ہوتے۔ جب آثار نہیں
تو یقیناً مطلوب جاہ و مال ہے اور کچھ نہیں۔ اور اگر سو میں ایک ایسا ہو بھی گیا
تو وہ کس شمار میں ہے۔ اگر یہ بات ہوتی یعنی جاہ مقصود نہ ہوتی بلکہ خدمت خلق
اور ان کی حفاظت اور راحت و سانی مقصود ہوتی تو جو شخص تحصیل داری کر رہا ہے
اور اس کی وہی ڈپٹی کلکٹری کی جگہ ہوتی تو وہ اس جگہ پر نہ جاتا کیونکہ اس کی عرض
تحصیل داری میں بھی حاصل ہو رہی ہے (وہ کیا ہے خدمت خلق) بلکہ سب انسپکٹری
میں تحصیل داری سے بھی زیادہ حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر خدمت مد نظر ہے
تو اسی کو اختیار کرتے کیونکہ مقصود اس میں زیادہ حاصل ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں
کرتے۔ تو یہ علامت اس کی ہے کہ مقصود خدمت خلق نہیں بلکہ مقصود جاہ
ہے اور جو تحقیق میں نے ڈپٹی کلکٹری وغیرہ کے متعلق بیان کی، کچھ اسی میں منحصر
نہیں ہے۔

بادشاہت اور جمہوریت | میں دینی متا سبت والوں کو مشا و عظیم
کو بھی کہتا ہوں کہ اس میں بھی وہی تفصیل

ہوگی جو اسباب جاہ میں مذکور ہوئی۔ وہ یہ کہ کبھی تو خود و اعظ بنے گا اور کبھی لوگ
بنائیں گے اور اس کے متعلق بھی احکام کی وہی تحقیق ہے جو اوپر آجکی مثال اپنے
طور پر تو خود و اعظ بننا جائز نہیں اور اگر بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ حدیث

یہی فریضہ کیا ہے۔ حدیث میں ہے لا یقض الا امیرا و مامورا و مختالا۔ یعنی واعظ کون بنے گا ایک امیر یعنی امام المسلمین، ایک اُس کا مامور یعنی جس کو امام المسلمین نے اس کام کے لئے تجویز کیا ہو، ایک مختال یعنی متکبر۔ ریا کاریوں سمجھتا ہے کہ ہم بڑے ہیں یا بڑا بنتا چاہتے ہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے میرے دعوے کی۔ اب آج کل کے واعظین سوچ لیں کہ آیا آپ کو کسی نے واعظ بنایا ہے یا خود بنے ہیں۔ اگر کسی نے بنایا ہے تو مامور میں داخل ہیں اور اگر نہیں بنایا تو مختال ہیں۔ کیونکہ امیر نہ ہونا تو ظاہر ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ تم بھی تو اسی میں داخل ہو تمہیں کس نے واعظ بنایا ہے؟ اس لئے تم بھی مختال ہوئے اور اگر یہی ہے تو کوئی بھی ہندوستان میں واعظ نہ کہے، کیونکہ یہاں نہ تو کوئی امیر ہے نہ مامور ہے۔ بس تیسری شق رہ گئی لہذا سب کے سب مختال ہوئے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول حدیث کی حقیقت سمجھنا چاہئے۔ اُس سے جواب معلوم ہو جائے گا۔ سو اس کے لئے ایک مقدمہ سمجھئے۔ وہ یہ کہ بادشاہ کے جو اختیار است ہیں اُس کی حقیقت کیا ہے۔ اُس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ میزان کل ہے تمام رعایا کے اختیار است کی یعنی فراوی فراوی جو اختیار است رعایا کو تحفہ سب کی میزان بادشاہ کو سپرد کردی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بادشاہ کے اختیار است مستفاد ہوتے ہیں رعایا سے یعنی عوام الناس اختیار دیتے ہیں بادشاہ کو۔ اب چونکہ تمام عوام الناس کا اجتماع تو عادتہ محال ہے اس لئے اُن کے قائم مقام اہل حل و عقد ہوں گے۔ نئی اصطلاح میں اس کو پارلیمنٹ کہتے ہیں اور اس میں یہ

ضرور نہیں کہ عوام الناس زبان سے کہیں کہ یہ لوگ ہمارے قائم مقام ہیں۔ بلکہ عوام الناس اُن کے ساتھ برتاؤ ایسا کرتے ہیں جس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اُن کو اپنا پیشوا اور دستور سمجھتے ہیں۔ یہ برتاؤ شہادت اس کی ہے کہ عوام الناس نے ان خواص کو اپنی طرف سے اختیارات دے دیئے ہیں۔ وہ گویا وکیل ہیں عوام الناس کے۔ بس وہ مل کر بادشاہ کو بادشاہ بناتے ہیں اور اُن کا بنانا سب کا بنانا ہے۔ بس اہل حل و عقد کی جماعت سب کی قائم مقام ہے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ خود اختیارات میں مستفید ہے عوام سے اور بادشاہ کے بنانے والے بھی عوام ہی ہیں بواسطہ اہل حل و عقد کے۔ تو بس اہل حل و عقد ہی سب کچھ ہوئے۔ جیسا وہ کریں گے وہی سب کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ پس یہاں اگرچہ امام المسلمین کا وجود نہیں ہے، مگر اہل حل و عقد تو موجود ہیں یعنی علماء و صلحاء۔ اس لئے صلحا کا تسلیم کیا ہوا واعظ صحیح طویل سے واعظ ہوگا گویا اس کو بادشاہ ہی نے واعظ بنایا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر بواسطہ ایک فعل صحیح ہے تو بلا واسطہ بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا مطلب یہ ہے کہ جو واعظ بادشاہ کے واسطہ سے بنایا گیا ہے جب وہ صحیح ہے تو اہل حل و عقد کا بلا واسطہ بادشاہ کے کسی کو واعظ بنادینا بدرجہ اولیٰ درست ہوا۔ پس فیصلہ یہ ہوا کہ جس کو صلحاء اتقیا و عقد کے لئے تجویز کریں وہ مامور میں داخل ہو جائے گا اور اُس کو وعظ کہنا جائز ہوگا اور جس کو یہ جماعت تجویز نہ کرے اُس کو وعظ کہنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر اس معیار پر نظر ہو تو جو گمراہی پھیل رہی ہے قوم میں وہ سب جاتی رہے۔ مگر آج کل تو کوئی معیار ہی نہ رہا۔ ہر شخص

واعظ ہے مقتدا ہے۔

جاہل واعظ دیوبند میں ایک نابینا صاحب تشریف لائے۔ آنکھوں کے تو اندھے تھے ہی دل کے بھی اندھے تھے۔ سورہ جمعہ

میں جو ان کسند تعلمون ہے اس کا آپ نے عجیب ترجمہ کیا۔ وہ یہ ہے کہ اے لوگو! بہتر ہے تمہارے لئے کہ تالا لگا کر جمعہ کی نماز کو چلے جایا کرو آپ نے تعلمون کو تالا موند سمجھا۔ اس کا یہ ترجمہ کیا۔ میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا اور مولانا رفیع الدین صاحب بھی موجود تھے۔ مولانا نے دھمکا کر واعظ کہنے سے منع فرمایا۔

ایک اور حکایت ہے کانپور کی کہ مدرسہ جامع العلوم میں ایک واعظ صاحب تشریف لائے اور سورہ الرحمن کے تیسرے رکوع کا واعظ شروع کیا جنتان کو تو جنتن پڑھا اور یہ ترجمہ کیا کہ جنت میں ایک ایک تخت کا پاپا ہزار ہزار کوس کا ہوگا۔ کوس بڑے شین سے فرمایا پھر اس کی تفسیر بھی فرمائی کہ ایک کوس ہوتا ہے چھوٹے شین سے، وہ چھوٹا ہوتا اور ایک کوش ہوتا ہے بڑے شین سے وہ بڑا ہوتا ہے۔ اور بھی بہت واہی تباہی روایات غلط بیان کیں۔ بے چارے کو اس واعظ میں ایک آنہ ملا۔

میرے چھوٹے ماموں صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک جامع مسجد میں ایک جاہل پہنچا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں واعظ بھی ہوا کرتا ہے معلوم ہوا کہ نہیں ہوتا۔ تو بعد نماز کے خود ہی پکارا کہ ہاں ہوا! اس وقت وارج (واعظ) ہوگا اور نماز کے بعد واعظ کے لئے منبر پر جا بیٹھے۔ تو آپ نے شین کو شین پڑھا۔ یہاں تک بھی

غیبت تھا۔ ترجمہ کیا تو نور علی نور۔ ترجمہ یہ کہ اے محمد! اگر تو نہ ہوتا تو آسمان وزمین کچھ نہ ہوتا۔ یہ ترجمہ یسین کا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو تھکے۔ اندسے ہیں اس لئے آدھا وعظ آج کہا ہے آدھا کل ہوگا۔ اس جلسہ میں ایک نابینا عالم بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا ذرا ان واعظ صاحب کو میرے پاس لانا۔ جب وہ آئے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے تو انہیں کہتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہے ہاپوڑ۔ اتنے بڑے عالم تھے اور وعظ فرماتے تھے وہ بولے کہ مولانا میں حکومت کی تحصیل کو نہیں پوچھتا بلکہ یہ پوچھتا ہوں آپ نے پڑھا کیا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا ہے وفات نامہ ساپن نامہ، ہرنی نامہ اور اس کے بعد کہا اور تو کیا جانے اندھے۔ حالت تو ان کی یہ کھنی اور بڑے خوش تھے کہ ہم واعظ ہیں۔

حضرت یہ واعظین کی آج کل کیفیت ہے۔ بعض لوگ لفاظ ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے ہیں۔ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سی بات صحیح ہے کون سی غلط۔ بس روپے سیدھے کرنے کے لئے وعظ کہتے ہیں شریعت نے اس کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ واعظ کون ہو سکتا ہے۔ جس کی تفصیل میں نے عرض کر دی ہے۔

کنارہ تا تراش پیر | اسی طرح پیر بن جانا بھی ہے اس میں یہی شرط ہے کہ مامور ہو یعنی کسی شیخ کامل نے اس کو اجازت دی ہو بیعت کرنے کی۔ مگر آج کل تو یہ حالت ہے پیری مریدی کی زبان سے واہی تباہی کہتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فقیری کے راز بیان ہو رہے ہیں۔

داراشکوہ کا قصہ سنا ہے کہ اُس نے ایک شاہ صاحب سے پوچھا کہ جناب کی عمر کتنی ہے۔ کہا کہ جب تمہارے دادا صاحب کی لڑائی محمد صاحب سے ہوئی تھی تو فقیر کی اتنی عمر تھی۔ سعد اللہ خان وزیر نے کہا، ماشاء اللہ آپ مودخ بھی بہت بڑے ہیں۔ داراشکوہ بولے، ایسا نہ کہو، بزرگوں کے اصرار ہوتے ہیں یا اور کسی کا قصہ ہو۔

کاندھلہ میں ایک شاہ صاحب آئے۔ مولانا مظفر حسین صاحب، اُن سے ملنے گئے۔ شاہ صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب! تنہائی میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھوں گا۔ مولوی صاحب نے دل میں کہا کہ خدا جانے نصرت کا کون سا دقیق مسئلہ پوچھیں گے۔ اب سینے شاہ صاحب کیا مسئلہ پوچھتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ محمد صاحب کی جو اتنی شہرت مشرق و مغرب میں ہوئی ہے وہ کس کے مرید تھے۔ کیا بڑے پیر صاحب سے آپ نے بیعت کر لی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا، کم نجرت! فقیر بنا پھرتا ہے۔ لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔ ملعون تو کیسا مسلمان ہے! تجھ کو اتنی خبر بھی نہیں کہ بڑے پیر صاحب تو حضورؐ کی اولاد ہیں اور آپ کے اُمّتی ہیں۔ غرض قصہ سے نکلوا دیا۔

ایک صاحب قنوج میں تشریف لائے۔ لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا اور سب کو یہ تعلیم کی کہ نماز میں قرائت زبان سے مرت پڑھو۔ دل میں خیال کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید تھی کہ کسی سے کہتا نہیں۔ غرض لوگوں کی نمازیں خوب تباہ کیں! آخر کسی طرح وہاں کے رؤساء کو خبر ہو گئی تب اُس کو نکلوا دیا۔

غرض پیری مریدی کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اس کا کوئی صیح معیار ہی نہیں

رہا۔ صرف معیار یہ رہ گیا ہے کہ جس طرف مخلوق جا رہی ہے اُسی طرف ہولٹے۔
 اشعب طماع کا قصہ ہے کہ لڑکے اُن کو بہت چھیڑا کرتے تھے۔ جب
 زیادہ پریشان ہو جاتے کہہ دیتے کہ یہاں کیا رکھا ہے فلاں امیر کے گھر مٹھائی
 تقسیم ہو رہی ہے یا کھانا بٹ رہا ہے وہاں جاؤ۔ لڑکے یہ سُن کر امیر کے گھر
 کی طرف دوڑتے تو کچھ دیر میں آپ بھی اُسی طرف کو دوڑتے۔ کوئی کہتا کہ میاں
 تم کیوں چلے۔ تو کہتے کہ شاید مٹھائی تقسیم ہی ہو رہی ہو کیونکہ لڑکے بھاگے جا
 رہے ہیں۔ حالانکہ آپ ہی نے اُن کو بھگا یا تھا۔

یہی حال یہاں ہے کہ عوام الناس کہہ دیتے ہیں کہ جب اتنے آدمی اُس
 کے پاس جاتے ہیں تو پیر میں کچھ تو ہوگا اور پیر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جب اتنے
 آدمی میرے معتقد ہیں تو میں بھی کچھ ہوں گا۔ حالانکہ خود ہی اُن کو دھوکا دیا ہے۔
 مگر خود بھی اپنے دھوکا میں آگئے۔ آج کل بزرگی کا معیار اکثر تو یہ رہ گیا ہے کہ
 بڑے بڑے لوگ جس کے مرید ہوں تو بس وہ پیر ہے یا جس کو کشف ہوتا ہو وہ
 پیر ہے۔ اگر کشف ہی پر دار و مدار ہے تو شیطان کو ایسا کشف ہوتا ہے کہ بڑوں
 بڑوں کو بھی نہیں ہوتا۔

دیکھتے بدر میں بڑے بڑے صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے
 شیطان بھی کفار کے لشکر میں تھا اور اُن سے آکر کہا کہ میں تمہارا حامی ہوں۔ لوگ
 کوئی سرواڑہ سمجھے۔

فلما تراءت الفتنان نكص على عقبيه وقال انى برئ

منكم انى ادى مالا ترون۔

کہ جب دونوں جماعتیں مقابل ہوئیں اور فرشتوں کا نزول ہوا تو شیطان صاحب گھبرا گئے اور کہا کہ مجھے ایسی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں کہ تمہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ حالت دیکھ کر شیطان تو بھاگ گیا اور بہت سے کفار کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ اب دیکھ لیجئے کہ بہت سے صحابہ تو فرشتوں کو نہ دیکھ سکے اور شیطان نے دیکھ لیا۔

قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو جانوروں کو معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کنٹوں اور بلیوں کو کشف قبور ہوتا ہے۔ مگر آج کل پیری کی یہ خاص علامت ہے۔ بھلا جو چیز حیوانات تک میں مشترک ہو وہ کیسے انسانی کمال ہو سکتی ہے انہوں نے یہ لوگ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

بعضوں نے بزرگی کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ تصرف کر کے لوگوں کو لوٹ پوٹ کر دے پس وہ بزرگ ہے۔ اگر یہی معیار ہے تو ایسا تو ہوگی بھی کر دیتے ہیں جو کافر محض ہیں بمسمریزم والے کیا کیا نہیں کرتے۔ عجیب عجیب کام کر کے دکھلا دیتے ہیں۔ تو چاہئے یہ سب بھی بزرگ ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس سے خرق عادت صادر ہو وہ بزرگ ہے اگر یہی حال ہے تو خرق عادت و تہال سے زیادہ کسی سے بھی صادر نہ ہوگی۔ زمین کے خزانے تک نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ ایک صالح شخص اس کی خدائی کا انکار کرے گا۔ پس وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ پھر اس کو زندہ کرے گا۔ وہ پھر انکار کرے گا۔ مگر وہ پھر اس پر قادر نہ ہوگا۔ اگر تصرفات اور خوارق دلیل بزرگی کی ہیں تو و تہال بڑا بزرگ ہونا چاہئے۔ پس یہ سب معیار تو غلط ہیں۔

شیخ کامل کا معیار | شیخ کامل کے معیار کی چند صفات ہیں۔ اُن صفات کو سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔

ایک یہ کہ بقادر ضرورت اُس کو علم دین حاصل ہو۔ جاہل محض نہ ہو۔ دوسرے اُس کو علماء سے موانست ہو نفرت نہ ہو۔ اگر پیر جاہل ہے اور اس کو علماء سے نفرت ہے تو جب اُسے مسائل کی ضرورت ہوگی، تو اپنی رائے پر عمل کرے گا اور گمراہ ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ عاقل ہو شریعت پر تتبع سنت ہو، شریعت کے خلاف عدا نہ کرنا ہو کیونکہ جو شخص گویا تعلیم پر قادر ہو خود عمل نہ کرتا ہو تو اُس کی تعلیم میں برکت نہ ہوگی۔

چوتھے یہ کہ کسی شیخ مسلم عند العلماء سے مجاز بھی ہو۔

پانچویں یہ کہ اُس کی صحبت میں یہ اثر ہو کہ روز بروز دنیا سے دل افردہ ہوتا جاتا ہو اور آخرت کی رغبت بڑھتی جاتی ہو۔

مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

کارِ مرداں روشنی و گہمی ست کارِ دونوں حیلہ و بے شرمی ست

اور مکار بیرون کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے بہت پس پیر دستے نباید داد دست

تو یہ منصب بھی بہت بڑا ہے اس میں بھی وہی تفصیل ہے کہ کسی شیخ کی

طرف سے مقرر کیا گیا ہو۔ اب تو پیری بھی ایک رسم ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی خاندان

میں کوئی اُن کے بڑے پیر ہو گئے۔ پس اُن کی نسل میں پیری چل پڑی۔ جب اُن

کسی کو صاحب سجادہ بناتے ہیں تو سب لوگ جمع ہو کر اُن کے سر پر پگڑی
 باندھتے ہیں۔ گویا یہ سر پر پگڑی باندھتے ہیں کیونکہ پیر کی نسل تو خود پیر ہوتی
 ہے۔ پھر اُن کے سر پر پیری کی پگڑی باندھی تو اور زیادہ پیر ہو گئے، پھر اُن میں
 اہل ہوتے ہیں وہ تو کسی شیخ کا مل کی طرف بغرض اصلاح رجوع کر لیتے ہیں رنہ
 باندھتے ہیں ہی۔

چنانچہ گنگوہ میں ایک پیر زادہ تھے۔ اُنہوں نے اپنی بی بی کو مجھ سے بیعت
 لایا۔ کسی نے اُن سے کہا کہ تم تو خود پیر ہو خود کیوں نہ بیعت کر لیا۔ اُنہوں نے
 بیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم تو اس کے پیر ہیں (یعنی کھانے کمانے کے پیر ہیں)
 ہم کہاں سے پیر ہوئے تھے تو بعض ایسے منصف مزاج بھی ہیں مگر شاذ۔
 غرض حضرت یہ بہت ہی بڑا منصب تھا مگر اس منصب کی اب یہ
 دگت ہو رہی ہے کہ عوام الناس اُس کی دستار بندی کرتے ہیں۔ جب دستار بندی
 ہو گئی اور بڑے ہو گئے مگر ہیں جاہل، تو اب اُن کو تعلیم حاصل کرنے اور کسی کا مل
 کی طرف رجوع کرنے سے عار آتی ہے کیونکہ بڑا ہو کر چھوٹا نہیں ہوا سجاتا۔ ایسے
 پیر قابل اس کے ہیں کہ اُن کو خیر خواہی سے یہ خطاب کیا جاوے۔

ایسے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی

تار راہ میں نہ باشی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق

ہاں اے پسر بکوش کہ رونے سے پدر شوی

باقی بدون شرائط کے محض اپنی رائے سے پیر بن جانا خود راہی ہے اور

سلوک میں خود رانی وہ چیز ہے جس کی بابت کہتے ہیں ۔

فکر خود و رائے خود در عالم زندگی نیست

کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رانی

دیکھئے عارف شیرازی ایسے لوگوں کو کافر کہتے ہیں یعنی کافر طریقت ۔

ایسے مشائخ جو حقیقت میں خود رائے ہیں وہ خود و پیر میں حقیقی پیر نہیں ۔ ایسے پیر کی علمی تحقیقات دیکھئے تو قابل دید ہیں ۔

ایک ایسے ہی پیر والضحیٰ کی تفسیر بیان کر رہے تھے والضحیٰ واللیل ہا

اے نفس تیری بھی سجاد سزا، ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا ان کو مشن کے لئے مل گیا ۔

اس کا وہ ناس مارا ہے کہ خدا کی پناہ ۔ وحدۃ الوجود جو حق کے موافق ہے اس

تو کلام نہیں ۔ باقی یہ لوگ جو اس کے متعلق تحقیقات بیان کرتے ہیں باطل ہو

کے ساتھ مصحکہ آمیز بھی ہیں ۔

ایک ایسے ہی پیر کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود قل یا سے ثابت ہے کہ

نے کہا کہ قل یا سے کیسے ثابت ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ دیکھو قل یا

ایہا الکافرون لا اعبدا ما تعبدون ۔ اس میں لا زائد ہے یعنی اعبدا ما تعبدون

ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اے کافرو! میں بھی اسی چیز کی عبادت کرتا ہوں تو وہ

کے معبود یعنی بت اور خدا تعالیٰ تعوذ باللہ ایک ہوئے ۔ اب ان سے کوئی

کہ دلیل کیا ہے لا کے زائد ہونے کی ۔ سو وہ دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک

دفعہ نماز میں قل یا پڑھی تھی تو لا چھوڑ گئے تھے انہوں نے اس تک سے

اس بات کو ظاہر کر دیا کہ لا زائد ہے ۔ پھر اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ تو حالت

س ترک ہو گیا تھا۔ اُس کا جواب یہ عطا ہوا تھا کہ برائے نام شراب پی لی تھی تاکہ
حکام مولویوں کے فتویٰ سے بچ جاؤں اور سکر وغیرہ کچھ نہ تھا۔ خدا کی پناہ پھر
ان خرافات کو فقیری کے نکات سمجھتے ہیں۔

نکات پر یاد آیا۔ ہمارے یہاں ایک رئیس تھے قاضی امیر احمد وہ کہتے
تھے کہ میں ایک دفعہ پیران کلیر میں موجود تھا ان کو دو درویشوں نے پکارا، اور مرنے
ادھر آ۔ اُن کو خیال بھی نہ ہوا کہ مجھ کو کوئی پکارتا ہوگا۔ پھر پکارا، اور مرنے ادھر آ
اس پر انہوں نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ آخر یہ کس کو کہہ رہے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ
ابے ہم تجھ ہی کو تو بلارہے ہیں۔ اُن کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے تماشا دیکھنے
چلے گئے کہ دیکھوں کیا بات ہے جب اُن کے پاس پہنچے تو کہا بیٹھ جا، دیکھ
مرشد کا نکتہ سن۔ کہنے لگے کہ جب خدا نے بندوں سے احکام کا اقرار لیا تھا
تو درویش تھے اگلی صف میں اور مولوی تھے پیچھے کی صف میں۔ خدا نے رنحوذ باللہ
بھنگ بوزہ کا حکم فرمایا تھا۔ چونکہ مولوی دور تھے بھنگ بوزہ کا نماز بوزہ سن
لیا اور درویشوں نے بھنگ بوزہ ہی سنا۔ اس لئے ہم اس میں مشغول ہو گئے اور وہ
اس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد کہا کہ جا مرشدوں کا یہ نکتہ یاد رکھنا، بھولنا مرنے
ایک اور قصہ ہے۔ ایک درویش نے مولوی فیض الحسن صاحب سے کہا کہ
مولوی تبتلا چار میم کون سے ہیں۔ وہ اس مہل بات کو سن کر خاموش ہو گئے۔ بقول
شخصیکہ ج

جواب جابلال باشت خموشی

درویش نے کہا کہ نہیں تبتلاتا تو چوغہ مولویت کا اتار کر رکھ اور اس کو فقیر
سے سن کہ چار میم کون سے ہیں۔ مولا، محمد، مکہ، مدینہ۔ یہ ہیں چار میم اور اس نکتہ کو

یاد رکھو۔ بھولیو موت!

ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ ایک فقیر نے اُن سے کہا، بتلاؤ
 کا مرتبہ بڑا ہے یا رزق کا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ
 سے بڑھا ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بے پیر معلوم ہوتا ہے اور سونٹا سر
 گھما کر جیسے ان لوگوں کی عادت ہے، کہنے لگا دیکھ، اذان میں ہے اشہد ان
 محمد رسول اللہ۔ اس میں اُن پہلے ہے اور محمد بعد میں۔ اُن رزق کو کہتے ہیں
 لئے رزق کا مرتبہ بڑا ہے۔

یہ تصوف کے محققین ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے اس کی رکھا ہے لوگوں
 بس یہ عوام الناس کا دیا ہوا منصب ہے کہ چند جاہل باہم جمع ہو گئے اور کسی
 پیر بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے تو ایسے ہی جاہل پیر پیدا ہوں گے۔ حقیقی پیر
 طرح ٹھوڑا ہی بنتا ہے۔ میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ واعظ اور پیر خود بنتا جائز نہیں
 بلکہ کسی محقق کے امر و اذن کے بعد اس منصب کو قبول کرنا جائز ہے

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ حکومت کی خواہش
 طلب منصب کی صورت

قانون تو یہ ہے کہ طالب التولیتہ لایولی۔ جو خود حکومت کی درخواست کرے
 کو حاکم نہ بنایا جائے۔

اس پر اگر کوئی کہے کہ جب اصل قانون یہ ہے کہ خود حکومت کی درخواست
 کرنا درست نہیں اور ہر شخص اس پر عمل کر کے کوئی بھی درخواست نہ کرے
 جو درخواست کرے وہ حاکم نہ بنایا جاوے اور دوسروں کو اس کی اہلیت

صلاحیت کی اطلاع نہ ہو تو پھر دنیا کا انتظام کس طرح ہو۔
 اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک استثناء ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی کام
 ضروری ہو اور کوئی اہل موجود نہ ہو اور ظاہراً یہ شخص اس کا اہل ہے اور اس کو امید
 ہے کہ میں کام کر سکتا ہوں۔ ایسے شخص کو درخواست کرنا درست ہے۔ دلیل
 اس کی حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے کہ جب بادشاہ نے اُن سے کہا
 تھا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظام کون سر و سرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں
 کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اُن کا مقولہ یہ ہے کہ

اجعلنی علی خزائن الارض یعنی مجھ کو ملک کے غلہ کے

انی حفیظ علیم خزانوں پر مقرر کر دیجئے میں اس

کی خوب نگرانی کروں گا۔ میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

تو گو اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی تعریف خود کر رہے ہیں کہ میں ایسا
 ہوں اور ایسا ہوں۔ لاؤ حکومت مجھ کو دے دو مگر آپ کو یہ یقینی طور سے معلوم
 تھا کہ یہ کام ضروری اور عظیم الشان ہے اور انتظام کا اہل کوئی ہے نہیں۔ اس لئے
 آپ نے اس موقع پر تواضع سے کام نہیں لیا ورنہ ساری مخلوق تباہ ہو جاتی۔ بلکہ
 آپ نے اظہار نعمت کے طور پر اپنے واقعی اوصاف بیان فرما دیئے تاکہ بادشاہ
 کو پورا اطمینان ہو جاوے کہ ہاں یہ کام آپ خوب کر سکتے ہیں۔ آپ کو بھروسہ
 تھا کہ میں اس کام کو بخوبی کر سکتا ہوں۔ اس لئے آپ نے خود درخواست کی
 پس اگر کسی زمانہ میں کسی شخص کو اپنی نسبت یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت
 پہنچا سکتا ہوں۔ اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضہ میں پہنچے گی تو راحت نہیں

احکام الجہاد

مل سکتی اور اس کو بھروسہ ہو کہ میں آرام پہنچا سکتا ہوں اور شریعت کے موافق حکومت و انتظام کر سکتا ہوں۔ اور اس کو مال و جاہ کی بالکل پروا نہ ہو۔ تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے، اور ہمارے نزدیک عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی سلطنت کیلئے سعی کرنا بھی اسی وجہ سے صحابہ یہ صورت ہو کہ کوئی حاکم نہ ہو تو غیر قوم سے ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کی بڑی گنت بنائی جائے گی۔ تو درخواست کرنا حکومت کی اس صورت میں بھی جائز ہے۔ مگر اس میں بھی دو شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو۔

دوسرے جاہ مقصود نہ ہو۔

یہ اور بات ہے کہ مال و جاہ از خود حاصل ہو جاوے مگر مقصود نہیں لیکن اب تو یہ کیفیت ہے کہ مال و جاہ ہی مقصود ہو گئے ہیں۔ حق و ناحق سے بھی کچھ بحث نہیں رہی، نہ اہلیت و عدم اہلیت سے۔

چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک جاہل بدلیاقت آنریری مجسٹریٹ ہو گئے تھے بوجہ عدم لیاقت کے حیران تھے کہ فیصلے کیسے کروں گا۔ فیصلہ کا طریقہ دیکھنے کسی حاکم کے اجلاس میں پہنچے اور اتفاقاً اس حاکم کے پاس دو شخصوں نے اپنی اپنی عرضیاں پیش کیں۔ حاکم نے ایک کو کہہ دیا منظور اور دوسری کو کہا نا منظور۔ آپ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ جب یہ اپنے اجلاس میں بیٹھے بہت سی عرضیاں پیش ہوئیں۔ آپ نے کیا کیا کہ ایک کو منظور اور ایک کو نا منظور کرنا شروع کر دیا۔ طاق سلسلہ میں تو منظور اور حجت میں نا منظور بعض لوگ

یامی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ جیسے بعضے مدرس کیا کرتے ہیں۔ کسی طالب علم کا خطا چھا دیکھ لیا۔ بس اور باتوں میں بھی اس کو پاس کر دیا۔ اس میں بڑی خیانت ہوتی ہے۔ حضرت ساری خرابی اس کی ہے کہ کام نا اہلوں کو سونپ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی کام کسی کے سپرد کیا جاوے تو اس کی لیاقت اس کو ہونا چاہئے۔

حکومت میں بڑی مشقت اور دلسوزی کرنی پڑتی ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ حاکم اگر قصہ کہے

حضور کی بدنی قوت

خلق کی نفع رسانی کا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے تمام کاموں میں مدد ہوتی ہے مگر دلسوزی کی ضرورت ہے۔ میں تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں مشائخ کو بھی، اطباء کو بھی، عہدہ داروں کو بھی کہ دوسروں کو وہی شخص راحت پہنچا سکتا ہے جو اپنے اوپر تکلیف اٹھائے اور جو شخص خود آرام طلب ہوگا، وہ شخص دوسروں کو آرام نہیں پہنچا سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا۔ آپ کے ساتھ صحابہ کی یہ جان تھاری تھی کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار تھے۔ آپ کی ذرا سی تکلیف بھی ان کو گوارا نہ تھی مگر باایں ہمہ آپ کو دوسروں کی راحت رسانی کی کتنی فکر رہتی تھی۔ اس کو احادیث سے معلوم کرو۔

ایک دفعہ سفر میں اونٹ کم تھے۔ آپ نے فرمایا کہ سب باری باری اترتے چڑھتے چلو اور سب سے پہلے اس قانون پر حضورؐ نے عمل کیا۔ ہر چہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ نہ اتریں مگر حضورؐ نے نہ مانا اور فرمایا کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی نہیں۔ ثواب کی

حاجت مجھ کو بھی ہے۔ کہ پیادہ چلوں اور ثواب ملے، اور میں کچھ کمزور
کہ چل نہ سکوں۔

آپ کے قوی ظاہری بھی سب سے اچھے تھے۔ آپ میں تو
ہی کمال کی صفتیں تھیں۔ آپ کی تو شان یہ تھی۔

حسن یوسف رحمہ اللہ یذہبنا داری آنچہ خواباں ہمہ ارند تو تنہا داری
حضور کی جسمانی قوت کا یہ حال تھا کہ عرب میں ایک پہلوان تھا کہ
جو کہ ایک ہزار آدمیوں کا مقابل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے اس کو
کی دعوت دی۔ اس نے کہا میں ایک شرط سے مسلمان ہوتا ہوں کہ آپ مجھ
کشتی میں بچھاڑ دیں۔ بھلا کہاں حضور اور کہاں کشتی! آپ نے کشتی کی کہاں تعلیم
تھی۔ مگر آپ نے فرمایا، اچھا۔ چنانچہ کشتی ہوئی اور آپ اس پر غالب آئے
اس نے کہا، ایک دفعہ نہیں بلکہ دوبارہ پھر کشتی ہو۔ اگر یہ بچھاڑنا اتفاقاً ہوتا،
حضور دوبارہ ہرگز منظور نہ فرماتے۔ مگر دوبارہ پھر کشتی ہوئی اور حضور اس دفعہ
بھی اس پر غالب آئے۔ وہ مسلمان ہو گئے اور سمجھ گئے کہ واقعی آپ
من اللہ ہیں۔

عزیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بدنی قوت بھی بہت تھی۔ اس لیے
آپ نے فرمایا میں کمزور نہیں پیادہ چلوں گا۔ عزیز آپ دوسروں کی راحت
کے لئے خود تکلیف برداشت فرماتے تھے۔ آپ کی وراثت میں ایسی زنگ
حضرات صحابہ کا تھا۔

دیکھئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ شریف پہنچے

تو آپ جس وقت مجلس میں تشریف فرما تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی خدمت میں حاضر تھے۔ لوگ زیارت کو آتے تھے۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ ذرا زیادہ بزرگ معلوم ہوتے تھے، لوگوں کو حضرت صدیقؓ کی صورت دیکھ کر یہ گمان ہوا کہ حضورؐ یہ ہوں گے۔ اس لئے ان سے مصافحہ کرتے رہے اور حضرت صدیقؓ نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ سے نہیں بلکہ حضورؐ سے مصافحہ کرو۔ کیونکہ اس سے حضورؐ کی راحت میں خلل پڑتا۔ جب ذرا آفتاب بلند ہوا اور دھوپ آئی تو صدیق اکبرؓ پاؤں دھو کر آپ پر سایہ کرنے کی غرض سے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ آپ ہیں۔ دیکھے ابوبکرؓ نے آپ کو مصافحہ کی بھی تکلیف نہیں دینے دی مصافحہ کی تکلیف کو خود گوارا کر لیا۔ یہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نیت ادب تھا کہ آپ وقایہ ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ تکلیف نہ پہنچے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خود پیدل چلے اور فرمایا کہ میں تو تباہ نہیں ہوں۔ پھر کیوں نہ پیادہ چلوں کہ ثواب ملے۔ غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو اتنا محتاج بنانا سچا ہوتے ہیں خدا تعالیٰ کا کہ ذرا ذرا سے ثواب کے طالب ہیں، مگر بعض لوگوں کی آج کل یہ حالت ہے کہ آپ کو خدائی کے رتبہ تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے وہ اوصاف ثابت کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خاص اوصاف ہیں مثلاً علم غیب محیط کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق نہیں دیکھتے کہ میں خدا تعالیٰ کا محتاج رہوں اور مجھے ثواب ملے کیسے

حضور کا اصلی مذاق

حضرت عاشق کی بھان بھی ہوتی ہے کہ اس کو کسی حالت پر بس نہیں ہوتی۔ اس کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔

دل آرام و دل آرام جوئے لب از تشنگی خشک بر طرف جوئے
نگویم کہ بر آب قادر نیست کہ بر ساحل نیل مستحق اند
اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضورؐ ثواب کے طالب ہوئے خدا کے طالب نہ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جس چیز کو مطلوب قرار دے دیں گے، عاشق کو اس کی بھی طلب ہوگی اور وہ خدا ہی کی طلب ہے اور اس لئے اس کو ان چیزوں کی رغبت کرنا بھی لازم ہے چنانچہ از ثناء ہے و فی ذلک فلیتناہض المتناہضون۔ عاشق کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازین
پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ثواب حاصل کرنے کے لئے پیدل سفر میں ہیں تو اب کون شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہو۔ مگر آج کل لوگ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں اور یہی دلیل ہے کہ بڑے بننے کے لائق نہیں اور اس پر متفرع ہوتا ہے کہ منصب حکومت ہر شخص کے مناسب نہیں بلکہ اس شخص کے لئے جائز ہے کہ اپنے کو تکلیف اور دوسروں کو راحت دینا چاہتا ہو۔

جاہ طلبی | بہر حال جاہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کی جانب حاصل ہو خواہ من جانب المخلوق ہو یا من جانب الخالق۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اپنی جانب سے ہو پس جو اپنی جانب سے ہو اس کو

اُس کے ذرائع خود بہم پہنچائے جائیں وہ بجز خاص حالات کے ناجائز ہے
آج یہ کیفیت ہے کہ عوام الناس سے مہربانی وغیرہ کی درخواست کی جاتی
ہے کہ ہمارے واسطے پرچہ دینا۔ پرچوں کے واسطے تیری میری خوشامد کرتے
رہتے ہیں۔ بعض لوگ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتے ہیں۔ رشتوں دیتے ہیں
بسمجھ لو کہ اس میں برکت نہیں ہوتی اور خدا کی مدد بھی نہیں ہوتی۔ البتہ اگر
کو بلا طلب کوئی عہدہ مل جائے تو اُس کو خدا کی مدد ہوتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کو قضا کا عہدہ ملتا تھا مگر آپؒ نے قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جیل
تہ میں بھیجے گئے۔ دیکھئے آپ کو اس قدر نفرت تھی قضا سے اور عجیب لطیفہ یہ
کہ خلیفہ صفیر بن منصور نے اس جبر حاکمانہ کے ساتھ آپؒ سے عالمانہ مباحثہ
کیا۔ اس طرح سے کہ جب آپؒ سے منصب قضا قبول کرنے کے لئے
ایکا تو آپؒ نے فرمایا کہ میں اس لائق نہیں ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ آپؒ جھوٹ
اتے ہیں۔ اس پر آپؒ نے فرمایا کہ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے والا
میں حکومت کے لائق نہیں ہوتا۔ تمام دربار میں اس جواب سے سناٹا ہو گیا
کسی سے جواب نہ بن پڑا۔

صاحبو! ہمارے سلف تو اتنا ڈرتے تھے قضا اور حکومت سے، مگر
آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اور اس کے لئے ذرائع پیدا کئے جاتے ہیں
میں سفارش کرائی جاتی ہے کہیں دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ سوان ذرائع کا استعمال
ائز نہیں۔ ہاں اگر منہاجب اللہ مل جاوے تو خیر مگر بے عزتی کیوں اختیار کی جائے
وہ یہ کہ لوگوں کی خوشامد کی جاوے اور مال خرچ کیا جاوے۔ سو یکمیرے کئے

جہاں اس وقت تو یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک شخص کا منبر بھی مقدم
اور وہ غریب حاجت مند بھی ہے مگر پھر بھی دوسرا شخص اس کے مقابلہ
کے لئے درخواست کرتا ہے۔ حالانکہ یہ قابلیت میں بھی اس کے برابر
اور وہ غریب محتاج ہے مگر پھر ملے کہتے ہیں کہ عہدہ ہم کو ہی ملنا چاہئے
ہم زمیندار ہیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں حالانکہ یہی وجہ دوسرے کے
اور اس کے عدم استحقاق کی تھی۔

جو لوگ آج کل ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں کیا وہ اس کی کوئی نظیر پیش
کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی درخواست کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں منسوخ
دیا ہوا اور اثار اور ہمدردی سے کام لیا ہو۔ غالباً وہ ایسی ایک نظیر بھی پیش
کرتے۔ وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ ان کو صرف مال و جاہ مقصود ہے اور
نہیں۔ زبان پر ہمدردی کے الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں۔ آج کل
کیا ہمدردی ہے جس میں خلوص کا پتہ ہی نہیں۔

حضرت علی خوام قرآتے ہیں کہ اگر کسی جگہ کوئی عالم ہو اور دین کا کام
رہا ہو اور سمجھتا ہو کہ میں یہ کام ثواب کے لئے کر رہا ہوں۔ یا کوئی پیر ہو اور
تربیت باطنی کر رہا ہو اور دل میں یہ سمجھتا ہو کہ میں دین کے لئے یہ کام کر
ان دونوں کو ایک علامت سے اپنے خلوص کا امتحان کرنا چاہئے
علامت یہ ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص اچھا ہے اور وہ بھی
جیسا یا اس سے اچھا کام کر سکتا ہو تو دیکھنا چاہئے کہ یہ شخص کام کو اچھا
پیر کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کے پیر کو دے اور خود اس کام سے

رے اور کسی دوسرے کام میں لگ جاوے تو وہ مخلص ہے اور اگر اسی فکر ہو کہ یہ کہاں سے امراء نکلاؤ اس کو تو مخلص نہیں دیا کا رہے۔
اسی طرح سبب و مال کے مقصود نہ ہونے بلکہ خدمت خلق مقصود ہونے کی علامت یہ ہے کہ اگر یہ دیکھو کہ ہمارا بھائی ہم سے اچھا کام کرے گا، تو تم اس چھوڑ دو تاکہ وہ دوسرا شخص اس منصب پر فائز ہو جائے۔ دوسرے کو بنانا ہے کہ خود اس کام سے الگ ہو جاؤ۔ اور جو شخص ایسا ہو گا وہ اپنی میعاد طاعت ماننے کے لئے یا عہدہ حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹری سٹریٹجیٹ کیوں حاصل کرے گا مگر آج کل تو اس حکومت اور منصب کے لئے روپیہ خرچ کر کے ڈاکٹریٹجیٹ حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ صراف علامت ہے اس کی کہ خدمت مقصود نہیں بلکہ سبب و مال مقصود ہے۔ یہاں تک تو سبب کے حاصل کرنے کی جگہ تھی۔

۱۰۔ کا مصروف اب باقی رہا سبب کے صرف اور استعمال کرنے کا قاعدہ کہ سبب کہاں صرف کی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سبب کے مواقع مختلف ہیں اور ہر ایک کا جدا حکم ہے اور اس کے متعلق کی قاعدہ یہ ہے کہ جہاں استعمال سبب سے دوسرے شخص کی منفعت مقصود یعنی جس دوسرے پر سبب کا اثر ڈالا جا رہا ہو اور اس منفعت کی تفصیل اس شخص کی ہے تو اس صورت میں سبب سے کام لینا جائز بلکہ واجب ہے۔ ایک شخص نماز نہیں پڑھتا اور ہم اپنی سبب کے اثر سے اس کو نماز پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تو اس موقع پر صرف سبب واجب ہے۔ حاکم اپنے ملازموں سے

بادشاہ اپنی رعایا سے نماز پڑھوا سکتا ہے۔ اُثناءِ شکرِ دلوں سے، شوہر بیوی سے، باپ اولاد سے حکومت کے ساتھ یہ کام لے سکتا ہے۔ تو ان لوگوں کو واجب ہوگا کہ اپنی جاہ سے کام لیں اور ماتحتوں سے نماز پڑھوائیں۔

ایک صورت اس کے مقابل یہ ہے کہ استعمالِ جاہ سے دوسرے کی مصلحت مقصود نہیں بلکہ اپنی ہی منفعت مقصود ہے۔ اس صورت میں جاہ کا کام لینا جائز نہیں جیسے رئیسوں کی عادت ہوتی ہے کہ ریل پر جانے کو تانگہ لگا کر اب اس سے اجرت ملے نہیں کرتے ویسے ہی تانگہ میں سوار ہو جیتے ہیں۔ ایسے پہنچ کر ایک آنہ دو آنہ اس کے ماتحت پر رکھ دیتے ہیں۔ وہ غریب ان کی جاہ و جہ سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ صورت حرام ہے بلکہ یا تو ابتدا میں اجرت ملے کر عرف عام کے موافق اس کو پوری اجرت دے۔

اسی قبیل کی ایک صورت یہ ہے کہ تحصیلدار صاحب، محتایدار صاحب کسی جگہ پہنچے اور لوگوں نے ان کے واسطے سواری خود ہی پیش کر دی۔ ظاہر ہے ہدیہ کی صورت ہے مگر حدیث میں حکام کو رعایا سے ہدایا لینے کی ممانعت اور شریعت کا فتویٰ ہے ہدایا الاصل و غلول۔ ہاں اگر کسی کا تعلق آپ کے ساتھ پہلے سے دوستی یا قرابت کا ہو کہ وہ پہلے بھی آپ کو ہدیہ دیا کرتا ہو تو ایسے شخص کا ہدیہ لینا حکومت کے بعد بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں جاہ سے نہیں آیا بلکہ چاہ سے یعنی محبت سے آیا ہے۔ غرض شریعت صاحبِ جاہ کو زور ڈالنے کی اجازت نہیں دی۔ ہاں خوش دلی سے محتاج کوئی ان کی خدمت کرنے کو اس کا مقصد لقمہ نہیں مگر محبت اور خوش

پہچاننے کی سنت ضرورت ہے کہ حکام سے محبت لوگوں کو کم ہوتی ہے۔ خوف اور غرض کا تعلق زیادہ ہے اس لئے حکام کو سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور ان ہی حکام میں میانجی لوگ بھی داخل ہیں جو اپنے اثر کو بے ساحل میں صرف کرتے ہیں۔ یہ لوگ خوب کان کھول کر سن لیں کہ شاگردوں سے ہر قسم کی خدمت لینا ان کو جائز نہیں۔

مثلاً شاگردوں سے کہتے ہیں کہ ذرا پانی پلا دینا، ذرا پنکھا بھل دینا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت سخت کام شاگردوں سے لیتے ہیں اور مقصود محض استہدام ہوتا ہے بجایہ لوگ کس معاوضہ میں شاگردوں سے کام لیتے ہیں۔ کیا پانی پلانے کے عوض میں ان کو شاگرد بنایا تھا۔ ان صورتوں میں بھی ایسے شخص سے کام لیا گیا ہے جس سے کام لینا جائز نہیں۔ ہاں مصلحت تادیب سے جائز ہے بشرطیکہ غرض بھی تادیب ہو نہ کہ اپنے آپ کو راحت پہنچانا بلکہ مقصود یہ ہو کہ شاگرد کو کام کا سلیقہ آ جاوے اور اس کے لئے بھی ولی سے اجازت لینا شرط ہے۔ اور ولی کے واسطے یہ قانون ہے کہ جس میں اس شاگرد کی مصلحت ہو اس کی اجازت دینا ولی کو جائز ہے جب ایسی صورت ہو تو بے شک استاد کو شاگرد سے کام لینا جائز ہے۔ نہ یہ کہ اپنی راحت کے لئے ٹھنڈی ہوا پنکھے سے کرار ہے ہیں۔ اس بیچارہ کو کئی کئی گھنٹے پنکھا بھلتے ہو جاتے ہیں۔ نہ پڑھتے ہیں نہ یاد کرتے ہیں۔ گھنٹوں ان سے پاؤں دبواتے ہیں بڑی بڑی خدمتیں لیتے ہیں۔ ایسا تصرف کرنے کا تو خود ولی کو بھی اختیار نہیں۔ پھر جس کو ولی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت ہو اس کو تو ایسا تصرف کرنا کب جائز ہوگا۔ بس استاد تو آج کل بچوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں جیسے غلام۔ جہلاء یوں کہتے

ہیں کہ جان خدا کی اور ہڈیاں ہاں باپ کی اور گوشت اُستاد کا۔ خوب سمجھ لو کہ اُستاد کو شاگرد پر حق ملک نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لئے شریعت میں خاص حدود ہیں۔

میاں جی لوگوں کی یہ حالت ہے کہ بی بی پر تو خفا ہو کر آئے اور بچوں پر غصہ نکالا اور تمہی بھائی شروع کر دی۔ ایسے ظالموں کو شاگرد بھی ایسے ہی مل جاتے ہیں جو درحقیقت ان کی مقبوتہ ہیں۔ چنانچہ ان میں بعض طلباء تو وہ ہیں جن میں ادب ہی نہیں ہوتا اُستادوں کا جیسے تعلیم جدید کے طلباء میں کہ وہ اُستاد کو اُستاد ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسکول کا نوکر سمجھتے ہیں اور بعض شریک لڑکے ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں تو ادب کرتے ہیں مگر دل سے ادب نہیں کرتے اور بعض اُستادوں سے خیانت بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ لوہاری میں ایک میاں جی تھے۔ لڑکے ان کی چیزیں چڑا کر کھا جاتے ان کے پاس کسی جگہ سے بہت سے بتائے آتے تھے۔ انہوں نے لڑکوں سے بچانے کے لئے ایک بدھن میں ان کو بھر کر اوپر سے چھنی ڈھال کر اٹھا لگا دیا۔ لڑکوں نے کمیٹی کی کہ کسی طرح بتائے کھانے چاہئیں۔ مگر اس میں حیران تھے کہ کیا تیر کرین کیونکہ لوٹے کے منہ کو اٹھا لگا ہوا ہے۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ اس میں ٹونٹی سے پانی بھر کر شربت بنا کر پی جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ کئی روز کے بعد میاں جی صاب کا بتائے کھانے کو جی چاہا۔ بدھنی مٹا کر جو مٹی بالکل میدان صاف ہو ایسوں کو ایسے ہی مل جاتے ہیں۔

غرض یہ میاں جی لوگ بہت ہی ظلم کرتے ہیں بچوں پر۔ حالانکہ ظلم کرنا کسی پر بھی

جو حرام ہے خاص کر عاجز بچوں پر اگرچہ باپ بھی اجازت دے دے پھر غضب
 کہ قصور نہ ہو کسی کا اور ایک طرف سے سب کو گھڑنا شروع کر دیتے ہیں۔
 قصہ میں ان کو خبر نہیں رہتی کہ کون قصور دار ہے اور کون بے قصور ہے۔ کوئی مقدمہ
 ہوتا ہے تو بلا تحقیق سب کو مارنا پٹنا شروع کر دیتے ہیں اور مارتے اس قدر ہیں
 جس کی انتہا نہیں ہے۔

حکام اور میاں جی کیلئے دستور العمل | میں عہدہ داروں کو بھی اور میاں جی
 لوگوں کو بھی ظلم سے بچنے کا ایک

دستور العمل بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ غصہ میں کسی مقدمہ کا فیصلہ نہ کیا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم نے ہم کو یہی سکھایا ہے۔

لا یقضی القاضی وهو غضبان کہ قاضی کو چاہئے کہ غصہ کی

حالت میں فیصلہ نہ کرے۔

میاں جی وغیرہ کو بھی چاہئے کہ غصہ میں نہ ماریں۔ جب غصہ آئے تو خاموش
 ہو جائیں۔ جب غصہ اتر جائے تو خود کریں کہ کتنی سزا دینی چاہئے اور ہر جرم پر
 ٹھہر یا قچیوں کا عدد مقرر کر لیں۔ یہ نہیں کہ بے طرح مارنا شروع کر دیا۔ خواہ ماتحت ٹوٹے
 یا ٹانگ کہ جو شخص اس دستور العمل کا لحاظ رکھے گا اس کے ماتحت سے ظلم نہ ہوگا۔

اب رئیسوں کی کیفیت سنئے کہ ذرا ملازم نے تین پانچ کی اور ان کو غصہ
 آیا اور نگے اُس پر بے بجا ڈھونڈتے پڑنے بلکہ ملازم تک بھی محدود نہیں ہے۔
 بے تعلق لوگوں پر بھی ظلم سے نہیں رکھتے۔

ہمارے یہاں کا قصہ ہے ایک شخص رئیس تھے اور بڑے متکبر۔ ایک

غریب قوم کے آدمی ہمارے حضرت حاجی صاحب کے مریدان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے اُڑے تھے۔ وہ رئیس صاحب بھی راستہ میں بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر بہت ہی ناگوار ہوا کہ اس نے بھی ہمارے جیسے صاف کپڑے پہنے ہیں۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ معلوم ہوا کہ قصائی ہے اور حاجی صاحب کا مرید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نے ہی اس کا دماغ خراب کیا ہے۔ بڑے ولی ہو گئے۔ میں اس غریب کو پاس بلا کر پانچ جوتے لگائے۔ اُس بیچارے نے کہا کہ شیخ جی خدا کے یہاں جا کر اس کا مزہ چکھو گے۔ یہ بات سن کر آپ کو اور مسخروں کو جھا کہ آپ نے اُس کے سامنے جوتار کھد دیا کہ تو اب میرے مار لے۔ اُس نے کہا، میری کیا مجال ہے جو ایسی گستاخی کروں۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اب تو سمجھ میں آگیا ہو گا کہ ہمیں خدا تعالیٰ کا ہی حکم ہے کہ تمہارے جوتے لگائیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے تو بلا اجازت بھی تم کو مار لیا اور تم اجازت سے بھی ہم کو نہیں مار سکتے اور تمہیں حکم نہیں۔

پھر اس ظلم کا سبب کیا تھا صرف تکبر یعنی اپنے کو بڑا سمجھنا کہ یہ قصائی ہے اور ہم شیخ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سب خدا تعالیٰ کے بندے ہیں خواہ قصائی ہوں یا اور کوئی ہو۔ ان باتوں کے انسداد کا طریقہ یہی ہے کہ بے وجہ کسی پر غصہ مرت کر دے اور غصہ میں فیصلہ مرت کر دے۔

نسب پر یا منصب پر فخر کرنا بھوڑ و۔ آخرت میں اس کو کون
نسب اور فخر پوچھتا ہے۔ خوب فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ

انما من بجهة المثلث الكلام ابوہم آدم والام حواء

جس کی نسبت فرماتے ہیں :-

ما الفضل الا لاهل العلم انهم علی الهدی لمن استهدی ادلاء

ہاں شرافت نسبی بھی خدا تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اگر کوئی شریف النسب ہو تو خدا تعالیٰ کا شکر کرے۔ نہ یہ کہ جس کے پاس یہ نعمت نہیں اس پر ظلم کرے، بلکہ اس نعمت کے شکر میں تو پھوٹوں کے ساتھ احسان کیا کرو۔

ایک رئیس صاحب تھے، اُن کا برتاؤ پھوٹوں کے ساتھ دیکھئے کہ ایک بھنگن اُن کے گھر کمانے آئی، بچی کو ایک جگہ بٹھلا کر کام میں لگ گئی، بچی رہنے لگی تو انہوں نے بے تکلف اُس کو گود میں اٹھا لیا۔ حالانکہ بھنگن کی بچی تھی جو لوگ واقعی شریف ہیں، اُن میں شرافت سے تواضع پیدا ہوتی ہے غرور پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب صورتیں تھیں جاہ کے استعمال کی۔

ان ہی میں ایک صورت جاہ سے کام لینے کی چنڈہ کے بارہ میں اثر سے کام لینا بھی ہے۔ اس میں دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس پر ہم زور ڈال رہے ہیں اُس پر شرعاً اتفاق واجب ہے مثلاً ایک شخص کے ذمہ زکوٰۃ ہے اور ہم اس پر اثر

لے اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس تقریر پر تو چنڈہ مدارس کے لئے امراء و روسا پر

زور ڈالنے کی گنجائش نکل آئی۔ کیونکہ آج کل اکثر امراء و روسا زکوٰۃ نہیں دیتے

بس چنڈہ لے کر اُن سے کہہ دیا جاوے کہ آپ اس میں زکوٰۃ کی نیت کر لیجئے

اور ہم اس میں شرائط زکوٰۃ کی رعایت کریں گے تو جواب اُس کے موجود ہے کہ

ادائے واجب کے لئے زور ڈالنا تو جائز ہے مگر اس قید کے ساتھ تو

(بقیہ حاشیہ بر ص ۲۶۸)

ڈال سکتے ہیں تو ہمارے ذمہ واجب ہے کہ اس پر ایسا اثر ڈالیں کہ زکوٰۃ ادا کرے
مگر یہ زور ڈالنا حرام ہے کہ غلامان مدرسہ میں یا غلامان انجمن ہی میں وہ۔
ایک صورت یہ ہے کہ جس پر ہم چندہ کے لئے زور ڈال رہے ہیں اس
پر اتفاق واجب نہیں اور جس کام کے لئے چندہ کیا جا رہا ہے وہ کسی خاص شخص کے
ذمہ نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہے۔ تو اس میں اثر اور جاہ سے کام لینا جائز نہیں
خواہ چندہ کسی مدرسہ کے لئے ہو یا قومی کام کے لئے یا مسجد کے لئے۔ دلیل اس
کی یہ ہے۔

لا یحل مال امرأ مسلم الا - کہ کسی مسلمان کا مال لینا حلال نہیں

لطیب نفس منه

مگر اس کی خوش دلی سے۔

میاں بی بی کے علاقہ کو سب جانتے ہیں کہ کبينا کچھ ہوتا ہے کہ دونوں میں
تعلیق کا علاقہ ہوتا ہے مگر اس کے بارہ میں بھی حق تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے
وَأَلْوَا النَّسَاءُ صِدْقَهُنَّ غَلَّةً فَإِنْ طَبَنَ لَكُمُ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا
فَحَلُّوهُ هَسْبًا مَرِيئًا۔

اگر وہ خوشی سے مہر کا کچھ حصہ معاف کر دیں تو جائز ہے ورنہ جائز
نہیں۔

یعنی بی بی کا اتنا کہہ دینا کہ میں نے مہر معاف کر دیا کافی نہیں ہے بلکہ خوشی سے

دلفیہ حاشیہ از ص ۲۶ زور ڈالنا جائز نہیں کہ ہماری ہی معرفت ادا کرو بلکہ ان

کو آزادی دینا واجب ہے خواہ مساکین کو دیں خواہ ان کو۔

معاف کرنا معتبر ہے۔ دیکھئے میان بی بی کا ایسا تو علاقہ مگر وہاں بھی یہ حکم ہے کہ ظاہری معافی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھ لو کہ ایسے قرآن بھی موجود ہیں جن سے اس کی خوش دلی پائی جاتی ہو، تو دوسروں کے عطا یا میں تو اس کا لحاظ بہت ہی زیادہ ضروری ہوگا۔ پس چندہ میں اس کا بہت ہی خیال کرنا سچا ہے۔

مثلاً ہم ایک شخص سے چندہ مانگتے گئے اور اس نے مجمع میں ہم کو دو روپے دیئے اور غل غلب یہ ہے کہ اگر ہم اس سے خلوت میں مانگتے تو ایک ہی روپیہ دیتا۔ اس صورت میں ایک روپیہ تو حلال ہے اور ایک روپیہ حرام ہے۔ ہمارے کہنے سے تو اس نے ایک روپیہ دے دیا اور اگر اسی کام کے لئے دوسرا کہتا تو کچھ نہ دیتا۔ تو اس صورت میں ایک روپیہ بھی جائز نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی درویش باطنی تصرف سے کسی کے قلب میں یہ خیال ڈال دے کہ فلاں شخص کو ایک ہزار روپیہ یاد تو اس کا لینا بھی حرام ہے۔ لوگ اس کو کمال سمجھتے ہیں مگر یہ صورت حرام ہے کہ باطنی تصرف سے کسی کا مال لیا جاوے۔ تجربہ ہے کہ ایسی صورت میں آدمی وہب کر کچھ دے دیتا ہے پھر بعد میں پچھتا تا ہے۔ یہ اس کی علامت ہے کہ خوش دلی سے نہیں دیا تھا۔

ایک مسئلہ یاد آگیا، اثر باطنی کے متعلق۔ وہ یہ کہ بعض لوگ بددعا کیا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہلاک ہو جاوے۔ تو اگر کسی نے کسی کے واسطے بددعا کی اور وہ اتفاق سے مر گیا۔ تو اس کا کیا حکم ہے۔ تفصیل اس میں یہ ہے کہ یہ بددعا کرنے والا صاحب تصرف ہے یا نہیں۔ اگر واقعات سے اس کو اپنا صاحب تصرف

نہ ہونا معلوم ہے۔ تو اس کو اگر بددعا کرنا جائز نہ تھا تو صرف بددعا کا گناہ ہوا۔
 قتل کا گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر واقعات سے اس کو اپنا صاحب تصرف ہونا معلوم
 ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جس وقت اس نے بددعا کی ہے آیا اس وقت یہ
 خالی الذہن تھا یا دل اس بات پر متوجہ تھا کہ یہ میرا جائز ہے۔ اگر خالی الذہن تھا
 تو بھی بددعا ہی کرنے کا گناہ ہوا۔ قتل کا نہیں ہوا۔ اور اگر دوسری شق تھی یعنی اس
 کے ہلاک کی طرف باقاعدہ توجہ تھی تو قاتل ہونے کا بھی گناہ ہوا۔ کیونکہ اس نے
 اپنے فعل سے اس کو قتل کیا۔ تصرف نفس سے قتل کرنا اور نہ ہر دے کے مال نہ برابر
 ہے۔ اور یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ نفس بھی قاتل ہوتا ہے جیسے لاکھ پاؤں فاعل
 ہیں۔ تو جیسے لاکھ پاؤں سے قتل کرنا قتل ہے ایسے ہی قلب سے قتل کرنا بھی
 قتل ہے۔ کیونکہ دونوں کا فعل برابر ہے۔ قتل کے سب احکام جاری ہوں گے
 البتہ اس قتل میں شبہ عمدہ کے احکام جاری ہوں گے۔

ایک مسئلہ اسی کے متعلق اور ہے۔ وہ یہ کہ کوئی شخص کسی عورت سے
 نکاح کرنا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتی اور اس پر نکاح کرنا واجب بھی نہیں، تو
 اس نے کسی سے تعویذ کر لیا یا اس عرض سے کہ وہ نکاح کرے تو یہ بھی جائز نہیں
 نہ ایسا تعویذ دینا جائز ہے۔ کیونکہ اس میں بھی عامل کی قوت خیالی کا اثر ہوتا ہے
 اور قلب سے کسی کو مجبور کرنا جائز نہیں۔ البتہ میاں بی بی کی موافقت کے بغیر
 تعویذ کرنا جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص حقوق واجبہ اپنی بی بی کے ادا نہیں کرتا یا نسبت
 سے تعویذ کرنا جائز ہے کہ دونوں میں موافقت ہو جائے اور شوہر حقوق کو ادا
 کرنے لگے۔ مگر حال یہ تصویذ نہ کرے کہ شوہر اس پر فریفتہ ہو جائے بلکہ صرف

تصور ادا لئے حقوق واجبہ کا رکھو۔ اور جن کو آج کل تسخیر کہتے ہیں اُس کا قصد نہ کیے
تعویذ دینے والے اور لینے والے سب کو یہی لحاظ رکھنا چاہئے۔

اسی استعمال حجاب کے فروع میں سے ایک جزئیہ آج کل
سفارش کا مسئلہ | کی سفارش کا بھی ہے جو حقیقت میں زور ڈالنا ہے

لوگ زور ڈال ڈال کر اپنے کام کے لئے دوسروں کو مجبور کرتے ہیں اور جو چیز
دوسرے کے ذمہ واجب نہ تھی اُس کو اُس کے ذمہ لازم کرتے ہیں۔ سو یہ جائز
نہیں کیونکہ یہ دوسرے کو مجبور کرنا ہے۔ ہاں اگر سفارش اس طریقہ سے ہو، کہ
دوسرے پر بار نہ ہو، اُس کی آزادی میں خلل نہ پڑے تو جائز بلکہ سنت ہے
دلیل اس کی حضرت بریرہؓ کا قصہ ہے کہ آپ نے اُن سے فرمایا کہ
اے بریرہ تم منیث سے نکاح کر لو۔ یہ اُن کے شوہر کا نام ہے جن سے یہ
خیار عین کے سبب جدا ہو چکی تھیں۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یہ حکم ہے یا سفارش۔ آپ نے فرمایا حکم نہیں سفارش ہے۔ اس پر انہوں نے
عرض کیا تو میں اس سفارش کو نہیں مانتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفارش کی حقیقت
کے لئے یہ لازم ہے کہ دوسرے کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔ چنانچہ آپ نے
پھر اُن کو مجبور نہیں کیا۔ نہ اُن کے صاف جواب سے آپ کو ناگواری ہوئی۔ بہر حال
سفارش میں یہ صورت ہونا چاہئے کہ جس سے سفارش کی ہے اُس کی آزادی میں
خلل نہ ہو، نہ اُس پر بار ہو اور اگر وہ ان کی سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے
والا بُرا نہ مانتے۔

اب تو کہا جاتا ہے کہ صاحب جب تک زور دار الفاظ نہ ہوں، تو

سفارش سے کیا ہوتا ہے۔ اس لئے خوب زور دار الفاظ لکھو تا کہ اثر پڑے۔ حکام
یہ تو جبر اور اکراہ ہے۔

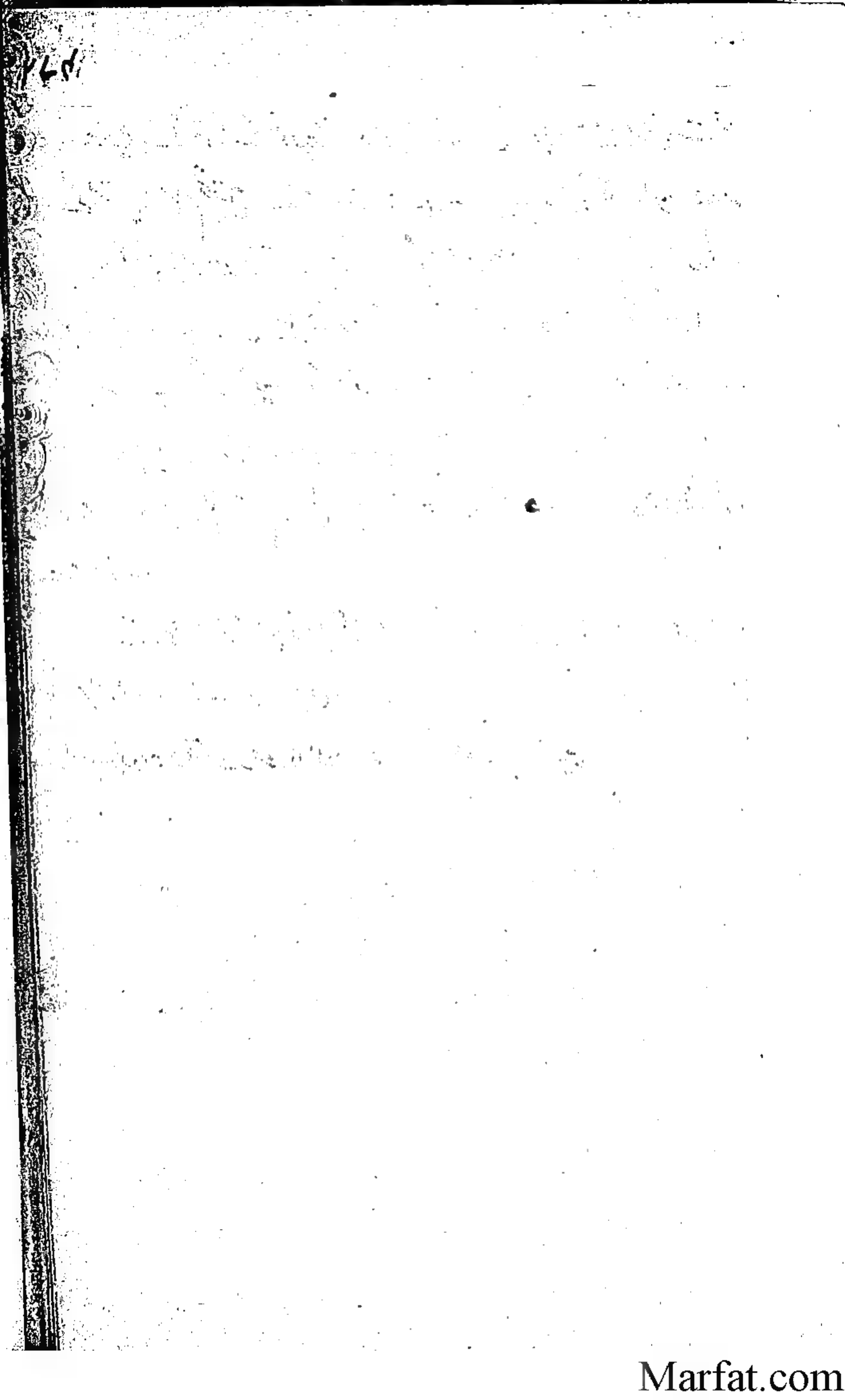
یہ چند صورتیں جاہ سے کام لینے کی جو آج کل رائج زیادہ ہیں مع ضروری احکام
کے بیان کر دی گئیں اور بھی اس کے متعلق بہت سی جزئیات ہیں مگر سب کا استنباط
ایک جلسہ میں دشوار ہے۔ اس لئے اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور جس
حدیث کی خطبہ میں تلاوت کی تھی اس کا ترجمہ کر کے ختم کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم فرماتے ہیں: **حکمہ راجع وحکمہ مستول عن رعیۃ ہر شخص را علی**
اور حاکم ہے۔ کوئی اپنے گھر والوں پر کوئی نوکروں پر۔ اور بھی کچھ نہیں ہے تو اپنے
نفس اور ماتحت پاؤں پر ضرور حاکم ہوگا۔ اور سب سے پوچھا جائے گا کہ تم نے
اپنی رعیت کے بارہ میں کیا کیا۔ یعنی ہم نے یہ جاہ اور اثر جو تم کو ماتحتوں پر دیا
تھا اس کو کہاں استعمال کیا۔

یہ سوال تو اس صورت میں ہے جب کہ جاہ اور اثر خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا
ہو بدھن اس کے کسب کے اور اگر اس کے کسب اور اسباب سے حاصل ہوا
ہے تو یہ سوال بھی ہوگا کہ تم کس ذریعہ سے راہی بنے تھے۔ بہر حال رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہو گیا کہ جاہ کے بھی حقوق ہیں۔ قیامت میں
ان کی باز پرس ہوگی کہ کہاں سے حاصل کی اور کہاں صرف کی۔ جیسے مال کے
متعلق پوچھ ہوگی کہ

من این اکتسبتہ وایت کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا
انفقہ

اسی واسطے میں نے نمونہ کے طور پر متعدد جزئیات بیان کر دیں۔ مزید جزئیات اور ان کے متعلق احکام تحقیق سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر میرے اس مختصر بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ جاہ اور اثر جس کا نام ہے اس کا خود حاصل کرنا بجز ہمت و اعتماد کے جائز نہیں اور جو بدولت تحصیل کے حاصل ہو جائے اس کا ہر جگہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اب لوگ شریعت کو نماز و روزہ ہی میں منحصر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شریعت نے سب چیزوں سے بحث کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فکر اور تلاش ہی نہ ہو۔ مگر حجت الہیہ قائم ہو چکی ہے۔ اب کوئی عمل نہ کرے گا تو عذر اللہ اس سے مواخذہ ہوگا۔

اب دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین ثم آمین وصلى الله على خير خلقه محمد وعلى آله واصحابه اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين۔



خیر الممال للرجال

تجارت اور آخرت کے متعلق یہ وعظ ۸۔ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو قلی بازار، کانپور میں فرمایا جو ۱۴ گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضرین قریباً ۵۰۰ کی تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبة بالورع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله نحمدك واستغفرك واستغفرتك ونؤمن بك ونتوكل
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد
أن سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى
عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم أما بعد فاعوذ بالله
من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم رجال
لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله ط وإقام الصلاة و
إيتاء الزكاة ط يخافون يومًا تتقلب فيه القلوب والأبصار
ليجزيهم الله أحسن ما عملوا ويزيدهم من فضله والله
يرزق من يشاء بغير حساب ط

ترجمہ

خاص بندے ایسے ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید و فروخت
اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا
کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اس دن سے
جس میں قلوب اور آنکھیں الٹ پڑتے ہو جائیں گے
ضرور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیں گے
اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جس
کو چاہتے ہیں، روزی بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

پ

علم اور عمل

یہ ایک آیت ہے جو ماقبل سے مرتبط ہے مگر میں نے اس وقت اسی پر اکتفا کیا ہے۔ کیونکہ جن مضمون کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے اس کے لئے یہ آیت کافی ہے۔ رجال ترکیب میں فاعل ہے، ایک قرائت پر فعل ملفوظ کا ایک صورت میں مقتدر کا جن پر یُسَبِّحُ ماقبل فعل دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ اس جگہ قراءتیں دو ہیں یُسَبِّحُ بصیغہ معروف اور یُسَبِّحُ بصیغہ مجہول ہے۔ اس قرائت پر یہاں یُسَبِّحُ بصیغہ معروف مقتدر کیا جاوے اس بناء پر میں نے اس کو تلاوت میں یہاں شروع کیا۔ مگر ہر حال میں مطلب ایک ہی ہے۔ یہ سب اس لئے عرض کر دیا تاکہ ترکیب معلوم ہونے سے ترجمہ میں آسانی ہو۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح فرماتے ہیں اُن خاص بندوں کی جن میں یہ خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہئے

وہ خاص صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے کہ فقط تذکرہ میں تو ان صفات کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدح کی تحصیل نہیں کی جاتی۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر قادر ہو اور اس کے اصول بھی اس کو معلوم ہوں لیکن وہ ان اصول کی صرف مدح ہی مدح کرتا ہے مگر مال کا اکتساب نہیں کرتا۔ بتلا بیٹے کہ نری مدح سے اس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ ہاں تعریف بہت کر رہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی قوت آ جاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے۔ سبب کے منہ تک رہا ہے۔ مگر کھاتا نہیں۔ بس تعریف کرنے کو ہی کافی سمجھ رہا ہے۔ انصاف سے کہئے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو عاقل قرار دے گا۔ ہرگز نہیں!

مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملے میں عقلا و اہل الرائے اپنے کو عاقل تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں۔ مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے۔ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جو حضرات صحابہؓ اور بزرگوں کے اخلاق کی مدح نہ کرتا ہو کہ فلاں ایسے بزرگ تھے اور فلاں ایسے تھے۔ ان میں ایسی اچھی اچھی صفات تھیں کیسی مسلمان سے اس کے خلاف نہ سنا ہوگا۔ مگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ تم نے بھی ان

خوبیوں کے حاصل کرنے کی طرف توجہ کی تو صاف جواب ملے گا۔ تو کیا محض ان کا معتقد ہو جانا کافی ہے۔ پھر اس سے بڑی سخت غلطی یہ ہے کہ لوگ اس کوتاہی کی تاویلیں کر لیں گے مگر غلطی کا اقرار نہیں کریں گے۔ اگر آدمی غلطی کا اعتراف کرے تو اصلاح کی بھی امید ہے مگر ہم نے تو کلمہ حق اُرِیدَ بہ الباطلِ اس سے بال ہر اولیا جاتا ہے، کے طور پر یہ حدیث یاد کر لی ہے۔

الْحَمْدُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ قَالَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي
جَوَابِ مَنْ سَأَلَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ تَقُولُ فِي
رَجُلٍ أَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِمْ رَوَاهُ الْمُشَيْخَانِ۔

جو شخص جس سے محبت رکھے اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا ہیں نے آپ سے دریافت کیا، آپ اس کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے اور ان کے ساتھ ملحق نہیں ہے۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔

یعنی جو شخص جس قوم سے محبت رکھے وہ انہیں میں سے ہے۔ کسی نے اس کا ترجمہ نظم میں کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ۔

أَحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقُنِي صَدَاحًا

میں نیکوں سے محبت کرتا ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو نیکی کی توفیق عطا کر دیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر کھانے سے کسی کو محبت ہو تو کیا محض محبت سے

پریت بھر جائے گا۔ وہاں نہیں کہتے۔

أَحِبُّ الْأَكْلَيْنِ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقُنِي رَغِيْفًا

کھانے والوں سے محبت کرتا ہوں اور میں اُن میں سے نہیں ہوں
شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو روٹی عنایت کر دیں۔

کہ میں کھانے والوں کو دوست رکھتا ہوں اسی سے میرا پریت بھر جائیگا
میں اس شعر کے مصنف پر اعتراض نہیں کرتا اور حاشا روکلا حدیث پر تو کون اعتراض
کر سکتا ہے۔ میں تو استدلال باطل کرنے والوں پر اعتراض کرتا ہوں اور اُن سے
پوچھتا ہوں کہ اگر اس کے یہ معنی ہوتے جو آپ نے سمجھے ہیں کہ محبت ہی کافی
ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں جیسا آج کل لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ تو وہ
پہلے لوگ بھی یوں ہی رہا کرتے۔ کچھ بھی نہ کرتے۔ بس محبت ہی کا سلسلہ رہتا اور
انہیروائے بھی صرف محبت کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ بس کوئی بھی
عمل نہ کرتا۔ بس صرف آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی عمل کر لیتے اور دوسرے
لوگ صرف محبت کو کافی سمجھ لیتے مگر ایسا تو نہیں ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ پھر الحمد ومع صاحب کے
کیا معنی ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس میں عمل کرنے

استحقاق اور فضل

والوں کے لئے ایک تسلی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو
اہل سلوک سمجھ سکتے ہیں۔ باقی جس کو درد ہی نہ ہوا ہو وہ درماں کی قدر کیا جانے وہ
تسلی یہ ہے کہ اہل طریق عبادت کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے
کہ کچھ کمی رہ گئی۔ اور واقع میں کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے۔ اگر کمی محسوس نہ ہو تو

یہ بھی برکت عمل اور ترقی کے لئے مانع ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ بندہ عمل کے بعد بھی کمی کو محسوس کرے۔ چنانچہ کالمین اس کو محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمی کا احتمال فرماتے ہیں۔

لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ
میں آپ کی تعریف کا احاطہ

نہیں کر سکتا۔

کہ میں آپ کی ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ حالانکہ آپ میں فی الواقع کمی نہیں مگر عظمت حق پر نظر کر کے آپ فرماتے ہیں کہ میں حق ادا نہیں کر سکتا۔ سو یہ کمی اضافی ہے حقیقی نہیں۔ کیونکہ جو درجہ ثنا کا آپ سے مطلوب ہے اور جو طاعت خدا تعالیٰ کو آپ سے مقصود ہے آپ سے اس میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہوئی مگر آپ جب عظمت خداوندی پر نظر کرتے ہیں یعنی عظمت حق جس درجہ کو مقتضی ہے جس کے آپ مرکلف نہیں ہوئے اور وہ امکان بشر سے خارج ہے۔ اس کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمادے ہیں۔ لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کمی کا اپنے اندر محسوس ہونا کمالات میں سے ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے تو پھر اولیاء تو کیا چیزیں ہیں پھر عوام تو کوئی چیز ہی نہیں۔ بہر حال ہم میں طاعت کی کمی ضروری ہے اور اس کمی پر نظر نہیں تو ہمارے اندر خود ایک کمی یہ ہوگی کہ اپنے نقص پر نظر نہیں بہر حال جب ہمارے اعمال پورے نہیں تو ضابطہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ جزا اور اجر بھی نہ ملے۔ ویسے اللہ تعالیٰ فضل فرماوے تو وہ اور بات ہے اُن کے فضل کو کون روک سکتا ہے۔ باقی ہم ضابطہ سے جزائے موعود کے

کسی طرح مستحق نہیں۔ اور واقع میں مستحق تو اتنی کے بھی نہیں تھے۔ اگرچہ اعمال میں کمی بھی نہ ہوتی جتنا وعدہ ہے۔ وعدہ کے اعتبار سے غیر لازم استحقاق ہے مگر اب کمی کی صورت میں اس کے بھی مستحق نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہم نے کام ہی کیا کیا ہے پھر جزا کیسے ملے گی۔ اور یہ سب باتیں موٹی ہیں مگر چونکہ ہم کو فکر نہیں اس لئے ذہن میں نہیں آتیں ورنہ جن حضرات کو فکر ہے ان کی حالت دیکھو۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کیسے متواصل فکر تھے۔ کسی وقت قلب مبارک آپ کا بے چینی سے خالی نہ تھا۔ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام ملائکہ سے افضل اور پھر احتمال باز پرس کا بھی نہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کوئی بات باز پرس کی تھی ہی نہیں۔ اگر شاید خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو احتمال بھی ہوتا باز پرس کا تو اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں فرما دیا۔

يَغْفِرُ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ
مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے
پچھلے گناہ بخش دیں۔

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ذنب سے پاک ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا ہو۔ تو اس شبہ کو بھی رفع فرما دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے عاشق

اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کر دیجئے گا۔ حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں۔ خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔

شغل اور استغراق | اولیاء اللہ ایسے ہوتے ہیں۔ جن سے باوجود کمال عشق کوئی امر خلاف عقل اور دین کے صادر نہیں ہوا

شیخ عبدالحق دہلویؒ باوجود غایت استغراق کے فرماتے ہیں کہ

”منصور بچہ بود کہ از یک قطره بفریاد آمد۔ اینجا مردانند کہ دریایا
فرورند و آردوغ نزنند۔“

منصور بچہ تھا کہ ایک قطره شراب عشق، سے شور و غل کرنے لگا۔
یہاں ایسے رہاورد مرد ہیں کہ دریائے کسے دریائی جاتے ہیں اور
ڈکار تک نہیں لیتے۔

حضرت شیخ علی احمد صابر صاحبؒ بارہ سال تک مراقبہ میں مشغول رہے
کچھ ہوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ پیر کے یہاں سے مزاج پرسی کے لئے ڈوم آیا تو آپ
کو خبر دی گئی کہ شیخ کے یہاں سے ڈوم آیا ہے۔ آپ نے سراٹھا کر اتنا فرمایا
کہ پیر اچھے ہیں۔ کہا، جی ہاں! خیریت سے ہیں۔ اور اُس کی یہ خاطر کی کہ آپ
گو لہ بھیکے بلانمک کے کھایا کرتے تھے۔ اُس روز فرمایا کہ آج گو لہوں میں نمک
ڈال دینا۔ اُس بیچارے کے تو زخم پر نمک چھڑکا گیا۔ وہ تو بڑی بڑی خاطر
کا خوگر تھا۔ اُس نے واپس ہو کر شیخ سے بڑی شکایت کی کہ حضرت انہوں نے
تو آپ کو بھی زیادہ نہیں پوچھا۔ صرف کچھ دیر کو آنکھیں کھول کر اتنا پوچھا تھا کہ

شیخ اچھے ہیں۔ اس کو سن کر شیخ پھڑک گئے اور فرمایا اُن کی محبت ہے کہ ایسی حالت میں مجھ کو یاد رکھا۔

دیکھئے حضرت صابر صاحبؒ اس قدر تو مشغول و مستغرق تھے مگر بارہ سال تک ایک وقت کی نماز وقت سے ٹپکی نہیں۔ عوام الناس اہل کمال کو کیا جانیں وہ تو بھنگڑوں کو جانتے ہیں جو نماز بھی نہ پڑھیں۔ استغراق محمود وہ ہے جو سنت کے دائرہ سے خارج نہ ہونے دے۔ غرض انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان تھی، انبیاء اللہ ایسے ایسے گزرے ہیں جن کا دین غالب تھا عشق پر اور اُن کو استغراق میں بھی دین سے غفلت نہ ہوتی تھی۔

غم اور فکر | نگر چونکہ ہم خالی ہیں اس غم سے کیونکہ ہمارے اوپر دوسرا غم صبر وصال مسلط ہو گیا ہے (یعنی غم دنیا) اس لئے ہم کو دین کے کاموں میں خلل و مت محسوس نہیں ہوتی۔ باقی جن کو یہ غم حاصل ہے اُن کی تو اُن غم سے یہ حالت ہے۔

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر ریشِ بے بند و گریہ ہمیش
اُن کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے۔ اگر غم دیکھتے
ہیں تو اُن پر مرہم رکھتے ہیں۔

گدایا نے از پادشاہی غور بامیدش اندر گدائیِ عبور
ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے ہیں اور اُن کی امید
پر فقری میں قناعت کرنے والے ہیں۔

دنا دمِ شرابِ الم در کشند و گریہ بے بند دم در کشند

ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں۔ جب اس میں رنج کی کڑواہٹ
دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔

ان اشعار کی بندش بتلا رہی ہے کہ سچا مضمون ہے۔ کیونکہ ان اشعار کا
قلب پر اثر پڑتا ہے اور جتنا ہے۔ جو بات دل سے نہیں ہوتی اس کا اثر اول
تو ہوتا نہیں۔ اگر عارضی طور پر ہو جاتا ہے تو باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ رنگین و عظم
کہ بعض لوگوں کو رونا آ جاتا ہے مگر مجلس سے اٹھے اور سب فرجاتا رہا۔

عرض اہل غم کی یہ حالت ہے مگر ہمیں دین کا غم ہی نہیں۔ اسی لئے اگر
ہم تقویٰ بھی اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی نام ہی کا ہوتا ہے۔ ورنہ اس کی بھی یہ
حالت ہوتی ہے کہ کسی چیز سے لڑتا ہی نہیں۔ ہمارا تقویٰ کیا ہے؟ بی بی تمیزہ
کا وضو ہے کہ شوقِ مجاہد سے بھی نہیں لڑتا تھا۔

ایک بی بی تمیزہ تھی فاسقہ قاہرہ۔ کسی بزرگ نے اس کو وضو کرایا، نماز
پڑھوائی اور نصیحت کی کہ نماز پڑھتی رہنا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ بزرگ جو پھر
اُدھر آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا، جی
ہاں! فرمایا، وضو بھی کرتی ہو؟ تو کہتی ہے کہ آپ جو وضو کرا گئے تھے میں اُسی
سے پڑھ لیتی ہوں۔

یہ حکایت تو کتابی ہے۔ ایک حکایت مولانا رفیع الدین صاحب کی
بیان کی ہوئی ہے کہ ایک سقہ کو وضو کرا دیا اور خیال کیا کہ یہ تو ہر وقت پانی
میں رہتا ہے۔ اس کو کیا مشکل ہے وضو کرنا۔ اس لئے کوئی خاص تاکید نہیں کی
کچھ روز کے بعد دیکھا کہ وہ سقہ بے وضو نماز میں آکھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا کہ

یہ کیا تو وہ کہتا ہے کہ جی اُس دن وضو کرا نہیں دیا تھا۔
 وضو پر ایک لطیف بات یاد آگئی۔ اللہ تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ وضو
 میں وہی اعضاء دھونے کو بتلائے ہیں کہ اگر نہ بھی بتلاتے تو ضرورت کی وجہ
 سے اُن کو ویسے بھی دھوتے ہیں۔ سو کوئی کام بڑھایا نہیں۔ حق تعالیٰ کے
 حکام کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض طبیب کے پاس گیا اور کہا کہ گوشت
 کھانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ طبیب نے کہا کہ گوشت تو مضر ہوگا مگر طبیب
 ضیق بھی ہے۔ اُس نے کہا کہ گوشت کھا لینا مگر اس میں دھنیے کی پوٹی ڈال لیا
 کرو۔ ایسا طبیب کہاں ملے جو طبیعت کے موافق دوا اور غذا بتلائے۔ حق تعالیٰ
 کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے۔ چنانچہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کا حکم دیا جن کو ہم خود
 بھی دھوتے ہیں۔ کیونکہ ان ہی پر گرد و غبار کا زیادہ اثر ہوتا ہے مگر اتنا بتلا دیا
 کہ اس ترتیب سے دھو لیا کرو۔ جو امور فطرت کے مناسب تھے وہی تجویز
 فرمائے بشرطیکہ فطرت سلیمہ ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں اس کو کہہ رہا تھا کہ بعض کا تقویٰ ایسا ہے
 جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ چاہے کچھ ہی کر لیں۔ دہن کر فرمایا کہ، ہاں پیروں کے ٹوٹنے
 سے نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔

اس پر ایک پیر کی حکایت یاد آئی۔ کسی مرید نے نکاح پڑھنے کے لئے
 اُن کو نہ بلایا۔ دوسرے کسی آدمی سے نکاح پڑھوا لیا۔ پیر نے سمجھا کہ یہ تو بُری
 رسم نکلی۔ اس سے تو بڑا نقصان ہوگا۔ وہ اُس کے گھر پہنچے اور کہا کہ بغیر ہمارے
 کسی نے نکاح پڑھایا ہے۔ بہت نکتہ ہوئے اور کہا کہ میں ابھی اس کو ادھر پڑتا

ہوں۔ بس بیٹھ گئے پڑھنے والے شمس و قمر کا قسم ہے آفتاب کی اور اس کی روشنی کی، اُدھیر بے نکاحا۔ تمام آیتوں میں اسی طرح جوڑ لگاتے چلے گئے۔ کہا ایک دو آیت اور رہی ہے بس اُدھڑا ہی چاہتا ہے۔ اس بیچارے سے پانچ روپے نکال کر دے ویٹے اور کہا اچی ایسا منت کر وہ سو ہم جو اپنے تقویٰ طہارت کو ایسا سمجھتے ہیں کہ زوال کا خوف ہی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو وہ غم نہیں جس سے فکر ہو۔ اسی غم کو ان اشعار میں فرمایا ہے اور چونکہ صاحب مشاہدہ کا سچا مضمون ہے اس لئے مؤثر ہوتا ہے ان کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں اثر نہیں ہوا کرتا۔ عارف شیرازی کے کلام میں بھی اسی لئے بے حد اثر ہے کہ وہ صاحب مشاہدہ ہیں۔ ان اشعار کو پھر دہراتا ہوں ہے

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر دیش بینت و گر مرہش
گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائیِ عبور
و نادم شرابِ الم درکشند اگر تلخ بینت دم درکشند
یعنی اہل اللہ اس غم میں بھی خوش رہتے ہیں، یہ غم ایسی نعمت ہے کہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ

محبت اور عمل

نعمت پر مسرور ہیں۔ یہ قید ایسی ہے کہ اس کا قیدی رہائی نہیں چاہتا ہے۔ ایسے شخص خواہد رہائی نہ پسند شکارش بخود خلاص از کمند
اس کا قیدی قید سے چسکا رہا نہیں چاہتا۔ اس کا شکار کمند سے خلاصی نہیں ڈھونڈتا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو اسپانک پیچھے سے آکر بغل میں زور سے دبا لے کہ ہڈی پسلی ٹوٹنے لگے۔ اول بے خبری سے ذرا گھبرا یا اس گھبرانے کو دیکھ کر معشوق کہتا ہے کہ اگر تمہارا جی گھبراتا ہو، پریشانی ہو، تکلیف ہو تو چھوڑ دوں۔ تمہاری آزادی میں خلل پڑ گیا ہو تو چھوڑ دوں۔ اگر عاشق صادق ہے تو جواب میں یہی کہے گا۔

امیرت نخواہد رمانی زمیند شکار ت بخوابد خلاص از کند
تیرا قیدی قید سے رمانی نہیں چاہتا اور تیرا شکار کند سے چھکارا نہیں
ڈھونڈتا۔

اور یوں کہے گا کہ بھائی خدا نہ کرے کہ مجھ کو اس قید سے رمانی ہو۔ جس کو یہ قید نصیب ہو گئی ہے وہ اس سے نکلنا کب چاہے گا۔ اسی طرح حضرت حبیب دین کا غم ہو جائے گا تو حقیقت کا ادراک ہو گا۔ اس وقت اپنی کمی اعمال میں محسوس ہونے لگے گی اور اس کمی کے احساس سے بعض اوقات دل شکستگی اور مایوسی کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ ایسوں کی تسلی کے لئے فرما دیا گیا ہے۔ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ یعنی اگر تم نے کوشش کی مگر پھر کمی رہ گئی تو غم مت کرنا، دل کو مت توڑنا پریشان مت ہونا۔ تم ان ہی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ گے جن سے تم کو محبت ہے۔ غرض الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ ایسے شخص کی تسلی کے لئے فرمایا گیا ہے نہ کہ بے عملوں کے لئے۔

جیسے کوئی شخص کام میں کوشش کرے اور اس کا معلوم ہو کہ اس نے پوری کوشش کی ہے اور اتفاق سے کام میں کچھ نقص رہ جاوے تو اہمیت کی وقت

اُس کو پوری مزدوری دیتے ہیں اور انہی کام کرنے والوں کے ساتھ لاسی کرتے ہیں جن کے کام میں کوتاہی واقع نہیں ہوتی۔ یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور گو مفید خالی محبت بھی ہے۔ یعنی اگر محبت بھی نہ ہوتی تو اُس کے اعتبار سے یہ خالی محبت بھی مفید ہے مگر یہ تو نہیں کہ عمل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ بڑی محبت ہی محبت کافی ہو جاوے گو عمل کچھ بھی نہ ہو۔

اس کا ایک راز ہے۔ وہ یہ کہ بدون عمل کے جو محبت ہوتی ہے۔ اُس محبت میں بھی ثبات اور قوت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شیخ کے دو مرید ہوں ایک تو ہو قبیح دوسرا غیر قبیح۔ تو قبیح ہی کی محبت قابل اعتبار ہوگی۔ اور دوسرا اس کی یہ ہے کہ جو اتباع کرتا ہے وہ شیخ کو پہچانتا ہے۔ روزمرہ شیخ کے ساتھ اس کی معرفت بڑھتی ہے اور معرفت سے محبت بڑھتی ہے بخلاف اُس شخص کے جو قبیح نہیں وہ شیخ کو پہچانے ہی کا نہیں۔ تو اُسے محبت کیا خاک ہوگی۔ اُس کے نزدیک تو پیر اگر اُس کی مرضی کے خلاف ہوا تو پیر ہی نہ رہے گا۔ اور قبیح شخص کی یہ حالت ہے کہ اگر پیر سے لغزش بھی ہو جاوے تو وہ موازنہ کرتا ہے اُس لغزش کا اُس کے کمالات کے ساتھ۔ پھر کمالات کو غالب دیکھتا ہے تو بد اعتقاد نہیں ہوتا اور اُس کی لغزش کو خیال میں بھی نہیں لاتا اور اس پر محمول کرتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ يَسْأَلُ عَنْ تَرَاوُكِهِ كَيْدُ الْبَلَدِ

فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِسُونَ

ہیں۔

اُس کو ایسا خیال کرتا ہے جیسے کوئی حسین ہو مگر اُس کے پھرے پر ایک

کا لائل بھی ہو کہ وہ بھلا ہی نظر آتا ہے۔ اس تل پر اہل عرب کا مذاق یاد آیا عرب کی عجیب تشبیہات تھیں۔ اشعار کہا کرتے تھے کہ اُن کے چہرہ پر ایسا تل ہے، جیسے میدان میں اونٹ کی منگنی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے یہ تہذیب لختی، اہل عرب کی۔ اُن کو تو اسلام ہی نے کام کی باتیں سکھلائیں۔ بعد کے اشعار دیکھئے وہ کیسے اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ عرب کو اونٹ بہت محبوب تھے۔ اسی واسطے ہر جگہ اُن ہی کا تذکرہ تھا۔ اس لئے محبوب کے تل کو بھی تشبیہ دی تو منگنی سے اگر اسلامی شعراء کے یہاں یہ مضمون ہوتا تو اور عنوان سے ہوتا۔

غرض یہ ہے کہ جو پیر کے کمالات کو جانتا ہے تو وہ اُن کی لغزش کو تل کی مثل سمجھے گا اور جس کی نظر کمالات پر نہیں اُن کے نزدیک معمولی لغزش بھی بلکہ غیر لغزش بھی پہاڑ کے برابر ہوگی۔

ایک شخص نے ایک بزرگ کی نسبت یہ کہا تھا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں ایک بی شخص۔ انہوں نے ایک بزرگ کو پانخانے سجاتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں یہ کیسے بزرگ ہیں جو پانخانہ بھی کرتے ہیں۔ اسی بنا پر شریف عبداللہ نے بدوؤں کو اپنی ولایت کا معتقد بنانے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اور یہ انتظام کیا تھا کہ اُن کے پانخانہ پیشاب کی اطلاع کسی کو نہ ہونے دیتے۔ جہلاء کا اعتقاد ہی کیا۔ بس جاہل لوگ اُن کی ولایت کے قائل تھے۔ اُن کا یہ خیال جم گیا تھا کہ شریف صاحب پانخانہ پیشاب نہیں کرتے۔ اس لئے ولی ہیں۔

ایک شخص ایک معمولی بات پر میرے معتقد ہوئے تھے اور ایک معمولی

بات پر غیر معتقد ہو گئے۔ معتقد تو اس بات پر ہوئے تھے کہ میں نے ایک شخص سے تین روپے نہ لئے تھے جو مجھ کو ہدیہ دینا چاہتے تھے۔ بس اتنی بات پر معتقد ہو گئے اور کئی سال تک معتقد رہے۔ اور غیر معتقد اس پر کہ اُن کو دنیا کا ایک کام پیش آیا۔ اُنہوں نے مجھ سے سفارش چاہی۔ میں نے انکار کر دیا۔ بس غیر معتقد ہو گئے۔ کہنے لگے یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ایک مسلمان کی سفارش نہیں کرتے۔

نادان کی دوستی | بس نادان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے۔ الف یلیٰ میں ایک حکایت جاہل کی دوستی کی لکھی ہے کہ ایک شخص قاضی کی لڑکی پر عاشق تھا اور وہ بھی اُس کو بلاقی تھی مگر موقع نہ ملتا تھا۔ جمعہ کا دن آیا تو اُس نے خیال کیا کہ آج اچھا موقع ہے۔ سب لوگ نماز کے لئے چلے جائیں گے۔ میدان خالی ہوگا۔ اُس سے کہلا بھیجا، مگر اُس نے خیال کیا کہ غموں کے پاس ابھی ہیئت سے جانا چاہئے۔ چنانچہ ایک حجام کو بلا کر خط بنوانے کا ارادہ کیا۔ وہ نائی اس قدر بکی تھا کہ ذرا سا خط بنا لیا اور پھر بک مارنے لگا اور یہ شخص ادھر خط چھوڑ کر اٹھ بھی نہیں سکتا۔ حجام بخومی بھی تھا۔ کبھی خط کو چھوڑ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا، کبھی اسطرلاب نکال کر ارتفاع شمس کو دیکھتا۔ غرض اُس نائی نے ایسے قصے بھیلادے کہ جمعہ کا وقت بھی گزرنے لگا۔ یہ شخص اُس سے پیچھا پھڑا کر معشوقہ کے مکان میں گیا۔ نائی صاحب بھی خیر خواہی سے جا کر مکان کے باہر ایک تخت پڑا تھا، اُس پر بیٹھ گئے۔ جب قاضی صاحب جمعہ سے واپس ہو کر مکان پر آئے۔ گھر میں جا کر کسی غلام پر خفا ہو کر

اُن کو مارنے لگے وہ رونے چلانے لگا۔ حجام صاحب سمجھے شاید میرے میاں پکڑے گئے اور پٹ رہے ہیں۔ فوراً مدد کے لئے پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیٹی کو نہیں کہتا، اُنسی نے تو میرے آقا کو بلایا ہے۔ غرض راز فاش ہو گیا۔ وہ آقا ڈرا کہ اب پکڑا سجاؤں گا۔ بیچارہ اندہ مکان کے اس حال کو معلوم کر کے کہیں کو چھپ کر بھاگا اور چھت پر سے کودا۔ پاؤں ٹوٹ گیا۔ جانے کس طرح پیچھا چھڑا کر وہاں سے بچا۔ نادان کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک رئیس کے ہاں ایک ریچھ پلا ہوا تھا۔ جب وہ رئیس موتا تو ریچھ اُس کی مکھیاں جھلا کرتا۔ ایک روز اتفاق سے مکھیوں نے بہت زور باندھا۔ ریچھ اڑاتے اڑاتے دق ہو گیا۔ اُس نے دل میں کہا کہ اچھا میں تمہارا علاج بناؤں گا۔ جب مکھیاں اچھی طرح آقا کے منہ پر بیٹھ گئیں، اُس نے بڑا سا پتھر لا کر اُن مکھیوں کے مارا۔ مارا تو تھا مکھیوں کے وہاں آقا صاحب ہی کا پکنا چور ہو گیا۔ غرض نادان کی دوستی ہی کیا بلکہ مضر اور ایذا دہ ہے۔

اسی لئے حضرت مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرے ایک مرید کو ہٹا دے تو فی مرید ایک آنہ اور مولوی کے ہٹانے پر فی مولوی چار آنہ لے لے۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص نادان ہے اُس کو شیخ سے بھی برائے نام ہی محبت ہوگی۔ نادان کی دوستی رہ نہیں سکتی۔ وہ معمولی بات کو بھی بزرگی کے خلاف سمجھ گا۔ اور غیر معتقد ہو جائے گا۔ اُس کی نظر جہل کے سبب اکثر عیوب ہی کی طرف زیادہ ہوگی اور کمالات کو تو وہ جانتا ہی نہیں اُن پر تو اُس کی نظر کیا ہوتی۔ سچی محبت اسی کو ہوگی جن کو شیخ کی معرفت ہوگی اور شیخ کی معرفت

اُس کے اتباع سے ہوگی۔ جیسا اوپر قریب ہی مذکور ہوا۔ پس من احب
 پورے طور پر وہیں صادق اُسے گا جہاں اتباع ہو اور جہاں اتباع نہ ہوگی
 محبت بھی کامل نہ ہوگی۔ اسی درجہ کے لئے عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں۔
 تعصى الله وانت تظهد حبه

هذه العزيماني الفعال بدائع
 اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اُس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے
 اپنی جان کی قسم یہ فعلوں میں انوکھی بات ہے
 لو كان حبك صادقا لاطعته
 ان المحب لمن يحب يطيع

اگر اس کی محبت میں صادق ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا۔ اس
 لئے محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

مگر اس وقت محبین بہت ہی کم ہو گئے ہیں جو قبیح ہوں
 احکام و آثار | ان محبت کا دم بھرنے والے بہت ہیں۔ ان کی مثال

وہی ہے۔ جیسے ایک بدوی کو کسی نے دیکھا کہ زار زار رو رہا ہے اور ایک
 گنا اُس کے پاس پڑا ہے۔ اُس نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا، میرا کتا
 مارے بھوک کے جاں بدب ہے۔ اُس کے فراق میں رو رہا ہوں۔ اُس
 شخص کی نظر ایک تھیلے پر پڑی جس میں روٹی کے ٹکڑے بھرے ہوئے
 تھے۔ اُس نے بدوی سے کہا کہ اس تھیلے میں کیا ہے۔ کہا روٹی کے ٹکڑے
 ہیں۔ کہا پھر اس کو کھلاتا کیوں نہیں۔ کہنے لگا۔

گفت ناید بے درم در راه نان یک بہت آب و ویدہ ایگال
روٹی تو بغیر پیوں کے راستہ میں نہیں ملتی لیکن آٹو تو مفت کے
میں۔

یعنی اتنی محبت نہیں کہ روٹی خرچ کر دیں اور آٹو تو مفت کے ہیں پھر
آٹو کی جگہ دس بہاؤوں کا اور روٹی کو لگے ہیں دام۔ پس محبت روٹے کی ہے
کھلانے پلانے کی نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ غیر قبیح کو محبت نہیں ہوتی یعنی کامل۔ اور یہ قاعدہ ہے
کہ قابل اعتبار وہی چیز ہوتی ہے جو معتد بہ درجہ میں ہو۔ جیسے رائی کا دانہ ترازو میں
رکھا جائے تو اس کا وزن تو ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایک دانہ میں وزن نہیں تو ویسے
ہی دانے بہت سے ڈال کر ترازو کا پتہ کیسے جھک گیا۔ یہ تو سب کو مستلزم ہے
کہ ایک دانہ میں وزن ضرور ہے مگر چونکہ اس پر آثار مرتب نہیں ہوتے۔ اس
لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ نہ شریعت نے اعتبار کیا ہے نہ اہل عرف نے۔
گو فلاسفہ کے نزدیک یہ بات مافی ہوئی ہے کہ جب حیوانی زمین پر چلتی ہے
تو ساری زمین کو حرکت ہو جاتی ہے اور دلیل سے یہ بات سچی ہے۔ مگر سننے
والوں کو تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس پر احکام و آثار مرتب نہیں دیکھے
جانتے۔ اس لئے قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ اسی طرح احکام شریعیہ و حسیہ میں وہی چیز
معتبر ہوگی جس پر احکام و آثار مرتب ہوں۔ پس محبت وہی معتبر ہوگی جس پر
آثار مرتب ہوں یعنی جس میں اتباع ہو وہی محبت قابل اعتبار ہوگی، نرا احب
کچھ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے مطلب کی حدیث یاد کر لی ہے اپنے
کو عمل سے فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حِلْعَةُ الْحَقِّ اُرِیدَ بِہِ الْبَاطِلُ ہے
یعنی اَلْعَمْرُؤُ مَعَ احَبِّ بِالْکُلِّ حَقِّ ہے مگر اس سے اپنے مطلب کے لئے
باطل مراد لیا گیا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے بھی رد کیا ہے۔

چنانچہ غزوہ اُحُد کے متعلق فرماتے ہیں۔

غزوہ اُحُد

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمْنَةً نَّفَاسًا
یَغْشٰی طَائِفَتَکُمْ وَ طَائِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ فَوَلَّوْا
بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ عَلٰی الْجَاهِلِیَّةِ ط یَقُولُوْنَ هَلْ نَحْنُ مِنَ الْاَمْرِ
مِنْ شَیْءٍ ط قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهُ لِلّٰهِ ط یُخَفُّوْنَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ
مَا لَا یُبْدُوْنَ لَکَ ط یَقُولُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ
مَا قَتَلْنَا هٰہُنَا ط قُلْ لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ
عَلَیْہِمْ الْقَتْلُ اِلٰی مَوَاضِعِهِمْ ۚ وَ لَیْسَ لَکَ اِلَیْہِمْ شَیْءٌ
وَلَیْمٌ مِّنْ عَمَلٍ ط وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔

پھر تم پر اتارا انگلی کے بعد امن کو۔ وہ اونگھتے تھے کہ گھیر رہی تھی تم میں
سے بعضوں کو اور بعضوں کو فکر پڑی تھی اپنی جان کی۔ خیال کرتے
تھے اللہ پر۔ بھوٹے خیال جاہلوں کے سے کہتے تھے کچھ بھی کام
ہے ہمارے ہاتھ میں۔ تو کہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے
اپنے جی سے چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں
اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھ میں تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ

آپ کہہ دیجئے اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھا تھا مارا ہی جاتا اپنے پڑاؤ پر۔ اور اللہ کو آزماتا تھا، جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور نکھارتا تھا جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ کو معلوم ہے دل کی بات۔

یہ حاصل سے مدلول آیات کا بغزوہ اُحد میں اول غلبہ مسلمانوں کو تھا اور اُحد فتح کے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی۔ اُس میں بہت سے شہید ہو گئے اور جو میدان میں باقی رہے اُن پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رعب و وحشت جاتی رہی۔ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی۔ جو لوگ اُس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا۔ هَلْ لَنَا مِنَ الْأُمْرِ شَيْءٌ۔ ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر اُن کی نیت میں یہ نہ تھا۔ بلکہ نیت میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے، تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ فرماتے ہیں يَنْفَعُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے۔ اُن کے دلوں میں تو یہ ہے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأُمْرِ شَيْءٌ مَا تَقَلْنَا هَذَا کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ اگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر اکر مارے جاتے یہ نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں یہ جو کلمہ ہے هَلْ لَنَا مِنَ الْأُمْرِ

شئی۔ یہ کلمہ تو حق ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا، مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا۔ کیونکہ ان کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ ان کی مراد یہ تھی کہ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ لَنَأْمُرَ بِشَيْءٍ مَّا قَتَلْنَا هَٰؤُلَاءِ (پس یہ قول) هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ (کیا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں منافقین کا ہے اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ذو جہین بات کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے ذو جہین کہی۔

اس کا ایک محل تو حق ہے۔ وہ محل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قادر ظاہر کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اس نے چاہا وہ کیا۔ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر ان کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ فوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں ان کے کچھ اور تھا۔ سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے۔ یہ اعتقاد اسباب کے مؤثر ہونے کا ہے۔ اور یہی ان کا عقیدہ تھا کہ اسباب مؤثر بالذات ہیں۔ پس اسی پر

يُخْفُونَ فِي الْأَنْفُسِ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ
اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے۔

مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں۔ آگے اس کو بیان فرماتے ہیں۔

يَقُولُونَ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ لَنَأْمُرَ بِشَيْءٍ مَّا قَتَلْنَا هَٰؤُلَاءِ
کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے

میں آگے مصرع ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَإِنْ زَنْتَ فَإِنَّ سَخِرَ لِعَيْنِ أَكْرَبَ وَهَذَا كَرَّسَ، اور

چوری کرے

تب بھی جنت میں داخل ہوگا۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بہار جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا و سرقت سے ایمان نہیں جاتا۔ اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ گو بعد سزا سہی۔ تو اعمال کی عدم ضرورت اس سے کیسے ثابت ہوئی۔ جیسے جہلاء کا زعم ہے کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں۔ اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے۔ یہ تو بہت آسان بات تھی۔ اسی کی تعلیم فرما دیتے۔ نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اور کس سے ساقط ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے آخر صحابہ میں کوئی بھی سمجھ دار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہ نماز نہیں پڑھتے تھے اور اعمال نہیں کرتے تھے۔ کیا صرف لا الہ الا اللہ پڑھ کر تھے۔ ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک کو چھوڑنا بہت برا خیالی کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق۔ یہاں دلائل

کا یہ مفہوم نہیں۔ صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے
جیسے تراش لئے ہیں۔ کیا آیت
وَلَطَّلُ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ
چاہئے کہ عمل کریں۔ اس کی مثل عمل کرنے والوں کو

اور حدیث

مَنْ تَوَكَّلَ الْقَلَوَةَ مُتَعَدًّا
فَقَدْ كَفَرَ
جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا
وہ کافر ہو گیا۔

وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں۔ کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی۔ مجھے تو شرم آتی ہے
ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے۔ غرض یہ بات
رِجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ
نہیں غافل کرتی۔
جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے اُن ہی اعمال کو تیار ہی ہے جن کی
حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔

اب وہ صفات سنئے کیا ہیں۔ بعضے ایکل درجہات
وین و دنیا کا تعلق
میں گرفتار ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں
ہمیں جنت و دوزخ سے کچھ سروکار نہیں۔ اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت
ہے۔ عمل تو وہ کرے جو جنت کو لینا چاہے۔ ہمیں اس سے مطلب ہی نہیں۔
ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا
چاہئے۔ جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے۔ ذات کی طلب میں تو بڑی

مشقت اٹھاتی پڑتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اور زیادہ
عمل کی ضرورت ہے۔ اب ان اعمال کو سفیئے ارشاد فرماتے ہیں۔
لَا تَلْهَيْهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ
ان کو تجارت اور خرید و فروخت
عن ذکر اللہ الخ
اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں
کرتی۔

اپنے اچھے بندوں کی ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں
جن کو غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے۔ اس صفت کا حاصل ایک غلطی
کا رفع ہے اور انہی غلطی کی وجہ سے لوگوں میں عمل کی ہمت نہیں رہی۔ آج کل کے
غیر محقق و عظیمین نے عقل کو کھو رکھا ہے۔ ایسی ایسی حکایات لوگوں کے سامنے
بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ غلطی یہ ہوئی ہے کہ
لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے جاتا رہتا ہے۔
اس لئے وہ دین کا کام نہیں کرتے۔

تو خوب سمجھ لیجئے کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے نہیں جاتا بلکہ
جن وقت آدمی کو دین کا شوق ہوتا ہے تو ضروری دنیا تو اور زیادہ آسانی سے
ملتی ہے البتہ فضول دنیا خود رخصت ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے چراغ
کے جلنے سے تاریکی جاتی رہتی ہے۔ جب چراغ آیا تو اندھیرا کہاں۔ باقی ضروری
دنیا میں تو اور زیادہ برکت نصیب ہوتی ہے تو ضروری اور مفید دنیا دین کے
ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ پس بہت لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات جب
سب ختم ہو جائیں تب دین اختیار کریں۔ یہ خیالی محض غلط ہے۔ البتہ دین میں

یہ ضروری ہے کہ کمال پر غیر اللہ یعنی جو دنیا مضر ہے وہ خود رخصت ہو جاتی ہے
مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ دین پر چلنے سے بیٹا مر جائے گا۔ بہن مر جائے گی۔
مال و دولت سب اتار رہے گا۔ سو دنیا کی دولت رخصت نہیں ہوتی۔ البتہ ان
چیزوں کے مضر تعلقات رخصت ہو جاتے ہیں یعنی بیٹے کے ساتھ جو تعلق
اب ہے محبت کا جو صاحب عن اللہ ہے وہ نہیں رہتا۔ جو تعلق بیٹے کے
ساتھ اب ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو جائے گا۔ سب چیزیں فنا ہوتی
ہیں مگر فنا کے وہ معنی نہیں جو عوام کے نزدیک ہیں کہ آدمی کو کہیں کی بھی خبر نہ
رہے نہ کھانے کی نہ پینے کی نہ اپنے تن کی۔ سو یہ معنی نہیں۔ فن کی کتابیں دیکھئے تو
معلوم ہو۔ پڑھے لکھے لوگ بھی کتابیں پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے۔ فنا کا حاصل
ہے فضول تعلقات کا سب اتار ہونا۔ یعنی دنیا کی چیزوں سے جو تعلق اب ہے وہ
نہیں رہتا بلکہ وہ تعلق خدا کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ چیزیں کسی درجہ
میں محبوب بھی نہ رہیں ان سے بالکل ہی بے تعلقی ہو جائے۔ ان سے کوئی
فاصلہ ہی نہ رہے۔ یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی محبت مغلوب ہو جاتی ہے اور اس میں
کوئی عذر نہیں کہ ان چیزوں کے ساتھ بھی محبت کا تعلق ہو۔ مگر غالب تعلق اللہ
کے ساتھ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ آبَاؤُكُمْ وَابْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ
وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ بَقِيَتْ مِنْكُمْ وَأَمْوَالٌ تَحْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسْكِينٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَ
رُسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ

بِأَمْرِ ط

کہہ دیجئے کہ اگر باپ تمہارے اور بھائی تمہارے اور بیٹے تمہارے اور بیبیائیں تمہاری اور قبیلہ اور کنبہ تمہارا اور مال جو کمائے ہیں تم نے اور سوداگری جس کے مندا ہونے سے ڈرتے ہو اور گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے پس انتظار کرو یہاں تک کہ لاؤں اللہ اپنا حکم۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ صورت تو بُری ہے کہ یہ چیزیں احب ہوں یعنی زیادہ محبوب ہوں اللہ سے۔ معلوم ہوا کہ اگر کم محبوب ہوں تو مضائقہ نہیں۔ آیت میں زیادہ محبوب ہونے کی مذمت کی گئی ہے یعنی یہ چیزیں زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں۔

باقی اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو مساوات کی نفی نہیں کی گئی کہ یہ چیزیں محبت میں مساوی بھی نہ ہوں

اہل اللہ کی حالت

تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مساوات میں مضائقہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی خلاف ہے مساوات بھی نہ ہونا چاہئے۔ وہ بھی ایسی ہی بُری ہے جیسے زیادہ احب ہونا بُرا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال ہی نہیں۔ اس لئے مساوات سے بحث ہی نہیں کی کیونکہ برابر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ مشاہدہ ہے اور جو چیز واقع نہیں ہوتی اس سے بحث نہیں ہوتی۔ وہ تو خود ہی خارج ہے۔ پس بہت لوگ جو

یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوگی تو یہ چیزیں چھٹ جائیں گی۔ سو یہ بات نہیں، یہ چیزیں چھوٹیں گی نہیں البتہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے سے ان چیزوں کی محبت کم ہو جاتی ہے جو خود مفید ہے کیونکہ محبت کم ہونے سے پریشانی کم ہو جائے گی۔ کیونکہ پریشانی کی حقیقت ہے کسی متوقع چیز کا چھٹ جانا اور جب محبت کم ہوگی اُس کی طرف التفات بھی نہ ہوگا۔ تو اُس کی تمنا اور توقع بھی نہ ہوگی۔ جب توقع ہی نہ ہوگی تو پریشانی کیسی۔ بلکہ وہ چیز ہوتی ہے اور نہ ہو تب، دونوں حالتیں برابر ہوں گی۔ جیسے کسی کو اولاد کی تمنا ہو تو اُس کو نہ ہونے سے پریشانی ہوگی اور جو تمنا ہی نہ ہو تو کیا پریشانی ہوگی۔ اہل اللہ کو کسی چیز کے جانتے رہنے سے اسی لئے پریشانی نہیں ہوتی کہ اُن کو کسی چیز کی تمنا ہی نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن کے پاس کسی امیر نے ایک بیش قیمت موتی ہڈی بھجوا دی۔ خادم نے پیش کیا۔ فرمایا، الحمد للہ! اور حکم دیا کہ اس کو رکھ لو۔ خادم نے رکھ لیا۔ اتفاق سے وہ موتی چوری ہو گیا۔ خادم نے یہ واقعہ بھی عرض کیا۔ اُن بزرگ نے فرمایا، الحمد للہ! خادم کو بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے دوسرے وقت پوچھا کہ حضرت! مجھے بڑی ہیرت ہے۔ وہ یہ کہ جب موتی حضور میں آیا تھا تو اُس وقت بھی آپ نے الحمد للہ فرمایا تھا اور ضائع ہونے کی خبر معلوم ہو کر بھی یہی الحمد للہ فرمایا۔ اس میں کیا راز ہے؟ آنا اور جانا دونوں پر کیسے خوشی ہو سکتی ہے۔ فرمایا میں نے نہ اُنے پر الحمد للہ کہا نہ سجانے پر۔ بلکہ جس وقت آیا تھا میں نے قلب کو دیکھا کہ اُسے پر کچھ خوشی نہیں ہوئی۔ اس پر

میں نے الحمد للہ کہا تھا۔ اسی طرح جانتے رہنے پر میں نے قلب پر کچھ رنج نہیں پایا۔ اس لئے میں نے الحمد للہ کہا۔ یہ حالت ہے اہل اللہ کی۔

اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ کسی امیر نے ایک بزرگ کی خدمت میں ایک چلینی آئینہ بہت قیمتی ہدیہ بھیجا تھا۔ وہ بزرگ کبھی کبھی اس میں اپنا منہ دیکھا کرتے تھے۔ اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ اس کو بڑا ہی ڈر ہوا کہ دیکھتے کیا ہوگا۔ کیسا جلال آئے گا۔

جلال پر ایک مضمون یاد آیا۔ وہ یہ کہ خدا کے اسماء کو لوگ جلالی اور جمالی کہتے ہیں۔ یہاں تک تو صحیح ہے۔ واقعی اسمائے باری تعالیٰ بعض جلالی ہیں اور بعض جمالی مگر لوگوں نے جو ان سے مراد نہ رکھی ہے وہ غلط ہے۔ لوگوں کے نزدیک جلالی ان اسماء کو کہتے ہیں جن کے پڑھنے سے بال پڑے گرمی پیدا ہو، جنوں پیدا ہو جائے اور جو اسماء ایسے نہ ہوں ان کو جمالی کہتے ہیں۔ سو یہ تفسیر محض غلط ہے۔ کہیں خدا کے نام سے بھی وبال اور خواست یا جنوں پیدا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ! بلکہ جلالی وہ ہیں جن میں معنی قہر کے پائے جاتے ہیں جیسے قہار، جبار، عزیز اور جمالی وہ ہیں جن میں معنی لطف کے پائے جاتے ہیں، جیسے رحمن، کریم، لطیف۔ سو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں دونوں صفتیں ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے بعض بزرگوں کو بھی لوگ جلالی کہتے ہیں کہ ان کو غصہ بہت آتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ بزرگوں کو غصہ آتا ہے مگر اس میں مصالح ہوتے ہیں۔ پس ان کا جلال بھی مشتمل بر جمالی ہوتا ہے۔ جیسا حق تعالیٰ

کے قہر کے ساتھ بھی لطف ملا ہوا ہوتا ہے۔

اس لطف پر ایک آیت یاد آئی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْ يُوَٰخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ

بِظُلْمِهِمْ مَا تَوَلَّكَ عَلَيْهِمَا

مِنْ دَابَّةٍ۔

ہیں سب کو ہلاک کر ڈالتے۔

ظاہر یہاں مقدم اور تالی میں ملازمت کا تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ تو ہو آدمیوں سے اور ہلاک ہوں وہ اب بھی۔ اگر یوں فرماتے تو ملازمت کا تعلق ہوتا۔

وَلَوْ يُوَٰخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ

بِظُلْمِهِمْ مَا تَوَلَّكَ عَلَيْهِمَا

مِنْ النَّاسِ۔

فرماتے تو زمین پر کوئی آدمی

نہیں رہتا۔

سو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمیوں کو ڈرا بھی رہے ہیں جو قہر و جلال

ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا شرف بھی بتلا رہے ہیں جو لطف و جمال ہے

تقریر اس کی یہ ہے کہ اگر انسان سے مواخذہ کیا جاتا تو سارے عالم کو اس

لئے درہم برہم کر دیا جاتا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان ہی کے واسطے ہے

جب یہ نہ رہتا تو کچھ بھی نہ رہتا۔ سبحان اللہ! جن پر غفہ ہے ان کی شرافت

و مقصودیت بھی ظاہر کی جا رہی ہے۔ صاحبو! واقعی تم بڑے مرتبہ والے ہو

مگر افسوس ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر تدبیر نہیں کرتے اگر تدبیر کرتے تو اللہ تعالیٰ کے غصہ میں بھی رحمت نظر آتی اور اس سے ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی۔ اسی طرح اہل اللہ بھی غصے ہوتے ہیں مگر ان کے غصہ کے اندر رحمت بھی ہوتی ہے۔ واقعات کو دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کتنی رعایتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ جن بزرگ کا واقعہ میں بیان کر رہا تھا کہ خادم کے ماتھے سے ان کا آئینہ چلنی ٹوٹ گیا جو موجب عتاب و عقاب ہوتا۔ مگر اس میں بھی ان کی رحمت کا ظہور ہوا۔ وہ اسی طرح کہ خادم کو جب عتاب کا ڈر ہوا تو اس نے سوچا کہ بزرگ زندہ دل ہوتے ہیں۔ لاؤ شاعری بگھارو۔ خوش ہو کر کچھ نہ کہیں گے۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ ج

از قضا آئینہ چلنی شکست

آپ فی البدیہہ فرماتے ہیں۔ ج

خوب شد اسباب خود بینی شکست

یعنی اس آئینہ کا بھی جھگڑا ہی تھا۔ خود بینی کا سبب تھا، اچھا ہوا ٹوٹ گیا۔ پاپ کٹا۔ یہ حالت ہوتی ہے اہل اللہ کے دنیوی تعلقات کی کہ ان کو کسی چیز کے نہ آنے سے فرحت ہو، نہ جانے سے غم۔ اسی انقطاع تعلق کو کہتے ہیں۔

تا بدلی ہر کراہیدہاں بخواند از ہمہ کار ہہاں بیکار ماند
جن شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کار و بار سے بیکار کر دیتے ہیں۔

اُس کا یہ مطلب نہیں کہ زراعت، تجارت، بی بی بیچے سب چھوٹ جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن سے دل کو کوئی خاص لگاؤ اور تعلق نہیں رہتا بلکہ خاص لگاؤ اللہ تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔

بلکہ میں کثرت سے ایسے دکاندار ہیں جن کی یہ حالت ہے کہ دکان پر سودا لئے بیٹھے ہیں اور دلائل الخیرات پڑھ رہے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں، ذکر میں مشغول ہیں۔ کوئی خریدار آیا سودا دے دیا۔ پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ ٹھوڑی دیر بیٹھ کر جب بقدر ضرورت مل گیا دکان بند کی اور گھر کو بلکہ اکثر حرم شریف کو چل دیئے۔ بس اتنا تعلق ہے اُن کو دنیا کی چیزوں سے۔

رزقِ حلال کا اثر | ایک شخص عبداللہ شاہ تھے دیوبند میں جو گھاس بیچتے تھے جو ملتا تھا اُس میں سے ایک حصہ اپنی والدہ کو دیتے اور ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے اور باقی اپنے خرچ میں لاتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور دوسرے حضرات کی دعوت کی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ دعوت کہاں سے کرو گے۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا۔ کہنے لگے کہ جو حصہ خیرات کا نکالتا ہوں، اُسی سے دعوت کہہ دوں گا۔ غرض پانچ آنے جمع کئے اور حضرت مولانا کے پاس لائے اور کہا کہ تم ہی پکا لیجیو۔ میں کہاں جھگڑا کروں گا۔ اگر دنیا دار بھی اس طرز کو اختیار کر لیں تو کیسا اچھا ہو۔ وہاں تھے کئی اور پیسے کل پانچ آنے۔ بزرگوں مہانوں کا مشورہ ہوا کہ کوئی کستی سی چیز تجویز کی جائے۔ چنانچہ بیٹھے سچا دل گڑ کے تجویز ہوئے۔

بڑی احتیاط سے پکائے گئے۔ کوری مانڈی منگائی گئی۔ پکانے والے کو وضو
کرایا گیا۔ غرض ہر طرح کی احتیاط کی گئی۔ وہ چاول تھتے ہی کھتے۔ ایک ایک
دولتے کھالٹے۔ مولانا خود فرماتے تھے کہ اُن دولتوں کی یہ برکت دیکھی کہ
ایک ماہ تک قلب میں الوار و برکات محسوس ہوتے تھے۔ ایک ماہ کامل یہ
اثر رہا۔ اور میں کہتا تھا کہ جس کی کمائی کے ایک لقمہ کا یہ اثر ہے تو جو دنیا کی
اسی کو کھاتا ہے، اُس کی کیا حالت ہوگی۔

صاحبزادہ اگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت ہوگی تو یہ بات
پیدا ہو جائے گی۔ پس اہل اللہ دنیا کو ضروری تو سمجھتے ہیں مگر الضوری بتقدیر
بتقدیر الضوری اُن کا مشرب ہوتا ہے یعنی ضروری چیز بقدر ضرورت ہی
اختیار کی جاتی ہے۔ وہ حضرات بقدر ضرورت دنیا کو حاصل کرتے ہیں جیسے
تم پاخانہ میں جاتے ہو تو کیا وہاں تفریح کے لئے جاتے ہو بلکہ ضرورت رفع
کرنے کو۔ اور جہاں ضرورت رفع ہو گئی پس باہر نکل آئے۔ اسی طرح اُن کے
نزدیک دنیا ایک حاجت کی چیز ہے۔ تفریح کی چیز نہیں، دل لگانے کی جگہ
نہیں۔ پس اللہ کی محبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں سے ضروری تعلق
رہ جاتا ہے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

تبادلہ ہر کرانہ دال بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر | پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی محبت
سے دنیا جاتی رہتی ہے تو اُس کے

معنی یہی ہیں کہ اُس کو دنیا سے تعلق و محبت نہیں رہتی۔ یہ معنی نہیں کہ وہ سارے

حقوق کو مستقل کر کے بیٹھ رہے۔ وہ کرتا سب کچھ ہے مگر دل اور ہی طرف رہتا ہے۔ پس یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دل بیار دست بکار۔ دنیا داروں کی طرح نہیں کہ ہر وقت دنیا ہی میں اُن کا دل رہتا ہے۔

چنانچہ ایک شاعر تھے اُن کو نماز میں بھی شعر ہی کی سوچتی تھی۔ جہاں کوئی مصرعہ موزوں ہوا نماز توڑ دیتے اور شعر لکھ لیتے۔ ایسے ہی دنیا داروں کا مذاق ہے کہ اگر نماز کے وقت گاہک آگیا تو یوں سمجھتے ہیں کہ اگر نماز جماعت سے پڑھی اور دیر لگ گئی تو گاہک بھاگ جائے گا۔ اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نماز جماعت سے پڑھو۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جانے کے بعد دنیا کی چیزوں سے ایسا تعلق نہ رہے گا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے۔ باقی وہ کمانے میں غم سے اچھا رہے گا۔

ہمارے قریب گاؤں میں ایک شخص ہیں ایک گاؤں میں کھیتی کرتے ہیں اور کھیتی بھی عجیب طریقہ سے۔ ایک بیل تو اُن کے پاس ہے اور دوسرا بیل ضرورت کے وقت کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے چوتھے سال دس پانچ روپے کسی سے قرض بھی لے لیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اتنا غلہ پیدا ہو جاتا ہے جسے کہ سال بھر کو کافی ہو جاتا ہے اور دین کی یہ حالت ہے کہ کام بھی کرتے ہیں اور ذکر میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ اطمینان اُن کے اندر اس قدر دیکھا کہ ایسا اطمینان ہوتا مشکل ہے۔ بیماری (انفلوئنزا) جو پھیلی تھی تو لوگوں کے دلوں کی کیا حالت تھی سب جانتے ہیں کہ کیسی پریشانی سب کو تھی۔ وہ اسی حالت میں میرے

پاس آئے تھے۔ خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ بھی ایک شان ہے اللہ کی کہ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ہراس اُن پر نہ تھا۔ ویسے وہ دیکھنے میں گنوار ہیں۔ کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں۔ مگر فہم کی یہ حالت ہے کہ پڑھے لکھوں سے زیادہ فہم ہیں۔

دین اور فہم | دین سے فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ اسی درستی فہم پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شخص گنوار حضرت مولانا گنگوہی صاحب

کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی جی، مجھے مرید کر لو۔ حضرت نے فرمایا، اچھا بھائی آ۔ مرید کرتے ہوئے جو باتیں کہلاتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھا کرو سب کچھ کہلو الیا۔ جب مولانا اپنی باتیں پوری فرما چکے تو آپ کہتے ہیں کہ مولوی جی تم نے افیم سے تو توبہ کرائی نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر کہ تو افیم بھی کھاتا ہے۔ حضرت چونکہ طبیب بھی تھے، جانتے تھے کہ دفعۃً ایون کا چھوڑنا مشکل ہے اور طالب کی حالت کی رعایت ضروری ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ کتنی کھایا کرتے ہو میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ اُس نے گولی بنا کر حضرت کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حضرت نے اُس میں سے کچھ کم کر کے باقی اُس کو دے دی اور فرمایا کہ اتنی کھا لیا کرو۔ پھر مشورہ کر لینا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کہنے لگا۔ اہی مولوی جی جب توبہ ہی کر لی۔ پھر اتنی اور اتنی کیا۔ یہ کہہ کر ایون کی ڈبیہ نکال کر دیوار پر ماری اور یہ کہا کہ اہی افیم، جہاں میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ میں یہ کہہ کر چلا گیا نہ ذکر پوچھا نہ مشغل۔

ایون کے چھوڑنے سے دست آنے لگے۔ اُس نے کہلا کر بھیجا

کہ مولوی جی دُعا کر دیجیو کہ میں اچھا ہو جاؤں مگر افیم نہ کھاؤں گا۔ عرض بُری
 حالت تک نوبت پہنچی، مرتے مرتے بچا۔ مگر اچھا ہو گیا۔ تندرست ہو کہ
 حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کون؟ کہا میں ہوں افیم
 والا اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد دورِ واپس پیش کئے۔ مولانا نے کسی قدر
 عذر کے بعد دلجوئی کی۔ اور روپے قبول فرمائے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ اچی مولوی
 جی! یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ کیسے روپے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی
 اب بتلا دے کیسے روپے ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ روپے افیم کے ہیں۔ حضرت
 نے پوچھا کہ افیم کے کیسے۔ اُس نے کہا کہ میں دورِ واپس مہینہ کی افیم کھاتا تھا
 جب میں نے افیم سے توبہ کی تو نفس بڑا خوش ہوا کہ اب دورِ واپس ماہوار
 بچیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ تو دین میں دنیا مل گئی۔ بس میں نے نفس سے کہا کہ
 یہ یاد رکھو کہ یہ روپہ تیرے پاس نہ چھوڑوں گا۔ یہ مت سمجھ کہ تجھے دے دوں گا
 بلکہ اسی وقت نیرت کر لی کہ جتنے کی افیم کھایا کرتا تھا وہ پیر کو دیا کروں گا پس
 یہ دورِ واپس ماہوار آپ کے پاس آیا کریں گے۔

دیکھا آپ نے یہ گنوار کی حکایت ہے جس کو پڑھنا لکھنا کچھ نہ آتا تھا
 مگر دین کی سمجھ ایسی تھی کہ دین میں دنیا کی آمیزش کو فوراً سمجھ گیا۔ یہ وہ بات
 ہے کہ اچھے اچھے لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ کامل بزرگوں سے ایسے
 واقعات منقول ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن نورانیؒ کا واقعہ ہے کہ ایک جہاز میں بیس ملے
 شراب کے خلیفہ وقت کے واسطے آئے تھے۔ آپ بھی دریا کے کنارے

ٹہلنے ہوئے پہنچے۔ جہاز والے سے پوچھا کہ اس میں کیا چیز ہے؟ اُس نے کہا کہ خلیفہ کے واسطے شراب آئی ہے۔ آپ نے مشکوں کو توڑنا شروع کیا۔ انیس توڑ دیئے صرف ایک مشکا باقی رہ گیا تھا کہ اُس کو آپ نے چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کی خبر خلیفہ کو پہنچی خلیفہ کو غصہ آیا اور اُن کے پکڑ لانے کا حکم ہوا۔ حاضر کئے گئے۔ خلیفہ نے ایسی جرات کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا حق تعالیٰ کا حکم ہے

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ
حکم کر کہنے کا اور روک برائی
سے جو تکلیف تجھ کو پہنچے اُس
پر صبر کر۔

خلیفہ نے پوچھا کہ ایک کو کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ اس کے توڑنے میں نفس کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس لئے چھوڑ دیا۔ وہ اس طرح کہ جب میں انیس مشکے توڑ چکا تو نفس کے اندر خیال ہوا کہ تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پروا نہ کی۔ اس بات پر نفس بھولا۔ تو میں نے ایک کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ کام خالص اللہ کے واسطے رہا تھا۔ خلیفہ پر اس اخلاص کا یہ اثر ہوا کہ اُن کا معتقد ہو گیا اور محتسب شہر بنا دیا۔ اسی طرح نفس کی کید کی طرف اُس گنوار کا فہم بھی پہنچا۔

یہ حکایت (گنوار کی) اس پر یاد آگئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ دین اختیار کرنے سے آدمی کا فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ باتیں منکشف ہوتی ہیں جو علماء کو بھی نہیں ہوتیں۔ یہ تو نعمت معنوی ملتی باقی حسی نعمتیں بھی ایسے شخص کو اور دل سے زیادہ عطا ہوتی ہیں۔

چنانچہ سب نعمتوں کی روح اطمینان ہے اور
چند غلط فہمیوں کا ازالہ | اس شخص کو اطمینان کہ اگر خاص دین کے ہو

جاؤ گے تو اور دن سے اچھے رہو گے، ایسا میسر ہوتا ہے جو مال سے بھی کبھی
 حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک اور بات کہتا ہوں کہ دنیا کی چیزوں سے اگر تعلق
 کم ہو گیا تو ضرر کیا ہوا بلکہ تعلق کم ہونے سے تو اور قید سے رہائی ہو جائے گی
 بہر حال یہ اثر ہے دین میں کہ دنیا کا فکر و غم کم ہو جائے گا۔ یہ خود اس میں
 خاصیت ہے۔

باقی بعضوں کا یہ خیال بالکل ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے سب کام
 پورے کر لیں، اس کے بعد دین حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم
 ہی نہیں ہوتا۔ ع

کارے دنیا کے تمام نہ کرو

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ساری عمر دنیا کے قصوں میں گزر جاتی ہے۔
 دین کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ بس اگر کامیابی کی صورت ہے تو یہی ہے کہ دین کا
 کام شروع کر دو۔ یہ انتظار ہی مت کرو کہ پہلے دنیا کا کام تمام کر لیں پھر دین کا کام
 کریں گے۔ دین کی روشنی پھیلنے سے فضول دنیا کی ظلمت خود ہی جاتی رہے گی
 اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس کی ہمت نہ ہو، تو چلو یہ بھی نہ سہی بلکہ یوں کرو کہ دونوں
 کو ساتھ ساتھ شروع کر دو۔ دنیا سے فارغ ہونے کا انتظار مت کرو۔ دین خود
 دنیا پر غالب آ جاوے گا۔

دنیا کے ساتھ دین شروع کرنے کے متعلق بھی لوگ ایک بڑی غلط فہمی

میں مبتلا ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ طاعت و تجارت میں منافات ہے پھر دنیا کے ساتھ دین کیسے شروع کریں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ دکاندار ہی نہ ہو تب طاعت ہو سکتی ہے۔ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ حق تعالیٰ اس غلطی کو بھی رفع فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

لَا تُلْهِكُمْ تِجَارَتُكُمْ وَلَا بَيْعُكُمْ
عَنِ
لَعْنَةُ اللَّهِ
یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرما رہے ہیں کہ اُن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔ یوں نہیں فرمایا رَجَالَ لَا يُتَخَبَّرُونَ کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے۔ پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت اُن کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر اللہ بیع و تجارت کو چھوڑاتا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

بہر حال ایک غلطی تو یہ ہے کہ بعض لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ دنیا کو جب تک بالکل نہ چھوڑ دیں، دین کیا اختیار کریں اور دنیا چھوڑنا مشکل اس لئے وہ دین کو اختیار ہی نہیں کرتے حالانکہ دین دنیا کو چھوڑاتا نہیں۔ یہ غلطی تو اُن لوگوں کی ہے جو ہنوز دین کے طالب ہی نہیں ہوئے۔ اس غلطی کا سبب وہی دین و دنیا میں تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک وہ لوگ ہیں جن کے قلب میں دین کی عظمت ہے اور بزعم خود اُس کے طالب بھی ہیں مگر اُن کی یہ حالت ہے کہ جس کو فقیر مَن لیا اُس کی تعظیم

کرنے لگے۔ گو وہ تعظیم شرک ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ منشا اس تعظیم کا عظمت ہے دین کی مگر اس عظمت میں غلو ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ پیروں ہی کے ہوئے اور بیوی بچوں سے بے تعلق ہو گئے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تجارت اور دین میں تنافی ہے اس لئے دنیا کو بالکل قطع کرتے ہیں۔ اس غلطی کا سبب بھی وہی دین و دنیا کی تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک غلطی نئی تعظیم یافتوں کو ہوتی ہے کہ وہ خالص دنیا کے قصد کو ضروری نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اصل اور مقصود بالذات دنیا ہی کو قرار دے رکھا ہے اس کے تابع دین بھی سہی۔ دین کو دنیا کے ساتھ ایسا سمجھتے ہیں جیسا دوپٹہ میں سبک اصل مقصود تو دنیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹھوڑا لگاؤ دین کا بھی سہی۔ دین کو تابع نہیں سمجھتے جیسے کپڑا تو اصل ہے اور سبک اس کے تابع۔ اسی طرح یہ لوگ دنیا کو اصل قرار دے دیتے ہیں کہ اگر وقت نیچے تو خیر دین کا کام بھی کرو۔ اگر نہ نیچے تو مت کرو۔

بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ مذہب صرف اس لئے ہے کہ دنیا کی ترقی کی جائے۔ بعض کو جنت و دوزخ سے بھی انکار ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف ڈرانے کی غرض سے جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے کوئی واقعی چیز نہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر واقعی چیز سے جس کا غیر واقعی ہونا بھی بتلادیا جائے کیسے تخلیف ہو سکتی ہے۔ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے اس کا وجود الفاظ ہی میں ہے واقع میں نہیں تو وہ اس سے کیا خاک ڈرے گا۔ پس یہ دعوائے عقل بھی غلط ہوا کہ صرف ڈرانے کی غرض سے دوزخ

کا ذکر کیا ہے۔ جب عقلاً یہ مصلحت محض باطل ہوئی تو یوں کہو کہ فصول ذکر کیا ہے۔ سو ایسا ایمان و اسلام آپ ہی کو مبارک ہو۔ جو خدا کی طرف لغو اور عبادت کو منسوب کرے۔ اور اگر عرض بھی کر لو نعوذ باللہ جنت و دوزخ واقعی کوئی چیز نہیں اور اللہ تعالیٰ نے محض بطور پالیسی کے ان کا ذکر کیا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے ہم کو ڈرایا ہے تو یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس کی عرض یہی ہے کہ لوگ جنت و دوزخ کا اعتقاد رکھیں تو پھر اس کی کیا وجہ کہ خداوند تعالیٰ ایک پالیسی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آپ اس کو توڑنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے فہم پر بات لازم نہیں کہ خدا کی پالیسی کی حفاظت کریں۔ نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں چلی گئی یا مسخ ہو گئی۔

علاوہ اس کے اگر جنت و دوزخ کا وجود نہیں تو ان سے ڈرانا ایسا ہوا جیسے ہوتی سے بچوں کو ڈرایا کرتے ہیں کہ اس کا وجود کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا۔ پھر اس کا بھی قائل ہونے پڑے گا کہ نیر اللہ تعالیٰ بے وقوفوں ہی کے ڈرانے کو ہیں۔ ان حاقلوں کے ڈرانے کو نہیں کیونکہ ہوا سے تو بے وقوف ہی ڈرا کرتے ہیں۔ لندن کی ہوا کھاتے والے خاک ڈریں گے۔ سبحان اللہ! کیا عظمت کی ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عنقریب معلوم ہو جائے گا آخرت میں۔ عرض ان لوگوں کے نزدیک اصل تو ہے دنیا باقی دین و مذہب وہ محض دنیا کی حفاظت کے لئے ہے۔

اس طرح سے مشاہدہ ہے کہ مذہب کے برابر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ جب مذہب کی پابندی ہوگی تو فتنہ فساد

نہ ہوگا کوئی کسی کا حق نہ مارے گا، چوری نہ کرے گا۔ آپس میں اتفاق قائم رہیگا پس دنیا پر امن ہوگی۔ گویا مذہب اُن کے نزدیک اس لئے بنایا گیا ہے کہ دنیا کی حفاظت رہے۔

صاحبو! اس سے تو سارا قرآن و حدیث ہی اڑا جاتا ہے۔ پھر چونکہ اصل مقصود ان کے نزدیک، دنیا ہے اور اہل دین مقصود دین کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ دین والوں کو بے وقوف بھی سمجھتے ہیں۔ اور اس اعتقاد کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ اپنوں سے بوجہ طالب دین ہونے کے غیر معتقد اور غیر قوموں کی بوجہ طالب دنیا ہونے کے مدح کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ مذاق ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے چنانچہ دیکھ جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو بات بھی ہے وہ تو ان کے نزدیک بڑی اور غیر قوموں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اچھی۔ ہمیشہ اپنے لوگوں کی بُرائی اور غیر قوموں کی مدح کرتے رہتے ہیں۔

ایک اثر یہ ہے کہ علماء کی بات کو نہیں مانتے کیونکہ ان کو تو یہ قوف شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ علماء ہمیشہ سے کہتے آرہے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک جماعت خالص مذہبی ہونی چاہئے جو محض مذہب کی خدمت کرے مگر یہ لوگ اُس میں قیل و قال کرتے رہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اُن کی یہ ساری قیل و قال اسی وقت تک رہی جب تک کہ غیر اقوام نے اپنے انداز ایسی مذہبی جماعت پیدا نہیں کی تھی اور اب جو وہ ایسا کرنے لگے تو یہ بھی اُن ہی کا دم بھرنے لگے۔ کہ مذہبی جماعت ضرور ہونا چاہئے۔ چنانچہ غیر قوموں کی دیکھا دیکھی اب کسی قدر یہ بھی علماء کے ہم زبان ہو گئے ہیں۔ بس ان کا مشرب

وہی ہو جاتا ہے جو غیر قوموں کا مشرب ہو جاوے۔ حالانکہ بفضلہ تعالیٰ ہمیں قوموں سے کسی چیز کے لینے کی کچھ بھی حاجت نہیں۔ ہمارے یہاں تو سب کچھ ہے مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں :-

ایک سبد پر نال ترابہ فرق سر تو بھی جوئی لب نال در بدر
ایک ٹوکرا روٹیوں کا بھرا ہوا تیرے سر پر رکھا ہوا ہے اور تو
روٹی کا ٹکڑا در بدر مانگتا پھرتا ہے۔

ہمارے یہاں تو جو ہرات بھرے ہوئے ہیں اور یہ دوسروں سے کوڑیوں کے طالب ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ تقلید کرتے ہیں غیر قوموں کی حالانکہ اپنے یہاں سب کچھ ہے۔

اور طرفہ یہ ہے کہ اس کو رائہ تقلید میں پریشانی بھی اٹھاتے ہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی :- ایک اچھے صاحب

تھے جنٹلمین، مگر کے غریب تھے اس لئے کوٹ پتوں بھی صرف سوئی گبروں کا تھا۔ جس میں ذرا گرمی نہ تھی۔ جاڑے کا موسم، ریل میں سفر کر رہے تھے اور جنٹلمین لباس پہنے ہوئے تھے۔ کان بھی کھلے ہوئے سر بھی کھلا ہوا۔ ایک انگریز نے لیمن پانی اور برف پیا۔ آپ نے بھی تقلید میں برف پیا۔ لیمن اینٹھ گئے۔ ایک اور صاحب جو مجھ سے اس حکایت کو بیان کرتے تھے اُس درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس رضائی تھی۔ اُن کو صاحب بہادر کے حال پر رحم آیا۔ انہوں نے کہا کہ رضائی لیتے ہو۔ کچھ انکار نہ کیا چکے سے لے لی۔ سب اینٹھ مروڑ نکل گئی۔ خدا کے بندے کو اس حالت میں بھی برف پیارہ گیا تھا۔ مگر صاحب

بہادر کیسے نہیں، اگر ایسا نہ کریں۔ وہی مثل ہے۔

کلاسے تک کبک درگوش کرد تک خوشیتن رافرا موش کرد
ایک کوٹے نے چکور کی چال اختیار کی اپنی خیال کو بھول گیا۔

ایک اور صاحب بہادر ریل میں سفر کر رہے تھے اور ایک مولوی
پرانے خیال کے سیدھے ساوے چلن دانے بھی اس درجہ میں بیٹھے ہوئے
تھے اور ان کے ساتھ صراحی تھی۔ ان میں انہوں نے پانی بھر کر رکھ لیا تھا کیونکہ
راستہ میں پانی کی کمی تھی۔ آپ صراحی کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن
لیا ہے۔ انہوں نے کہا، جیسا میں ہوں ویسا ہی میرا برتن ہے۔ چونکہ بیچارے
ساوے پٹرے پہن رہے تھے اور ایسے لوگوں کی آج کل کچھ قدر نہیں۔ بلکہ
ایسے لوگوں کو یہ لوگ وقیانوسی خیال کا کہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایسی
بیباکی کی گفتگو کی۔ صاحب بہادر کو اتفاق سے شدت کی پیاس لگی اور پانی ساتھ
رکھنا خلاف تہذیب تھا۔ اب لگے کن انکھیوں سے مولوی صاحب کی صراحی
کو ٹکنے لگے شرم کے مارے ناگہیں کیسے۔ واقعی کریم انضبی اہل اللہ پر ختم ہے۔
مولوی صاحب کو ان کی سالت پر رحم آیا۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی رحم نہ کرتا انہوں
نے قرآن سے معلوم کر لیا کہ اس کو پیاس لگی ہے مگر شرم کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے
تو یہ مولوی صاحب بشکفت انکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور غور ڈی دہی دی دیر
میں مصروفی ختم ہونے لگے تاکہ یہ صاحب سمجھیں کہ سو رہے ہیں۔ جب
اپنے خیال میں انہوں نے سوتا ہوا سمجھ لیا تو اپنی جگہ سے اٹھے صراحی سے پانی
پینے کے ارادے سے۔ یہ بھی چپکے چپکے دیکھتے رہے۔ صاحب بہادر نے

صریحی اٹھائی مگر ڈرتے جاتے ہیں کہ کہیں جاگ نہ جائیں۔ مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس خیال سے کہ بیمارے غریب کو پانی پی لینے دو پیاسہ رہ جائے۔ دیکھتے کیا حوصلہ ہے اہل اللہ کا۔ عرض آپ نے خوب پانی سرب۔ پانی پی کر صراحی رکھنے لگے تو مولوی صاحب نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، ہاتھ! آپ نے بھنگیوں کے برتن سے پانی کیسے پی لیا۔ اب تو بڑے خفیف ہوئے اور کہا، معاف کیجئے میں اپنی بات کو واپس لیتا ہوں۔ وہ مجھ سے حماقت ہوئی۔ پھر جو صاحب بہادر کو معلوم ہوا کہ مولانا کسی اسکول پر و فیسر بھی ہیں۔ اب تو لگے تعظیم کرنے۔

ایسے لوگوں کا ایک فیشن یہ بھی ہے کہ سفر میں بستر بچھونا نہیں لیتے۔ پانچ کا برتن ساتھ نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ جہاں جائیں گے وہاں بستر بچھونا موجود ہے اور پانی اسٹیشنوں پر ملتا ہی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے۔ کچھ نہیں صرف غیر قوم کی تقلید ہے نواہ اُن میں تکلیف ہی ہو۔

اُن کے اسی مذاق کی بناء پر میں نے الہ آباد میں ایک وعظ میں جنٹلمینوں سے خطاب کیا تھا کہ صاحبو! لندن سے واٹر بھی رکھنے کا فتویٰ آنے والا ہے اخبار کی خبر ہے کہ لندن والوں نے اس پر رائے دی ہے کہ واٹر بھی رکھنی چاہیے اب قبل اس کے کہ وہ لوگ واٹر بھی رکھیں تم جلدی واٹر بھی رکھ لو۔ کیونکہ اگر اب نہ رکھی اور بعد میں تو ضرور ہی رکھو گے تو لوگ مطعون کریں گے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے تو نہ رکھی اور لندن والوں کے کہنے سے رکھی اس لئے ابھی سے رکھ لو تاکہ بدنامی نہ ہو۔

اسی طرح علماء کی اس بات کو کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو محض دین کی خادم ہو اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاوے کسی نے نہیں مانا تھا۔ مگر ابھی تھوڑے دنوں سے ہندوؤں نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک جماعت مذہبی ایسی ہونی چاہیے جو صرف مذہب کی خدمت کرنے والی ہو اور کوئی کام اس کے متعلق نہ ہو۔ بس دن رات یہی کام کیا کرے، تو مسلمان بھی کچھ سمجھنے لگے۔

غرض ان کو شب و روز دنیا ہی مقصود ہے۔ مذہب کو یہ لوگ محض اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے مصالح دنیا محفوظ رہیں۔ باقی دین کو دینی حیثیت سے اختیار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینی امور کو از خود اختیار کرتے۔ اسی کو پسند کرتے۔ دوسری قوموں کے کیوں غلط رہتے۔ بس ایک غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود اور دین کو تابع قرار دیتے ہیں حالانکہ

لَا تُلْهِكُمْ تِجَارَتُكُمْ وَلَا بَيْعُكُمْ

تجارت اور خرید و فروخت ان

عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ

کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔

کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا تو مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے۔ اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے لَا تُلْهِكُمْ تِجَارَتُكُمْ وَلَا بَيْعُكُمْ یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرما رہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

یہ مسئلہ تو مسلمانوں کے نزدیک بالکل بدیہی
بلکہ حسی ہے کہ اگر دین مقصود نہ ہوتا تو انبیاء

بعثت انبیاء کا مقصد

علیہم السلام کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیا
کمانے کے طریقے نہیں بتلائے ہیں۔ صرف احکام بتلائے ہیں اور چونکہ عقلی
مسئلہ ہے کہ فعل کا اثر قول سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ
اگر دنیا مقصود تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا نمونہ کیوں
نہیں بنایا۔ اس طرح سے کہ آپ کا کوئی کارخانہ ہوتا اور بہت بڑا کارخانہ ہوتا
جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین میں بے مثل نمونہ بنے تو دنیا میں بھی بنتے۔
مگر احادیث دیکھ لیجئے کہ آپ کس چیز کا نمونہ تھے۔ اگر حدیث صحیح نہیں
دجیسا کہ ان میں سے بعض کا خیال ہے، تو تاریخ تو موجود ہیں تو تاریخ ان
حضرات کا دین ایمان ہے، تو تاریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات
دیکھئے کہ کیا تھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیوی اعتبار سے آپ کی کیا حالت
تھی۔

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب
تادیبا اپنی پیپیوں کے پاس جانے کی ایک مہینے کے لئے قسم کھالی تھی اور
مشہور یہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو طلاق دے دی ہے۔
اور اس پر سب لوگ رو رہے تھے۔ اس حالت میں حضرت عمرؓ نے آپ
کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی مگر اجازت نہیں ہوئی حضرت
عمرؓ کو شبہ ہوا کہ شاید آپ کو خیال ہوا ہے کہ حفصہؓ کی سفارش کرتے آئے

ہیں اور اگر ایسا ہوا تو اُن کی سفارش مانتی پڑے گی۔ اس لئے اجازت نہیں ملی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پکار کر عرض کیا کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ فرمائیں تو میں حفصہ کا سر اتار لاؤں میں صرف واقعہ معلوم کرنے آیا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اُسے کی اجازت دے دی۔

وہ حاضر ہوئے۔ اس کے بعد اُن کی نظر دولت خانہ کی ہیبت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے میں کجور کے پٹھے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ چمڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔ بس یہ کائنات جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نہ کیس نہ الماری نہ میز نہ کرسی نہ بنگلہ نہ کوٹھی نہ اور کوئی ساز و سامان۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کے آنسو جاری ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ قبیروں کی خدا تعالیٰ کے دشمن، صلیب پرستی کرنے والے، اُن کے پاس تو یہ ساز و سامان اور آپؐ کی یہ حالت۔ آپؐ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ آپؐ کی امت پر دنیا کی وسعت فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب سے یہ نہیں کہا کہ آپؐ پر وسعت فرماویں۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپؐ کے خادموں کو ایسا کر دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی یہ بات سُن کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا

اِنِّیْ شَیْءٌ اَنْتَ یَا عُمَرُو اے عمرؓ! تم ابھی تک شک

ہی میں ہو۔

ان لوگوں کو تو جو ملتا تھا سب کچھ دنیا میں مل گیا ہے وہاں کچھ نہیں۔ اور ہمارے لئے آخرت کی راحت ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

اور یہ معاشرت ہے۔ آج کل بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث مولویوں کی گھڑی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے نزدیک تاریخ تو گھڑی ہوئی نہیں تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں دنیا کم تھی یا زیادہ۔ سو حدیث میں بھی ہے اور تاریخ میں بھی ہے کہ دنیا آپ کے یہاں بہت سی کم تھی۔ یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں جہان اُسے ہیں۔ پوچھنے پر آپ کے سارے گھروں سے جواب آیا کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں۔ کیا اس واقعہ سے نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صرف دین کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن ہی کو دیکھ لیجئے دین کے ساتھ کہیں دنیا کا مطلوبیہ کے ساتھ تمام بھی نہیں لیا گیا جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات امر فرمایا ہے۔ ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی ہو۔

کسبِ حلال اور حُبِ دنیا | باقی میں کسبِ حلال سے منع نہیں کرتا۔

کسبِ الحلال تو فرض ہے۔ ماں حُبِ دنیا سے منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

حُبُّ الدُّنْيَا دَامَ مِثْلُ خَلِيطَةٍ

کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

صاحبو! ایک تو یہ ہے کسبِ دنیا اور ایک ہے حُبِ دنیا۔ کسبِ دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب اور فرض بھی ہے اور حُبِ دنیا حرام ہے اور ان میں باہم تلازم نہیں نہ کسبِ دنیا کے لئے حُبِ دنیا لازم اور نہ حُبِ دنیا کے لئے کسبِ دنیا لازم۔

کے لئے کسب دنیا لازم۔ کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش حاصل کرے مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حُبوب دنیا اس وقت بھی ہو سکتی ہے کہ کمائے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو۔ مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حُبوب دنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل نہیں۔ کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حُبوب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حُبوب دنیا بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے۔ اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں۔ نہ کسب دنیا نہ حُبوب دنیا۔ مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں غرض حُبوب دنیا و کسب دنیا متلازم نہیں۔ بعض تعبیریں کا سبب نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کا سبب ہو اور محرب نہ ہو سو ہم حُبوب دنیا سے منع کرتے ہیں باقی کسب دنیا وہ تو خاص قیود کے ساتھ ضروری ہے۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرعن کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی فرعن کفایہ ہے۔ کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات معاش کی تحصیل فرعن کفایہ ہے اور فرعن کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بعقیہ لوگوں کے ذمہ سے فرعن ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ بھلا فرعن کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے۔ بس محب دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں۔ باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے یعنی ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کسب دنیا ضروری ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں۔ بیان اس کا یہ ہے کہ جس شخص کو عدم کسب کی

حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے۔ اُن کا چاہئے کہ کسب دنیا کرے۔

علماء اور کسب دنیا سے کسی کا غر نہیں۔ نہ اُن کا نہ اہل عیال کا۔ سو یہ لوگ

اگر کسب دنیا نہ کریں تو کچھ حرج نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کر سکیں۔ اُن کے لئے کسب دنیا مناسب نہیں بشرطیکہ ترک کسب سے تشویش میں نہ پڑیں۔ اللہ کے ایسے بندے ہرگز میں ہوسٹے ہیں مگر ایک جماعت ہے دنیا پرستوں کی۔ وہ ایسے حضرات پر طعن و اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں، آرام طلب ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ عقلی بھی ہے چنانچہ اہل مہنوں کو ایک مسلم عند العتقاد، عقلمندوں کے نزدیک، مثال سے سمجھاتا ہوں جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے۔

وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اُس کو دوسرے کوئی کام تجارت وغیرہ کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً کوئی شخص سرکاری ملازم ہے اور وہ ٹھیکہ لینے لگے تو سرکاری طور سے اُس پر گرفت ہوگی۔ چنانچہ ایک شخص ملازم تھے انہوں نے ملازمت کی حالت میں مہینہ کیا۔ کچھ روز کے بعد کسی نے خبر لی کہ وہی۔ اُن پر شبہ ہو گیا۔ بہت قصہ بھیدا۔ گو پورا ثبوت ہونے سے بری تو ہو گئے مگر وہ پریشان اتنے ہوئے کہ انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔

غرض سرکاری آدمی کو اجازت ہی نہیں کہ وہ دوسرا کام کرے۔

اس قانون پر کوئی روشن دماغ اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن اگر بڑی سرکار یعنی اللہ
میاں کا کوئی ملازم ہو اور اس لئے وہ اسباب معاش کو ترک کر دے، تو
اُس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نکمے ہیں۔ ماتحت پر ماتحت دھرے بیٹھے رہتے
ہیں۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں کے فتوے کی تصدیق نہ ہو اور حکام کے فتویٰ
کی تصدیق ہو۔ قَالَ اللَّهُ وَقَالَ الرَّسُولُ إِنَّ اللَّهَ قَدْ فَرَّأَیَا اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پر قناعت نہ ہو اور قَالَ الْحُكَّامُ پر قناعت ہو
میں گورنمنٹ کے اس قانون کا راز بتلاتا ہوں گو میرے ذمہ تو ہے نہیں مگر
خیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہو سکتا
اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو ضرور سرکاری کام میں خلل واقع ہو گا۔
اس لئے اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے اسی طرح
جو لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی ترقی کیوں نہیں کرتے،
مشینیں اور کارخانے کیوں نہیں چلاتے، تو وہ مثال مذکورہ کو پیش نظر رکھ کر
خوب سمجھ لیں کہ جب یہ لوگ دنیا میں مشغول ہوں گے تو اُس کا کیا نتیجہ ہو گا یہی
ہو گا کہ دین کا کام نہ کر سکیں گے۔

ایک مولوی صاحب جو ایک دینی ملازم تھے مگر لکڑیوں کی تجارت
بھی کرتے تھے، خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت میں طلباء کو
پڑھانے بیٹھے ہیں کہ گاہک آگیا۔ اُس نے لکڑی کا سودا کرنا چاہا۔ میں مولوی
صاحب کشمکش میں پڑ گئے۔ اگر اٹھتے ہیں تو مدرسہ کا حرج، اگر نہیں اٹھتے، تو

خریدار لوٹا جاتا ہے۔ مجبوراً اُن سے کہتے ہیں ابھائی ابھی اٹھنا ہوں ذرا ٹھہرو۔ اس میں تھوڑا جھوٹ بھی تھا۔ عرض اُن کا دل بٹ جاتا۔ سبق میں کچھ سے کچھ بیان کر جاتے۔ پہلے تو طالب علموں کو ہنسی خوشی بتلا رہے تھے، اب دل دوسری طرف ہو گیا۔ طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں دیر ہوتی ہے تو اُن پر تھنچلاتے ہیں، غصے ہوتے ہیں۔ بس علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ دین کا کام پوری طرح نہیں کر سکتے۔ انہی کے متعلق ایک اور قصہ ہے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا ایک بڑھیا اپنے دروازے میں جھانک رہی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر بولی کہ بیٹا، یہاں آنا۔ میں گیا تو بولی کہ ایک مسئلہ بتا دو۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ دینا مدرسہ میں جائز ہے یا نہیں۔ میں نے مسئلہ بتلایا۔ پھر کہنے لگی کہ میں نے اُن سے (یعنی لکڑیوں والے مولوی صاحب سے) بھی پوچھا تھا۔ انہوں نے بھی تمہارے موافق بتلایا مگر مجھ کو اُن کا یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کو کہتے ہوں اب تمہارے بتلانے سے یقین ہوا کیونکہ تم پر یہ شبہ نہیں۔ خیر میں نے بڑی بی کو سمجھا دیا کہ ایسا گمان علماء پر جائز نہیں۔

یہ ہے علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ۔ تو معلوم ہو گیا کہ مسائل تک میں اُن کا اعتبار نہیں رہتا۔ میں کہتا ہوں جو لوگ علماء کو مشورہ دیتے ہیں دنیا میں مشغول ہونے کا اگر علماء اُن کی رائے پر عمل کریں تو سب سے پہلے ہی لوگ اُن کو مردود ٹھہرائیں گے۔ اس لئے علماء کو یہ مشورہ مرت دو کہ وہ دنیا میں مشغول ہوں۔ اُن کے مشغول ہونے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ خود تم کو اُن

کے فتاویٰ کا، اُن کے وعظوں کا اعتبار نہ رہے گا۔

غرض علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہ اثر ہے۔ اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ علماء سے چندہ کی تحریک بھی مدت کراؤ۔ انہیں چندہ وصول کرنے کے لئے مدت مقرر کرو۔ اس میں بھی اُن کا اعتبار جاتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ چندہ کی تحریک ردّ ساء کریں۔ اُن کی تحریک کا اثر زیادہ ہوگا کیونکہ وہ خود بھی دیں گے۔ علماء کی طرف سے تو یہ خیال ہوگا کہ وہ دوسروں ہی سے کہنے کو ہیں خود کبھی کچھ بھی نہیں دیتے۔ علماء سے وہی کام لو جس کے لئے وہ ہیں یعنی ان سے دین سیکھو، مگر آج کل علماء سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اُن کا نہیں ہے۔ کافر نسوں میں لوگ علماء کو صرف اس لئے بلا تے ہیں کہ اُن کے قال اللہ اور قال الرسول کے ذریعہ سے خوب چندہ ہوگا۔ سبحان اللہ! مولوی کیا ہوئے بھاڑے کے ٹوٹے ہوئے۔ علماء کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے امور سے احتراز کریں۔ علماء کا طرز تو وہ ہوتا چاہئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ حکم تھا۔

وَأَمَّا هَٰذَا بِالصَّلَاةِ

اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کرو۔

یہی اُن کا طرز بھی ہونا چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے
 أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَوْفًا وَخَرًا جُ
 رَبِّكَ خَيْرٌ وَهُوَ خَيْرُ
 التَّائِقِينَ
 یا آپ اُن سے کچھ آمدنی
 چاہتے ہیں تو آمدنی تو آپ
 کے رب کی سب سے بہتر

ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے۔

سوانگنا علماء کا کام نہیں۔ ان قصوں کی بناء پر ان کی شان کے خلاف ہے۔ اور وہ بات بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی ان پر بدگمانی بھی ہوتی ہے اور رؤسا پر یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص

پچاس روپیہ اپنی جیب سے دے گا تو اوروں سے پچاس لے سکتا ہے اور یہ رؤسا کر سکتے ہیں۔ اس لئے علماء کو چاہئے کہ وہ اس کام کو نہ کریں۔

علماء و امراء کے اختلاط کا اثر

پھر یہ تحریک علماء کے فرض منصبی کی بھی مغل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مولوی

صاحب کہتے تھے کہ چندہ کے واسطے امراء کے دروازوں پر جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی امیر کے پاس جاؤں اور وہ شطرنج کھیل رہے ہوں، تو ہم ان کو منع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم اپنی عرض کو ان کے پاس جاتے ہیں۔ اس لئے دینا پڑتا ہے۔ عرض ان مقاصد کے سبب علماء کا اختلاط امراء سے اچھا نہیں اکثر ان کے اختلاط سے خود مولوی بگڑ جاتے ہیں۔

ایک کابلی مولوی صاحب مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ میں ایک وزیر ریاست کے پاس بیٹھا تھا۔ وزیر صاحب واڑھی صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا حسین چہرہ دیا ہے مگر جو پیر چہرہ کی زینت ہے اس کو آپ مٹا دیتے ہیں۔ اس کہنے سے وہ کچھ شرمائے۔ ایک دوسرے مولوی صاحب ان کے ہاں اور بیٹھے تھے وہ خوشامد میں کیا کہتے ہیں کہ واڑھی کبھی نہ رکھنی چاہئے اور جو یہ بیان فرمائی کہ

اُس میں جویش پڑ جاتی ہیں اور باہم زنا کرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ چکلہ آپ نے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ اور باہر آکر میں نے ان مولوی صاحب کو بہت تارڑا اور کہا کہ تم کو خوف نہ ہوا کہ ایسی باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ تو وہ غائب میں کہتے ہیں کہ ہم جب مکان سے چلتے ہیں، ایمان تو فلاں تالہ پر چھوڑ آتے ہیں۔

سو علماء کے لئے امراء کا اختلاط ایسا سم قاتل ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز علماء کے پاس ہے دینی علم، امراء کو بزعم خود اس کی ضرورت نہیں اور جو چیز امراء کے پاس ہے دینی مال، علماء کو اس کی ضرورت ہے اس واسطے ان کو امراء کے پاس جا کر جھکنا پڑتا ہے۔ اس لئے حق بات نہیں کہہ سکتے۔ پس علماء کو تو آزاد رہنا چاہئے اور ان کی آزادی کی یہ حالت ہونی چاہئے۔

زیر بار اند درختاں کہ شرم دارند
لے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد اند
پہل دار درخت زیر بار ہیں۔ سرو بہت اچھا ہے کہ غم کی قید سے آزاد ہے۔

اور اس آزادی کے ساتھ دین کی خدمت کیسے کریں۔
باقی یہ کہ پھر ان کی معاش کا کیا انتظام ہوگا۔ سوائس کی علماء اور تنخواہ دو صورتیں ہیں یا تو توکل کریں یا پابندی سے جو خدمت کریں تدریس یا تبلیغ اس پر کسی مدرسہ یا انجمن سے تنخواہ مقرر کرالیں۔ پھر اس

پر اگر کوئی سوال کرے کہ یہ تو بیرونی دین فروشی ہوئی جس کی خدمت کی بجا رہی سو میں اس کی تحقیق بتلاتا ہوں۔ سنیئے اصولی اور عقلی مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی خدمت میں مجبوس ہوا اُس کا نفقہ اُس کے ذمہ ہوتا ہے اور یہ قاعدہ تمام دنیا کے عقلاء کا معمول رہا ہے۔ حتیٰ کہ سلاطین تک کے لئے بھی یہی قانون نافذ ہے۔ بادشاہ کو جو خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی محض اس لئے کہ وہ رعایا کے کام میں مجبوس ہے۔ کیونکہ بادشاہ وہ ہے جس کو ساری قوم حاکم بنا ہے اور اُس کو بیت المال کے خزانہ سے تنخواہ دیتی ہے۔

اب یہ دیکھو کہ وہ خزانہ کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ ساری قوم سے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے کہ ایک پائی زید کی اور ایک پائی عمرو کی اور ایک پائی بکر کی۔ جس کو ٹھری میں اس کو جمع کیا جاتا ہے اس کا نام خزانہ ہے۔ حقیقت اس کی وہی چندہ ہے۔ وہ بھی قومی چندہ ہے۔ اسی سے بادشاہ کو تنخواہ ملتی ہے۔ صرف خزانہ کے لفظ سے اس کی عزت بڑھ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ شاہی ہے مگر حقیقت اس کی وہی چندہ قومی ہے۔ پس یہی حقیقت اس چندہ کی ہے جس سے مولویوں کو تنخواہ ملتی ہے۔ مگر مولویوں کے حق میں چندہ سے تنخواہ ملنے کو لوگ ذلت سمجھتے ہیں اور بادشاہ کے لئے ذلت نہیں سمجھتی جاتی۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بادشاہ کو ایک لاکھ ملتے ہیں، اس لئے ذلت نہیں خیالی کی جاتی اور مولوی بیچارہ کو محض پچاس روپیہ مقدار ملتی ہے۔ اس لئے اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہل عام رکھتے ہیں کہ مولوی خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں مگر بغور دیکھئے حقیقت

دونوں جگہ ایک ہی ہے اور جب حقیقت ایک ٹھہری تو جس نے پندہ میں سے ایک پیسہ لیا اُس کی کم ذلت ہوتا چاہئے اور جس نے زیادہ لیا اُس کی زیادہ ذلت ہونی چاہئے۔

اب رہی یہ بات کہ بادشاہ کو خزانہ سے تنخواہ ملنے کے استحقاق کی علت کیا ہے۔ سو وہ استحقاق کی علت یہ ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے کیونکہ وہ قوم کی خدمت کرتا ہے۔ اس لئے اس کا نفقہ رعایا کے ذمہ ہے اور بادشاہ پر کیا موقوف ہے۔ سب کو چنڈہ تو ملی ہی ہے تنخواہ ملتی ہے۔ کلکٹر کو بھی، ڈپٹی کلکٹر کو بھی، جج کو بھی، منصف کو بھی۔ پس یہ مسئلہ عقلی ہوا اور اسی قاعدہ کو شریعت نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ جیسے زوجہ کا نفقہ اُس کے شوہر پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اُس کے پاس محبوس ہوتی ہے۔

اب بتلائیے یہ علت علماء کے استحقاق تنخواہ وغیرہ میں بھی مشترک ہے یا نہیں کیونکہ وہ بھی قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں۔ اس لئے ان کا نفقہ بھی قوم کے ذمہ ہے۔ کیونکہ جب تک وہ معاش سے فارغ نہ ہوں تو ان کا کام کر نہیں سکتے۔ اگر ان کی خدمت نہ کی جاوے گی تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اس صورت میں اُن پر کسی کا احسان بھی نہیں۔ کبھی کوئی احسان کرنے لگے۔ اس لئے کہ اگر وہ تنخواہ وغیرہ لیتے ہیں تو آپ کی دینی خدمت بھی تو کرتے ہیں۔ پس آپ کے ذمہ تو ان کا قرض ہے۔ اگر یہ کہاں دنیا میں نہ دیا تو شاید آخرت میں اگلا میں اور یہ دوسری بات ہے کہ یہ تپا مست میں

معاف کر دیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ معاف ہی کر دیں گے غرض
 علماء چونکہ قوم کی دینی خدمت میں مجبوس ہیں اس لئے ان کی تنخواہ یا نذرانہ قوم
 کے ذمہ ہے۔ البتہ کسی خاص وعظ پر نذرانہ ٹھہرا کر لینا یہ ناجائز ہے۔ باقی جو
 مجبوس ہونے کے سبب تدریس یا تبلیغ پر تنخواہ لیں گے وہ جائز ہے۔ ایسا
 نہ ہو تو پڑھنے پڑھانے کا اور تبلیغ کا سلسلہ ہی ختم ہو جاوے گا۔ اور سادہ
 دین و دہم برہم ہو جاوے۔ اس تقریر سے دونوں باتوں کا جواب نکل آیا۔
 ایک تو یہ کہ مولوی تنخواہ وغیرہ کیوں لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خیرات کے ٹکڑے
 کھاتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ اگر یہ لوگ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں تو
 بادشاہ اور والسرائے اور جج، کلکٹر سب ہی خیرات کھاتے ہیں۔ اگر یہی بات
 ہے تو کسی کو بھی تنخواہ نہ ملنی چاہیے کیونکہ سب کو قوم ہی کے چندہ سے
 تنخواہ ملتی ہے۔

آزمائش علماء

مگر اس تقریر سے کوئی مولوی صاحب دھوکا میں نہ
 پڑ جائیں کہ ہم تو دین کی خدمت کر رہے ہیں اور ہماری
 تنخواہ نفقہ جس ہے۔ اس لئے ہم کا سب دنیا نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے اور
 اپنے معاملات میں غور کر لیجئے ان معاملات اور واقعات سے کاسب دنیا
 ہونے نہ ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ معاملہ محل خور یہ ہے کہ بعض دفعہ
 ایسا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ایک جگہ لوگوں میں دین کی خدمت کر رہے ہیں
 اور پچاس روپے تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں گز رہی اوسط درجہ کا ہوتا ہے
 تنگی بھی نہیں، پچاس روپے کافی ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں ایک جگہ

اسے شرط آیا ملازمت کا کہ مبلغ سو روپیہ تنخواہ ملے گی یہاں چلے آؤ۔ شاید کہیں طلباء نے بیچاروں کی تعریف کر دی ہوگی۔ بعض مدیرین اس لئے بھی طلباء کی خاطر کرتے ہیں کہ کہیں مہتمم سے ان کی بُرائی نہ کر دیں اور نوکری جاتی رہے۔ اسی طرح بعض مہتممین بھی طلباء کی بہت خاطر داری کیسے ہیں اگرچہ وہ ناقابلِ ہی ہوں کہ کہیں مدرسہ سے چلے نہ جائیں جس سے مدرسہ کی رونق کم ہو جائے۔ پھر ان سے چند کم ہو جائے۔ حالانکہ مدرسہ علمی کا مہتمم عالم باعمل ہونا چاہئے جو ظلم کے سبب تو بچھے بُرے کو سمجھتا ہو۔ کیونکہ ناواقف ہونے کی صورت میں طلباء کی جراثیم بڑھتی ہے اور جو عالم ہوگا وہ سب باتوں کو سمجھے گا اور طلباء پر اس کا دباؤ ہوگا۔ یا اگر مہتمم عالم نہ ہو تو کم از کم علماء باعمل کی صحبت میں رہا ہو۔ ہر بات کو سمجھتا ہو یہ نہ ہو کہ نہ عالم ہو نہ صحبت یافتہ ہو اور عمل کے سبب حدود طمع و غرض سے پاک ہو۔ خواہ اپنی غرض یا مدرسہ کی غرض سے تکثیر سواو یا تکثیر چندہ پر یہ تو جملہ موثر منہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہیں طلباء نے مولوی صاحب کی تعریف کر دی ہوگی اس سے سو روپیہ تنخواہ کی ملازمت آگئی۔ اب اس سے دین یا دنیا کی طلب کا حال معلوم ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ وہاں نئی جگہ میں نفع مالی بھی زیادہ ہے عزت بھی زیادہ ہے، مگر دین کی خدمت کا موقع زیادہ نہیں بلکہ دین کی خدمت اس جگہ زیادہ ہے جہاں تنخواہ پچاس روپیہ ہے مگر کافی ہے۔ اب دیکھا جائے گا کہ مولانا پچھلے تو نہیں۔ اگر لکھ دیا کہ میں نہیں آنا چاہتا ہوں میرا گزر ہو رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ مقصود ان کا دین کی خدمت ہے اور

تتخواہ تنبغاے رہے ہیں اور ان کی تتخواہ جزائے جس اور میری تقریر کا ممبر
ہے اور جو مولانا چل دیئے تو سمجھا جائے گا کہ مولانا دنیا دار ہیں۔ انہوں
نے جو تتخواہ کو جزائے جس بنایا تھا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ محض دھوکا تھا۔ اسی طرح
جب مولوی صاحب کسی مدرسہ میں نوکر ہونے لگیں اور وہاں ایسی صورت
ہے کہ جو تتخواہ ہم کو ملے گی ہمارا گنارہ معمولی طریقہ سے اُس میں ہو سکتا ہے۔ اگر
اُس کو ہم نے بطیب خاطر اختیار کر لیا اور واقع میں ہمارے مناسب حال
بھی یہی تھا کہ تین پانچ رکریں تو سمجھا جائے گا کہ تتخواہ لینا دراصل مقصود نہیں
بلکہ اصل مقصود دین ہے اور اگر باوجود کافی ہونے کے پھر بھی تین پانچ کر کے
تتخواہ ملے ہوتی تو معلوم ہو گا کہ مولوی صاحب دنیا دار ہیں۔

اب تو یہ حالت ہے کہ گاہر مولیٰ کا سا مولیت کا بھاؤ ہونے لگا ہے
لوگ ہیں روپے تتخواہ کہتے ہیں اور وہ مولانا کے گزر کے لئے کافی ہے مگر مولانا
کہتے ہیں کہ چالیس لوں کا جب ر ہوں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تین لے لیجئے۔ مولانا
کہتے ہیں کہ اچھا نہ ہمارا کہنا رہے نہ تمہارا ابین متیں رہے۔ آپس میں جھگڑا تکرار ہو
رہا ہے۔ بالکل گاہر اور مولیٰ کا سا سودا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول
ہی نظریں لوگوں کے دل سے اتر جاتے ہیں۔ خیر کہنے سننے سے پتتیں قرار پا
گئے۔ پھر تھوڑے دنوں میں مولانا کے پتہ ہو گیا۔ اب درخواست ہے کہ
ہمارے ذمہ ایک خرچ آگیا ہے ذرا خیال رکھئے گا۔ اب اس جستجو میں ہیں کہ
تتخواہ میں اضافہ ہو جائے۔ وقتاً فوقتاً لوگوں کے کان میں یہ بات ڈالتے
ہیں۔ خیر لوگوں نے طوعاً و کرہاً چالیں کر دیئے۔ پھر اس پر بھی قناعت نہیں۔

سال چھ مہینے میں دوسرا بچہ ہو گیا۔ اب پھر لوگوں کے سر میں۔ درخواستیں کرتے کرتے لَدَقَقْتُ عِنْدَ حَتَّاکِ نوبت پہنچتی ہے۔ پس اگر یہ صورت ہے تو دنیا داری ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے کہ تنخواہ میں گزر ہونے کی صورت میں اس کو چھوڑ کر زیادہ تنخواہ پر نہیں گئے یا جو تنخواہ گزر کے قابل مل گئی منظور کر لی۔ کچھ تین پانچ نہ کیا اور خدمت دین میں مشغول ہو گئے تو ایسے شخص کو کاسبِ دنیا نہ کہا جائے گا۔

یہ تو معیارِ تنخواہ کی صورت میں تھا لیکن اگر کسی میں قوتِ توکل اعلیٰ درجہ کی ہو اور وہ تنخواہ وغیرہ سب چھوڑ دے تو سبحان اللہ! مگر ہر ایک کے لئے یہ صورت درست نہیں کیونکہ سب میں یہ قوت نہیں یا کسی میں قوتِ توکل خود اپنی ذات کے واسطے تو ہے مگر اہل و عیال میں قوت توکل ایسی نہیں ہے۔ یعنی اگر تنخواہ نہ ملے تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں۔ تو ایسے شخص کو بھی تنخواہ چھوڑنا درست نہیں کیونکہ یہ بھی ایک عبادت ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی کوئی خدمت کرے۔ اُن کے حقوق کو ادا کرے۔ عرض اس بات میں لوگوں کے مختلف حالات ہیں۔ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے۔ بعض کو نہ ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اور ہونے سے اطمینان رہتا ہے پس جس کو جس طرح اطمینان اور جمعیتِ قلب حاصل ہو وہ کرنا چاہئے۔

اہل اللہ کا استغناء | میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اُس پر تعجب نہ کیا جائے۔ واقعی اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جن کو مال کی کثرت سے

بار ہوتا ہے۔ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اُس کے حقوق کا ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ اس لئے ایسے لوگ کثرتِ مال سے گھبراتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ایک صاحبِ مطبع میں ملازم رکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ علمی لیاقت تو مجھ میں ہے نہیں۔ اس لئے بڑا کام تو کر نہیں سکتا۔ البتہ قرآن کی تصحیح کر لیا کروں گا۔ اس میں دس روپیہ ماہوار دے دیا کرو اللہ اے کیا تو واضح اور زہد ہے۔

اسی زمانہ میں ایک دیاست سے تین سو روپیہ مالانہ کی نوکری آگئی مولانا جواب میں لکھتے ہیں کہ میں آپ کی یادآوری کا شکریہ گزار ہوں۔ مگر مجھ کو یہاں دس روپے ملتے ہیں جس میں پانچ روپے تو میرے اہل و عیال کے لئے کافی ہو جاتے ہیں اور پانچ خرچ جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں سے جو تین سو روپے ملیں گے، اُن میں پانچ روپے تو خرچ میں آئیں گے۔ آگے دو سو پچانوے جو بچیں گے میں اُن کا کیا کروں گا۔ مجھ کو ہر وقت یہی فکر لگا رہے گا کہ ان کو کہاں خرچ کروں۔ اس لئے معذور ہوں۔ اس لئے تشریف نہیں لے گئے۔

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھی لکھا تھا اور سو روپیہ تنخواہ لکھی تھی مولانا نے دوسرا جواب دیا کہ میں آسکتا ہوں مگر تین سو روپے سے کم میں نہیں آسکتا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ مولانا ذرا سنبھل کر جواب لکھئے۔ اگر تین سو کی منظوری یہ طلبی آگئی تو وعدہ پر جانا پریگا تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے اُس کے ساتھ یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ مگر اُن

میں ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ جب چاہوں گا یہاں رہوں گا جب چاہوں گا وہاں رہوں گا۔ وہ رئیس صاحب سمجھ گئے کہ ان حضرات کو آنا ہی منظور نہیں اور واقعی جانا بخوڑا ہی منظور تھا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بات ظرافت کے طور پر لکھ دی تھی۔

اللہ اکبر! کس قدر استغفار تھا ان حضرات میں۔ واقعی اہل اللہ کے دل پر مال کی کثرت سے بھیجی بار ہوتا ہے۔ اُن کو خیال ہوتا کہ خدا سب نے اس کے حقوق ہم سے ادا ہوں یا نہ ہوں۔

میرے ذوق میں اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سلطنت دی گئی تھی تو اُس کے ساتھ اُن کی یہ خاص تسلی بھی حقوق ادا ہو سکتے یا نہ ہو سکتے کی کر دی گئی تھی۔ ارشاد ہے۔ هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْتَدِّحْ اَوْ اَمْسِلْ بِفَيْرٍ حِسَابٍ کہ یہ ہماری عطا ہے خواہ کسی پر احسان کرو یا جمع کرو۔ یعنی عطا و امساک بالکل تمہارے اختیار میں ہے۔ آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ تم سے اس کا کوئی حساب نہ ہو گا۔ اس تسلی کے بعد اُن کو سلطنت سے گرائی نہیں ہوئی ورنہ گھبرا جاتے اور ایک دن بھی بادشاہت نہ کر سکتے۔

اس آیت پر ایک بات یاد آگئی کہ آج کل تعلیم جدید والے ترقی دنیا پر اس سے دلیل پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے معلوم ہوا ترقی دنیوی محمود ہے۔ اول تو ان لوگوں کو تمام انبیاء علیہم السلام میں دلیل پکڑنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ملے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہیں ہوئے۔ ان کے حالات بھی

۲۲۲
 لینے چاہئیں۔ دیکھ لیجئے کہ اُن میں سے اکثر کی بلکہ قریب قریب کل انبیاء علیہم السلام کی کیا حالت تھی۔ سب کی حالت قریب قریب فقر کی رہی ہے۔ دوسرے خود یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حکمت الہیہ سے ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضا ہوتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے جبار اور متکبر بادشاہ تھے۔ اُس وقت کا مقتضا یہی تھا کہ نبی کو بطور معجزہ ایسی سلطنت دی جاوے جس کا سب لوگ مان لیں۔ اسی واسطے جانوروں اور ہوا تک پر اُن کو حکومت دی گئی کہ تمام بادشاہ پست ہو گئے۔ پس سلطنت اُن کا معجزہ تھا۔ یہ راز تھا اُن کی سلطنت میں، ترقی دنیا مطلوب نہ تھی۔ چنانچہ اس حالت میں بھی حسب نقل عارف رومی۔

زبان سلیمان خویش را مسکین بخواند

یعنی آپ اپنے کو مسکین ہی کہا کرتے تھے اور اپنی وفات کے لئے بادشاہی سامان سے کام نہ لیتے تھے بلکہ حسب نقل بہشتی زیور اپنی دستکار زنبیل سازی کے پیوں سے کھاتے پیتے تھے اور بادشاہرت سے گھبراتے تھے کہ مبادا حقوق کی ادائیگی میں کمی رہ جائے۔ اس لئے آپ کے بالے میں ارشاد ہوا۔

فَاَمْنٌ اَوْ اَمْسِلْتُ بِخَيْرٍ پس خواہ کسی پر احسان کرو

جس کا حساب۔ یا بے اندازہ جمع کرو۔

کہ ہم ان حقوق کے متعلق آپ سے حساب نہ لیں گے۔ آپ نہ گھبرائیے۔

جمعیت قلب | میں نے اوپر اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اصل چیز جمعیت قلب ہے جس طریقہ سے بھی حاصل ہو۔ بعض کو پریشانی ہوتی ہے۔ مال کے ہونے سے اُن کے لئے مال کا نہ ہونا اچھا اور بعض کو جمعیت ہوتی ہے مال کے ہونے سے۔ اُن کے لئے مال کا ہونا اچھا۔ ہر ایک کی حالت جدا ہے پس اگر کسی کو مال کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو اُسے چاہئے کہ خدا نے جس کام کے لئے اُس کو پیدا کیا ہے۔ میں صرف وہی کام کرے۔

اس بیان پر ایک شبہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ادھر تو وجوہاً یا اباسۃ یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں لگو اور اُن کے ساتھ ہی یوں کہا جاتا ہے کہ غافل مرت رہو۔ دونوں باتوں کا اجتماع کیسے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب دنیا میں لگا جاوے گا تو دوسری طرف سے غفلت ضرور ہوگی۔ یہ تو وہ بات ہو گئی ہے۔

در میان فقر و ریاضت بندم کہ در
بازم گیوئی کہ دامن ترکن ہوشیار باش

دگر سے دریا میں تو نے مجھے تختہ سے باندھ دیا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ ہوشیار رہ کہ دامن نہ بھیکے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض غیر محقق ہی کیے گا۔ محقق کبھی یہ اعتراض نہ کرے گا۔ بات یہ ہے کہ امور غیر مطلوبہ و قسم کے ہیں اختیاری اور غیر اختیاری امور غیر اختیاری میں تو ملا مرت نہیں۔ وہ تو اختیار سے باہر ہیں۔ انسان اُن کا مکلف نہیں کیا گیا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا وَّزَنًا

وَسَعَهَا كَمَا أَنَّ تَعَالَى كَسَى كَوَاسٍ كِي طَاقَتِ سَعَى زِيَادَةٍ تَكْلِيفِ نَهَى دَسِيقَةٍ
الْبَدَةِ أُمُورِ اخْتِيَارِيَةٍ بِرِ مَلَامَتٍ هِيَ - لَيْسَ غَفْلَتِ أَيْكٍ تَوَاخْتِيَارِيَةٍ هِيَ أَوْرٍ
أَيْكٍ غَيْرِ اخْتِيَارِيَةٍ هِيَ غَفْلَتِ اخْتِيَارِيَةٍ مِثْلُ مَلَامَتٍ هِيَ أَوْرٍ غَيْرِ اخْتِيَارِيَةٍ
مِثْلُ مَلَامَتٍ هِيَ -

مَثَلًا أَيْكٍ نَيْكٍ كَامٍ كَيْتُ جَوْتُ جَوْرٍ كَسَاخَتُ كَرْنَا جَا سَهْتُ تَحَا أَوْرٍ مَلَامَتٍ
اخْتِيَارِيَةٍ مِثْلُ غَفْلَتِ هُوَ كَيْتُ تَوِيهِ مَوْجِبِ مَلَامَتِ نَهَى - اِسْ صُورَتِ مِثْلُ
"وَرَمِيَانِ فَرْدِ دِيَا تَحْتَرِ جَرْمِ كَرْدَمِ" كَهَا لِي هِيَ ؟ كَيْونَكَمَ اِسْ مِثْلُ مَلَامَتِ هِيَ نَهَى
لَا يَهْ سَوْچُنَا كَقَلْبِ كِي اِيسِي سَالَتِ كِيُولِ هِيَ كَمَ دُنْيَا مِثْلُ لُكْ كَرِ اَللّٰهُ سَعَى
غَفْلَتِ هُوَ جَا قِي هِيَ - اَوْرِ يَهْ سَوْچُ كَرِ غَفْلَتِ دَوْرِ كَرْنِي كِي تَدْبِيرِ كَرْنَا يَهْ اَمْرِ
اخْتِيَارِيَةٍ هِيَ - اِسْ اَصْلَاحِ مِثْلُ كُشْكُشِ نَزْ كَرْنِي بِرِ بَلْ شَكْ مَلَامَتِ هِيَ
جَيْسَا قُرْآنِ كَا بَلَا اخْتِيَارِ غَلَطِ پَرِ حَنَا قَابِلِ مَلَامَتِ نَهَى - لَا صَحِيحِ پَرِ حَنَا كِي كُشْكُشِ
نَزْ كَرْنَا يَهْ اخْتِيَارِيَةٍ هِيَ اَوْرِ قَابِلِ مَلَامَتِ هِيَ -

غَرَضُ يَهْ سَوْچُنَا كَرِ غَفْلَتِ كَا سَبَبِ كَيْتُ پھر اِسْ كِي تَدْبِيرِ كَرْنَا يَهْ اَمْرِ
اخْتِيَارِيَةٍ هِيَ - جَوْبِ اِسْ كَا سَبَبِ سَوْچِي كَا يَهْ مَعْلُومِ هُوَ كَا كَرِ خُدا كِي مَحَبَّتِ
قَلْبِ پَرِ غَالِبِ نَهَى وَرَنَ غَفْلَتِ كِيُولِ هُوَتِي - جَنِ سَهْرَا سَتِ مِثْلُ خُدا كِي مَحَبَّتِ
غَالِبِ هُوَتِي هِيَ اُنْ كِي تَمَامِ كَامِ خُدا اِيسِي كِي وَاسِطِ ہوتے ہیں گو ظاہر
مِثْلُ وَہ دُنْيَا كِي كَامِ مَعْلُومِ ہوتے ہیں - اُنْ كُو دُنْيَا مِثْلُ لُكْ كَرِ بَلْ خُدا سَعَى
غَفْلَتِ نَهَى ہوتی -

اِسْ كِي مَثَالِ اِيسِي هِيَ جَيْسِي كَسِي كُو اِسْ كِي مَعْلُومِ نَزْ بَلَا يَا اَوْرِ وَہ يَهْ

چاہتا ہے کہ معشوقہ کے پاس اس نیت سے جاؤں کہ وہ دیکھ کر خوش ہو
 اس لئے حجام کو بلا یا کہ وہ خط بنائے، غسل کرے، اچھے کپڑے پہنے اور اس
 کے بعد محبوبہ کے پاس جائے تو جو شخص عشق سے خالی ہے وہ اس کو اس
 شغل میں دیکھ کر یوں کہے گا کہ یہ تو اپنے بناؤ سنگار میں مصروف ہے محبوبہ
 غافل ہے مگر اس کو کیا خبر ہے کہ اس کی نیت ہر چیز میں محبوب ہی کے لئے
 ہے۔ کپڑے پہنتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب خوش ہو گا اور غسل کرتا
 ہے تو اس نیت سے کہ محبوب کو اچھا لگوں گا۔ غرض اس کی ہر چیز میں محبوب
 ہی مقصود ہے۔ جب یہ حالت ہے تو اس کو محبوب سے غافل کس طرح کہیں
 گے۔ اگر تم بھی حق تعالیٰ کی محبت کو غالب کر لو تو دنیا کے ہر کام میں تمہارا بھی
 یہی حال ہو جائے گا۔ اب جو ہم کو دنیا میں لگ کر خدا سے غفلت ہو جاتی ہے
 تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت حق غالب نہیں اور اس محبت سے مراد وہ محبت
 ہے جس کا انسان مامور ہے۔ سو اس محبت کا غالب کرنا اختیاری ہے اس
 لئے ہمارے ذمہ ہے کہ محبت الہی کو دل میں غالب کریں۔ باقی اس کے
 اختیاری ہونے کی دلیل وہ مشاہدہ اور واقعات ہیں۔ آؤ ماکر دیکھ لو تذبذب
 کے دیکھ لو۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ امر اختیاری ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گرو لیدت یابد از رشتے متاب

سورج کا نکلنا سورج کے وجود پر دلیل ہے اگر تم کو دلیل کی خواہش

ہے تو اس سے منہ پھیرو۔

جب اختیاری ہے تو اس کی تدبیر کیجئے اور ہر کام تدبیر ہی کرنے

سے ہوتا ہے۔ نری تمنا یا باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آپ چاہیں کہ تفریح کر کے اور محض وعظ من کر کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا ہے۔
کار کن کار بگیز از گفتار کاندیں راہ کار باید کار
کام کرو باتوں کو ترک کرو۔ اس راہ سلوک میں کام کرنا چاہئے
کام۔۔۔!

طریق تربیت | اب تدبیر کے متعلق یہ سوال ہو گا کہ کیا دنیا کو چھوڑ دیں۔ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کسی غیر محقق کے ہاتھ میں پھنس گئے تھے۔ اُس نے اسی طرح بتلایا ہو گا۔ اُس نے بتلادیا ہو گا کہ ایک وقت کھانا کھایا کرو۔ چھ مہینے میں بیوی بچوں کو دیکھ لیا کرو۔ نیز طاقت سے زیادہ کام بتلادیا ہو گا۔ کیونکہ آج کل کے پیروں میں یہ بھی ایک مرض ہے کہ وسعت سے زیادہ کام بتلا دیتے ہیں۔ جس سے وہ پریشان ہو کر ہمت مار دیتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے مولانا شیوخ کو تعلیم فرماتے ہیں۔

چار پارا قدرت بار نہ برضیعیاں قدر ہمت کار نہ
چار پایوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ لا دو۔ کمزوروں کو
ان کی ہمت کے موافق کام دو۔
طفل را گر تاں دی بر جائے شیر طفل مسکین را ازاں ناں مردہ گیر
بچہ کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دی جائے تو بچہ کو اس روٹی
سے مردہ سمجھ لو۔

اگر بچہ کو بوٹیاں کھلانے لگو گے تو اُس کا پیٹ پھٹے گا یا نہیں۔ اسی کی شکایت عارف شیرازی فرماتے ہیں :-

خستگان را چو طلب باشد و قوت نبود

گر تو بیدار کنی شرط مروت نبود

کمزوروں میں جب طلب ہو اور قوت نہ ہو، اگر تم اُن کی ہمت سے زیادہ کام دے کر غلام کرو تو مروت کے خلاف ہے۔

یہ رسمی پیروں کو خطاب ہے جو محقق نہ ہوں۔ شیوخ کو چاہئے کہ ہر ایک کی حالت دیکھ کر اُس کے مناسب تعلیم کریں۔ جیسے کوئی مریض طبیب سے یوں کہے کہ میں ناوار ہوں قیمتی نسخہ کا منتحل نہیں ہو سکتا، ارزاں نسخہ لکھ دو۔ تو طبیب کو چاہئے کہ اس کی حیثیت کے موافق نسخہ تجویز کرے۔ اسی طرح شیوخ باطن کو طالب کی طاقت و ہمت کا لحاظ لازم ہے۔ اگر کسی کو ایک سال کا دستور العمل ایک دن میں بتلا دیا تو وہ کس طرح کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کام چھوڑ کر بیٹھ رہے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور کام ہو جاوے۔ کچھ نہ کچھ تو مشقت اٹھانا ہی پڑے گی۔ جو لوگ گھر بیٹھے کام بنانا چاہیں، وہ اپنے گھر پر رہیں مشائخ کو پریشان نہ کریں۔

مولانا نے غنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گونے والے سے کہا کہ میری بیٹی پر بشر کی تصویر بنا دو تاکہ کمر میں قوت رہے وہ تصویر بنانے بیٹھا اور سوئی چھوٹی۔ اُس نے ایک آہ کی اور پوچھا، کیا

بناتے ہو؟ اُس نے کہا کہ دم بناتا ہوں۔ آپ بولے کہ دم نہ بناؤ۔ یہ کوئی کھیل کا
 مٹھوڑا اڑائے گا۔ اُس نے دم چھوڑ کر دوسری طرف سوئی چھوٹی۔ پھر آہ کی آواز
 پوچھا کہ اب کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ سر بناتا ہوں۔ آپ نے کہا، یہ کوئی
 دیکھے گا مٹھوڑا ہی۔ ایسے ہی رہنے دو۔ پھر اُس نے پیٹ بنانا سچا ہوتا ہے
 کہتے ہیں کہ یہ کوئی کھائے گا مٹھوڑا ہی۔ غرض جس عضو کو بناتا تھا۔ آپ یہی کہتے
 تھے کہ اس کو کیوں بناتے ہو۔ اس پر بنانے والے نے سوئی پھینک دی اور
 کہا۔

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید ایں چنین شیرے خدا ہم نافرید
 شیر بغیر کان اور سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے۔ ایسا شیر تو
 خدا نے بھی نہیں بنایا میں کیا بناؤں گا۔
 اُسکے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن از چنین شیرتیاں بس دم مزین
 یعنی اگر تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ سوئی کو بڑا شست
 کر سکو تو شیر کا نام بھی مت لو۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہیں کہ رہیں تو اسی مرکز پر جس پر چہلے
 سے تھے اور کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ وہلی جانا ہو تو ذرا گھر سے
 ہٹو بھی تو سہی۔ چلتے تو ہو نہیں اور چاہو کہ وہلی پہنچ جاویں تو کیسے ممکن ہے
 اور یہاں تو برخلاف مقاصد دنیا کے کوشش کے بعد ناکامی میں بھی کامیابی
 ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کام کرنے کے بعد جو ناکام رہے

وہ بھی عند اللہ کامیاب ہے۔ مگر کام تو کرے۔ باقی یہ نہیں ہو سکتا کہ رہو تو اُسی چکر میں اور چاہو کہ ہمیں مقصود تک پہنچا دو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

صاحبو! مقصود بہت دور ہے۔ وہ کیا ہے۔ رضائے حق تعالیٰ جس کی مثال جنت کی سی ہے کہ جنت سے پہلے پلصراط ہے اور اس سے پار ہو کہ جنت ہے۔ اور جس طرح پلصراط پر رفتار ہر شخص کی مختلف ہوگی۔ بعض پہلی کی طرح عبور کر جائیں گے اور بعض کی رفتار گھوڑے کے سوار کی سی ہوگی اور بعض کی اس سے کم اور بعض کی اس سے بھی کم۔ اسی طرح یہاں سلوک کا مقام اخیر یعنی رضا جنت کے مشابہ ہے اور لوگ اس مقام تک مختلف طرق سے پہنچتے ہیں۔ بعض جلد ہی اور بعض دیر میں۔ پس جیسے پلصراط پر چلنے کے بعد جنت ملے گی اور بعد تکلیف کے راحت نصیب ہوگی اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تکلیف کے بعد راحت نصیب ہوگی۔

باقی اس سے اطمینان رکھو کہ شیخ محقق تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائیگا بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ حوام نوکری بھی اُس وقت تک نہ چھڑائیں گے جب تک حلال میسر نہ ہو جائے۔ کیونکہ افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا تنگ دستی بعض دفعہ کفر کے

قریب ہو جاتی ہے۔

اس لئے محقق حوام کو دنیوی تعلقات ملازمت وغیرہ سے الگ نہیں کرتا۔ حوام نوکری سے بھی تدریجاً الگ کرتا ہے کہ پریشانی نہ ہو۔ پھر

خیر الممال للکرتجال

بھی تعجب ہے کہ ایسا راستہ بے ضرر اور اس پر بھی ہم نہ چلیں۔ صاحبو! مجھ کو
کا طریق گو کسی قدر مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ بس کسی محقق سے تعلق پیدا کر لو جس سے
صالح مرمت ڈھونڈ و مصلح کو ڈھونڈ و تندرست کو مرمت دیکھو بلکہ تندرست
کنندہ یعنی معالج کو تلاش کرو۔

شیخ وہ ہونا چاہئے جو خود بھی متقی ہو اور مصلح بھی ہو۔ گو ایسا شیخ تمہارے
دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا۔ مگر یہ بھی نہیں کہ تم تو کچھ نہ کرو اور شیخ تمہاری اصلاح
کی غرض سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ کیونکہ اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے
جو تمہارے پیچھے پھرے گا۔ بس ان اصول پر فوراً کام شروع کر دو۔ کل پر سوا
کا انتظار مرمت کرو۔ گو یہ دریا سے ناپیدا کنار ہے مگر جب خدا تعالیٰ کا فضل
شامل حال ہوگا تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن دوسرے کنارہ پر پہنچ ہی جا
وے گا۔ میں مکرر کہتا ہوں اور اطمینان کلی دلاتا ہوں کہ تمہاری معاش میں خلل ہرگز نہ
پڑے گا۔

طریق عمل | مگر یہ بھی نہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور پرہیز تو کرنا ہی پڑے گا۔
اگر کسی مریض سے طبیب کہے کہ بھائی دوا پینا اور پرہیز کرنا
اور مریض یوں کہے کہ حضور آپ ہی پی لیں۔ آپ ہی پرہیز کر لیں۔ تو ایسے مریض
کو کیوں کر شفا ہوگی۔ شفا تو خود مریض کے دوا پینے اور پرہیز کرنے سے
ہوگی۔ باقی یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ اس طریق میں ذرا بھی تعب اور مشقت نہیں
البتہ نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔ سو اس میں کیا مشقت ہے مثلاً پانی
عورت کو مرمت دیکھو، پوری مرمت کرو۔ سو اس میں کون سی مشقت ہے بلکہ

یہ تو باتیں وہ ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے علاوہ ایصال الی المقصود کے اور بہت سی دینی و مفسر توں سے بچ جاؤ گے۔ پھر تمہارا نقصان ہی کیا ہوا۔ دنیا بھی نہیں گئی بلکہ اور سنور گئی اور دین مل گیا۔ بس صرف متقاومت کرنا پڑے گی نفس کی۔ اور یہ کام تو ضرور کرنا پڑے گا۔ اب تمہیں غرض ہو تو تم اس طرف آؤ۔ آگے تم جانو۔ باقی خدا تعالیٰ کو کوئی غرض نہیں کہ گھیر کر لاویں۔ مگر جب آؤ سمجھ کر آؤ۔ کبھی خام ہوئیں گے کہ نہ آؤ کہ اس میں ایسی لذت ہوگی، ایسے انوار ہوں گے کشف و کرامت ہوگی۔ جب کچھ نہ ہو تو بعد میں کہو کہ دھوکا ہی ہو گیا۔

جیسا کسی بدوی نے کلام اللہ میں یہ سن کر کہ خدا نے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی ہے انجیر کھالیا تھا۔ بہت اچھا معلوم ہوا۔ پھر آپ نے زیتون بھی کھایا وہ بد مزہ اور بکسا معلوم ہوا تو آپ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ زیتون کی بے چکھے ہی قسم کھالی۔ بڑا دھوکا ہوا۔

اسی طرح اس طریق کے زیتون میں بکسا پن تو ہوگا مگر وہ زیتون ایسا ہے کہ لا شرقیۃ ولا غربیۃ (نہ مشرق میں نہ مغرب میں) پھر تو وہ زیتون ایسا اچھا لگے گا کہ کسی چیز کی بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت نظر نہ آئے گی۔ جیسے تمباکو کھانے والوں کو تمباکو اول اول کیسا برا معلوم ہوتا ہے مگر پھر اس سے زیادہ کوئی چیز مزیدار نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح جب کوئی مریض کھاتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے مگر پھر وہی اچھی لگتی ہے کہ گھی بھی اس کے سامنے اچھا نہیں لگتا۔ کیا خدا کے راستے کی چیزیں مریض سے بھی کم ہیں۔ یہ راستہ بھی اول اول قدر سے و شوار اور بد مزہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس

کی تحصیل میں جان و مال سب کچھ دینا گوارا کر لو گے۔ ذرا اس راستہ پر چل کر تو دیکھو
میں کہاں تک تفصیل کروں۔ کیا تصوف کا لقمہ منہ میں بنا کر دے دوں۔ پکاؤ اور کھاؤ
ترکیب ہم بتلا دیں گے۔ پہلے کچی روٹی پکاؤ گے پھر پھلکے پکانے لگو گے مگر اس
کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روٹی پکانے میں دھواں بھی ضرور لگے گا۔ مطلب یہ ہے
کہ اس طریق میں مقاومت نفس اور شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی برداشت کرنی
پڑے گی۔ جیسے روٹی پکانے میں دھواں اور آگ کی گرمی ضرور لگتی ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد
آبادیؒ بعض لوگوں پر تیزی فرماتے تھے۔

سختی مشائخ کی حکمت

اس پر ایک تعلقہ دار نے مجھ سے شکایت کی کہ گنج مراد آباد میں تو غلامی کرنا
پڑتی ہے۔ اس لئے کوئی اور پیر تبلاؤ جہاں کچھ رعایت ہو۔ بس اتنی سی بات
پر برگشتہ ہو گئے۔ صاحبو! اتنے چہرے تو لگیں گے ہی۔ مشائخ کی سختی تو برداشت
کرنا ہی پڑے گی۔ مگر وہ سختی عین حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔ وہ بے فائدہ
سختی نہیں کرتے بلکہ معالجہ کرتے ہیں امراض کا۔ گو سمجھ میں نہ آوے۔

ہمارے ہاں خاتقاہ میں ایک شخص تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے
شخص کو امر بالمعروف کیا۔ امر بالمعروف ہے تو اچھی چیز مگر مجھ کو ان کے طرز
سے یہ محسوس ہوا کہ منشاء اس کا کبر ہے۔ انہوں نے اپنے کو اچھا اور دوسرے
کو حقیر سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ میں نے اُن کو بلایا اور کہا۔ کیا آپ محتسب ہیں یا
کسی کی طرف سے نامور ہیں۔ انہوں نے اول اول بہت تاویلیں کیں مگر اخیر میں
سمجھے۔ میں نے اُن کی یہ سزا مقرر کی کہ خاتقاہ کے لوگوں کی جو تیاں سیدھی کھا

کریں۔ چنانچہ وہ کرتے رہے۔ پھر مکان بچلے گئے۔ رہاں بھی غالباً کرتے رہے۔
جب میں نے دیکھا کہ مرنے نکل گیا۔ لکھ بھیجا کہ اب نہ کرو۔
انہوں نے ایک شخص سے بیان کیا۔ واقعی مجھ میں یہ مرنے تھا اور مجھ کو اس
تدبیر سے اتنا نفع ہوا کہ دس برس کے مجاہدہ سے بھی نہ ہوتا۔ کبھی برسوں کا علاج
ایک آن میں ہو جاتا ہے۔ عرض مشارحہ کی سختی اور بد مزاجی میں اصلاح آئی ہوتی ہے
اُن کو سختی سمجھنا غلطی ہے۔

عادت اللہ | اسی طرح اس کے علاوہ ایک غلطی اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ
مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں کو ایک نظر میں غوث
کر دیا۔ ایک نظر میں کیمیا بن گئی۔ ایسی باتوں کو سن کر بعض لوگ پیر کے بھروسہ
پر کام سے بیٹھ رہتے ہیں اور خیال کر لیتے ہیں کہ پیر ایک نظر میں ہم کو کامل بنا
دیں گے۔ ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کام اپنے
ہی کرنے سے ہوتا ہے۔ باقی بعض واقعات جو مشہور ہیں کہ ایک نظروں طالب
کی کیمیا بن گئی۔ سو یہ بھی ایک درجہ میں صحیح ہے مگر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اس اکبر
بننے سے پہلے کتنی دیر لگی تھی اور کیا کچھ اُن کو کرنا پڑا تھا کتنے اور کیسے کیسے
مجاہدے انہوں نے کئے تھے۔ جب اکبر بنے۔ ہاں عین اکبر بننے کے وقت
دیر نہیں لگی۔ ایک نظر میں کام ہو گیا۔ یہ ہے حقیقت واقعہ کی۔ البتہ کہیں فرق
عادت کے طور پر ایسا بھی ہو گیا ہے کہ کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک نظر میں
کام ہو گیا مگر یہ شاذ و نادر ہے۔ وَ اِنْ تَشَاؤْ كَالْمَعْدُوْمِ دَنَا وَ تَشَلَّ وَ تَبُوْنَهُ هٰی كَ
ہے، عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کام کرنے سے ہوتا ہے۔ جو بھی ہوتا

ہے۔

شاہ بھیک صاحب حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کے مرید ہیں۔ ان کو ایک نظر میں کامل کر دیا تھا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کیا تھا۔ کتنے یہ پانعات و مجاہدے کئے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آئی۔ ایک اور ان کے مجاہدہ کا سنئے۔

شیخ نے ایک روز کسی بات پر ان سے کہا کہ جاؤ نکل جاؤ۔ یہ نکل کے یہاں آگئی۔ مگر گرنے کو ہو گیا۔ بی بی صاحبہ نے کہا، ایسے کاموں کا ایک آدمی تھا، اسے ہی نکال دیا۔ اب گھر کی مرمت کون کرے۔ آپ نے فرمایا میں نے نکال دیا ہے تم بلا لو۔ بی بی صاحبہ نے بلا لیا۔ شاہ بھیک صاحب کی وجہ سے پاس نہیں گئے تاکہ حضرت شیخ کو ناگوار نہ ہو۔ بی بی صاحبہ نے کہا کہ بھائی بھیک چھت خراب ہو گئی۔ کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اس کو درست کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے، چھت پالی، مٹی ڈالی، کوٹا پٹیا۔ جس وقت چھت کوٹ رہے تھے، شاہ ابوالمعالی گھر میں تشریف لائے۔ معلوم ہوا بھیک چھت کوٹ رہے ہیں۔ اس وقت آپ روٹی کھانے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں لئے ہوئے صحن میں آئے اور فرمایا، لومیاں بھیک! وہ آپ زبان سے اتنا سنتے ہی چھت پر سے کود پڑے۔ آپ نے ہاتھ پکڑ کر لیا اور لقمہ منہ میں دے دیا۔ پس ایک لقمہ میں کام ہو گیا اور کامل ہو گئے۔ سویر تو صحیح بات ہوئی کہ ایک نظر میں کامل ہو گئے مگر یہ دیکھنا کہ کتنی دقتوں کے بعد اور کتنے مصائب کے بعد سوکھی لکڑی میں آگ

جلد لگتی ہے مگر سوکھتی ہے کتنے دنوں میں۔ شیخ کے پاس رہ کر پہلے اپنا گیلان
تو دور کرو۔ اس کے بعد پھر آگ کا فوراً ہی اثر ہوگا۔ عارف شیرازیؒ اسی کو تو
فرماتے ہیں :-

دوش وقت سحر از غفۃ حیاتم دادند
وند رال غفلت شرب آب حیاتم دادند
کل رات صبح کے وقت غفہ و غم سے مجھ کو حیات دی شرب
کی غفلت میں مجھ کو آب حیات دی۔
کیہا نیست عجب بستگی پیرمغاں
خاک او گشتم و چندی در جاتم دادند
پیر کامل کی اطاعت عجیب کیہا ہے۔ اس کے قدموں پر رہا
اتنے درجات پائے۔

اس میں طریقہ بھی بتلادیا کہ میں نے شیخ کا اتباع کیا تھا۔ اس کی جوتوں
کی خاک بن گیا تھا۔ اس لئے ایسا ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اختیار ہی ہے
پھر کیا عذر ہے۔ پس اس طریقہ سے غلبہ محبت پیدا کر لو۔ پھر دنیا میں لگ کر بھی
اللہ سے غفلت نہ ہوگی۔ یہ ہے کامیابی اور فرضا۔ اگر کامیاب نہ بھی ہوئے
تب بھی اسی جماعت کے ساتھ مشغور ہو گے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ اس
طریق کی تاقامی میں بھی کامیابی ہوتی ہے۔ اسی واسطے اہل طریق کہتے ہیں کہ
کام کرنے والے اس طریق میں ضرور کامیاب ہی ہوتے ہیں۔ تاکامی بعض کسی
کو نہیں ہوتی۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں۔ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ
الزَّكَاةِ۔ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر

اللہ اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر فعل قلب ہے اور نماز فعل
جوارح عبادت بدنی ہے۔ زکوٰۃ عبادت مالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت
وبیع دُن کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے غافل
مالی عبادت سے۔ اس میں یہ بھی تبلا دیا کہ محض عبادت ظاہری کافی نہیں، بلکہ
قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ۔ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت نہیں۔ کیونکہ اس
میں تعین وقت کی قید نہیں۔ وہ تو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ کسی کام میں اس سے
خرج ہی واقع نہیں ہو سکتا بخلاف دوسرے اعمال کے۔ جیسے نماز ہی ہے
مثلاً اُس میں وقت کا اس لئے تعین ہے۔ اگر تعین نہ ہو تو دوسرے ضروریات
میں بڑی دقت پیش آئے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس
کا ضرر ظاہر ہے اور تعین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تو وقت معین پر ادا کرو
مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو۔ اسی کو
کہتے ہیں۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نشانی

شاید کہ نگاہ سے گشت آگاہ نشانی

ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مرت ہو

شاید کہ غم پر کھٹک کر نگاہ کریں اور غم آگاہ نہ ہو۔

بس اس میں ہر وقت لگے رہو۔ خدا جانے کس وقت کام بن جاوے اور
گو مقصود اس تقریر کا ذکر قلبی ہی ہے مگر وہ عادت پیدا ہوتا ہے، ذکر لسانی سے
اس لئے زبان کو بھی ڈاکر بنانا چاہئے۔ گو کسی وقت ذکر قلبی سے خالی ہی ہو
وہ بھی اگر خلوص سے ہو موثر ہوتا ہے۔

شاید اس پر کوئی ناواقف کلام کرے کہ زبان سے نام لینے سے کیا
ہوتا ہے جب اُس کے ساتھ قلبی توجہ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کھٹائی کے نام
لینے میں تو یہ اثر مشاہد ہے کہ اُس کے نام لینے سے منہ میں پانی بھرا ہوتا ہے
کیا اللہ کا نام اتنا بھی نہیں ہے کہ دل تک اُس کا اثر پڑے۔

صاحبو! اعتراض مت کرو۔ اللہ اللہ کہہ لیا کرو۔ پھر خود دیکھ لو گے کیا
اثر ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہی ترتیب ہے سلوک کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی
سُبْحِ اسْمَ رَبِّكَ اَلْعَلٰی۔ اپنے رب کے نام
کی پاکی بیان کرو۔

میں اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتدا بیان فرمائی
ہے سلوک کی کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔ اسی واسطے سُبْحِ
رَبِّكَ اَلْعَلٰی اپنے رب کی پاکی بیان کرو، نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ
بھی لائے۔ گویا یہ تعلیم فرمادیا کہ ابتدا نام ہی سے کرو۔ اس سے آگے ترقی
ہو جاتی ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں اور تسبیح کرتے ہیں۔

از صفت و ز نام چہ زاید خیال وال خیالش بہت دلال وصال
وصف اور نام سے کیسا خیال پیدا ہوتا کہ وہ اس کا خیال وصال

کے لئے رہنا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب یہ خیال مت کر کہ صفت اور نام سے کیا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے خیال پیدا ہوگا۔ پھر وہی خیال رہتا ہے وصال ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرضاً ذکر لسانی سے نفع ہو ہوم بھی نہ ہو، تب بھی محبوب کا نام لینے میں کم سے کم مزہ تو آوے ہی گا۔ اسی کو ایک شاعر کہتا ہے۔

أَذْنًا سَقْنِي خَمْرًا وَقُلْ لِي رَحَى الْخَمْرِ
وَلَا تُسْقِنِي سِرًّا مَتَى أُمُكِنَ الْجَهْمُ

کہ اے ساقی شراب پلاتا جا اور اُس کے ساتھ یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے۔

ایسے ہی محنوں کی حکایت ہے۔

دید محنوں را یکے صحرا نورد
در بیابان غمش بنشسته فرد
رنگ کا قد بود انگشتاں قلم
می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے محنوں شیدا چیت این
می نویسی نامہ بہر کیست این
گفت مشق نامہ یلے می کنم
خاطر خود را تسلی مسبد ہم
محنوں کو کسی تے جگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی انگلی سے ریت
پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کس کو خط لکھ رہے ہو۔ جواب دیا کہ میں
اپنی محبوبہ یلے کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو
تسلی دیتا ہوں۔

عشق کا خود مقتضائے محبوب کا نام لینا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو بس
چلتے پھرتے زبان سے اللہ کا نام لیتے رہو۔ اس طرز پر

لَا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَیْعٌ ۚ اِنَّ كُوْلًا لِّدُنِّیْ یَا دُسَّ نِجَارَتِ
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ الخ غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت

کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر چند دن ایسا کر کے بھی اعتراض کرو
کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا۔ تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس
نیت سے نہیں کیا ہوگا کہ دل میں اثر ہو۔ اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر
ہوگا۔ اُگے ارشاد ہے۔

يُخَافُوتَ يَوْمَ مَا تَلْقَیْنِیْہِ ۚ
الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ
وہ اس دن سے ڈرتے ہیں
کہ اس میں دل اور آنکھیں لٹ

پلٹ ہو جائیں گی۔

اس میں عجب کا علاج ہے۔ یعنی اُن کو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا باوجود
عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں۔ یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے

مُلُوْبُهُمْ وَجِلَّتْ اَنْہُمْ
اِلٰی رِیْبِهِمْ رَاۤیِعُوْنَ
اُن کے دل ڈرتے ہیں اس
بات سے کہ وہ اپنے رب

کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اُن دن سے
کہ لٹ پلٹ ہو جائیں گے اُس میں دل اور آنکھیں۔ مطلب یہ کہ اُن میں
باوجود عبادت کے پھر خوف ہے، عجب نہیں۔ وہ اپنے اعمال کی ہیچ

سمجھتے ہیں۔

عمل اور اجر

ایک مسئلہ یہاں سے اور مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو عمل کو پیچ سمجھے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا۔ تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ جیسے آج کل اکثر کی یہ حالت ہے کہ یہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تھیں کہ۔

حضرت حاجی صاحبؒ ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے۔ کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب ان کی طرف توجہ کرتا ہے ان سے مزے لیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کو مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ ان کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اشد نہیں۔ مگر لوگ ان ثمرات مانع ہی کو چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ سو ان کے لئے کاہرگز قصد نہ کیے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لٹو دے کر یا پیسہ دے کر پہلاتے ہیں۔ اسی طرح بندی سلوک کو اس رنگ آمیزی سے پہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے۔ سو مقصود کام ہی ہے۔ اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں۔ تاکہ ذکر اللہ کا چمک لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں، وہ بدرجہ مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں۔ ان کو مذموم

نہ سمجھنا چاہئے۔ اگر خود آئیں اُنے وو۔ ان کے دُور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ۔ اگر نہ آئیں تو معنوم مرت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں نہیں آتے بلا سے مرت آئیں۔

اس آیت میں یُخَافُونَ یَوْمًا (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا۔ یُخَافُونَ نہ فرمایا۔ حالانکہ بظاہر یُخَافُونَ زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔

سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض کو عروج کے مقام میں پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے وہ ماسوائے اللہ سے ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پروا ہے نہ دوزخ کا ڈر، نہ یوم آخرت سے خوف، صرف خدا ہی سے تعلق، محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو عبودیت کے خلاف ہے۔ اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے، نہ کہ اُن چیزوں کی ذات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت کھانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غَيْرِ مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنَى عَنْهُ رَبَّنَا یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں۔ ہم تو بندے ہیں۔ ہر حال اور

ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں۔

اہل طریق کا جو قول ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جائے اس کے یہ معنی ہیں

کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغنا ہونا

چاہئے۔ باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس

حیثیت سے اُن کے ساتھ تعلق رکھے۔ تو اس سے استغنا نہ ہونا چاہئے

بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کو محتاج سمجھے۔ یہ عین عبدیت ہے۔

پس آیت میں لفظ یَوْمًا لاکر تاک کو علو سے عبدیت کے مقام پر

اتارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے۔ وہ تو خدا کی

چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں۔ پس یَوْمًا لانے میں یہ نکتہ ہے۔ اور بعض

مقام پر یُخَافُونَ رَبَّهُمْ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، فرمایا ہے۔ وہ اس

طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے۔ اسی لئے صوفیاء

کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہئے۔

اگے فرماتے ہیں لَیَجْزِيهِمْ اللّٰهُ۔ اس میں لام عاقبت سے مطلب

یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے۔ اُن کا یہ انجام ہوگا۔ اُن کو یہ ملے گا

أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا مِنْ أَحْسَنٍ اور مَا عَمِلُوا جو انہوں نے عمل کئے ہیں ایک

ہی چیز ہے۔ لفظ أَحْسَنَ سے یہ بتا دیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے پس یہ قید

واقعی ہے استرازی نہیں۔

جیسے ہم جنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے انتخاب کر کے کھاتے ہیں

اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی کھلے ہوؤں کے ساتھ کھا

جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ نیک عمل کیساری ہو سب احسن ما عملوا میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم ناچیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمت بڑھاتے ہیں۔ قرآن میں تدبیر کیا جائے تو جابجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلا تے ہیں۔

یوں نہیں فرمایا۔

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الصَّلَاةِ اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ
وَالزَّكَاةِ۔ کی طرف بلا تے ہیں۔

اگر ابتداء یوں فرما دیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادات کی طرف بلائے کو سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا تاکہ دل کو رغبت پیدا ہو جاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق جزا بقدر مجتہد بہ کے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزا ہونی چاہئے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کئے ہیں۔ ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت

معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اُجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ سزا دی جاوے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہئے تھی کہ دس برس یا بیس برس جنت میں رکھ کر پھر باہر کر دیئے جاتے۔ کیونکہ محدود کی جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیسا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَيُزِيدُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ
اور زیادہ دیں گے اُن کو
اپنے فضل سے۔

کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے فضل سے زیادہ دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال تو ہمارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ تازہ ہوتا کہ ہمارے اعمال شاید نیچے جیسے ہوں یعنی اُن میں خاصیت ہو نشوونما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا مِنْ فَضْلِهِ کہ تمہارے اعمال نیچے وچے کچھ نہیں جنت بلکہ یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ اُگے ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ يَزِدُّكَ مِنْ ثَمَرِهِ
اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے

بغیر حساب۔ ہیں بے حساب و زی دیتے ہیں

یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ مہیاں جس کو چاہیں بے حساب

روزی دیں۔ اُن کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور

مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب نہیں۔ پس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

صاحبو! یہ ہے مومن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مال میں کام آوے وہ ہے مال حقیقی (یعنی اعمال صالحہ) واللہ! مال سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے۔ دونوں جہان میں اسی کو ارشاد فرماتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ مَالًا مِنْ ذِكْرٍ أُنْتِ وَأَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلْخَيْرِ نَافِعَةٍ
حَيَوَةٍ طَيِّبَةٍ وَلَيُجْزِيَنَّهُمْ أَجْرُهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْلَمُونَ
کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ
زندگی عطا فرمائیں گے یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت
ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون و اطمینان ہوگا اور آخرت میں ان
کے نیک اعمال کی کامل اجرت دیں گے۔

ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ
يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمًى۔

یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی
یعنی دنیا میں۔ اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت و ماں بھی مصیبت۔
چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے۔ یہ حال ہے کہ

مال و دولت تو اُن کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ عیسے نہیں۔ بعض اوقات تو اُن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی۔ دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصل مال اس کو کہنا چاہیے۔ دنیوی مال کو تو مال اسی کہتے ہیں میل الیہ القلوب یعنی اُس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب اُن کی طرف مائل ہو۔

پس وعظ کا مقصود تو ختم ہوا۔ اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رجال کا لفظ آیا ہے۔ عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ تابع ہیں مردوں کے۔ دوسرے دلالت النص کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آگئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح ہیں۔ اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو کر ان صفات کو اختیار کرے تو بڑی ہمت کی بات ہے۔

روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آجاوے۔ جیسا لا تُلْهِمْہُ اس میں نص ہے یعنی صفت تو اس کی عبودیت ہو اور تعلق الٰہیت سے ہو۔ پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الٰہیت اور عبودیت کو اس طرح جمع کرے

جاوے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور نشان عبادت کی ہو۔

بس اب بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "نخیر الممال للرجال" رکھتا ہوں۔ اس نام کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں عورت کو مال کہا گیا ہے اور یہ مال ہے تشبیہاً۔ اس لئے میں نے بھی اعمال کو تشبیہاً مال کہہ دیا۔ اور چونکہ میں اس وقت تجارت گاہ میں ہوں جہاں تجارت زیادہ ہیں تو شاید کسی کو اُن میں سے یہ خیال ہوتا کہ تجارت مانع سے آخرت سے۔ اس لئے میں نے اُن کے مناسب مضمون اختیار کیا اور اُس کی اچھی طرح تفصیل کر دی کہ تجارت مانع آخرت نہیں۔ البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا کی قید اور اُس کے ساتھ تعلق ضرور کم ہو جاوے گا۔ سو اس کا کیا مضائقہ بلکہ یہ تو مفید ہے کہ پیر میں ایک بٹری مٹی وہ کم ہو گئی۔ بس یہ خلاصہ تھا بیان کا۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین!

انشرف علی!

۳۴۸

خیرالاناث لاناٹ

گورنوں کے بہترین سرمایہ کے متعلق یہ وعظ ۶ ربیع الاول ۱۳۳۶ء
کو زمانہ مکان مطبع قیومی کا پور میں فرمایا۔ دو گھنٹے میں ختم ہوا۔ اسناد
کا جمع تھا۔ کچھ مرد بھی شریک تھے۔ حکیم محمد یوسف صاحب مدرعہ
بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبة بالورد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله، نحمده، ونستعينه، ونستغفره، ونؤمن به
ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات
أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل الله فلا
هادي له، ونشهد أن لا إله إلا الله، وحده لا شريك
له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله
عليه الله تعالى، عليه وعلى آله وصحبه وبارك وسلم
أما بعد، فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله
الرحمن الرحيم، وإذا تتلى عليهم آياتنا بينت قال
الذين كفروا للذين آمنوا أي الفريقين خير مقاماً و
أحسن تدبيراً، وكم أهلكنا قبلاً من قرون ههنا، نحن آتانا
ورسايه

پہلی آیت میں کفار کا تفاخر، ساز و سامان اور اہل و اعوان پر
 مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جہاد کا اور دوسری آیت میں
 سے زیادہ سامان و نمود والوں کا مبغوض اور عذاب سے ہلاک کیا جانا
 مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جہاد کے قابل تفاخر نہ ہونے کا۔

سب سے پہلے قابل عرض بات یہ ہے کہ گو اس جلسہ میں مرد بھی شریک
 نہ مگر زیادہ مقصود مستورات کو ملنا تھا ہے۔ اس لئے مردوں کے مذاق کی زیادہ
 حمایت نہ کی جائے گی۔ گو فائدہ دونوں میں مشترک ہے مگر اس وقت اس پر
 نہیں کہ نفع معتد بہ مردوں کو ہوتا اس کے دلچسپ ہونے پر نظر ہے۔ بلکہ
 انہوں کا افادہ اصل مد نظر ہے تاکہ عورتیں جن کو وعظ سننے کا موقع بہت کم
 ہے محروم نہ رہ جائیں۔ اس وقت وعظ میں مضامین متعدد وہ ہوں گے۔
 ہوں گے سہل۔ ارادہ تو یہی ہے۔ اگے اللہ تعالیٰ کو جو بھی منظور ہو بخیر و

میں جو امراض پائے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کا بیان اور ان کا معالجہ بتانے کا قصد ہے اور تلاوت کی ہوئی آیات میں ایسے ہی امراض کا ذکر ہے۔ جیسا آیات کے حاصل سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ جب تک مرض نہ معلوم ہو اُس کا علاج کیسے کیا جائے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اول ان امراض کو ظاہر کیا جائے تاکہ مرض معلوم ہونے پر اُس کے علاج کی طرف توجہ ہو۔

زیادہ تر افئوس تو یہی ہے کہ ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے اندر کچھ امراض بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علاج کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اور جن کو امراض کا کچھ احساس بھی ہے ان کی بھی یہ حالت ہے کہ آثار کو تو دیکھتے ہیں مگر ان کے اسباب کو نہیں دیکھتے کہ اس کا سبب کیا ہے اور یہ فعل کیوں پیدا ہوا۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ ہر فعل کسی خاص صفت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ صفت سبب ہوتی ہے اُس فعل کا۔ تو پہلے اُس صفت کا علاج کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ فعل خود بخود جاتا رہے گا۔ جن کی فہم کوتاہ ہے وہ صرف اثر کو دیکھتے ہیں اور اُس کے علاج کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ان کا یہ فعل کون سی صفت سے پیدا ہوا۔ اسی لئے علاج سے فائدہ معتد بہ نہیں ہوتا۔ پس اس وقت بھی مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر جو صفات مذکورہ ہیں ان کو معلوم کیا جائے پھر ان کا علاج کیا جائے جس سے اصلاح افعال کی ہو اور مراد صفت سے فطرت کا درجہ نہیں۔ وہ تو محل علاج نہیں بلکہ درجہ خلق یعنی عمل باطنی کا ہے۔

سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں میں دو قسم کے امراض | دو مرض بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک حُب

مال، دوسرے حسبِ جاہ۔ گو دونوں کارنگ مردوں اور عورتوں میں مختلف ہے یعنی مردوں میں حسبِ مال اور حسبِ جاہ کا اور رنگ ہے اور عورتوں میں دوسرا رنگ ہے مگر دونوں میں یہی دو مرتبہ زیادہ ہیں۔ مردوں میں حسبِ جاہ اس رنگ سے ہے کہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ عورتیں اپنے کو بڑا تو نہیں سمجھتیں مگر اپنے کو بڑا ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی باتیں اور ایسے طریقے اختیار کرتی ہیں کہ جن سے ان کا بڑا ہونا دوسرے پر ظاہر ہو۔

اسی طرح حسبِ مال کے رنگ بھی دونوں میں مختلف ہیں۔ مردوں کو زیادہ روپے سے محبت ہے اور کسی چیز سے اتنی نہیں۔ اسی واسطے اس کے کپڑے اور برتن وغیرہ خانگی سامان سے زیادہ محبت ہوتی ہے کہ رنگ برنگ کے کپڑے ہوں، قسم قسم کے برتن ہوں، مختلف قسم کے زیور ہوں علیٰ ہذا مگر اس بارہ میں مردوں کی سمجھ عورتوں سے اچھی ہے۔ کیونکہ روپیہ تو ایسی چیز ہے جس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کے پاس روپیہ ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا بدل ہو سکتا ہے اور ہر چیز اس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بخلاف کپڑے اور برتن وغیرہ کے کہ وہ ہر چیز کا بدل نہیں ہو سکتے اور ہر چیز اس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ مرد بکثرت جاں داویں خریدتے ہیں۔ کہیں مواضعیات، کہیں مکانات مول لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی سامان سے محبت ہے روپے سے نہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ وہاں بھی سامان سے محبت نہیں۔ بلکہ روپیہ سے محبت و رغبت ہے۔ جائداد کے لینے میں بھی روپیہ پھنسانے کی ایک صورت کر لی ہے۔ پس مردوں کو جو جائداد سے محبت ہے وہاں بھی غیر منقول سے منقول ہی مقصود ہے۔ جائداد سے آمدنی ہوتی رہے گی اور محفوظ رہے گا پس وہاں بھی مقصود روپیہ ہی ہے۔

عورتوں کی حرص

عورتوں میں یہ رنگ نہیں۔ وہ تو ساز و سامان کو فریفتہ ہیں۔ ہر وقت چیزوں کے جمع کرنے کی

کو حرص رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روپے کو بے طور اڑاتی ہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ ان کو اس بات پر نظر نہیں کہ روپے سے ہر چیز حاصل ہو جا رہے۔ دوسرے روپیہ ان کا کمایا ہوا نہیں جس سے دل دکھے۔ اس لئے بیدار خراج کرتی ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ کسی نے ایک شخص کو دیکھا کہ دوشالہ سے اپنے ادھوڑی کا جوتا صاف کر رہا ہے۔ یہ اس کو ملامت کرنے لگا، تو اس نے کہا، بات یہ ہے کہ جوتا تو میری کمائی کا ہے اور دوشالہ ہے ابا جان کی کمائی کا۔ یہ طبعی تفاوت ہے اپنے مکسوب اور غیر کے مکسوب میں کہ اپنی کمائی کو لگتی ہے اور دوسرے کی کمائی دل کو نہیں لگتی۔

خیر جو کچھ بھی وجہ ہو ان کو روپیہ کی قدر نہیں۔ ان کو زیادہ شوق چیز کا ہے حتیٰ کہ فضولیات تک ان کی نظر پہنچتی ہے۔ پس ان کو تو یہ خبر ہے چاہئے کہ فلاں چیز بک رہی ہے فوراً اس کے خریدنے کا اہتمام ہوتا ہے۔

گو یا پہلے ہی سے اس چیز کی غنظر تھیں۔ یہاں تک حالت ہے کہ ایک ضابطی بنائی کسی کپڑے کی۔ اس کے بعد دوسرا کپڑا سامنے آگیا۔ بس کوشش کریں گی کہ اس کو بھی خرید لیں۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اور اس کا یہاں نہ کیا ٹھہرایا ہے کہ یہ کپڑا اگلے سال کام آجائے گا اور اگر کہا جائے کہ اگلے سال اور تیار ہو جائے گی یا پہلی کو فروخت کر کے دوسری بنالو، تو کہتی ہیں کہ ایک تو اُنے جانے کے لئے ہے اور ایک گھر کے لئے۔ عرض گھر گھڑا کہ دوسری کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ کپڑا پسند آگیا ہے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ شوہر سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس گنجائش نہیں مگر وہاں اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اُن کو چیزوں سے ایسی محبت ہے کہ ہر شے کے لئے میں ضرورتیں تراش لیں گی۔ برتن بکڑا ہوا آجائے خواہ اس کی کچھ بھی ضرورت نہ ہو بس خرید لیں گی۔ پتا چھ گنجائش والے گھروں میں اتنا سامان موجود ہے کہ کبھی استعمال کی بھی نہ بت نہیں آتی۔ مگر عورتوں کو سامان کے خریدنے سے کسی وقت بھی انکار نہیں۔ اُدھی کو تو حقیقت میں غٹوڑ سے ہی سامان کی ضرورت ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

حصر قانع نیست صاحبِ رزاسباب معاش

آنچه مادر کار دارم اکثر سے در کار نیست

یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے فرش اور صندوق مشغول رکھے ہوئے ہیں

مگر اُن کی خریداری بند نہیں ہوتی۔ خصوصاً نازک اور تکلف کا سامان خریدنے کا

آج کل بڑا ہی شوق ہے۔ جو سوائے زینت و آرائش کے کسی کام کا نہیں اور

ماشاء اللہ پختہ ایسا ہے کہ اگر ذرا ٹھیں لگ جاوے تو کسی کام کا بھی نہیں۔
 جیسے ایک شخص چوڑیوں کی گٹھڑی کر رہا ہوئے چار ماٹھا رات
 میں ایک گنوار ملا۔ گنواروں کی عادت ہوتی ہے کہ لکڑی مار کر پوچھا کرتے
 اُس نے گٹھڑی میں لکڑی مار کر کہا کہ اس میں کیا پیر ہے۔ چوڑی والے نے
 کہا کہ ایک دفعہ اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ بیچا ہے کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔
 یہی حال تکلف کے سامان کا ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی میں کسی
 کا بھی نہیں۔ مگر مستورات کو دن رات اسی کا اہتمام ہے کہ گھر میں بہت
 چیزیں ہوں، تکلف کا سامان ہو۔ ہر وقت یہی دھن ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُن کے
 اندر حُب مال اس رنگ میں ہے کہ اُن کے پاس کتنی ہی چیزیں ہوں مگر طالب
 مزید ہی رہتی ہیں۔ اُن کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔

ایک عورت نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہماری مثال تو جہنم کی سی ہے
 کہ اس سے کہا جائے گا اہل امتلت کہ کیا تو بھر چکی۔ تو وہ کہے گی اہل
 یعنی کچھ اور بھی ہے۔ اسی طرح ان کو صبر نہیں طالب مزید ہی رہتی ہیں۔

عورتوں کی ناشکری | جب کبھی ان سے پوچھو تو یہی کہیں گی کہ ہمارا
 پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ شکر کرتا تو کبھی جواب

ہی نہیں۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ ایک مضمون اپنے وعظ میں فرما
 کرتے تھے۔ گو مضمون تو ہے شاعرانہ مگر ہے واقعی۔

چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کے پاس اگر کپڑوں کے صندوق
 بھرے ہوں مگر اُن سے جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار چلتے ہیں۔ سارا گھر

برتنوں سے بھرا ہوا ہو مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے۔ جوتیوں کے کتے ہی جوڑے ہوں مگر ہمیشہ یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے۔ یہ مضمون ممکن ہے قافیہ کی ضرورت سے بنا ہو مگر واقعہ سچا ہے۔

حاصل یہ کہ ان کو سامان سے کبھی صبر ہوتا ہی نہیں۔ مرد تو کپڑوں میں پیوند تک لگا لیتے ہیں مگر عورتیں ہیں کہ ان کو نئے کپڑوں کے صندوق بھر کر بھی کفایت نہیں ہوتی۔ چاہتی ہیں کہ کپڑوں سے گھر بھر لیں۔ اگر سخت مجبوری ہو تو پیوند بھی لگالیں گی۔ مگر وسعت میں تو لگاتی ہی نہیں۔ بعض مرد بیچارے ہیں تو مرد اور چار آنے اٹھ آنے کے مگر پیسوں کو دیکھو تو بیگم بنی ہوئی ہیں مرد اپنے لئے پیوند لگے کپڑوں کو عیب نہیں سمجھتا مگر عورت غریب کی بھی ہوگی اپنے کو ایسا بنائے گی کہ گویا بنت الامیر و زوجۃ الکبیر ہے اور یہ سب ساز و سامان اور سجاوٹ شوہر کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کی غرض سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ محض کم فہمی کی بات ہے۔ دکھانے سے ہوتا کیا ہے کیونکہ آپس میں خاندان والوں کو ایک دوسرے کا حال تو معلوم ہی ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اتنی ہے اور اس کی اتنی۔ پھر دکھانے سے نتیجہ کیا۔ یہ مانا کہ عورتوں کے مناسب زینت ہے مگر اس میں اعتدال تو ہو حد سے بڑھی ہوئی تو نہ ہو۔ ان میں حسب مال کا یہ رنگ ہے اور مردوں میں بھی یہ مرض حسب مال کا موجود ہے مگر رنگ مختلف ہے۔

عورت اور حسب جاہ | دوسرا مرض عورتوں میں حسب جاہ ہے اور یہ مرض مردوں میں بھی ہے مگر دوسرے رنگ

میں۔ وہ بھی اپنے کو بڑا بناتے ہیں مگر رنگ اور ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر مردوں میں اور کمالات بھی ہیں جیسے علم وغیرہ۔ اس لئے ان کا حُجّہ جاہ اس قدر نازدیک نہیں اور عورتوں میں تو یہ بھی نہیں مگر پھر بھی ان میں حُجّہ جاہ ہے۔ گو یہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتیں مگر یہ چاہتی ہیں کہ دوسرے ان کو بڑا سمجھیں ان میں اس کے ساتھ تذلل اور تواضع کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض عیبیاں پائنتی بیٹھتی ہیں اور خدا و مرہ سرمانے۔ اور خود پان لگا کر جنگل وغیرہ کو دے دیتی ہیں۔ ان بیچارہ یوں میں اس قسم کی تواضع بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتی ہیں کہ ہم سب سے بڑھی رہیں بیچارہ یوں میں کمالات تو ہیں نہیں مگر چاہتی ہیں کہ زیور اور سامان بہت سا ہو کہ دوسروں سے بڑھی پڑھی رہیں۔ جب کہیں جائیں گی، تو خوب زیور لاو پھاند کر جائیں گی۔ خواہ مانگا ہوا ہی زیور ہو اور گو دوسروں کو معلوم بھی ہو کہ مانگ کر پہنا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم کو کوئی ہلکانہ سمجھے۔ رات دن اسی کا اہتمام ہے۔ یہی سبق ہے کہ پیک ہو، گوڑ ہو، ٹھپہ ہو، چک ہو، کپڑے کی تراش ایسی ہو، جھال بھی لگا ہوا ہو۔ جہاں تک ان کے امکان میں ہے بناوٹ کا اہتمام کرتی ہیں۔

اس کے متعلق ان میں کمیٹی بھی ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے معاملات اس کے متعلق طے ہوتے ہیں کہ بہن ذرا بتلاؤ تو کہ اس کو تہ کے ساتھ کون سا پاجامہ اچھا لگے گا اور اس جوڑے پر دوپٹہ کون سا ہونا چاہئے۔ پھر ان کا سب سے بدترین مذاق ہے کہ یہ سب ذہنت محض دوسرے کے

خوش کرنے کو کرتی ہیں۔ باقی خاوند کے سامنے ایسی میل کچیل رہیں گی جیسے مہنگن۔ اگر کہیں برادری وغیرہ میں جائیں گی تو غسل صحت بھی ہوگا یعنی جیسے آدمی تندرست ہو کر مدت کے میل کچیل کو اچھی طرح صابون کھلی وغیرہ لگا کر بدن سے صاف کرتا ہے۔ جب واپس آئیں گی تو خاوند کی قسمت میں وہی مبارک صورت ہوگی۔ جہاں گھر میں آئیں فوراً زیبائش کے کپڑے اتار پھینکے۔ خدا جانے یہ عورتوں کا کیا مذاق ہے۔ کہتی ہیں وہاں ضرورت تھی اس لئے زیور کپڑے پہن لئے۔ یہاں کیا ضرورت ہے! اور وہ ضرورت صرف یہ ہے کہ شان کو ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ہم کو کوئی ہلکا نہ سمجھے۔ اگر اعتدال سے زینت ہو تو مصالفتہ نہیں مگر اتنا انہماک کہ ہر وقت اسی میں لگی رہتی ہیں یہ ٹھیک نہیں۔

یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ ان کے پاس اچھا خاصا زیور ہے مگر کسی بی بی کے پاس کسی اور وضع یا نقشہ کا زیور بنا ہوا دیکھا بس فریفتہ ہو گئیں۔ اور اس سے فرمائش کی جاتی ہے کہ بہن ذرا مجھ کو دے دینا میں بھی ایسا ہی بنواؤں گی۔ پھر اس سے زیور لے کر شوہر سے فرمائش کرتی ہیں کہ ایسا بنوادو۔ اب وہ ہر چیز سمجھاتا ہے کہ اس کو کیوں خواب کرتی ہو اچھا خاصا بنا بنا یا زیور خواب ہو جاوے گا۔ سنار کھوٹ ملا دے گا تو چار پیسہ کا زیور رہ جائے گا۔ مگر ایک نہیں سنتیں۔ یہی کہتی ہیں کہ مجھے تو اسی نمونہ کا بنوادو کچھ ہی ہو۔ اب وہ بیچارہ ان کے اصرار پر دلجوئی بھی کرتا ہے اور یہ اس کی عقل پر غالب ہو جاتی ہیں۔ عاقل و لشکنی کو پسند نہیں کرتا۔ آخر

وہ کہتا ہے کہ تم جیتی میں مارا۔ اور پھر اس پر بھی بس نہیں۔ اگر اگلے مہینہ
اور کوئی نمونہ سامنے آگیا تو یہ کہتی ہیں کہ اب یہ نمونہ ہونا چاہئے۔

غرض ہر چیز پر ان کا عشق ہے۔ بس یہی چاہتی ہیں کہ جیسی چیز اور کس
کے پاس ہو ویسی ہی ہمارے پاس ہو جاوے۔ شوہر کی ساری کمائی اور
کی زیب و زینت ہی میں صرف ہوتی ہے۔ اور یہ ساری مذکورہ خرابیاں
جاہ اور حُب مال کی ہے مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ صرف فرق
ہے کہ مردوں میں کبھی قدر ضرورتوں پر نظر ہے اور عورتوں میں ضرورتوں پر
نظر نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق بیان کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اس
لئے میں نے یہ آیت اس وقت اختیار کی ہے۔

خوارج اور معتزلہ کا مذہب | اگرچہ آیت میں کفار کی حالت
بیان کی گئی ہے کہ ان میں فلاں

فلاں صفات ذمہ پائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی حالت بیان نہیں کی گئی مگر اس
عنوان سے بیان کرنے میں ایک بڑا فائدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں اس
پر دلالت ہے کہ یہ صفات فی نفسہ ایسی بُری خصال ہیں کہ کفار میں بھی باوجود
کافر ہونے کے بُری ہیں۔ تو مسلمانوں میں تو اسلام کے ہوتے ہوئے بدرجہ
اولیٰ نہ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلمانوں کے لئے ان صفات
ذمہ سے زیادہ مانع ہونی چاہئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک تو سیاہ کپڑے پر دھبہ ہو، وہ ایسا
بُرا نہیں معلوم ہوتا جیسا سفید کپڑے پر معلوم ہوتا ہے۔ یہ میں نے اس لئے

کہا کہ بعض لوگ شاید یوں کہیں کہ یہ آیتیں تو کفار کے بارہ میں ہیں اور مسلمانوں میں ان کو کیوں جاری کیا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان آیات کے جاری کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ صفات اگر مسلمانوں میں پائی جاویں تو ان کو ان صفات کی وجہ سے کافر بنایا جاوے۔ اس درجہ میں تو منطبق کرنا حرام ہے اور اس میں ترک ہے خصوصاً کا۔ یہ تو مذہب ہے خوارج کا۔ وہ کہتے ہیں کہ کبار کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لا تکفیرہ بذنب ولا تنجیہ
یعنی کسی مسلمان کو کافر مت
من الایمان۔ بناؤ کسی گناہ کی وجہ سے اور

اس کو ایمان سے خارج مت کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو جملے ارشاد فرمائے ایک لا تکفیرہ بذنب اور دوسرا لا تنجیہ من الایمان۔ بظاہر دوسرے جملہ کے بیان کرنے کی حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ لا تنجیہ من الایمان تو لا تکفیرہ بذنب میں خود ہی آگیا۔ کیونکہ جب مسلمان کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ ہوا تو خروج من الایمان بھی نہ پایا گیا۔ پھر دوسرا جملہ ارشاد فرمانے کی کیا ضرورت تھی۔

سو اس کا راز یہ ہے کہ آپ کے بعد دو متبوع فرقے بڑے بڑے پیدا ہونے والے تھے جن کا فتنہ عظیم تھا۔ ایک خوارج دوسرے معتزلہ خواجہ کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ

کہتے ہیں کہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر تو نہیں ہوتا مگر مومن بھی نہیں رہتا ایک
بین بین حالت ہو جاتی ہے۔ نہ اس کو کافر کہہ سکتے ہیں نہ مومن۔ آپ نے
ان دونوں فرقوں پر نکیر فرمائی۔ پہلے جملہ میں تو خوارج کا رو ہے اور دوسرے
میں معتزلہ کا۔ اس لئے آپ نے دو جملے ارشاد فرمائے۔

.. میں ہر چند قصد کرتا ہوں کہ ایسے غیر اہل علم کے مجمع میں ایسی باتیں نہ بیان
کردوں جو اہل علم کے لائق ہیں عوام کے مناسب نہیں مگر ایک اوجھ بات
بیان ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال ان آیات کا مسلمانوں کے حق میں اس طرح جاری
کرنا کہ ان کو ان صفات کے ارتکاب سے کافر بنایا جاوے، یہ تو مذموم ہے
لیکن ایک دوسری صورت ہے کہ تعبیر دمن العار، یعنی شرم دلانے کے طور
پر ان آیات کو مسلمانوں پر جاری کیا جاوے۔ یہ عین حکمت ہے اور شرعاً
مطلوب ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من ترك الصلاة متعمداً یعنی جس نے عداً نماز چھوڑ دی
فقد كفر وہ عملاً کافر ہے۔

گو عقیدہ کے اعتبار سے کافر نہیں۔ یعنی نماز کا ترک کرنا کفار کا ساعل ہے
کہ وہ بھی نماز نہیں پڑھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک صلوٰۃ کو کفر فرمایا
گو اس میں تاویل ہے مگر اصل مقصود عار دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں
کی سی خصلتیں مسلمانوں میں کیوں ہوں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جو صفات ان آیات میں مذکور ہیں ان کے مذموم

ہونے کے لئے کفر بشرط ہے یعنی جس شخص میں یہ صفات کفر کے ساتھ ہوں وہی ان کا مخاطب اور مورد عقاب ہوگا اور اگر ان کے ساتھ کفر نہ ہو تو مورد عقاب نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک دعوئے ہے جس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کافروں میں تو کفر تھا ہی اور وہ اُن کے لئے کافی تھا اور صفات پر عقاب کیوں کیا گیا۔

حُبُّ اللہ وِ اللہ | سو کفار کے لئے ان صفات کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے

نہ محبت ہے نہ بغض۔ بلکہ اُن کے بغض و محبت کا مدار صفات پر ہے جس میں اچھی صفات ہوں اُس سے محبت ہے اور جس میں بُری صفات ہوں اُس سے بغض ہے۔ اور وہاں تو کیا ذکر ہے خود حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں ارشاد ہے۔ لَوْ اَشِیْکُمْ اَلْحَبِطُ عَنْهُمْ مَا کَانُوا یَعْمَلُونَ۔ یعنی اگر انبیاء علیہم السلام میں بھی ایسی صفت پائی جاوے تو اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جاوے گا۔ جو اوروں کے ساتھ کیا جاوے گا۔ اور مقدم اور تالی میں صرف ملازمت کافی ہے گو مقدم کا وقوع محال ہی ہو۔ پس ہر چند کہ اُن حضرات سے ایسا ہو نہیں سکتا مگر نعوذ باللہ، نعوذ باللہ! بفرص محال اگر ایسا ہو، تو وہی اثر ہوگا جو اوروں میں ہوتا ہے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارہ میں ارشاد ہے لیضا عَف لَهَا الْعَذَابُ ضَعِیفٌ۔ کہ نافرمانی کرنے پر اُن کو دوسروں سے دگنا عذاب

ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کو ناز و نعمت سے پالتے ہیں اور جس کی زیادہ
خاطر واری کرتے ہیں وہ اگر نافرمانی کرے تو اس پر غصہ بھی بہت آتا ہے
ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی اہل بیت سے زیادہ کون مورد انعام
و فضل ہوگا۔

بہر حال ان نصوص سے معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے
نہ ایسی محبت ہے کہ چاہے جو بھی کرتا رہے پھر بھی کچھ نہ کہیں۔ اور نہ کسی
کی ذات سے ایسا بغض ہے کہ وہ کسی ہی اطاعت و فرماں برداری کرے
پھر بھی قدر نہ ہو۔

میں نے اپنے بیان میں ایسی کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حق تعالیٰ
کو بعض سے اتنی محبت ضرور ہے کہ ان کو معاصی نہیں کرنے دیتے۔ ان
کے افعال کے ساتھ خدا تعالیٰ کو محبت ہو گئی ہے جس سے ان کی حفاظت
کرتے ہیں۔ ان کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔ پناہ ایک جگہ فرماتے ہیں صلوٰۃ
صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں۔

ولولان ثبتناک لقد
کدت ترکن الیہم شیئا
قلیل۔
یعنی اگر ہم آپ کو ثابت
قدم نہ رکھتے تو آپ ان کی
طرف کسی قدر ٹھوڑا سا مائل

ہونے کے قریب ہو جاتے۔

اللہ اکبر۔ کیا شان حفاظت ہے کہ قلیل در قلیل کے میلان سے
بھی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر کبھی ایسوں سے لغزش ہونے والی ہوتی

ہوتی ہے تو ان کو سنبھال لیتے ہیں۔ اگے نہیں بڑھنے دیتے۔ ایسے بندوں کو خدا تعالیٰ نے پہلے سے محفوظ رکھا ہے۔ معصیت ان سے ہوتی ہی نہیں انبیاء علیہم السلام سب ہی ایسے ہوئے ہیں۔ اولیاء میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مراد کہتے ہیں اور ایک ہوتے ہیں مرید جو کہ مجاہدہ کے معامی سے محفوظ رہتے ہیں۔ بعض اولیاء کو یہ مرتبہ دیا ہے۔ یعنی مرادیت کا، ان کے ارادوں کے اسباب بعد منہدم کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان سے معصیت سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ایسے اولیاء کو محفوظ کہتے ہیں اور انبیاء کو معصوم۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء سے تو معامی صادر ہوئے ہیں پھر معصوم ہونے کا حکم کیسے کیا گیا۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارہ میں ہے عصی آدم ربہ کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عصی کے معنی مجازی مراد ہیں یعنی خطائے اجتہادی۔ جیسا اپنے موقع میں ثابت ہو چکا ہے۔ اور خطائے اجتہادی میں تو ایک گنا ثواب ملتا ہے۔ پس وہ صورت خطا ہے ورنہ واقع میں طاعت ہے کیونکہ ثواب مخصوص ہے طاعت کے ساتھ۔ پس انبیاء علیہم السلام کی غرضیں حقیقت میں طاعات ہی ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ عقوبت کا کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ اس وقت اس تحقیق کا زیادہ موقع نہیں۔

اس وقت رنجہ فقط اتنا بتانا ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی بندہ کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ہو کہ اس کو گناہ کرنے ہی نہ دیں مگر یہ نہیں ہو سکتا

کہ باوجود گناہ کرنے کے محبت باقی رہے۔ اسی واسطے میں نے اپنی تقریر میں ایسی کی قید لگائی۔ بہت لوگوں کو یہ ناز ہے کہ ہم کچھ ہی گناہ کر لیں کچھ ہو گا کیونکہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں۔ مگر یہ خیال محض باطل ہے۔ یہ عقیدہ یہود و اور نصاریٰ کا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے ایسی محبت نہیں کہ معاصی کرنے پر بھی وہ باقی رہے۔ نہ ایسا بغض ہے کہ طاعت سے بھی قدر نہ ہو۔

جیسے انسان کا حال ہے کہ کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ جو کچھ بھی کرے سب معاف اور یا بغض ہو جاتا ہے تو وہ جو کیسی ہی طاعت کرے مگر قبول ہی نہیں۔ جیسے کسی حاکم کو کسی کی ذات سے بغض ہو جاتا ہے تو وہ اُس کو قید ہی کرنا چاہتا ہے۔ وکلاء و بیرسٹرو وغیرہ سب کے سب رہ جاتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی سے ذاتی نفرت ہوتی ہے اُس کے ہزار کمالات بھی بے اثر ہو جاتے ہیں بلکہ عیوب نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک بزرگ تھے۔ اچھے اچھے لوگ اُن کے معتقد تھے مگر بی بی اُن کی نہایت نالائق تھی۔ وہ اُن کی معتقد نہ تھی بلکہ ایذا میں دیتی تھی۔ ہمیشہ اُن سے لڑتی رہتی تھی۔ اُن کے خوارق اور کرامات کو بھی دیکھتی تھی مگر اس کا اعتقاد ہی اُن پر نہ ہوتا تھا۔ ایک روز وہ بزرگ قصداً ہوا میں اڑے اور اپنے گھر کے اوپر سے گزرے تاکہ بی بی دیکھے اور ایذا دینا چھوڑ دے۔ مستورات نے جو اُن کے گھر میں جمع تھیں دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی ابدال معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی بی بی نے بھی کہا کہ واقعی ابدال ہی ہیں۔ جب وہ گھر میں آئے تو بی بی نے

اللہ اکبر! آج ہم نے عجیب بات دیکھی جو کبھی نہ دیکھی نہ سنی۔ ایک بزرگ
 وائیں اڑ رہے تھے۔ بڑے صاحب کمال تھے۔ اُن بزرگ نے کہا کہ بی بی
 نے پہچانا بھی۔ کہا نہیں۔ فرمایا وہ میں ہی تھا۔ تو وہ کہتی ہے کہ میں جب ہی
 بڑھے اڑ رہے تھے۔ اُس بی بی کو اُن کی ذات سے بغض تھا۔ اس لئے
 وجود ایسا کمال دیکھنے کے بھی اُن کی معتقد نہ ہوئی۔

بات یہ ہے کہ انسان جس کے متعلق کوئی رائے اچھی بُری قائم کر لیتا
 ہے تو گو اُس کو کیسی ہی دلیل اُس کے خلاف کی ملے مگر یہی چاہتا ہے اپنی
 رائے نہ بدلے۔ سو خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ کوئی ہزار
 برس بھی اطاعت کرے اور بغض ذاتی کی وجہ سے اُن کے نزدیک اُس کی
 بددین نہ ہو یا کوئی گناہ کیا کرے اور محب ذاتی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہیں۔ ہاں
 یہ بات ضرور ہے کہ کسی کی طاعت سے نہ اُن کا ذرہ برابر نفع نہ کسی کی
 عصیت سے اُن کا کچھ ضرر۔ وہاں تو یہ کیفیت ہے۔

بہر کہ خواہد گو بسیا و ہر کہ خواہد گو برو

دار و گیر و حاجب درباں دریں درگاہ نیست

حق سبحانہ تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہی معنی ہیں نہ وہ معنی جس کو عوام سمجھتے
 ہیں کہ نعوذ باللہ نہ کسی بات کا انتظام ہے نہ کسی کے آرام و تکلیف کی پروا ہے
 جس کو چاہا بدو نہ کسی حکمت کے نتیجہ کر دیا، جس کو چاہا مصیبت میں ڈال دیا
 جسے چاہا بیمار کر دیا۔ جب کوئی یتیم ہو جائے یا غریب ہو جائے یا مصیبت
 میں پڑ جائے تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ خدا کی ذات بے پروا ہے یعنی

کسی کے نفع و ضرر کی کوئی رعایت نہیں۔ ایسے موقع پر یہ کلمہ بہت ہی سحر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں آتا نہ کسی کی مصلحت کی خاطر کہتے ہیں۔ لوگ بدذات حال یہ چاہتے ہیں کہ جو مصلحت کسی واقعہ میں ہم سمجھیں، خدا تعالیٰ بھی نعوذ باللہ اسی کے موافق معاملہ فرماویں۔ اگرچہ یہ عقیدہ غلط ہے مگر اقوال سے تو یہی مفہوم ہوتا۔ بڑے بڑے اس میں مبتلا ہیں۔

یہ جو بیماری آج کل ہوئی تھی۔ اس میں کیسے کیسے کلمات لوگوں نے کہے ہیں۔ کفر تک بکا ہے۔ بیماری ہوئی تھی اس میں بہت جگہ ایسا ہوا کہ یہ یقین نہ رہ گئے۔ گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ بی بی بیوہ ہو گئی تو لوگ کہتے تھے کہ بس اللہ میاں کے یہاں نعوذ باللہ کوئی قاعدہ نہیں۔ اندھا دھند معاملہ ہے کسی کی پرواہ ہی نہیں۔ بڑی بڑی شکایتیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی، اس سے تو کہنا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہ معنی نہیں جو مذکور ہوئے بلکہ معنی ہیں کہ کسی کی طاعت سے اُن کو نفع نہیں اور کسی کے کفر و معصیت سے اُن کا ضرر نہیں۔ چنانچہ اسی معنی کو صریحاً فرماتے ہیں۔

ان تکفروا فان الله غنى
یعنی اگر تم کفر کرو تو اللہ تم

عنکم سے غنی ہے۔

یعنی اُس کا کچھ بھی ضرر نہیں جیسے سلاطین دنیا کو رعایا کے بگڑنے سے ضرر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کسی بادشاہ کی رعایا اُس سے باغی ہو جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اُس کا تخت و تاج باقی نہیں رہتا۔ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ اس کا احتمال حق تعالیٰ میں نہیں ہے۔ اگر تمام آسمان و زمین

لے باغی ہو جاویں تو وہاں ذرہ برابر بھی ضرر نہیں اور یہ بھی نہیں کہ کوئی ہزار
س تک معاہدی کرتا رہے پھر رجوع کرے اور توبہ کرے تو قبول نہ ہو۔
انچہ ارشاد بالا کے بعد ہی یہ بھی ارشاد ہے۔ وان تشکروا یبڑکھ

شیطان سے رعایت | چنانچہ میں ایک روایت سیر کی نقل کرتا
ہوں۔ سیر کی روایت بطور تائید کے بیان
دی جاوے تو مضائقہ نہیں۔ جب کہ وہ لفظوں سے متاثر ہوا اس روایت
میں معلوم ہوگا کہ شیطان کو بھی جو سب سے اعلیٰ درجہ کا نافرمان ہے حق
الی نے توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا۔

وہ روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ سے
مناجات کے لئے تشریف لے جا رہے تھے کہ شیطان ملا اور آپ سے
کہا کہ میری بھی ایک درخواست ہے۔ میں بہت گنہگار ہوں۔ میرے
میں بھی حق تعالیٰ سے دو کلمہ کہہ دیجئے گا۔ انبیاء علیہم السلام بڑے شفیق ہوتے
تھے۔ اس کے اس کہنے پر آپ کو رحمت کا جوش ہوا اور آپ نے وعدہ
فرمایا۔ عرض خدا تعالیٰ سے مناجات ہوئی۔ آپ شیطان کا پیام بھول گئے
حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کسی بندہ سے وعدہ کیے بھول گئے۔ آپ کو
واگیا اور آپ نے شیطان کے پاس میں عرض کیا۔ اس پر ارشاد ہوا کہ
میں سے کہہ دینا کہ ہمارا تمہارا جس بات پر بگاڑ ہوا ہے وہی اب بھی ہے
و آدم اس وقت موجود نہیں مگر ان کی قبر موجود ہے۔ ان کی قبر کو سجدہ کر لے

بس سب معاف ہے۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ یہ تو بڑا مستانغوب
اس میں اُس کا کیا حرج ہے۔ اچھا ہو کہ وہ ایسا کرے تو دنیا سے سارا فساد
مٹ جاوے۔ غرض آپ واپس تشریف لائے اور شیطان ملا تو آپ
نے فرمایا تو بڑا خوش قسمت ہے۔ وہاں سے عجیب و غریب جواب
سے۔ اُس نے کہا بتلائیے تو سہی۔ آپ نے جو جواب ارشاد ہوا
سے کہہ دیا۔ اُس نے کہا سبحان اللہ! اچھا پیام لائے۔ جب میں نے
کو اُن کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا تو اب مرنے کے بعد تو ضرور کروں گا۔ کم
خجیث ملعون نے یہ جواب دیا۔

شیطان کی خود ہی حالت ایسی ہے کہ اُسان سے اُسان فسخ
کم بخت کو بتلایا تو اُس سے نہ ہو سکا۔ جب خناس دماغ میں گھسا ہوا
عمل کون کرے لیکن اگر وہ بھی توبہ کرے تو اُس کو بھی روک ٹوک نہیں
کم بخت کیوں کرنے لگا۔ اُس کی قسمت ہی میں نہیں۔
آگے راز قدر کا ہے اس میں خوش نہ کرنا چاہئے۔ غرض جب شہ
کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے تو پھر اور کون رہ گیا۔ حق تعالیٰ بعد فرست
کیا رے کے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ لِعَمَلِهِ

الْقِيمَةُ وَيُجْلَدُ فِيهِ مِثْلَ مَا لَا يَمُنْ تَابَ - الخ

اس آیت میں کسی کو توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جب تک مغرب کے
آفتاب نہ نکلے اس وقت تک یہی قانون ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہے

کوئی بھی ہو۔ غرض قانون عام ہے گواہوں کا زمانہ محدود ہے۔
 خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے بھی حُب ذاتی اور بغض ذاتی نہیں
 کفار سے بھی اُن کی ذات کی وجہ سے بغض نہیں بلکہ اُن کے افعال سے بغض
 ہے جس میں کفر سب سے اشد ہے۔ اور دوسرے افعال بھی موجب
 بغض ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ افعال
 مبعوض ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان افعال

احتیاط کی ضرورت

کی وجہ سے خدا تعالیٰ کو کفار سے بغض ہے تو ان سے ہمیں بھی بچنا چاہئے
 ایک تو اس وجہ سے کہ وہ افعال مبعوض ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ ہم مکلف
 ہیں فروع کے۔ اس لئے ہمارے حق میں اُن کا قبح زیادہ شدید ہو گا۔ اس لئے
 ہم کو اور بھی زیادہ بچنا چاہئے۔ یہ تو تمہید تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بغض اور
 حُب کا مدار افعال و صفات پر ہے نہ ذات پر۔

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کفار کا
 ایک مقولہ بیان فرماتے ہیں جس کو وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے۔ وہ
 مقولہ یہ ہے اِی الْمُرَاقِبِینَ خَیْرَ مَقَامًا وَاَحْسَنَ مَدِیْنًا یعنی جو مراقبہ کی
 آیتیں کھلی کھلی ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ کفار ایمان والوں
 سے یوں کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے کونسا فوق بہتر ہے۔ مکان میں اور
 اچھا ہے محفل میں۔ واذا تتلى عليهم میں خصم کی ضمیر ظاہر ان کفار کی
 طرف عائد ہے مگر تخصیص کی بناء پر بلکہ تبلیغ عام کے وقت وہ تلاوت

ان لوگوں کے سامنے بھی ہو جاتی تھی۔

تخصیص کی نفی اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ خاص ان کا کوئی جلسہ

کر کے اُس میں تلاوت ہوتی ہو۔ گو کفار نے جدا جلسہ چاہا تھا۔ اور حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں اگر ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کو نہیں

مگر ہماری مجلس غریبہ سے علیحدہ کر دیجئے۔ ہم ان میں بیٹھنا نہیں چاہتے کیونکہ

یہ ذلیل لوگ ہیں اور ہم رؤسا ہیں۔ ان میں بیٹھ کر ہماری عزت کو بٹھ گتا ہے

ہماری امانت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حجّت کی غرض

سے اس کا کچھ خفیف سا خیال بھی کیا تھا تا کہ ان کے پاس پھر کوئی عذر نہ

رہے اور شاید ہدایت ہی ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ

وَجْهَهُمْ عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمِنْ حِسَابِكَ

عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ۔

اور مت دُور کر و ان کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام

چاہتے ہیں رضا مندی اُن کی۔ تم پر نہیں اُن کے حساب میں سے

کچھ اور نہ تمہارے حساب سے اُن پر کچھ تم اگر اُن کو دُور کر دو

پھر ہو جاؤ گے تم بے انصافوں میں سے۔

ایک جگہ اسی کے قریب المعنی یہ آیت ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ

يُرِيدُونَ وَجْهَهُمْ وَلَا تَعْدُ عَيْنُکَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ

الدنيا ولا تطعم من اغفلنا قلبه عن ذكرنا ما تبع هواه و
كان امره فوطا۔

اور روک رکھو اپنی ذات کو اُن کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے
رب کو صبح و شام۔ طالب ہیں اُن کی رضا مندی کے اور نہ ہمیں
تمہاری آنکھیں اُن کو چھوڑ کر تلاش میں رونق دنیا کی زندگی کی اور نہ
کہا مانو اُن کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیڑی
کی اُن نے اپنی خواہش کی اور ہے اُن کا کام حد سے نکلا ہوا
یہ تدریج مستقل جملہ نہیں ہے کہ جس سے لازم آوے کہ آپ سے اس کا دینی
ارادہ زہدیت دنیا کا، حد و رنجی ہوا ہو بلکہ نہی کے تحت میں ہے۔ اور ترکیب
میں حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں جس کا منشا اور
سبب ارادہ حیات دنیا کا ہوتا۔ اُن گے صاف صاف فرما دیا۔

فمن شار فليؤمن ومن شاد
فليکفر۔ کہ جس کے جی میں اُسے ایمان
لائے جس کے جی میں اُسے

کفر کرے۔

آپ کو کچھ خوشامد نہیں پڑی۔ عرض آپ کو منع فرما دیا کہ کوئی خاص جلیبہ
ان نجیثوں کے لئے نہ کیا جاوے۔ ان کو سود و فخر و غرض پر پڑے آئیں، اور نہ
جائیں جہنم میں۔

مقام طالب و مطلوب | امام مالک سے خلیفہ نے درخواست
کی تھی کہ شہزادوں کے واسطے حدیث

سنانے کا جلسہ علیحدہ کر دیا جاوے کیونکہ عام جلسہ میں پڑھنا اُن کے لئے
ہے۔ آپ نے اس کو منظور نہیں کیا۔ خلیفہ نے پہلے اُن سے یہ فرمائش کی
کہ آپ شہزادوں کو مکان پر آکر درس دیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ علم مطلوب
ہے طالب نہیں۔ خلیفہ سمجھ دار تھے اور نبوت کا زمانہ بھی قریب تھا۔
لئے فوراً سمجھ گئے اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام کے مکان پر جا کر جلسہ
عام میں بیٹھا کریں۔

یہ تو تتلی علیہم کے متعلق تحقیق تھی۔ اس کے بعد آیت میں بین
کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھلی کھلی آیتیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل مسئلہ
بھی کھلے ہوئے ہیں بلکہ ظاہر مقصود یعنی عبارة النص بالکل کھلا ہوا ہے۔ اس میں
اغلاق نہیں۔ باقی دلالت النص اور اشارة النص اور اقتضاء النص وہ کھلے ہوئے ہیں
کہ ہر کوئی اُن کو سمجھ لے چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے

وَإِذَا جَاءَهُمْ مِنْ أَمْرٍ أَوْ أَمْنٍ أَوْ خَوْفٍ أَوْ عَوَابَةٍ

رَدُّهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلَّهُمْ

الَّذِينَ لَيْسَتْ بَطُونُهُ مِنْهُمْ

اس میں منافقین کی شکایت ہے کہ جب کوئی خبر امن کی یا خوف کی
آتی ہے اُن کو پھیلا دیتے ہیں۔ جب معمولی خبروں کی حقیقت سمجھنے میں تو
استنباط شرط ہے تو اور امور علمیہ تو جدار ہے۔ لہٰذا ظاہری مدلول کھلا ہوا ہے
ہی۔

غرض کفار اہل ایمان کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ دیکھو گھر کس کا اچھا ہے

بیٹھک کس کی اچھی ہے یعنی اپنی زیب و زینت سے مسلمانوں پر کفار فخر کرتے تھے اور مقصود اُن کا یہ تھا کہ اگر ہم بُرے ہوتے تو ہم سے خدا تعالیٰ کو بغض ہوتا اور جب بغض ہوتا تو نہ ایسا اچھا گھر دیتے نہ بیٹھک دیتے، نہ مال دیتے، نہ اولاد دیتے۔

غالباً انہوں نے کسی پچانسی کے مجرم کو نہ دیکھا ہو گا کہ اُس کی کسی خاطر کی جاتی ہے مگر آج کل تو سب جانتے ہیں کہ پچانسی والے کی بڑی خاطر کی جاتی ہے۔ اُس سے کہتے ہیں کسی چیز کو دل چاہتا ہو تو بتلا دو۔ اگر وہ کہے فلاں چیز کو دل چاہتا ہے تو اُس کے لئے وہ چیز موجود کی جاتی ہے۔ اُس سے پوچھتے ہیں کہ کسی سے ملو گے۔ اگر کہے تو ملاتے بھی ہیں۔ تو اس وقت سب جانتے ہیں کہ اس کی کسی خاطر کی جاتی ہے مگر نتیجہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ اب اگر وہ پچانسی والا اُس منتظر کو دیکھ کر یوں سمجھے کہ میں حاکم کا بڑا محبوب ہوں اور یہ خیال کرے کہ رُوسا کو ابھی چاہئے تک بھی نہیں دی گئی اور میری یہ خاطر ہو رہی ہے تو یہ اس کی کتنی بڑی حماقت ہے۔

قاعدہ یہی ہے کہ جتنا سنگین مقدمہ ہوتا ہے اُسی قدر کفار کی غلط فہمی مجرم کو مہلت دی جاتی ہے۔ تو شرک و کفر سے

بڑھ کر کون سا جرم ہو گا۔ اس لئے اُس میں مہلت بھی اچھی دی گئی۔ پس کفار کا یہ استدلال کتنا باطل تھا کہ ہم خوشحال ہیں۔ ہمارے گھر اچھے ہیں۔ ہماری نشست گاہ عمدہ ہے۔ اس لئے ہم خدا کے محبوب ہیں۔ اور تمہارے پاس کیا ہے۔ روٹی بھی پیٹ پھر کر نہیں ملتی۔ ہمارا خوشحال ہونا دلیل ہے اس

امر کی کہ ہم حق پر ہیں۔

اس دلیل کی ایسی مثال ہے جیسے ایک سرحدی دیہاتی ہندوستان آیا تھا۔ ایک دکان پر اس نے حلوار کھا دیکھا۔ کھانے کو جی چاہا۔ پاس کچھ تھا نہیں۔ تو آپ نے کیا کیا کہ حلوار مٹھی میں بھر کر وہاں سے بھاگے۔ حلوائی پیچھے پیچھے دوڑا۔ جب دیکھا کہ یہ تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتا، تو آپ سارا حلوار منہ میں رکھ گئے اور کہا جاؤ، یہ حلوار نہ تمہارا رہا نہ ہمارا۔ کیونکہ خان نے اپنی منشاء کے موافق لطف کے ساتھ کھا یا ہی نہ تھا۔ حلوائی آپ کو حاکم کے پاس لے گیا۔ حاکم نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کو ایک گدھے پر سوار کرو اور لڑکوں کی فوج پیچھے تالیاں بجاتی جائے۔ اس طرح شہر سے باہر کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کوئی لڑکا دف بجارہا تھا۔ کوئی تالیاں پیٹ رہا تھا۔ عرض اس ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے اور اپنے ملک میں پہنچے۔ وہاں لوگوں نے پوچھا، "آغا ہندوستان رفتہ بودی۔ چہ طور یافتی؟"

تو آپ کہتے ہیں، "بابا! ہندوستان خوب ملک است۔ حلوہ خوردن مفت است۔ فوج طفلان مفت است۔ سوارہی نثر مفت است۔ ہندوستان خوب ملک است۔"

یعنی ہندوستان میں مجھ کو دوا ہوا بنا یا گیا۔ پیچھے پیچھے باجا بجاتا چلا آتا تھا۔ دودھ تک گدھے کی سواری ملی۔ سبحان اللہ! کیا آپ کا مذاق تھا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ دنیا کا سامان نافرمان کے لئے ایسی ہی سزا ہے، جیسی خان کی سزا تھی۔ مگر وہ اس کو سزا نہیں سمجھتے اور اس کا سزا ہونا کچھ

آخرت ہی پر موقوف نہیں۔ وہاں تو سزا ہو ہی گی۔ اس ساز و سامان کا سزا
 ہونا فہم سلیم کو دنیا ہی میں محسوس ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔
 انما یزید اللہ لیبذیہم کہ اللہ تعالیٰ یہی ارادہ کرتا ہے
 بہا فی الحیوۃ الدنیا۔ کہ اُن کو مال و دولت سے

دنیا میں (بھی) عذاب دے۔

اس ارشاد میں اس کی تحقیق زیادہ نہیں فرمائی کہ وہ عذاب کیا ہے
 کیونکہ ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کا ساز و سامان بظاہر سامان
 راحت تو ہے مگر اُن کو اس سے راحت نہیں۔

کیونکہ تا فرمان لوگ ہمیشہ دھماکی
 پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر

دولت اور کفار کی خصالت

مال میں نقصان ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگر چور لے گئے تو کیا ہوگا اور یہ ہوگا تو کیا
 ہوگا اور وہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ دن رات اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا ہیں۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

اولاد نہیں ہوتی تو اُمس کی فکر میں ہیں اور اگر ہو گئی تو بھی فکر سوار ہے
 کہ جانے زندہ رہے گی یا نہیں۔ غرض ہر وقت تردد میں ہیں۔ دن رات
 مال و اولاد کی فکر میں پریشان ہیں۔

ایک رئیس تھے۔ اُن کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا۔ مدت کے بعد
 اولاد ہوئی تو یہ غم سوار ہوا کہ دیکھئے زندہ بھی رہے گی یا نہیں۔ یہاں تک
 کہ اُن کی شادی بھی کر دیں۔ پھر یہ غم سوار ہوا کہ اولاد کے بھی اولاد ہوتی

ہے یا نہیں۔ بیچارے ہر وقت غم و پریشانی میں رہتے تھے۔

یہی وہ عذاب ہے جو اہل دنیا پر دنیا میں مسلط کیا جاتا ہے۔ غرض

وہاں بھی عذاب اور یہاں بھی عذاب۔ اگر صرف وہاں ہی ہوتا وہ بھی بہت کافی تھا چہ جائیکہ دونوں جگہ ہو۔ بخلاف ^{اللہ کے} کہ وہ عذاب سے آخرت میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ بری ہیں اور دنیا میں بھی۔ اُن کو یہ فکر ہی نہیں ہوتی کہ مال ہوگا تو کیا ہوگا اور نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ اولاد نہ ہوگی تو کیا ہوگا اور ہوگی تو کیا ہوگا میر جائے گی تو کیا ہوگا۔ جو حالت پیش آئے اُن کے نزدیک سب یکساں ہے۔

یہ مسلم ہے کہ سامانِ کلفت سے فی نفسہ کلفت ہوا کرتی ہے۔ مگر وہاں ایک عارض ہے جس کے سبب اُن کو کلفت نہیں پہنچتی۔ وہ عارض کیا ہے محبت حق۔ چونکہ اُن کو محبت ہے خدا تعالیٰ سے اس لئے جو سبب بھی کلفت کا پیش آتا ہے وہ اُن کے حق میں عین راحت ہوتا ہے محبت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے وہ راحت ہی ہوتی ہے۔ عشق مجازی میں اس کا تجربہ کر لیجئے کہ عشاق کو محبوب کی طرف سے کتنی کلفتیں پہنچتی ہیں مگر وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

غرض کفار استدلال کرتے تھے کہ ہماری حالت اچھی ہے۔ اگر ہم بڑے ہوتے تو ہمیں یہ چیزیں کیوں دی جائیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہاں کے اچھے ہونے سے کیا استدلال ہو سکتا ہے۔ جیسا ابھی بیان ہوا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اموال دنیا پر فخر کرنا کفار کی خصلت ہے چنانچہ

پہلے تو خدا تعالیٰ نے کفار کا قول نقل کیا۔ اُن کے اُس کار و بار ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَا أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مَن
قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِثًا قَرْنٌ هَلَكَ كَرِثًا
اور مشطریں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔

یعنی اُن کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی۔ مال و اسباب بھی بہت تھا۔ اچھے اچھے مکانات تھے، نشست گاہیں نہایت آراستہ و پیراستہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ زیب و زینت کی چیزیں اُن کے پاس بہت تھیں، مگر پھر بھی معذب ہوئے۔ تو ان میں بھی یہی دو مرض تھے حُبِ مال و حُبِ جاہ۔

افسوس ہے کہ آج کل اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے کہ مال کی بھی محبت ہے اور

حُبِ مال کے اثرات

جاہ کی بھی۔ میرا مقصود اس کی مذمت سے اس وقت اس پر تنبیہ کرنا ہے۔ کہ کفار کی خصالت مسلمانوں میں نہ ہونا چاہئے۔ اور یہاں گو چند علمی مضامین بھی قابل بیان ہیں مگر اس وقت وہ بیان سے مقصود نہیں۔ کیونکہ مجمع مستورات کا ہے علمی مضامین کو وہ کیا سمجھ سکتی ہیں۔ اس لئے سہل سہل مضامین بیان کر رہا ہوں۔

غرض اس آیت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نہ برتنے کی چیزیں قابلِ فخر ہیں نہ زینت کی چیزیں قابلِ فخر ہیں مگر عورتوں کو تو دن رات یہی فکر ہے کہ چیزیں جمع کر لیں جو کہ مال ہے اور اُس سے جاہ پیدا کریں۔ اور چونکہ یہ

دو بڑے مرض ہیں اس لئے ان کا علاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے
اور امراض مختلفہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کسی کا مال مارتا ہے تو وہ سب سے
مال کی وجہ سے۔ اگر حسبِ مال نہ ہو تو کیوں ایسا کرے گا۔ غیبت اسی
سے کرتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے جو کہ جاہ سے
غصہ کو جب ہی جاری کرتا ہے جب اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر خیال
کرتا ہے۔ جو کہ جاہ اور تکبر ہے۔ اور یہ تکبر ایسی بڑی خصلت ہے کہ اس
سے اور بہت سی بُری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان میں یہی تو تھا۔ اسی لئے
یہ کہا تھا۔

خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَ
مِنْ طِينٍ۔ کہ تو نے مجھ کو آگ سے
پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

میں بڑا ہوں یہ چھوٹا ہے۔ لوگو! تم جو بڑا بننا چاہتے ہو تو ذرا اپنی
حقیقت کو تو دیکھو۔

ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص اکڑتا ہوا گزرا۔ اُنہوں نے اُس
کو نصیحت کی۔ اُس نے کہا تم مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں۔ وہ بزرگ
بولے، اہل جانتا ہوں۔

اُولَٰئِكَ نَظَفَةُ مَذَٰہِہٖ وَاٰخِرُکَ حَیْفَةُ قَدْسِہٖ وَاٰنْتَ بَیِّنٌ
ذٰلَکَ تَحْمِلُ الْعِزَّةَ۔

یعنی اول تو ایک نطفہ ناپاک تھا اور اخیر میں سڑا ہوا مُروار
ہو جاوے گا۔ اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تیرے اندر پاخانہ

بھرا ہے۔

ہماری عجب حالت ہے۔ اگر ہمارے پیٹ میں سوراخ ہوتا۔ جس سے ہر وقت پاخانہ بہتا یا اُس میں سے ہر وقت بد بو آیا کرتی تو کوئی ہمیں اپنے پاس بھی نہ بیٹھنے دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسا چھپا دیا ہے کہ دوسرے کا ذہن بھی نجاست تک نہیں جاتا۔ ورنہ ہماری کیا گت ہوتی۔ اگر ہم بیٹھ کر اپنی اس حالت کو سوچ لیا کریں کہ ہمارے اندر پاخانہ بھرا ہوا ہے تو یہ بھی پورا علاج ہے تکبر کا۔ میں کہتا ہوں کہ جو شخص تکبر میں مبتلا ہو، وہ پاخانہ میں بیٹھ کر ذرا اپنی حالت پر غور کر لیا کرے کہ میرے اندر سے کیسی چیز اور کس طرح نکل رہی ہے۔ اگر اسی کا مراقبہ کر لیا کرے تو کافی ہے بعض لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں کہ تم ہمیں نہیں سمجانتے۔ ایسے لوگوں کا جواب یہی ہے جو ان بزرگ تے دیا تھا۔

اسی بیماری میں دیکھئے کیا کیا حالتیں ہوتیں۔ ایک دن کی بیماری میں آدمی ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو اپنے حسن و جمال پر ناز ہو اور چپک نکل آئے تو اُس سے پوچھئے کہ اب کہاں گیا وہ حسن و جمال اور کمال۔ بعض عالموں کو دیکھا گیا کہ علوم کے ماہر تھے۔ ان کو ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ الحمد للہ یاد نہ رہی۔ انسان کس کمال پر فک کرے۔

مال اور فخر | مال پر فخر کرنا تو بڑی ہی بیوقوفی ہے۔ کیونکہ اور کمالات کو تو انسان سے من و وجہ طلبیں بھی ہے جیسے علم، شجاعت اور سخاوت، مال میں یہ بھی نہیں۔ مال کو انسان کے ساتھ صرف اضافت کا تعلق ہے

کہ یہ فلاں کا مال ہے۔ اضافت پر کیا فخر اگر کہیں چور آگیا اور سب جمع ہو کر
 لے گیا تو بس مضاف الیہ ہی مضاف الیہ رہ گئے۔ مضاف ہو تھا وہ نکل گیا
 تھا نہ بھولن میں ایک بی بی تھیں۔ کچھ اثاثہ پاس تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا
 اُس کی شادی کے واسطے خوب سامان کیا۔ اُن کو خرافات میں خرچ کر کے
 سے منع بھی کیا گیا تو بڑیں، واہ ایک ہی تو بیٹا ہے۔ ارمان تو نکال لوں
 ہر چند منع کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ عرض خوب شیخ چلی کا سا گھر بنا یا کہ اگر خرچ
 جاوے گا تو کیا ہوا۔ جہیز میں اتنا آوے گا نیوتن میں اتنا۔ اتنا فلاں کا دوں
 اور اتنا فلاں نے کا۔ پھر اتنا پرج جاوے گا۔ عرض خوب جمع کر کے رکھا۔ چور
 تاک لگا رہے تھے۔ بس سب کا سب ایک ہی رات میں اٹھا کر لے گئے
 جب یہ حالت ہے مال کی اس پر فخر کرنا حماقت ہے۔ جو چیزیں فخر کی ہیں
 مثلاً علم وغیرہ اُس پر بھی فخر نہ چاہئے۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے کو نہیں نکلتا۔ اپنے آپ کو خدا جیسا
 کیا سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی اونچا نہیں۔ بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں
 اسی طرح لوگوں نے دنیا میں اپنے سے بڑوں کو نہیں دیکھا۔ اس لئے تکبر
 کرتے ہیں۔ اپنے سے بڑوں کو دیکھیں تو حقیقت معلوم ہو جائے۔ جب
 اپنے سے بڑے بڑے بھی دنیا میں موجود ہیں تو پھر فخر کی کہاں گنجائش ہے
 ہاں اپنے سے بڑا کوئی نہ ہوتا تو کچھ گنجائش بھی تھی فخر کی۔
 بوستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چودہری تھا جو
 کی عزت و توقیر گاؤں میں بہت زیادہ تھی۔ وہ اتفاق سے ایک جگہ پہنچا

یہاں شاہی لشکر پڑا تھا۔ مٹھی، گھوڑے، حشم، خدم، نقیب، چوبدار ہزاروں
 تعداد میں سب ہی کچھ تھا۔ چودھری یہ حال دیکھ کر کانپنے لگا۔ اُس کا لڑکا
 اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا، ابا جان! آپ بھی تو چودھری ہیں اور
 ایسے بڑے ہیں اور ایسے ہیں۔ آپ کی یہ حالت کیوں ہے۔ آپ کے پس
 ہی تو حشم خدم ہیں۔ اُس نے کہا، بیٹا میں چودھری اسی وقت تک ہوں جب
 یہاں قدم نہیں رکھا۔ میں تو گاؤں تک چودھری ہوں۔ یہاں میری کچھ بھی
 سستی نہیں۔

اسی طرح گولہ کا کیرا جب تک گولہ کے اندر سے یوں سمجھتا ہے کہ
 میں بڑی سلطنت کا مالک ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون ہوگا۔ مگر جب گولہ کا
 ہیٹ پھوٹا تو اپنی حقیقت کھلی۔ اسی کو کہتے ہیں۔

چوآن کیسے کہ درنگ نہایت زمین و آسمان سے ہماں ست
 شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید غل شد چو دریا سے پہنا بدید
 یعنی پانی کا ایک قطرہ اوپر سے ابر میں سے چلا اور اپنے کو سمجھ رہا
 تھا انا کذا و انا کذا کہ میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں۔ مدد ہوں یعنی حسین و جمیل
 ہوں۔ منوڈ ہوں یعنی چمک دمک رکھتا ہوں میطر ہوں۔ غرض اپنی صفات
 ہمال پر ناز کر رہا تھا۔ جب نیچے آیا اور دریا کو دیکھا تو سب پر ڈالی ٹکلی گئی
 فرماتے ہیں۔

غل شد چو دریا سے پہنا بدید

آگے نجدت میں وہی قطرہ کہتا ہے ۔

کہ جائیکہ دریا ست من کیستم گراوہست حقا کہ من کیستم

اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کی طرف نظر کی جائے
مستی اور غشی کا تفاوت معلوم ہو جاوے۔ اسی کو آگے کہتے ہیں ۔

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتر اند کہ باہستیش نام ہستی برند
عارف نظامی فرماتے ہیں ۔

پناہ پلندہی و ہستی توئی ہمہ نیستند آنچه ہستی توئی

یوستان میں ایک اور حکایت لکھی ہے۔ جگنو سے کسی نے پوچھا
کہ یار تم رات میں تو نظر آتے ہو۔ دن میں کہاں رہتے ہو۔ تو انھوں نے جواب
دیا ۔

کہ من روز شب جز بصر انیم دے پیش خورشید پیدا نیم

کہ میں دن رات صحرا ہی میں رہتا ہوں۔ میں کہیں چلا نہیں جاتا

لگہ آفتاب کے سامنے مرٹ جاتا ہوں۔

خدا جانتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی عظمت منکشف ہو جائے یعنی اپنی

استعداد کے موافق، ورنہ ہم کیا سمجھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت کو، تو نہ اپنے

علم پر نظر رہے نہ اور کسی چیز پر، نہ کوئی اپنے کو میر صاحب کہیں، نہ ڈیر

صاحب کہیں۔ یہ حالت ہو جاوے کہ سب کچھ بھول جاویں۔

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے وجود کو وجود حقیقی بنا رکھا ہے اور

خدا کا ہوائی۔ اسی لئے ہمیں بڑائی سوچتی ہے۔ پس اصل ہر حق اپنے کو بڑا

سمجھنا ہے اور اس کی اصل ہے خدا کو بڑا نہ سمجھنا۔ ساری خرابی اسی کی ہے پس اس کا علاج کرو۔

عورتوں کا مذاق | نیز اس سے ایک اور مرض بھی پیدا ہوتا ہے یعنی زیب و زینت کا خیال۔ چنانچہ زینت میں عورتوں کا مذاق یہ ہے کہ خوب زینت کرنا چاہئے۔ کوئی جہان آجائے تو بڑے بڑے سامان ہوتے ہیں۔ خاصداں جو جہان کے سامنے ایک دفعہ گیا تھا، دوسری دفعہ پان اس میں نہیں جانا چاہئے۔ بلکہ دوسرا خاصداں ہونا چاہئے صرف یہ بات ظاہر کرنے کے لئے کہ ہمارے یہاں خاصداں اور بھی ہے پھر ایک دفعہ تانبے کا ہو تو دوسری بار کوٹ کا ہو۔ اسی طرح اور چیزوں میں اندازہ کر لیجئے۔ روزانہ تو گھر کوڑے سے بھرا پڑا رہتا ہے۔ جہان آیا تو عاف کیا۔ غرض ہر بات میں دکھلا واسی ہے۔ اُن کا تو مذہب یہ ہے کہ کوئی یوں نہ کہے کہ ایسے ہیں اور ویسے ہیں۔ اور کوئی سے اُن کی مراد مخلوق ہی ہوتی ہے۔ کاش! اللہ تعالیٰ کو بھی اس عموم میں داخل کیا جاتا کہ اُن کے ناخوش ہونے کا بھی خیال ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین سے دنیا بھاری ہے اس لئے اس کی زیادہ رعایت کی جاتی ہے سو بالکل غلط۔ دنیا کیا بھاری ہوتی۔ دنیا ہے کیا چیز۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ! کھانا پینا، گناہ موتنا۔ بس اتنی ہی تو حقیقت ہے دنیا کی۔ یہ امیر کو بھی حاصل ہے اور غریب کو بھی۔ ہاں اگر پانچ روپیہ والے کی خوراک پانچ چھٹانک ہے اور پانچ ہزار والے کی پانچ ہزار

چھٹانک ہوتی تو کہہ سکتے تھے کہ امیر ہونے میں بڑا فائدہ ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہاں اتنا فرق بے شک ہے کہ یہ پانچ چھٹانک سوکھ کھاتا ہے اور وہ تو۔ بلکہ امیر صاحب تو پانچ چھٹانک کھا بھی نہیں سکتا وہ تو پانچ تو لہ ہی کھائی گئے۔ گھی کی کثرت سے ان کی خوراک ہی نہیں رہتی۔

جب میں نواب صاحب ڈھاکہ کے یہاں گیا تھا تو وہ میری دکان سے گھی کم ڈلاتے تھے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے مذاق میں زیادہ گھی ڈالنے سے کھانے کا مزہ ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر وہاں نواب صاحب کے چچا سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی پڑا کرتا ہے۔ میں نے کہا، اتنا گھی تو ہمارے یہاں بیوں کو دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گھی کوئی زیادہ مرغوب چیز نہیں مجھ سے پوچھا گیا۔ قرآن مجید سے کیسے معلوم ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ قرآن مجید نے جنت میں چار نہریں بتلائی ہیں۔ ایک پانی کی۔ ایک دودھ کی۔ ایک شراب طہور کی۔ ایک شہد کی۔ اگر گھی بھی مرغوب ہوتا تو ایک نہر اس کی بھی مذکور ہوتی پھر یہ کہ امیر صاحب کو ایک بچے کھانا نصیب ہوتا ہے اور غریب کو کچھ نہیں۔ جب صبح ہوئی اور بی بی سے پوچھتے ہیں کچھ ہے بس یا سی و اسی جو کچھ ہو کھا پی کر کھیت یا کچھری یا دوسرے کام کو چلے گئے اور امیر صاحب کو ایک بچے کھانا نصیب ہوگا۔ کیونکہ مکلف کھانے تو جلدی تیار نہیں ہو سکتے۔ تو صاحب ہم باز آئے ایسی امیری سے۔

عورت اور زیور | اسی طرح جو عورتیں دن رات زیور وغیرہ لادنے کی فکر میں رہتی ہیں وہ پوری قید میں ہیں اور اگر اس زیور وغیرہ کی زکوٰۃ نہ دی تو یہاں بھی قید اور وٹال آخرت میں بھی قید مگر عورتیں اس بوجھ کی ایسی عادی ہیں کہ لادے ہی رہتی ہیں۔

ایک بٹے کی حکایت ہے کہ اُس نے اپنی بی بی سے کہا کہ ذرا سل کا بٹہ اٹھا دیجیو۔ وہ بولی کہ میں اتنا بوجھ کس طرح اٹھاؤں۔ وہ بیچارہ خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے یہ کیا کہ بی بی سے چھپا کر سل کو سنار کے پاس لے گیا۔ اور کہا کہ اس پر سونا چڑھا دے اور ایک زنجیر ڈال دے۔ اُس نے سونا چڑھا دیا اور زنجیر بھی ڈال دی۔ اب اُس کو گھر لائے۔ بی بی سے کہا کہ میں نے تمہارے واسطے یہ ایک قسم کا زیور بنوایا ہے۔ یہ سنتے ہی اُس نے وہ سل اپنے گلے میں ڈال لی اور لگی ادھر ادھر چلنے پھرنے۔ ذرا بھی بوجھ نہ معلوم ہوا اگرچہ گردن جھک گئی۔ لالہ جی نے کہا کہ تجھ سے تو سل کا بٹہ بھی نہیں اٹھتا تھا اب سل کیسے اٹھالی۔

بعض دفعہ یہ حالت ہوتی ہے کہ کان زیور کو لادے لادے سوچ جاتے ہیں مگر ان کو شوق میں کچھ نہیں سوچتا۔ ان کو تو اس کے لادنے بچانے سے یہ مقصود ہے کہ ذرا بڑی نظر آویں۔ اور کچھ بھی نہیں غرض اس امیری کا یہ انجام ہے کہ یہاں بھی اس سے راحت نہیں ملتی۔ اور بڑی عورتوں کا کیا گلہ کیا جاوے۔ اس بات میں بچیوں کی بھی عجیب حالت ہے۔

ہمارے یہاں قصبہ گنگوہ میں عورتوں کی ناک اکثر نہیں بندھواتے۔ کیونکہ

علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ باقی ہمارے یہاں سب بندھواتے ہیں ہمارے یہاں ایک شخص کی لڑکی تھی جس سے اُن کو بہت محبت تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر اس کی ناک نہ بندھائی جائے تو کچھ حرج تو نہیں میں نے کہا کچھ حرج نہیں بلکہ بہتر ہے۔ اُنہوں نے اس بچی سے جاکر میری طرف منسوب کر کے کہا کہ اب تیری ناک نہیں بندھے گی۔ اُنہوں نے تو کہا تھا اس غرض سے کہ وہ خوش ہوگی کہ میں تکلیف سے بچی، اچھا ہوا مگر لڑکے نے یہ بات سُن کر بڑی لتاڑ کی اور کہا کہ میرے ہی واسطے یہ فتویٰ رہ گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے گھر والوں کے لئے یہ فتویٰ نہ بتلایا۔ غرض بچہ کو بھی اس قدر شوق ہے زیور کا کہ روتی جاتی ہیں اور کان ناک بندھائی جاتی ہیں۔ کس قدر محبت ہے زیور سے۔

عورت اور حُر زینت | اسی واسطے حق تعالیٰ نے کفار کے رد میں عورتوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔

ادمن ینشاء فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین یعنی کفار جو ملائکہ کو لغو باللہ خدا کی بیٹیاں بتلاتے تھے اور کہتے تھے الملائکہ بنات اللہ کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کا رد فرماتے ہیں کہ اُن کی عقل کہاں جاتی رہی۔ خدا کی اولاد بھی کس کو بنایا جن میں یہ دو بُری صفیں ہیں ایک تو ان میں قوت بیان نہ ہوتی۔ ان میں قوت استدلال نہیں۔ مرد کے ساتھ جب ان کی گفتگو ہوتی ہے وہ بیچارہ اس سے رنج ہی اٹھاتا ہے وہ تو مناظرہ و شدیدہ کے قانون سے گفتگو کرتا ہے اور یہ الی سیدھی ملائکہ

پہلی جاتی ہیں جس زبان چلائے جائیں گی۔ خواہ ایک بات بھی موقع کی نہ ہو
مرد بیچارہ اُن کی زبان زوری دیکھ کر چپکا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کبھی چپکی نہیں ہوتی
آخر یہ مناظرہ میں اُن پر غالب آجاتی ہیں۔ اگر محض بولنے اور بک بک کرنے
کا نام مناظرہ ہے، تو گدھا بڑا مناظرہ ہے۔ سو ایک تو اُن میں یہ نقص ہے۔

دوسری بات اُن میں یہ ہے کہ اوجھل پنشنو فی الحلیۃ اُن کی پرورش
زیور اور زینت میں ہوتی ہے۔ ان کے اندر ایک خاص شانِ حُسنِ زینت
کی ہے جس میں کہ ان کی ساری عقل صرف ہو جاتی ہے۔ اُن کے علوم و کمالات
تک رسائی نہیں ہوتی۔ تو جس میں یہ دو بڑی صفتیں ہوں اُن کو خدا کی اولاد بنانا
کتنی بڑی حماقت ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ امور تو عورتوں میں فطری ہیں پھر فطری امر پر کیوں ملامت
کی گئی۔ وہ تو اختیار سے باہر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود فطری پر ملامت نہیں بلکہ اعتدال کی
تعلیم مقصود ہے کہ عورتوں کو زینت میں انہماک نہ ہونا چاہئے۔ باقی اعتدال
کے ساتھ تو زینت ضروری ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ مرد بی بی کو تزکِ
زینت پر مار سکتا ہے۔ مگر یہ نہ ہونا چاہئے کہ رات دن اسی فکر میں رہیں
لیکن ان کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ رات دن اسی فکر میں پڑی رہتی ہیں اور غنیمت
ہے کہ غریب آدمی اس قسم کے بہت سے بکھڑوں سے بچے ہوئے ہیں۔
اور اُن کی مستورات کھانا بھی پکاتی ہیں اور دیگر مشاغل خانہ داری میں بھی لگی
رہتی ہیں۔ اس لئے اُن کو زیب و زینت کے لئے فرصت کہاں بخلاف

امراء کے کہ ان کی مستورات کو کام تو کچھ ہوتا نہیں۔ اس لئے دن رات ان کو یہی مشغلہ ہوتا ہے۔

غریب اور راحت | نیز غریبوں میں ایک اور امتیاز بھی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا جس کا نام ہے وہ بھی ان غریبوں

ہی کو حاصل ہے۔ یعنی راحت کیونکہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور کام بھی جس کی ضرورت ہے اور رات کو بے فکر پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ وقت پر کھاتے ہیں۔ محنت و مشقت سے بھنم بھی خوب ہوتا ہے۔ غذا بدن کو لگتی ہے۔ اکثر غریبوں کو وہ دولت پیشتر ہے جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

من اصبیح آمناً فی سربہ معافی فی جسده وعنده

قوت یومہ فکانما حیرت له الدنیا بعد

افیرھا۔

یعنی جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھا کہ اسے کسی شخص کا خوف نہ ہو مثلاً مقدمہ وغیرہ کا، کسی دشمن کا۔ معافی فی جسده بدن میں مرض اور دھن نہ ہو اور اس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو تو گویا ساری دنیا اس کے لئے اکٹھی ہو گئی۔ اسی کا گویا ترجمہ ہے۔

چون ترانانے و خرقانے بود ہون مونسے تو سلطانے بود اور ذرا سوچا جاوے کہ اگر کسی کو ساری دنیا مل بھی جاوے تو کیا ایک روز میں سب کھاپی کر خرچ کر لے گا۔ ہرگز نہیں! خرچ تو مقدار ہی کے

موافق ہوگا۔ سوائقی دنیا غریب کے پاس بھی ہے۔ اور اگر کسی غریب کے پاس دنیا اس سے بھی کم ہو مگر آخرت کا سامان پورا ہو تو سب کچھ ہے اور اگر کسی امیر کے پاس دنیا میں سب کچھ ہو اور آخرت کے لئے کچھ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔

ایک مثال سے یہ بات خوب سمجھ میں آجائے گی مثلاً ایک شخص ریل میں وہلی جانے کے قصد سے سوار ہوا۔ رستہ میں کسی اسٹیشن پر اترا۔ وہاں دیکھا کہ قسم قسم کی چیزیں بک رہی ہیں۔ وہ بندہ خدا خوب دل مکول کر چیزیں خریدنے لگا۔ اور ان کے کھانے میں ایسا مشغول ہوا کہ ریل چل دی اور وہ وہیں رہ گیا۔ مقصود سے جاتا رہا۔ تو ایسے مزہ اٹانے کو مزہ نہیں کہہ سکتے عاقل شخص یہی کہے گا کہ جب مقصود سے رہ گیا تو ایسے مزہ پر خاک۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے یہ مزے نہیں اٹائے اور وہلی پہنچ گیا۔ حقیقت میں پہلے شخص نے سراسر اپنا نقصان کیا اور دوسرے شخص کا سوائے اس کے کچھ بھی نقصان نہیں ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے مخلوط سے محروم رہا۔ مگر منزل مقصود تک تو پہنچ گیا۔ جہاں اطمینان سے ہر قسم کے مخلوط حاصل کر سکتا ہے۔

یہی حال دنیا اور آخرت کا ہے۔ ایک دن کو جو بچاں برس سے نسبت ہے دنیا کو آخرت سے وہ نسبت بھی نہیں۔ وہاں تو ابدالاباد ہے اور وہاں ہر قسم کی راحت کا وعدہ بھی ہے بشرط ایمان۔ البتہ قدر کا مقابلہ تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ مگر جو مومن ہے اسے ضرور توقع ہے پھر

خدا تعالیٰ کسی کا ایمان ٹھوڑا ہی چھینتے ہیں اور قند کی وجہ سے بھی جو شخص ایمان سے محروم رہے گا تو وہ بھی اپنے ارادہ سے محروم ہے۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ زبردستی ایمان اُس کے قلب سے نکال لیں۔ اور جب مومن کو رحمتِ آخرت کی توقع ہے۔ پھر دنیا سے دل لگانے کی کوئی وجہ نہیں اور آخرت سے غفلت کسی طرح جائز نہیں۔ کیونکہ دنیا میں جب کسی چیز کی توقع ہوتی ہے تو اُس کی تحصیل کے لئے آرام کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مثلاً کسی کو بوجھ و پرہ کی ملازمت کی توقع ہوتی ہے تو اُس کے لئے کیسی کیسی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اسکولوں میں پڑھتے ہیں، سفر کرتے ہیں، ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ تو جس چیز کا یقین دلایا گیا ہے تو یقین کے بعد اُس کے لئے آرام کو کیوں نہ چھوڑنا چاہئے۔ خصوصاً جب دونوں میں ایک خاص تفاوت بھی ہے۔ وہ یہ کہ سامانِ دنیا تو ایسی چیز ہے کہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے اسی قدر محنوم کا ہجوم ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی حد پر بس نہیں ہوتی۔ کسی دنیا دار سے نہیں سنا، نہ اُس نے کسی حد پر پہنچ کر کیوں کہا ہو کہ اب مجھے ضرورت نہیں۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

اگر شدید سستی کہ در صحرائے غور

گرفت چشم تنگ دنیا دار را

ہوس کی کوئی حد ہی نہیں البتہ ان عمول کے دور کرنے والی اگر کوئی

چیز ہے تو وہ تعلق مع اللہ ہے۔

ایک انسان مراقبہ | میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر خدا سے تعلق ہو جائے
 تو کبھی غم پائے نہ آوے۔ یہ ہے زندگی اور یہ
 ہے حیات طیبہ۔ بخلاف دنیا کے کہ اس کی لذت خیالی لذت ہے اس لئے
 میں سب کو غموں اور عورتوں کو خصوصاً خطاب کرتا ہوں کہ دنیا کی فنا اور
 انہوت کی بقا کا مراقبہ کیا کریں۔ زیادہ نہیں تو دس ہی منٹ کے لئے روزانہ
 کر لیا کریں۔ اور وقت بھی وہ لیں جو محض بیکار ہو یعنی جس وقت سونے کو
 لیں اُس وقت دس منٹ کے لئے سوچ لیا کریں کہ دنیا ایک نہ ایک دن
 ہم سے چھوٹ جائے گی۔ سارا سامان پڑا رہ جاوے گا۔ پھر آخرت کو
 پیش نظر کریں کہ خدا تعالیٰ کے سامنے جانا ہوگا۔ اعمال پیش ہوں گے۔ اعمال
 ٹھیک نہ ہوئے تو دوزخ میں جانے کا گمان غالب ہے۔ اس واسطے
 ہمیں اچھے اعمال کرنا چاہئیں تاکہ دوزخ کے عذاب سے بچیں اور جنت
 ملے۔ جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب نعمتیں ہوں گی۔ اور وہ دنیا کی نعمتوں کی
 طرح فنا نہ ہوں گی۔ خدا تعالیٰ کا دیدار بھی وہاں ہوگا۔ جو سب نعمتوں سے بڑی
 نعمت ہوگی۔ جس میں یہ حالت ہوگی۔

ہر چند پیر و خستہ و بس تا تو اس شدم

ہر گہ نظر بر شئے تو کروم جو ان شدم

اور ظاہر ہے کہ ایسی دائمی نعمت کو چھوڑ کر دنیا کی فانی چیزوں میں

منہمک رہنا سراسر بے عقلی ہے۔ حرص دنیا کے متعلق مجھے ایک قطعہ یاد آیا

اُسی کا مراقبہ کر لیا کریں۔ اور بھی کچھ نہیں تو یہی سہی۔ کیونکہ عورتوں کو گیت کا

بہت شوق ہوتا ہے تو وہ مراقبہ کے لئے اسی کو پڑھ لیا کریں یہ تو آسان
مراقبہ ہے۔

کل ہوں اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملک روم ہے اور سرزمین طوس ہے

گر طبر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی
اس طرف آواز طبل اوجھڑاٹے کوئی ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہر ووں سے کنارہ بوس ہے

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قید آں کا محبوس ہے
لے گئی بیک بارگی گدہ غریبوں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح بچو کس سے

مرفق دین دو میں دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و شہرت کیا ہے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت افسوس ہے

حقیقت یہ ہے کہ انسان مال و جاہ پر کیا ناز کرے جب کہ اس سے
زیادہ مال و عزت والے آج زمین کے اندر ایسے بے کس و بے بس پڑے
ہیں کہ نہ مال ان کے ساتھ گیا نہ عزت کچھ کام آئی۔ یہی حلال ہر شخص کو پیش

آنے والا ہے۔ البتہ اگر آخرت کا سامان ساتھ ہے تو یہ وہاں ضرور آرام دیگا
 پس یہ مراقبہ ہر شخص کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس مراقبہ سے انشاء اللہ
 پورا علاج ہو جاوے گا، حُب مال اور حُب جاہ کا یہی دوسرا بڑا مہلک
 مرض ہیں جو اصول امراض ہیں۔ ان ہی سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو
 ایک وقت معین کیے کہ یہ سوچا کرو کہ دنیا میچ در میچ ہے۔ اس لئے دنیا یہاں
 سے چلی گئی تو کیا اور ہم دنیا سے چلے گئے تو کیا۔

نشاوی میں بربادی | عورتوں کی ایک حالت یہ ہے کہ شادی کے
 موقع پر اتنا خرچ کرتی ہیں کہ سارا گھر خالی کیے

کو تیار ہو جاتی ہیں اور مقصود وہی نام ہوتا ہے۔ مگر اکثر تو نام بھی نہیں ہوتا
 کیونکہ بد نام کرنے کو بہت لوگ موجود ہو جاتے ہیں اور اگر ہو بھی گیا تو کیا ملا
 ایک صاحب نے دیوبند میں بیٹے کی شادی کی اور بہت ہی ضرورت
 سے زیادہ خرچ کیا۔ ایک بزرگ بھی وہاں تھے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ
 آپ نے خوب ہی خرچ کیا اور بڑے جوصلہ سے کام کیا۔ اس بات سے
 تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد ان بزرگ نے فرمایا کہ مگر افسوس
 یہ ہے کہ آپ نے خرچ کر کے کیا چیز خریدی، نام؟ کہ اگر اس کو بازار میں
 لے جاؤ تو اس کا کیا اٹھے گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں۔ شیخ صاحب! یہ تو آپ
 سے طاقت ہو گئی۔ باقی اور سب آپ نے اچھا کیا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر آپ برباد ہوئے تو کیا کوئی عزیز و قریب آپ
 کا ساتھ دے گا، ہرگز نہیں۔ مصیبت میں کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ اپنے

پراٹے سب آسودگی کے ساتھ ہیں۔

عاجو ایہ ساری خرابیاں حسب مال اور حسب جاہ کی ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

قال الذین کفرو والذین آمنوا ای المضریقین خیر مقامًا واحسن ندیا۔

یعنی کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ بتلاؤ ہم دونوں فرقوں میں سے کس کا گھر اچھا ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے۔ آگے ان کا جواب ہے۔

وکد اھلکنا قبلہم من
قرن ھد احسن اثاثا و دثیا

اچھے سامان والے اور اچھے منظر والے تھے۔

جیسے فرعون، ہامان، شداد، قارون وغیرہ۔

اہل اللہ کی کشش | پھر ہلاک بھی ایسے جن کا نام و نشان تک بھی نہ رہتا ہے کہ ان کی جوتیاں تک آج سر پر رکھی جاتی ہیں بخلاف بادشاہوں کے کہ ان کی تو کھوپریاں بھی ماری ماری پھرتی ہیں۔

ایک ہندو کلکڑ ہمارے ضلع میں تھا۔ بیمار ہو کر فنی تالی گیا۔ وہاں مر گیا۔ اس کی مہیم لائن کو فنی تالی سے لائی تھی۔ اس کی لائن کو کھار بھنگی میں لئے ہوئے

مہیم کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اس کا سر کہیں

گیا اور پختہ ہو گیا ہوا چلا آ رہا تھا۔ غرض اُن کی تو کھوپڑی تک کا بھی احترام ہوتا۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ اُن کی جوتیاں تک محترم ہیں۔

ہمارے قصبہ کے قریب لوہاری ایک قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے دادا حضرت میا بچی نور محمد صاحب قدس اللہ سرہ تشریف رکھتے تھے۔ اُن جوتیاں اب تک محفوظ رکھی ہیں جن کو لوگ آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ میں بھی حضرت میا بچی صاحب کی جوتیاں آنکھوں سے لگاتی تھیں۔

اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ وہاں ایک صاحب اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی شخص میاں جی صاحب کی شاگردوں زندہ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک ہندو سولائی زندہ ہے۔ آپ اُس کے پاس گئے اور اُس کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے میا بچی سے پڑھا ہے۔ اُس نے کہا، پھر پوچھا کبھی تجھے مارا بھی ہے؟ کہا، ہاں! کہا کس جگہ مارا تھا؟ کہا گدی پر مارا تھا۔ کہا بھائی میں مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ شاید تو مجھ سے بڑے ہیں۔ لیکن اگر تو اجازت دے تو میں اس جگہ کو چوم لوں، یہاں مارا ہے۔ اُس نے اجازت دے دی۔ تو آپ نے اُس جگہ کو بوسہ دیا۔ یہ کشش تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اسی لئے لوگ اُن کی جوتیاں چومتے ہیں۔ اسی لئے تو عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں۔

عشق لازم کہ یوسف ابیزار آؤد ہچو صنعا ز اہدے لے او بے نار آؤد

اُن سے اتنی محبت کیوں تھی۔ اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اگر مان عزت بھی چاہے تو اُس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا

کرے۔ مگر اس میں یہ غرض نہ ہو کہ ہماری عزت ہوگی بلکہ ہستی اختیار کرو۔
طریق میں ہستی ہی سے علو ہوتا ہے اور جو علو چاہتے ہیں تو اول علو ہو جائیں
پھر علو ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ سارے امراض
اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور سارے امراض کا علاج دنیا کی فنا اور آخرت
کی بقا کا پیش نظر رکھنا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ہر وقت یہ خیال رکھیں
کہ گناہ پر سزا ہوگی اور نیک کام پر جزا ملے گی۔ اجمالاً اتنا کافی ہے۔
تمام اعمال کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں نہ ضرورت ہے۔ کیوں
کہ کتابوں میں سب تفصیل موجود ہے۔ اور اب تو اردو میں بھی اچھی اچھی کتابیں
طبع ہو گئی ہیں جن کو کسی محقق سے معلوم کر لیں۔ پھر وہ کتابیں دیکھا کریں یا
کریں اور ان کے موافق عمل کریں۔

بس اب ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام خیرالاثاث لانا
ہوں یعنی اچھی پونجی عورتوں کے لئے۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم
کو عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین

علاج الحرس

حرس کی مذمت کے متعلق مستورات کی درخواست پر یہ وعظ
 ۹۔ شوال ۱۳۴۳ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح مکان موقوفہ خود واقعہ
 قحانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹہ ۵۴ منٹ میں ختم
 ہوا۔ مرد تقریباً ۴۰ تھے۔ مجمع مستورات پر وہیں تھا مولانا طغراچہ
 صاحب قحانوی نے قلمبند فرمایا

خطبة ماثورة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمد ﷺ ولستعينه ولستغفره ولؤمن به و
نتوكل عليه ولنعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات
أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا
هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك
له ونشهد أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله
صلى الله تعالى عليه وعلى آله وصحبه وبارك وسلم
أما بعد قال النبي صلى الله عليه وسلم لو كان لابن آدم
واديان من المال لا يفتق ثلثاه ولا يملأ جوفه إلا التراب
ويتوب الله على من تاب

مکمل ہے

یہ ایک حدیث ہے جس میں آدمی کی ایک خاصیت بیان کی گئی ہے جو تمام بنی آدم میں قریب قریب مشترک ہے۔ کوئی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاء اللہ۔ اور بعض کے اشتناء ہی کی وجہ سے قریب قریب کا لفظ کہا گیا ہے۔ چونکہ یہ مرض ایسا عام ہے اس لئے اس کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ معمول یہ ہے کہ جب تک کوئی مضمون ضروری ذہن میں نہ آجائے اس وقت تک بیان نہیں کیا جاتا اور اسی لئے اس بیان میں تاخیر ہوئی بحالانکہ بیان کا وعدہ بہت دلوں سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ وعدہ کے بعد بھی میں گھر میں پوچھتا رہا کہ مستورات کو کس قسم کے مضمون کی زیادہ ضرورت ہے اور ان میں کیا کیا عیوب زیادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ ضرورتیں ظاہر کیں مگر کوئی اہم ضرورت خیال میں نہ آئی۔ اور بات یہ بھی ہو گئی ہے کہ اب کوئی ضروری مضمون ذہن میں بہت کم آتا ہے۔ کیونکہ پہلے تو اپنے غیوب پر نظر کر کے دوسروں کو اپنے

اوپر قیاس کر لیا جاتا تھا کہ اُن میں بھی یہ عیوب ہوں گے۔ اس لئے ضرورت جلدی سمجھ میں آجاتی تھی۔ اور اب قیاس سے بھی کسی میں کوئی عیب ہی نظر نہیں آتا۔ اس لئے کوئی ضروری مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کیونکہ مخلوق کے عیوب پر نظر نہ ہونا فی نفسہ بڑی نعمت ہے اس لئے اب مجھے بعض دفعہ بیان کے لئے کئی کئی روز تک تردد رہتا ہے کہ کیا بیان کروں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی کئی روز تک سوچتا رہا۔ مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ تو پھر میں نے ایک کتاب ویسے ہی اپنے سامنے سے اٹھائی مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کون سی کتاب تھی۔ اتفاقاً وہ سامنے رکھی تھی میں نے اٹھا لی اور کھولنے سے پہلے ہی تعالیٰ سے دعا کی کہ بیان کے لئے کوئی ضروری مضمون اس میں نظر پڑ جائے۔

اس کے بعد جو اُسے کھولا تو نظر کے سامنے سب سے پہلے یہ حدیث آئی۔ میں بہت خوش ہوا کیونکہ

عورت اور حرج

واقع میں اس کا مضمون بہت ضرورت کا ہے خصوصاً عورتوں کی ضرورت کا کیونکہ عورتوں میں دنیا کے متعلق حرج بہت ہے۔ ان کے یہاں اس کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہ بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کر لیتی ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں رکھی رکھی خراب بھی ہو جاتی ہیں اور یہ رکھ کر ایسی بھولتی ہیں کہ نام بھی نہیں لیتیں اور یہ بھول جانا جیسا کہ عورتوں کی حرج کی دلیل ہے کہ اتنا سامان جمع کیا تھا کہ یاد بھی نہیں رہا۔ ایسے ہی حق تعالیٰ کے منعم ہونے کی بھی

دلیل ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اتنی نعمتیں دیں کہ ہم کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا چیزیں ہیں۔

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ تم یاد سے نعمتوں کا احصاء نہیں کر سکتے اور ایک محمل اور ہے جو دل کو زیادہ لگتا ہے کہ ضرورت اور حاجت کی صفت سے تم اس کا احصاء نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں تم کو بے ضرورت معلوم ہوں گی۔ واقعی بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ افسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کس کام میں لاؤں تو جیسا کہ اس سے خدا تعالیٰ کا منعم ہونا ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی ہماری حرص بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں جن کے لئے کوئی مصرف بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ مادہ عورتوں میں خصوصاً زیادہ ہے۔

ان کے متعلق مولوی عبدالرب صاحب کا ایک لطیفہ ہے کہ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کے پاس کپڑوں کا صندوق بھی بھرا ہوا ہو مگر پھر بھی جب پوچھو یہی کہیں گی میرے پاس کیا ہیں چار پٹیٹرے اور برتن چاہے کتنے ہی ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے اور چوتوں کے دو تین جوڑے رکھے ہوئے ہوں گے مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں دو لیٹرے۔

■ واعظ آدمی کتنے قافیہ خوب ملا یا۔ واعظوں کے بیان میں ایسی صنعتیں بہت ہوتی ہیں اور اسی کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ مولویوں کے وعظ کو پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کو یہ قافیہ نہیں آتے۔ مگر واقعی عورتوں کی حالت تو وہی ہے جو مولوی عبدالرب صاحب نے کہی ہے۔ چنانچہ بعض عورتیں ضرورت کے موافق کپڑے

بنالغتی ہیں۔ اس کے بعد پھر کوئی بزاز عمدہ سی پھینٹ لے آیا تو ایک دو پارہ
کی اگلے سال کے لئے ضرور خرید لیں گی۔ بس اس بارہ میں یہ بالکل اس شے
مصدق ہیں۔

لختہ برداز دل گزر دہر کم زوشیم من قاش فروش دل صد پارہ خوشیم
باقی شاعر نے جس معنی کے اعتبار سے لختہ برداز دل کہا ہے اس
مصدق عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے سامنے جو
بھی آجاتا ہے میں اس پر فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ سو یہ بات ماشاء اللہ تعالیٰ عورتوں
میں نہیں ہے بلکہ اس بارہ میں تو وہ عورتوں کے مشابہ ہیں۔ جیسے ان کے بارہ
قاصرات الطرف اے علی ازواجہا آیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے
کسی کو آنکھ اٹھا کہ نہ دیکھیں گی۔ یہی حالت ہندوستان کے اکثر حصہ کی عورتوں
کی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتیں۔ گو بعض کم بخت ایسی
ہیں کہ آبرو میں بڑ لگا دیتی ہیں۔ مگر ایسی بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عورتیں عقیف
ہوتی ہیں۔ ان کے دل پر غیر مرد کا خیال ہی نہیں گزرتا۔ نہ حلال کا نہ حرام کا۔ مگر
باغ میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی بعض دوسری قسم کی
ہیں۔ خیر ان سے قطع نظر کہ اکثر کو دیکھا جائے تو وہ قاصرات الطرف
مصدق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں نکاح ثانی کا رواج کم ہے۔ حقیقت
میں یہاں کی عورتیں یہی چاہتی ہیں کہ شوہر کے مرنے کے بعد خود ہی مرجائیں
مگر موت تو قبضہ میں نہیں ہے۔ یہ اسباب
موت اور اختیار وہ گو قبضہ میں ہیں مگر حرام ہیں اور واقع میں اسباب

موت اختیار کرنے کے بعد بھی موت قبضہ میں نہیں ہے کیونکہ اسباب موت اختیار کرنے سے موت کا آجانا لازم نہیں۔ ایسے بہت واقعات ہوئے ہیں کہ بعض لوگوں نے سکھیا کھا لیا اور نہیں مرے۔ اسی طرح بعضوں نے گلا کاٹ لیا اور نہیں مرے۔

ایک شخص ایک انگریز کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اُس کو کسی نے کچھ تہمت لگائی تو بدنامی کے رنج سے اُس نے استرہ لے کر اپنا گلا کاٹ لیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا پتھوڑی دیر کے بعد نامی سے جو خون نکلا تو ملازم گھبرا یا کہ یہ خون کیسا۔ اُس نے کمرہ کے کواڑوں میں جو اوپر آٹھنے لگے ہوئے تھے ان میں سے جھانکا تو دیکھا کہ سما حرب بہادر کا گلا کٹا ہوا پیچھے کو گرا ہوا ہے مگر کھال اٹکی ہے اور خون بہ رہا ہے اس نے فوراً پولیس اور ڈاکٹر کو کو خبر دی سب نے آکر کواڑ کھولے اور ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر کو یہ معلوم ہوا کہ بدن میں کچھ حرارت باقی ہے اور رگیں سب نہیں کٹیں، تو اُس نے جلدی سے سراٹھا کر سیدھا کمرے کے جھاڑ دیا اور گتے میں فوراً ٹانگے لگا کر کوئی دوا لگا دی۔ شام تک اُس مردہ نے آنکھیں کھول دیں اور چند روز میں مقوی دوائیں کھا کھا کر چلنے پھرنے لگا۔ راوی کہتے تھے کہ وہ بالکل اچھا خاصا ہو گیا۔ صرف ایک عیب ہو گیا تھا کہ گنگنا بولتا تھا۔ نہ معلوم غیشوم کی کون سی رگ خراب ہو گئی تھی۔

تو موت تو کسی کے قبضہ میں نہیں مگر عورتیں خاوند کے مرنے سے کالمیت ضرور ہو جاتی ہیں اور پہلے زمانہ میں تو بعض عورتیں سچ ہر محبت ہو جاتی تھیں

چنانچہ یہ سستی کی رسم بھی اسی محبت کی وجہ سے نکلی تھی جو ہندوستان کی عورتوں کو خاوند سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے کہ یہاں عورت کو مرد سے تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندی شاعری اس کی دلیل ہے۔ اس میں عورت کی طرف مرد کو خطاب ہوتا ہے۔ میرے پیار وغیرہ۔ اور عرب میں مرد کو عورت کی طرف سکھیلان ہوتا ہے جیسا کہ عربی شاعری اس پر شاہد ہے۔ اور فارس میں بڑا گندہ اثر ہے کہ وہاں مرد کو مرد سے میلان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں مذکر کی طرف سے مذکر کو خطاب ہوتا ہے اور اب یہ اثر ہندوستان کی اردو شاعری پر بھی ہو گیا ہے اور حیرت یہ کہ بعض ثقہ اور دیندار لوگ بھی اس اثر سے نہ بچ سکے۔ حضرت امیر خسرو کتنے بڑے درویش ہیں مگر شاعری میں وہ بھی لڑکوں اور مردوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

اے وہی والے بٹان ساوہ پگ بستہ و ریشہ کچ ہنساوہ
کہ دند مرا خراب آخسر ہندو بچکاں ساوہ زادہ

خیر ہندوستان میں یہ اثر خارجی آگیا ہے۔ ورنہ یہاں کی آب و ہوا کا اصلی اثر یہ ہے کہ عورت کو مرد کی طرف میلان ہوتا ہے اس لئے وہ شوہر کے مرنے سے کالمیت ہو جاتی ہیں۔ نہ نکاح کریں نہ زینت و آرائش عمر بھر کریں اسی لئے یہاں نکاح ثانی معیوب ہو گیا ہے۔ مگر اب نکاح بیوگاں رواج ہونے لگا ہے اور اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ گو نشا اس کا امر طبعی تھا مگر بعد میں عقلی کیا ہوت پیدا ہو گئی۔ ورنہ لوگ حکم شرعی کو عجیب سمجھنے لگے تھے۔

حتیٰ کہ کانپور میں ایک بیوہ عورت سے کسی نے کہا کہ دوسرا نکاح کرنا سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں نے دو دو نکاح کئے ہیں تو بھی دوسرا نکاح کر لے۔ تو وہ کمبخت کیا کہتی ہے کہ دیکھو حضور کی بیٹی حضرت فاطمہؓ نے تو دوسرا نہیں کیا۔ وہ خاندانی بی بی سے بھتیں اور دوسری بیٹیوں نے جو کیا ہے، تو ظالم نے ایسا سخت لفظ کہا کہ اس کو نقل کرتے ہوئے ہونگے کھڑے ہوتے ہیں۔ نقل کفر کفر نباشد۔ کمبخت کہنے لگی کہ وہ کسی کم ذات بی بی سے ہوں گی۔ نعوذ باللہ، استغفر اللہ!

حالانکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نکاح ثانی کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی وہ تو حضرت علیؓ کے سامنے وفات پا گئی تھیں۔ پھر حضورؐ کی سب صاحبزادیاں حضرت حدیجہؓ ہی سے تھیں اور کسی اور بیوی سے بھی ہوتیں، تو آپؐ کی ازواج میں کم ذات کوئی بھی نہ تھی۔ سب شریف زادیاں اعلیٰ خاندان سے تھیں۔ مگر اس کم بخت نے حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ایسا سخت لفظ کہا۔

جب اس طبعی اثر کا نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا تو علماء نے اس بابت کے مٹانے میں نوا و عملاً ہر طرح کوشش کی۔ پہلے مجھے علماء پر شبہ ہوتا تھا کہ نکاح ثانی کے باب میں تصحیح اعتقاد کافی ہے۔ عملی سعی کے لئے ضرورت ہے۔ بعض تصحیح عقائد پر کیوں اکتفا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ سر ہو کر بیوہ کا نکاح کیوں کر لیتے ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ظاہر کو بھی باطن میں بڑا اثر ہوتا ہے اور جب کسی عمل کو دائماً متروک رکھا جاتا ہے تو باطن پر اس کا اثر ضرور رہتا ہے۔ بدن عمل کے اعتقاد کی جڑ نہیں نکلتی۔ اس لئے علماء کی رائے صحیح ہے کہ اس

بدعت کا استیصال بدون عملی سعی کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب سے اس پر عمل
 ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے اعتقاد بھی درست ہونے لگے ہیں۔ غرض
 عورتوں کے متعلق یہ شعر اس معنی کو تو صحیح نہیں جو شاعر کی مراد ہے۔ شوہر کے
 باب میں ان کی یہ حالت نہیں ہے۔ مگر اور چیزوں کے متعلق ان کی یہی حالت
 ہے۔ زیور اور کپڑوں کے باب میں وہ بالکل اس شعر کا مصداق ہیں۔
 لختے بڑا زول گزدہر کہ زشمیم من قاش فردش دل صد پارہ خوشیم
 کہ جو چیز بھی دیکھتی ہیں ان پر اس کی حرص غالب ہو جاتی ہے۔ ان کو
 چیز کا دکھانا ہی غضب ہے۔ پھر بدولن خریدے یا بنوائے ان کو صبر نہیں آتا
 بس ان کو تو کوئی نئی چیز دکھاؤ ہی نہیں۔ غرض چونکہ ان میں حرص کا مادہ زیادہ ہے
 اس لئے یہ حدیث ان کے حال کے بہت مناسب ہے اور بعد میں یہ بھی
 اتفاقی مناسبت ہو گئی کہ میں نے اس مکان کو جس میں یہ بیان ہوا ہے وقف
 کر دیا ہے۔ اسباب کو معلوم ہوا ہو گا اور یہ فعل اس خاصیت کا مقابل ہے
 جو حدیث میں مذکور ہے کیونکہ حرص میں اپنی ملک کے اندر چیزوں کو لایا
 جاتا ہے۔ اور وقف میں ملک سے نکالا جاتا ہے۔ تو وقف، حرص کا مقابل
 ہوا اور اس پر ریش پر عمل ہے کیونکہ حضور کا مقصود حرص سے
 روکنا ہے جس کی سبب جاتی ہے اور یہ تفاخر نہیں بلکہ شکر ہے۔ بہر حال
 اس حدیث میں ایک ضروری مضمون ہے۔ عورتیں غور سے سنیں کیونکہ یہ مضمون
 خصوصیت سے ان کے مناسب ہے۔

فنا عشت کی ضرورت | پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر

ابن آدم کے پاس دو وادی سونے چاندی کے ہوں تو وہ قیسرے کا طالب ہوگا۔ وادی کہتے ہیں اس نشیبی زمین کو جس میں پانی بہتا ہو۔ جیسے ندی اور تالہ۔ تو اس لفظ میں زیادہ مبالغہ ہے کہ اگر انسان کے پاس چاندی سونا اس کثرت سے ہو کہ پانی کی طرح بہتا ہو جب بھی وہ زیادہ کا طالب ہوگا۔ چنانچہ اس کے پاس دو وادی بھی ہوں تو قیسری کا طالب ہوگا اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تین ہوں گے تو لا تبغی رابعا کہ چوتھے کی تلاش میں ہوگا۔ سعدیؒ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے۔

ہفت اقلیم اور بگرد پاوشاہ ہچناں در بند اقلیمے دگر
سلاطین کو تو اقلیم و سلطنت کی ہوس ہوتی ہی ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ رعایا بھی سلطنت کے خواب دیکھتی ہے۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہے سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے، جیسے چوٹی کے مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو اس کے پر لگتے ہیں۔ اس وقت تو وہ خوش ہوتی ہے کہ آگاہیں بھی ہوا میں اڑنے لگی اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔

چوٹی کے لگے پر تو وہ کہنے لگی اڑ کر

میں مثل سلیماں ہوں ہوا میں کئی دن سے

مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کی ہلاکت کے دن قریب آگئے ہیں۔ اسی طرح جب رعایا سلطنت کے خواب دیکھے گی تو اس کا نتیجہ بھی ہلاکت کے کچھ نہیں اور باوجودیکہ اس خواب پریشانی کا منشا محض حرص ہے اور کچھ نہیں

مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے۔

صاحبو! نام کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نتائج اور آثار کو دیکھنا چاہئے کہ اس ہوس خام کے آثار و نتائج کیا ہیں۔ کیا اس سے اسلام کو کچھ ترقی ہوئی ہے یا کفر کو۔ صوفیاء بڑے محقق ہیں اور ان سے زیادہ دیندار کون ہوگا۔ اُن کی تعلیم یہ ہے۔

آرزوی خواہ ایک اندازہ خواہ برتنا بد کوہ را یک برگ کاہ
یعنی آرزو اور تہمتا کا مضائقہ نہیں مگر اپنے اندازہ کے موافق
ہونی چاہئے حد سے زیادہ آرزو نہ کرنا چاہئے، کیونکہ پہاڑ
کو گھاس کا تنکا ہٹا نہیں سکتا۔

تو دیکھئے محققین حد سے زیادہ ہوس کو منع کرتے ہیں کیونکہ تجاوز عن الحد
میں پریشانی ہی پریشانی ہے اور شریعت نے مسلمانوں کو پریشانی سے بچانا
چاہا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لا تلقوا بایک یسدا لی التہلکۃ اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسه قالوا یا رسول اللہ
وکیف یذل نفسه قال یتحمل من البلاء لما لا یطیقہ

نص قرآنی سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ ممنوع ہے

وہ دین نہیں خلاف دین ہے۔ اور حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو اپنے
آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں گو ہلاکت بھی نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا
رسول اللہ! مسلمان اپنے آپ کو کیونکر ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا ایسی بلا کو سہرا

دھڑلے جس کے تحمل کی طاقت نہیں۔ اس سے بھی تجاوز عن الحد کی مذمت معلوم ہوئی۔

یہ تو مصائب اختیار یہ کے متعلق شریعت کی تعلیم تھی۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اختیار ہی مصائب سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ کبھی پاس نہ آ سکے۔

تفویض کی اہمیت | مصائب غیر اختیار یہ کا شریعت نے ایسا علاج بتلایا ہے کہ تمام حکماء عالم بھی جمع ہو جائیں تو اس کی نظیر نہیں لا سکتے۔ سنیئے علاج کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا مَا بِهِمْ مَصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں یعنی اس کی ملک ہیں وہ ہمارا مالک ہے اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا مملوک میں حق ہے، اور ہم اس کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اس میں تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت اس مضمون کا استحضار کرنا چاہئے مگر ہم لوگوں نے اس کو محض وظیفہ بنا لیا ہے جیسے اور وظیفے ہوتے ہیں تسخیر جن اور حجب وغیرہ کے یعنی محض زبان اور ہونٹوں تک اس کا اثر رہتا ہے۔ دل سے بالکل اس مضمون کو نہیں سوچتے۔

تو اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے سنا تھا کہ گل بنفشہ زکام کے لئے مفید ہے اس نے گل بنفشہ پکا کر ہونٹوں کو لگا لیا۔ تو بتلایئے اس سے

زکام کیونکہ جاتا رہے گا۔ اسی طرح ہماری پریشانی کیونکہ دور ہو جب کہ ہم نے انا اللہ کو محض ہونٹوں سے لگا رکھا ہے۔ اسے بھائی اس کو دل کے اندر اتارو۔ پھر دیکھو پریشانی کہاں جاتی ہے۔ شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں تو قالوا آیا ہے تفکر و انہیں آیا اور قول کا صدور ہم سے بھی ہو جاتا ہے پھر نفع کیوں نہیں ہوتا تو آپ کو خبر بھی ہے کہ قول کسے کہتے ہیں۔

ان السلام فی الفواد و انما

جعل اللسان علی الفواد دلیلا

اصل قول تو قلب ہی سے ہوتا ہے اور قرآن میں یہی مراد ہے کہ زبان و دل دونوں سے یہ کلمہ کہا جائے۔ شاید تم یہ کہو کہ جب ہم زبان سے کہیں گے تو دل میں بھی پہنچ جائے گا کیونکہ اس وقت تصور تو لازم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دل میں کیا پہنچے گا محض الفاظ ہی الفاظ پہنچیں گے۔ اور مقصود معنی کا پہنچانا ہے وہ بدول تامل و تفکر کے نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ہم اس کلمہ کو تصور معنی کے ساتھ کہا کریں تو پریشانی پاس نہیں آسکتی۔

چنانچہ اس میں اول تعلیم یہ کی گئی ہے کہ انا اللہ کا استحضار رکھو کہ ہم اول ہماری تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ملک ہیں اور مالک کو مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے۔ دوسروں کو کسی کی ملک میں کسی تجویز کا حق نہیں۔ اس میں ہماری تجویز کو قطع کیا گیا ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی خاص حالت اور خاص صورت اپنے لئے یا اپنے متعلقین وغیرہ کے لئے تجویز نہ کرو کیونکہ تم سب خدا کی ملک ہو۔ اور تجویز کا حق مالک کو ہے تم کو نہیں ہے اور یاد رکھئے کہ پریشانی

کا داری ہی تجویز ہے کہ انسان اپنے لئے یا اپنے متعلقین کے لئے ایک خیالی
پلاؤ پکالیتا ہے کہ یہ لڑکا زندہ رہے اور تعلیم یافتہ ہو اور اس کی اتنی تنخواہ ہو
پھر وہ ہماری خدمت کرے اور یہ مال ہمارے پاس رہے۔ اس میں یوں ترقی
ہو اور اتنا نفع ہو۔ اسی طرح شیخ چلی کی مانند ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ منصوبہ
قائم کر لئے جاتے ہیں۔

جیسے شیخ چلی کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے دو پیسہ کی مزدوری پر تیل کا
گھڑا ان سے اٹھوایا کہ فلاں جگہ تک پہنچا دو۔ آپ گھڑا سر پر رکھے ہوئے چلے
اور راستہ میں تجویزیں پکانے لگے کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لاؤں گا
ان کے بچے نکلاؤں گا۔ اس طرح میرے پاس بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی
پھر ان کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ ان میں بھی اسی طرح سلسلہ توالد چلے گا۔ پھر
ان کو بیچ کر گائے خریدوں گا۔ پھر بھینسوں گا۔ پھر ان کو بیچ کر بہت سا روپیہ
حاصل ہوگا تو میں ایک دکان کھولوں گا۔ جس میں بہت نفع ہوگا تو ایک عالیشان
محل بناؤں گا۔ اور بادشاہ زادی کو پیغام نکاح دوں گا۔ بادشاہ میری ریاست
کو دیکھ کر بس فوراً ہی نکاح کر دے گا۔ پھر اس سے ایک لڑکا ہوگا۔ وہ
میرے ساتھ ساتھ رہا کرے گا اور کبھی مجھ سے پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا
ہشت! بس ہشت ہو کیا تو سر کے ہلنے سے گھڑا گر پڑا اور سارا تیل بہہ گیا
مالک نے کہا ارے یہ کیا کیا۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میاں جاؤ بھی۔ تمہارا
تو چند پیسوں کا تیل ہی ضائع ہوا اور میرا تو سارا کتبہ ہی ہلاک ہو گیا اور سب کا رخانہ
تباہ ہو گیا۔ کیونکہ سارے منصوبوں کا نقشہ تو وہ دو پیسے تھے جو میاں کو مزدوری

میں ملتے۔ جب مزدوری پوری نہ ہوتی تو پیسے بھی نہ ملے اور جب پیسے نہ ملے تو سب انڈے بچے رکھے رہ گئے۔ لوگ اس حکایت پر سننے لگے تو فرمایا کہ:

ہم اس پر ہنستے ہیں مگر درحقیقت ہم سب اسی مرض میں مبتلا ہیں کہ بادل دیکھ کر گھڑے بھوڑ دیتے ہیں اور دُور دراز کی امیدیں پکانے لگتے ہیں۔ پھر جب تجوینہ اور امید کے خلاف وقوع ہوتا ہے تو پریشانی اور رنج میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اگر پہلے سے کوئی تجوینہ نہ ہو تو پریشانی کبھی پاس نہ پھٹکے۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ آرام و راحت و مسرت میں ہیں۔ ان کو کسی واقعہ سے پریشانی اور غم نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تجوینہ کا نشان ہی نہیں ہے۔ بلکہ نفولین کلی ہے۔ بس ان کو ایک غم آخرت کا تو ہے اور کسی بات کا غم نہیں مگر غم آخرت ایسا نورانی اور لذیذ ہے کہ اس کے بلے میں وہ سلطنت بھی لیتا نہیں چاہتے۔ اسی لئے کہتے ہیں:

غم دین خور کہ غم غم دین سرت ہمہ غم ہا فروزاں سرت
غم دنیا مخور کہ بیہودہ سرت ہتج کس درجہاں نیا سودہ سرت

اس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غم دین بیہودہ نہیں ہے بلکہ یہ غم موجب راحت ہے۔ اسی لئے

موت کے مشتاق

اہل اللہ ہر وقت شاداں و فرجاں نظر آتے ہیں کہ کوئی مرے جب خوش، جیسے جب خوش، بیمار ہو جب خوش، قحط ہو جب خوش۔ کیونکہ وہ ہر حال میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے

ہر چہ از دوست می رسد نیکو ست

غرض انا اللہ میں تجویز کو قطع کیا گیا ہے مگر چونکہ بعض کو ابتداء اس پر قدرت نام نہیں ہوتی تو ان کے لئے انا الیہ راجعون کی بھی تعلیم ہے کہ کسی کی مفارقت سے غم نہ کرو کیونکہ غم بھی ایک دن وہیں پہنچو گے، جہاں وہ گیا ہے۔ اس میں تسلی عام اور تمام ہو جاتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد کسی کے عزیز کو بلا لے اور اس کو مفارقت کا صدمہ ہو۔ پھر نظام اس کو خط لکھ دے کہ تم بھی غریب ہیں بلائے جاؤ گے۔ تو اب غم مفارقت نہیں ہوتا۔

اسی طرح اہل اللہ کو کسی کی مفارقت سے زیادہ غم نہیں ہوتا بلکہ وہ تو کسی کو مرتا ہوا دیکھ کر خود بھی موت کے مشتاق ہوتے ہیں۔ پھر کسی کے مرنے سے کیا غم کرتے۔ وہ تو موت سے ایسے مسرور ہیں کہ اس کے لئے نذریں ملتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں :-

خبرم آن وز کزین منزل یراں بوم راحت جاں طلیم وز پے جانان بوم
نذر کردم کہ گداید بسراں غم رنڈے تا در میکہ تشاواں و غزنواں بوم
اور یہ محض باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ عارفین نے اس کو کر کے دکھلا دیا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مر رہے تھے تو سب لوگ رو رہے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے :-

وقت آن آمد کہ من عرباں شوم جسم بگذارم سرا سر جاں شوم
غرض شریعت مسلمانوں کے لئے پریشانی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے مرضا

اختیار و غیر اختیار یہ سب کے لئے ایسی تعلیم دی گئی ہے جس سے پریشانی کا استیصال ہو جاتا ہے۔

راحت کی صورت | رعایا کو ہوس سلطنت ہوتا پریشانی کا سبب ہے اس لئے یہ ہوس دین نہیں ہے بلکہ حد سے تجاوز

ہے جس کی مانعیت آئی ہے اور مشاء اس ہوس کا محض حرس ہے اور ہر آرزو اور خواہش نہیں ہوا کرتی۔ تو حرس سے پریشانی ہی پریشانی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ام لا نسلک ما تمنى۔ اس لئے سرے کو کبھی راحت نہیں مل سکتی۔

ما حصل ما یتمنى الہوا بیدرکہ
تجری الوریاح بما لا تشہی السفن

انسان بہت دفعہ ایک آرزو قائم کرتا ہے اور وہ خاک میں مل جاتی ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس لئے اگر راحت چاہتے ہو تو احکام پر عمل کرو اور حرس کو قطع کر تم اپنے لئے نہ سلطنت تجویز کرو نہ گداگری، صرف خدا تعالیٰ کی غلامی اختیار کرو۔ اس کے بعد وہ جو چاہیں گے خود دے دیں گے۔

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو لوگ ترقی متعارف کے معلم ہیں، وہ درحقیقت پریشانی کی تعلیم دے رہے ہیں کیونکہ جس چیز کا نام انہوں نے ترقی رکھا ہے اس کی حقیقت محض حرس ہے اور جو لوگ ترقی متعارف سے مانع ہیں وہ راحت کے معلم ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں شریعت کے

موافق چلو اور اس میں راحت ہی راحت ہے۔ شریعت میں چل کر پریشانی پاس نہیں آسکتی۔ بہر حال حرس تمام پریشانیوں کی جڑ ہے۔ اور یہ مرض عورتوں میں زیادہ ہے۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو اعم الامراض کہنا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرس مال نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دباؤ۔ پھر ان فسادات کی بھی نوبت نہ آئے۔ بدکاری اور چوری وغیرہ کا منشا بھی حرس ہے۔ کہیں حرس مال ہے کہیں حرس لذت۔ نیز اخلاقِ رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرس ہے کیونکہ عارفین کا قول ہے کہ تمام اخلاقِ رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر کا منشا بھی ایک گونہ حرس ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بھی حرس کی ایک فرد ہے کیونکہ تکبر طلبِ جاہ کا نام ہے۔

تو اس میں جاہ کی ہوس ہے بلکہ غور کیا جائے تو مال کی بھی **جاہ کی ہوس** حرس ہے کیونکہ طلبِ جاہ اس واسطے کی جاتی ہے کہ

صاحبِ جاہ کو ضروریاتِ معاش سہولت سے مل جاتی ہیں۔ اس کی حاجتیں آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ جو کام دوسرے شخص کا سینکڑوں روپے خرچ ہونے سے نکلتا ہے، وہ صاحبِ جاہ کی زبان۔ ہلنے سے ہو جاتا ہے چنانچہ مفروضہ میں مشاہدہ ہے کہ کلکٹر اور حاکم کے منہ سے جہاں یہ نکلا کہ ہم کو دودھ کی ضرورت ہے تو ہر شخص دودھ لانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور جہاں یہ نکلا کہ ہم کو گائے کی ضرورت ہے تو ہر طرف سے لوگ گائے ہی گائے لئے چلے آتے ہیں۔ چاہے دل سے یا بدولی سے مگر حاکم کا منشا پورا ضرور ہو جاتا ہے تو صاحبِ جاہ کو انجامِ خواجہ سہل ہو جاتا ہے۔ مال بھی آسانی سے ملتا ہے

ورنہ کم از کم روپیہ کی بچت تو ضرور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص خوشامد میں کچھ لاتا ہے مفت ہی پیش کرتا ہے۔

اسی لئے صوفیاء نے صاحبِ جاہ کے آداب میں لکھا ہے کہ ایسا شخص اپنی حوائج کو ظاہر نہ کرے کیونکہ اس سے لوگ فکر میں پڑ جائیں گے اور ہر شخص اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہے گا۔ اس لئے صاحبِ جاہ کو اظہارِ حاجت مناسب نہیں۔

شاید کوئی کہے کہ ہم تو اظہارِ حاجت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم پر بار نہ ہو، گرانی نہ ہو تو یہ کام کر دو۔ تو خوب سن لو کہ یہ مقدمات شرطیں سب فضول ہیں کیونکہ معتقدین ان مقدمات کو نہیں دیکھتے بلکہ وہ تو تالی کو دیکھ کر حوائج کا تالا کھولنے میں لگ جاتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے جاہ کی حقیقت ملکِ المقلب لکھی ہے اور ملکِ المقلب سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کام سہولت سے نکلتے رہیں۔ پس تکبر کا منشا بھی حرص ہے اور کبر تمام روائی کی جڑ ہے۔ تو حرص منشا ہوا تمام معاصی کا چنانچہ منشا ہے کہ نا اتفاقی کا منشا بھی حرص ہے اور تفاخر کا منشا بھی یہی ہے کیونکہ مال دولت کو دکھانا جمع مال ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور وہ جمع ہوتا ہے حرص سے تو حرص کا ام الامراض اور اصل معاصی ہونا ثابت ہو گیا۔

یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا۔ حسبِ الدنیار اس

لے لا یحیی ما فیہ من اللطف فللہ و رد ما ابلغہ ۱۲ جامع

حل خطیۃ حُب دنیا ہی کا نام تو حرم ہے اور عورتوں میں یہ مرض مردوں سے زیادہ ہے۔ ان کو زور کپڑے اور برتنوں کی بہت حرم ہے۔ پھر اس سے زیادہ و ثفا نہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب محفل میں بیٹھیں گی تو کسی پہانہ سے اپنے کون پھول اور کنگن دکھانا چاہیں گی۔ کنگن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ وہ تو سب بے تکلف دیکھ لیتے ہیں البتہ کون پھول اور طوق گلاب بند وغیرہ دوپٹے سے مستور ہوتے ہیں۔ تو جو ان میں ثقہ نہیں ہیں وہ تو بدالالت قال دکھلاتی ہیں کہ اے فلاں! دیکھئے میرے کون پھول کیسے ہیں؟ اچھے بھی بنے ہیں مگر بند عمدہ بھی ہے جس سے سب سمجھ جاتی ہیں کہ مقصود یہ جملانا ہے کہ ہمارے پاس یہ چیزیں بھی ہیں اور جو ثقہ بھی ہیں وہ بدالالت قال تو نہیں دکھلاتیں مگر بدالالت حال دکھلاتی ہیں کہ بیٹھے بیٹھے اُن کے کان میں یا گلے میں کھجلی اٹھتی ہے۔ بار بار کان اور گلہ کھجلاتی ہیں۔ مگر یہ کھجلی اول دل میں ہوتی تھی۔ پھر کان میں ہونے لگی۔

بہر حال حرم سے اول قلب کو پریشانی ہوتی ہے پھر ظاہر کو بھی پریشانی ہونے لگتی ہے۔ تو اس کا علاج ضروری ہوا۔ جو اس حدیث میں مذکور ہے جس کی تقریر یتوب الیہ علی من قاب کی شرح میں ذکر کی جاوے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لو حان لابن آدم اور انسان | آدم وادیان من الممال۔ اس میں حضورؐ نے لفظ ابن آدم اختیار فرمایا ہے، انسان نہیں فرمایا۔ کیونکہ ابن آدم کے عنوان میں ایک مقبول کی طرف نسبت ہے جس سے شرم دلانا منظور ہے کہ ایسے مقبول کا بیٹا اور بنی زاوہ ہو کر اس کی خصلت ایسی جو بہائم جیسی ہے۔ دوسری توجہ یہ بھی ہو

سکتی ہے کہ حرق کو مذموم کے ساتھ خاص نہ کیا جائے بلکہ عام مان لیا جائے جو محمود و مذموم سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں لفظ ابن آدم میں اضافت سے بناء حرق کی طرف اشارہ ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ایک حرق محمود پیدا ہوئی تھی مگر حضرت انسان اس کی وجہ سے حرق مذموم میں مبتلا ہو گئے۔ مگر یہ تو جہہ عوام کے مناسب نہیں بلکہ خاص کے سمجھنے کی ہے۔ عوام کو ابن آدم کہنے کی وہی وجہ سمجھنی چاہئے جو پہلے مذکور ہوئی ریز ابن آدم کہنے سے اس خاصہ کے عموم پر اور فطری ہونے پر بھی اشارہ ہے،

خلاصہ یہ کہ حرق کا مادہ اس میں طبعی ہے۔ آگے اس کا علاج بتلاتے ہیں مگر علاج صحیح بتلانے سے پہلے ایک غلط علاج کا غلط ہونا بتلاتے ہیں۔ کیونکہ انسان میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امراض کا علاج خود کیا کرتا ہے جیسے عورتوں کی بھی عادت ہے کہ وہ اکثر امراض کا علاج خود کیا کرتی ہیں مگر حقیقت میں وہ الٹا علاج ہوتا ہے جس سے بجائے اصلاح کے فساد ہی بڑھتا ہے۔ کسی کے پیٹ میں درد ہو تو اس کا علاج عورتوں میں یہ ہے کہ کھانا کھا لو۔ چنانچہ کہا کرتی ہیں کہ یہ بھوک کا درد ہے کھانے سے جاتا رہے گا بھوک کا درد! یہ درد کی نئی قسم ہے جو اطباء کو بھی معلوم نہیں۔

اسی طرح مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے پاس ایک مریض آہ آہ کہتا ہوا آیا۔ اس کو درد شکم کی شکایت تھی۔ مولوی صاحب طبیب بھی نہ تھے آپ نے ایک نسخہ تجویز کر کے اس کو دیا کہ یہ دوا پی لو۔ تو آپ کہتے ہیں کہ حضرت اگر پیٹ میں دوا پینے کی گنجائش ہوتی تو میں کھانا ہی اور نہ کھاتا۔ اس

کے نزدیک بھی درد کا علاج کھانا ہی تھا۔

ایسے ہی آج کل لوگوں نے مرضِ حرق کا علاج اٹھا کیا ہے۔ اور یہ بھی وہ لوگ کرتے ہیں جو مرض سمجھتے ہیں ورنہ عام طور پر تو اس کو مرض بھی نہیں سمجھتے۔

آج کل کی ترقی | چنانچہ آج کل تعلیم یافتہ لوگوں نے مرض کا نام ترقی رکھا ہے اور اس کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں مگر صاحبِ

عنوان بدلتے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو کا نام کا سب رکھے اور اس کو الکا سب حبیب اللہ کا مصداق بنانے لگے یا جیسے ایک بد نے کہا تھا کہ ہم جو صاحبوں کو لوٹتے ہیں یہ جائز ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ۔

اور سلطانِ روم نصاریٰ سے موالات رکھتا ہے تو رنعود باللہ وہ بھی منہم ہے۔ اس سے ہر طرح لینا جائز ہے اور ہم حجاج کو اسی واسطے لوٹتے ہیں تاکہ دباؤ میں سلطان ہم کو دے۔

یا جیسے معتزلہ اپنے کو اہلِ توحید و اہلِ عدل کہتے ہیں کیونکہ وہ زیادتِ صفات کے منکر ہیں اور عاصی کی مغفرت کو بدوئے عذاب کے ناجائز کہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کو مواسد اور اہلِ عدل کہتے ہیں۔ اور تمنا شاید ہے کہ آج کل بعض نیچری اپنے کو معتزلی کہتے ہیں۔ حالانکہ جس جماعت کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرنا چاہتے ہیں وہ جماعت اس لقب سے نفرت کرتی ہے اور

اس کی اپنے سے نفی ترقی ہے۔ کیونکہ معتزلہ کا لقب تو ان کو ہم نے دیا تھا۔
 لا حترالہم عن جماعة الحق ورنہ وہ اس لقب سے خوش نہ تھے۔ اس
 کی ایسی مثال ہے جیسے شیعہ کو ہم لوگ رافضی کہتے ہیں مگر وہ اس لقب سے
 جلتے اور ناخوش ہوتے ہیں۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک سنی محرم کے زمانہ میں شیعوں کی مجلس میں
 جانے لگا۔ وہ خاص مجلس تھی جس میں سنیوں کے آنے کی مخالفت تھی۔ دروازہ
 پر پہرہ تھا جو کوئی اندر نہ جاتا اس سے پہلے پوچھ لیتے تھے کہ تم کون ہو۔ جو کوئی
 شیعہ بتلاتا اس کو اندر جانے دیتے ورنہ روک دیتے۔ جب یہ سنی صاحبِ دروازہ
 پر پہنچے تو ان سے بھی پوچھا گیا۔ تو آپ کہتے ہیں کہ ہم رافضی ہیں۔ سب سمجھ گئے
 کہ یہ سنی ہے کیونکہ شیعہ اپنی زبان سے کبھی خود کو رافضی نہ کہے گا۔ چنانچہ میاں
 نکال دیئے گئے۔ اسی طرح کوئی معتزلی اپنی زبان سے خود کو معتزلی نہیں کہہ
 سکتا۔ یہ آج کل کے نیچریوں کی کم علمی ہے جو لقب مذلت کو خود اختیار کر رہے
 ہیں۔

بہر حال عنوان کے اچھا ہونے سے معنون اچھا نہیں ہو سکتا۔ ورنہ پھر
 ڈاکو بھی اپنے کو کاسب کہہ سکتا ہے اور بدوؤں کا فعل بھی مستحسن ہو جائے گا۔
 پس ترقی کا عنوان تو عمدہ ہے کیونکہ قرآن میں بھی اس کا امر آیا ہے فاستبقوا
 الخیرات استباق کے معنی ہیں ایک دوسرے پر سبقت کرنا۔ یہی ترقی
 کا حاصل ہے۔

یہاں سے ایک مترجم قرآن کی غلطی واضح ہو گئی۔ جس نے یا ابانا انا

وہبنا لتتبع میں استباق کا ترجمہ کبڑی سے کیا ہے کیونکہ کبڑی میں ایک دوسرے پر دوڑنے میں سبقت مقصود نہیں ہوتی۔

دوسرے کبڑی کا میدان اتنا وسیع نہیں ہوتا جس میں سب کھیلنے والے اتنے دور چلے جائیں کہ ایک بچہ کو بھڑیا اٹھالے جائے اور کسی کو خبر نہ ہو بلکہ یہ بات دوڑنے میں بے شک ہوتی ہے کہ دو جماعتیں آپس میں دوڑیں کہ کون کون سے لگے نکلتا ہے۔ تو اس میں ایسا ہو سکتا ہے کہ سب کے سب دوڑتے ہوئے اتنی دور نکل جائیں کہ جس لڑکے کو سامان پر بٹھایا جائے وہ نظروں سے غائب ہو جائے۔

تیسرے کبڑی کا لفظ نہایت قبیل ہے جو فصحاء کے کلام میں مستعمل نہیں ہوتا اس لئے بھی ترجمہ قرآن میں اس کا لکھنا معیوب ہے کیونکہ قرآن کا ترجمہ ایسا فصیح و بلیغ و پر شوکت ہونا چاہئے۔ مگر باوجود ان غلطیوں کے وہ ترجمہ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑا مقبول ہے۔ حالانکہ معنوی غلطیوں کے ساتھ اس میں لغوی غلطیاں بھی بہت ہیں۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بہت عمدہ ہے۔ اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔

مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے کہ باہم ترقی خیرات میں ترقی کرو۔ اب فیصلہ اس پر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو وہ خیر ہے یا نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت

نہیں کر سکتے۔

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے۔

وانه لحب الخير لشدید اور کتب علیکم اذا حضرو

احدکم الموت ان تترك خیر الوصیة للوالدین

یہاں خیر سے مراد مال ہے۔ لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوتی۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ فاستبقوا الخیرات میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت

کرو۔ اور مال خیر مطلق نہیں بلکہ خیر مفید ہے جس کی خیریت کے لئے بہت سی

شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے۔ لہذا تم اپنی ترقی مالی کو ترقی خیر نہیں کہہ

سکتے۔ اور جس درجہ میں مال خیر ہے اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں

ہیں بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے حسب

الحلال فرضیۃ بعد الفرضیۃ۔

مگر تم ہی بتاؤ کہ جیسی ترقی آج کل دینی زمانہ تحریکات میں، ہو رہی تھی

کیا وہ خیر تھی؟ کیا اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو پنڈت کا

لقب دیا گیا۔ ہندوؤں کو مولا کہا گیا، قشتے لگائے گئے۔ گائے کے گوشت کو

ممنوع کہا گیا۔ مسلمانوں سے قربانی کی گامیں چھینی گئیں اور ایک ہندو کی نسبت

کہا گیا کہ ہوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو وہ بنی ہوتا پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں

اُن سے قطع تعلق نہیں کیا گیا بلکہ اُن کو بدستور لیڈر مانا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس

صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی تو فرعون سب سے

زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی

کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم تو محض ملائے ہو تم کو سیاسیات کی کچھ خبر نہیں۔ یہ وقت جائز و ناجائز کے سوال کا نہیں۔ اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہئے۔

افسوس! الی لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ ملاناپن ہی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملاناپن ہی کا پھیلاؤ ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

الذین ان مکنا ہم فی الارض اقاموا الصلوة و اتوا الزکوة و امروا بالمعروف و نهوا عن المنکر۔

مگر لوگ اسی کو مٹا رہے تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کو نہ کہہ سکتا ہے پس حرم کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کے عیب کو چھپانا چاہا ہے۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے۔

مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کو مرض سمجھتے ہیں۔ **ہوس اور موت** لیکن وہ اس کا علاج خود کرنا چاہتے ہیں اور ان کا علاج کیتے ہیں۔ ان کے علاج کا حاصل یہ ہے کہ ایک دفعہ خوب جی بھر کر ہوس کو پورا کر لو۔ پیٹ بھر کے گناہ کر لو۔ لڑکوں اور عورتوں کو خوب گھور لو۔ پھر توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ ایک جٹلمین مجھ سے ملے جو انگریزی پڑھ رہے تھے اور دین

کا بھی کچھ خیال تھا۔ وہ کہنے لگے کہ میری نیت مستقل کے متعلق یہ ہے کہ انگریز پڑھ کر بی اسے پاس کر کے بڑی سی نوکری کروں گا اور خوب پیٹ بھر کے رشوت لوں گا۔ اور مال جمع کر کے ایک دو گاؤں خرید کر ملازمت کو ترک کر دوں گا۔ پھر زندگی بھر اللہ کرے گا۔

اس غلطی میں جاہل صوفی بھی مبتلا ہیں۔ وہ بھی تقاضائے معصیت کا علاج اسی طرح کرتے ہیں کہ ہوں کو اچھی طرح پورا کر کے پھر توبہ کر لینا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط خیال کا اس حدیث میں جواب دیا ہے اور جواب بھی حکیمانہ دیا ہے۔ حکیمانہ نہیں دیا۔ ضابطہ کا جواب تو یہ بھی کافی تھا کہ یوں فرمادیتے کہ ازالہ محرم کی نیت سے بھی ہوس پورا کرنا اور ازالہ تقاضائے گناہ کی نیت سے گناہ کرنا بھی جائز نہیں مگر اس جواب سے فلسفی و مارع والوں کو تسلی نہ ہوتی۔ وہ اس کے ناجائز ہونے کی وجہ نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے آپ حکیمانہ جواب دیتے ہیں کہ محرم کے مقتضائے عمل کرنے سے جی بھر نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جن میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ پس یہ خیال ہی غلط ہے کہ ہوس کے پورا کرنے سے ہوس بجھ جائے گی۔ بلکہ جتنا اس کو پورا کرو گے یہ اتنا ہی بڑھے گی۔ انسان کی ہوس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ تراب سے مراد تراب قبر ہے یعنی موت کے سوا کوئی چیز ہوس کو نہیں بھر سکتی۔ شیخ سعدیؒ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے۔

گھٹت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پر کند یا خاک گور

موت کو ہوس کا پیر کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس سے ہوس منقطع ہو جاتی ہے۔ گو پوری اس وقت بھی نہیں ہوتی۔ مگر موت سے قطع ہر صراطِ راستی ہے اور ایسے وقت میں قطع ہے کہ تم کو اس قطع سے نفع نہیں پہنچ سکتا۔ مرنے کے بعد تو کفار بھی مومن ہو جائیں گے۔ مگر وہ ایمان کا لہجہ اور غیر قابل اعتبار ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ مرتے ہوئے ایمان لانے کے نافع نہ ہونے کی تصریح فرماتے ہیں۔

فَلَمْ يَلْبِسْهُمْ اِيْمَانَهُمْ کہ عذاب کا معائنہ ہو جانے
لَعَادُوْا وَّاسْتَنَآ کے بعد ایمان نافع نہیں۔

اور یہی ایمان منہی ہے امام صاحب کے اس جواب کا کہ امام صاحب سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ اس شخص کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہتا ہے کہ جہنم میں کوئی کافر نہ جائے گا۔ امام صاحب نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ فتوے دو۔ سب نے یہ کہا یہ شخص کافر ہے جو نص صریح کا منکر ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کیا اس کے قول میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی۔ لوگوں نے کہا اس میں کیا تاویل ہوگی۔ فرمایا ممکن ہے کہ اس نے کفر لغوی کا ارادہ کیا ہو، کفر شرعی مراد نہ لیا ہو اور کافر جب مرتا ہے تو خدا پر ایمان لے آتا ہے۔ لہذا لغت وہ مومن ہے جو شرعاً چونکہ یہ ایمان معتبر نہیں اس لئے کافر ہے۔ لہذا اس کا مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جو بھی جائے گا وہ لغت مومن ہوگا کافر نہ ہوگا۔

تو ایسے ہی مرتے ہوئے گو سب کی حرم منقطع ہو جائے گی مگر یہ نقصان

معتبر نہیں۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے علاج سے حرق قطع ہو گیا۔
گئی گو موت ہی کے وقت ہوئی۔

جواب یہ ہے کہ انقطاع آپ کے علاج سے نہیں ہوا بلکہ موت
سے اضطرار ہوا۔ اس لئے یہ انقطاع مفید نہیں۔ پس یہ علاج ہی غلط تھا کہ سو
گناہ کرنے سے حرق بھر جائے گی۔ ہرگز نہیں! بلکہ اس کو دینی ترقی ہوگی۔ کیونکہ
فلسفی مسئلہ ہے کہ جس وقت وقت سے جتنا کام لیا جاتا ہے اتنا ہی وہ وقت
زور پکڑتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے۔ پس نگاہ بد کرنے سے مرض نگاہ بد کو
سکون نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی جڑ اور مضبوط ہو گئی اور ایک بار گھور لینے سے جو سکون
ہو جاتا ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے کیونکہ یہ عارضی سکون ہے۔
اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمباکو کھانے والے کو جب تمباکو کی طلب
ہوتی ہے، تو اس وقت ایک بار کھا لینے سے کچھ دیر کو سکون معلوم ہوتا ہے مگر
درحقیقت اس کا اس وقت تمباکو کھا لینا زیادت طلب کا سبب ہے۔ اس
سے طلب میں کچھ کمی نہیں ہوتی بلکہ ہر دفعہ کے کھانے میں عادت اور بھتہ ہو
جاتی ہے۔

گناہ اور طاعت کا کمال | اسی طرح ایک بار گھورنے سے غوری

عادت بھتہ ہو رہی ہے۔ کیونکہ سکون کی وجہ رو میں ایک تو خروج علت سبب
ہے کہ جو چیز پریشانی کی علت تھی وہ اندر سے باہر نکل جائے اور ایک
سبب یہ ہے کہ وہ تہہ اور جڑ میں بیٹھ جائے۔ اس سے بھی قدرے سکون

ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے حوض میں ایک ڈھیلہ گر پڑے جس سے حوض گدلا ہو جاتا ہے پھر وہ تہہ کے اندر بیٹھ جائے تو تھوڑی دیر میں پانی صاف نظر آنے لگتا ہے مگر وہ ایسا صاف ہے کہ جہاں کوئی ذرا محسوس ہوگا، تو حوض پہلے سے زیادہ گدلا ہو جائے گا۔

اسی طرح یاد رکھو کہ نگاہ بد کرنے سے مرض کو سکون نہیں ہوتا بلکہ فوت ہوتی ہے اور اس عارضی سکون کی ایسی حالت ہے کہ جیسے درخت کی جڑ میں جب پانی دیا جاتا ہے تو وہ تھوڑی دیر میں نظروں سے غائب ہو جاتا ہے مگر واقع میں غائب نہیں ہوا بلکہ اب وہ شاخوں اور پتوں میں رطوبت بڑھا کر ظاہر ہوگا اور جڑ کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرے گا۔ پس جو لوگ مقتضائے تقاضا پر عمل کرتے ہیں، وہ حقیقت میں تقاضے کو کم نہیں کرتے بلکہ اس کی آبیاری کرتے ہیں۔

یہ میں جہلا صوفیاء کی غلطی بیان کر رہا ہوں کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو دوسرے نہ آئے۔ گناہ کا خطرہ نہ آوے اور جب یہ بات حاصل نہیں ہوتی تو وہ اس کی یہ تدبیر کرتے ہیں کہ لاؤ ایک دفعہ اس خطرہ پر عمل کر لیں پھر سکون ہو جائے گا۔ یہ ان کی سخت غلطی ہے۔

اول تو یہ مطلوب ہی صحیح نہیں کہ گناہ کا خطرہ نہ آئے۔ اگر تم کو گناہ کا دوسرے اور خطرہ ہی نہ آئے تو پھر طاعات میں تمہارا کمال ہی کیا ہوگا۔ پھر تو تم دیوار کی طرح ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اس کو بھی گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن دیوار اگر نہ نہ

نہ کرے تو کیا کمال ہے۔ اندھا نا محرم کو نہ دیکھے تو کیا کمال ہے۔ بہر غیب نہ سنے تو کیا کمال ہے۔ صاحبِ انور اسی میں ہے کہ تم کو گناہ کا تقاضا ہو اور تقاضے کا مقابلہ کرو۔ گھورنے کو جی چاہے اور نگاہ بد کو روکو۔ پھر دیکھو قلب میں کیسا نور اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں اس کے متعلق وارد ہوا ہے۔
وحد حلاوتہ الایمان کہ نگاہ کو روکنے سے علاوتہ

ایمان نصیب ہوتی ہے۔

بجلا یہ بات اس شخص کو کہاں نصیب جسے تقاضا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں :-

شہوت دنیا مثال گلخن است کہ از دو حام تقویٰ روشن است
اس تقاضے ہی سے تو تقوے کا حام روشن اور تقوے کا کمال ظاہر ہوتا ہے پس اول تو اس کے نہ ہونے کی طلب ہی بھل ہے۔ پھر اس کا جو علاج کیا گیا ہے وہ بالکل الٹا علاج ہے بلکہ علاج صرف یہ ہے کہ تقاضے کا مقابلہ کرو اور گو مقابلہ تقاضا سے یہ تقاضا زائل نہ ہوگا مگر ضعیف ضرور ہو جائے گا جس کے بعد پھر متقاومت سہل ہو جائے گی اور یہ بھی بڑا نفع ہے کہ دشمن ضعیف ہو جائے۔

یہاں سے ایک حدیث سے اشکال رہا
ماہ رمضان اور شیطان ہو گیا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے۔

اذا دخل رمضان صدقت الشیاطین
کہ جب رمضان آتا ہے، تو شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر رمضان میں گناہ کیوں ہوتے ہیں۔ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ سب قید نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے شیاطین قید ہوتے ہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں مودۃ الشیاطین آیا ہے۔ تو چھوٹے قید نہیں ہوتے اور رمضان میں صدور معاصی انہیں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اگر سب بھی قید ہو جائیں تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ معاصی کا سبب تقاضائے نفس بھی ہے پس شیاطین کے قید ہو جانے کے بعد جو گناہ ہوتے ہیں ان کا منشاء تقاضائے نفس ہے۔

مگر اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب چھوٹے شیاطین قول اول پر اور تقاضائے نفس قول ثانی پر گناہ کرانے کے لئے موجود ہیں تو پھر شیاطین کے قید ہونے سے کیا فائدہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی نفع ہے کہ چوروں کی جماعت کم ہو جائے رمضان سے پہلے اگر ہزار چور تھے تو اب سو رہ گئے اور دوسرے قول پر تو صرف ایک ہی رہ گیا اور ظاہر ہے کہ ایک چور کا ہونا ایک جماعت کے ہونے سے سہل ہے۔ اس کا مقابلہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے کم گناہ ہوتے ہیں تو جو شخص تقاضے کے ضعیف کرنے کے لئے اس کے معتقداً پر عمل کر رہا ہے وہ درخت کو پانی دے کر گرایا جاتا ہے۔ حالانکہ پانی سے تو جڑ اور مضبوط ہوگی۔ اس کی صورت تو یہی ہے کہ اس کو بالکل سکھا دو۔ تاکہ جڑ کمزور ہو جائے۔ پھر وہ خود ہی گر پڑے گا۔ بس ان لوگوں کے علاج کی وہی حالت ہے جس کو طبیب روحانی کی حکایت میں مولانا فرماتے ہیں کہ اس نے دوسرے

طبیعوں کے علاج کو سن کر کہا تھا ۔

گفت ہر وار و کما بیشاں کردہ اند

آن عمارت نیست یراں کردہ اند

بے خبر بودند اندہ حال دروں

استعین اللہ مما یفترون

خود رانی کے علاج کی یہی گت ہوتی ہے کہ اس سے

الٹا مرض ہی بڑھتا ہے۔ اس لئے اس طریق میں دشگرو

کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ یہ راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ مگر دست گیری سے

مراد ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنا نہیں ہے بلکہ دست گیری سے مقصود یہ

ہے کہ ایک شخص راہ تباہنے والا ہو اور تم اس کا اتباع لازم سمجھو۔ بیعت کی

ضرورت نہیں۔ دست گیری بدولن بیعت کے بھی ہو سکتی ہے

دیکھو اگر کوئی اندھا حافظ کسی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلے تو

کیا وہ اس کا مرید ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ مگر لڑکا حافظ جی کا دست گیر ضرور ہے۔

کیونکہ راستہ دیکھنے کے فن میں وہ حافظ جی سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ بصر ہے

اور حافظ جی ضربہ ہیں یعنی اندھے۔ وہ ان کی دست گیری کر کے منزل پر

ضرور پہنچا دے گا۔

بشرطیکہ وہ ایسا دست گیر نہ ہو جیسے ایک حافظ جی دعوت کھا کر ایک

لڑکے کے ساتھ واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں کھائی یعنی خدق آئی تو لڑکے

نے کہا، حافظ جی کھائی۔ تو وہ فرماتے ہیں ہاں بٹیا خوب کھائی۔ اس نے پھر

کہا، حافظ جی کھائی۔ وہ یہی کہتے رہے ہاں بٹیا خوب کھائی۔ آخر کو گڑھے

میں گر پڑے تو اس پر بڑے خفا ہوئے کہ تو نے بتلایا کیوں نہیں۔ اس نے

کہا کہ میں نے تو بار بار کہا تھا، حافظ جی کھائی۔ حافظ جی کھائی۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ تجھے یوں کہنا چاہئے تھا، حافظ جی خندق۔

تو ایسا درست گیر تو واقعی دھکے دے گا جو مخاطب کی حالت کو سمجھ کر اس کے موافق علاج نہ کرے اور اگر دست گیر کامل ہے تو وہ ضرور منزل پر پہنچا دے گا۔ اگر تم اس کا اتباع اور انقیاد کرتے رہے۔ باقی بیعت تو جھگڑا ہے۔ اہل بیعت تو انقیاد ہی ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے اس کو خوب سمجھا۔

حافظ محمد ضامن صاحب اور ہمارے حاجی صاحب
معاہدہ بیعت میں یہ معاہدہ قرار پایا تھا کہ جہاں ایک صاحب

بیعت ہوں وہ دوسرے کو خبر کر دیں۔ وہ بھی اپنی بزرگ سے بیعت ہو گئے پھر حضرت حاجی صاحب لوٹاری جا کر میاں جی صاحب سے بیعت ہو گئے اور حافظ صاحب سے تذکرہ کرنا بھول گئے۔ جب حافظ صاحب نے دیکھا کہ یہ بار بار لوٹاری جانتے ہیں تو دریافت کیا کہ آپ بار بار لوٹاری کیوں جایا کرتے ہیں۔ تب فرمایا کہ میں ایک بزرگ سے بیعت ہو گیا ہوں۔ فرمایا اول ہمارا تم سے تو معاہدہ ٹھہرا تھا کہ دونوں ایک ہی جگہ بیعت ہوں گے۔ آپ نے ہم سے کیوں نہ تذکرہ کیا۔ فرمایا میں بھول گیا تھا۔ اب چلے چلو۔ چنانچہ حافظ صاحب بھی ہمراہ ہو لئے۔ جب آپ لوٹاری پہنچے تو میاں جی صاحب نے دریافت فرمایا کہ حافظ صاحب کیسے آئے۔ عرض کیا حضرت بیعت کے ارادہ سے آیا ہوں۔ فرمایا بھائی میں تو بزرگ نہیں ہوں۔ ایک میاں جی ہوں

بچوں کو پٹھاتا ہوں۔ کسی بزرگ سے بیعت ہونا چاہیے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ میں نے تو اپنا ارادہ عرض کر دیا۔ اگے آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد حافظ صاحب ہمیشہ لوہاری آتے جاتے رہے۔ اور بیعت کے لئے پھر عرض نہیں کیا۔ آخر میانجی صاحب نے خود ہی ایک بار فرمایا کہ حافظ صاحب کیا اب بھی وہی خیال ہے۔ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں تو دل سے بیعت ہو چکا ہوں کیونکہ بیعت اعتقاد ہی ہے۔ باقی بزرگوں پر اصرار کرنا بے ادبی ہے۔ اس لئے صورت بیعت پر میں نے اصرار نہیں کیا فرمایا، اچھا وضو کر کے آ جاؤ اور بیعت ہو جاؤ۔

تو دیکھئے! حافظ صاحب نے صورت بیعت پر اصرار نہیں فرمایا پس اپنے اعتقاد و انقیاد کو کافی سمجھا۔ پھر خود ہی شیخ نے بیعت کے لئے فرمایا۔ تو صورت بیعت بھی نصیب ہو گئی۔ مگر جیسے حافظ صاحب کو شیخ نے دیر سے بیعت کیا تھا ایسے ہی وہ بھی بہت دیر میں بیعت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں سے اس کی کسر نکالی۔ چنانچہ عمر بھر میں آٹھ سے زیادہ آپ کے مرید نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آپ نے حاملان عرش کی شمار پوری کر دی۔ وہ بھی آٹھ ہی ہیں۔ اور حضرت حاجی صاحب بہت جلد بیعت کر لیتے تھے کیونکہ آپ کو میانجی صاحب نے فوراً بیعت کر لیا تھا۔ حضرت حاجی صاحب پہلے شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ پھر تکمیل سے پہلے ہی ان کا وصال ہو گیا تھا۔ تو حضرت کو دوسرے شیخ کی تلاش تھی اور اس تلاش میں بے چین تھے اور شاہ سلیمان صاحب

اسے بیعت ہونے کا کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ مشہور تھے
 اسی عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اپنے مشائخ میں سے کسی کو (اللہ صنی)
 آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضور کے ساتھ ایک بزرگ ہیں۔ اور حضور نے
 حاجی صاحب کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ یہ تمہارے شیخ ہیں۔ حاجی
 صاحب خواب سے بیدار ہوئے تو بڑے پریشان تھے کہ یا اللہ یہ کون بزرگ
 ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ خواب میں پتہ کچھ نہیں بتلایا گیا۔

آخر ایک دن کسی شخص سے میاں نجی صاحب کا تذکرہ سنا تو قلب کے
 اندر میاں نجی صاحب کی طرف ایک خاص کشش پائی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ تو یہاں
 سے قریب لوہاری ہی میں رہتے ہیں۔ تو حضرت نے زیارت کا ارادہ کیا۔ اب
 حالت یہ تھی کہ جوں جوں لوہاری کی طرف بڑھتے جاتے اسی قدر دل میں کشش
 بڑھتی جاتی جیسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ جب لوہاری پہنچے اور میاں نجی صاحب کی
 صورت دیکھی تو بعینہ وہی صورت تھی جو خواب میں دکھائی گئی تھی۔ اب تو
 حاجی صاحب کی اور ہی حالت ہوئی۔ قریب جا کر سلام عرض کیا تو میاں نجی صاحب
 نے در یافت فرمایا کہ صاحبزادے کیسے آنا ہو گیا۔ پس حاجی صاحب پر گریہ
 طاری ہو گیا اور جوش میں غرض کیا کہ کیا حضرت کو معلوم نہیں ہے کہ معلوم اس
 وقت حاجی صاحب پر کیا حالت تھی، اس کے جواب میں میاں نجی صاحب نے
 ارشاد فرمایا کہ صاحبزادے خواب و خیال کا کیا اعتبار۔ اس میں خواب کی طرف
 اشارہ تھا۔ اب تو حاجی صاحب کو اور بھی یقین ہو گیا اور زیادہ گریہ طاری ہو گیا
 اب میاں نجی صاحب نے تسلی فرمائی کہ آپ گھبراؤ نہیں۔ جو غم چاہتے ہو، وہی

ہو جائے گا۔ چنانچہ فوراً بیعت فرمالیا۔

حضرت حاجی صاحب پر یہی اثر غالب تھا کہ طالب کو پریشان نہیں کرتے تھے مگر دونوں صاحبوں کی نیت بخیر تھی۔ حاجی صاحب کی نظر وسعت رحمت پر تھی۔ اس لئے فیض کو عام کر رکھا تھا اور حافظ صاحب کی نظر اس پر تھی کہ سلسلہ کی بے قدری نہ کرنا چاہئے بلکہ اچھی طرح طلب کا امتحان کرنے کے بعد بیعت کرنا چاہئے۔

الغرض صورت بیعت کی تو ضرورت نہیں مگر کسی کو رہبر بنالینے اور اس کے اتباع کرنے کی اس طریق میں بہت ضرورت ہے۔ اپنی رائے پر عمل کرنا اس طریق میں سخت مضر ہے کیونکہ دای العلیل علیل۔ مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاؤرا اندر میں صحر مرو

ہر کہ تنہا نادراں رہد را برید ہم بعون ہیئت مرواں رسید

یہ اپنی رائے ہی سے علاج کرنے کا نتیجہ ہے کہ بعض جاہل تقاضائے معصیت

ضرورت رہبر و دست گیر

کے مقتضا پر عمل کر کے اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

ایک سالک میرے ساتھ سفر میں بڑوت کے رستہ میں تھے۔ وہ ایک مرض میں مبتلا تھے کہ نظر بد کو مفید سمجھتے تھے تاکہ تقاضا فرو ہو جائے۔ پھر میں ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا کہ اس طرح تو مرض دن بدن بڑھتا جائے گا۔ ہرگز سکوا نہ ہوگا۔

صاحبو! یہ الٹا علاج معصیت تو ہے ہی مگر اس میں کفر کا بھی اندیشہ ہے۔

کیونکہ یہ شخص معصیت کو مضر نہیں سمجھتا بلکہ مفید سمجھتا ہے اور اس کو طاعت کا
مقدمہ بناتا ہے اور مقدمہ طاعت طاعت ہے۔ تو اس نے گویا گناہ کو
طاعت سمجھا اور یہ قریب کفر ہے۔ اسی لئے ایک بزرگ نے عوام کو خطاب
کیے کہ فرمایا تھا کہ اگر تم غلطی کرتے ہو تو طاعات سے معافی میں آئے ہو۔
اور ہم غلطی کرتے ہیں تو ایمان سے نکل کر کفر میں جاتے ہیں۔ اور وہ اس کی
یہ ہے کہ یہ طریق نہایت لطیف ہے اور غذا جتنی لطیف ہوتی ہے اتنی ہی
جلدی سڑتی ہے اور سڑنے کے بعد اس میں کثیف غذا سے زیادہ نقص ہوتا
ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس طریق میں کسی کو رہبر اور دست گیر بنایا جائے
ورنہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور جس کو رہبر بنایا جائے اس کے
اتباع کی ضرورت ہے۔ صرف بیعت کافی نہیں۔

مگر اب تو اس لئے بیعت ہوتے ہیں کہ آئے دن مقدمات و امراض
وغیرہ میں تعویذ و ان کی ضرورت ہوتی ہے اور تعویذ گنڈے والے ہر دفعہ میں
طلب کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ایک کو پیر بنا لیا تا کہ عمر بھر کے لئے مفت
تعویذ لکھوائے گا ٹھکانا ہو جائے یا یہ نیت کرتے ہیں کہ مقدمات میں دعا کہنے
کو اور اللہ میاں سے لڑنے بھڑنے کو ایک شخص کو پیر بنا لے۔ واقعی آج کل بہت
لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ مشائخ اللہ میاں کے رشتہ دار ہیں کہ بس جس بات
کے لئے دعا کریں گے وہ ضرور ہو جائے گی اللہ تعالیٰ ان کے خلاف کر
ہی نہیں سکتے۔ نعوذ باللہ!

بعض کا یہ خیال ہے کہ پیر آخرت میں ہمارے گناہ اپنے سر لاد لے گا۔ اور ہمیں بخشوا لے گا۔

شفاعت انبیاء اور پیر

پھر جو چاہو کرو۔ تو پھر پیر کیا ہوا بھنگی ہوا کہ تمہارا پاخانہ اٹھا لے گا۔ استغفر اللہ
اسے میاں اقیامت کے دن انبیاء کا تو پتا پانی ہو جائے گا پیر بے چارہ کی
تو کیا ہستی ہے۔ کیا تم کو شفاعت کی حدیث یاد نہیں کہ لوگ حضرت آدم علیہ
السلام کے پاس اول جائیں گے کہ حق تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لئے سفارش
کر دیجئے۔ وہ کہیں گے نفسی نفسی۔ مجھے اپنی ہی فکر ہے۔ مجھ سے ایک قصور ہو
گیا تھا۔ اگر آج سوال ہو گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے بعد پھر نوح علیہ
السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ تو سب
نفسی نفسی کہیں گے۔ اور کچھ نہ کچھ عذر کر دیں گے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا شفاعت کے لئے آمادہ ہو جانا اور کوئی عذر نہ کرنا اس وجہ سے نہ ہو گا کہ آپ
خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہیں را استغفر اللہ آپ تو سب سے زیادہ خائف ہیں
انا اعلمکم باللہ و اخشاکم للہ مگر آپ کو اشارہ اور اذن ہو جائے گا اس لئے
آپ عذر نہ کریں گے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے یہاں بد و ن اذن کے کوئی شفاعت
نہیں کر سکتا۔ نفس موجود ہے۔ من والذی یشفع عندہ الذباذنب۔ اس لئے ماننا
پڑے گا کہ آپ اذن کے بعد شفاعت فرمائیں گے اور اذن کے بعد جو شفاعت
ہوگی اس کی تو یہ حالت ہوگی۔

ہم دعا کرتے تو اجابت ہم ز تو ایمنی اذ تو مہابت ہم ز تو

اور

ناچو چنگیم و تو زخمہ مے زنی زاری ازمانے تو زاری مسکینی
 جب وہ خود کہہ دیں گے کہ تم شفاعت کرو ہم قبول کریں گے۔ تو پھر
 یوں کہنا چاہئے کہ وہ خود ہی بخشنا چاہتے ہیں۔ بخشوانے کا نام ہی نام ہوگا۔ باقی
 اگر وہ بخشنا نہ چاہیں تو انبیاء بھی کسی کو نہیں بخشوا سکتے۔ پھر بے چارہ پیر تو کس شمار
 میں ہے۔

پس یہ خیالات تو محض لغو ہیں اور اس نیت سے بیعت ہونا کچھ مفید
 نہیں بلکہ اس طریق میں شیخ کے وجود کی مصلحت یہ ہے کہ وہ غلطیوں پر تائب کرتا ہے
 مقدمات میں دعا کرنے اور تعویذوں کے واسطے نہیں ہے۔ نہ وہ قیامت میں
 بخشوانے کا ذمہ دار ہے۔ ان خیالات کو قلب سے نکال دینا چاہئے۔ اور شیخ
 کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ نہ معلوم آخرت میں پیر مرید کو بچائے یا مرید پیر کو بچائے
 شیخ اپنے کو مریدوں سے بڑا نہ سمجھے۔ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون بڑا ہے
 اس لئے شیخ کو بھی چاہئے کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرتا رہے اور معاملہ
 میں ان سے رائے لیا کرے اور عام مسلمانوں سے دعا بھی کرائے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرص کا صحیح علاج بتاتے
حرص کا صحیح علاج ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ تمہارے علاج کی غلطی بھی

معلوم ہو گئی کہ زیادہ مال جمع کرنا حرص کو کم نہ کرے گا۔ اس سے تو مال کی حرص
 اور زیادہ ہوگی کم نہ ہوگی۔ دوسرے زیادہ مال ہونے سے پھر اس کی حفاظت
 کی حرص ہوگی۔ اور اس سے مال کے ساتھ تعلق بڑھے گا۔ ہر وقت اسی دھن
 میں رہو گے کہ اس روپیہ کو کہاں رکھوں کس طرح بڑھاؤں پس زیادتی مال

سے تو پریشانی دن بدن بڑھ گئی کم نہ ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

جان ہمہ روز از لکد کوب خیال میشود مجروح و پائمال
نے صفا میاندش نے لطف و فر نے بسوئے آسمان راہ سفر
اور یہ تعلقات بتدی کو تو بہت ہی مضر ہیں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذاب محمود صاحب پیش چھاری
کو لکھا تھا کہ آپ مکہ میں بہ نیت ہجرت آنا چاہتے ہیں تو یہاں رہ کر اپنے لئے
صرف اتنی رقم منگائے کہ انتظام کیجئے جو آپ کے خرچ کے لئے کافی ہو
تقسیم کے واسطے نہ کوئی رقم ساتھ لانا نہ دال سے منگائے کہ انتظام کرنا۔
حالانکہ یہ صدقہ تھا جو موجب ثواب ہے مگر بتدی کو یہ بھی مضر ہے کہ اس
جھگڑے میں پڑے کہ صدقہ کس کو پہنچا اور کون دلا اور رقم اب تک کیوں نہیں
آئی۔ کہاں دیر ہوئی اور اپنے آپ کو دینے والا اور دوسروں کو اپنا محتاج
سمجھے۔

ہاں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے اقویاء کو یہ تعلقات مضر نہیں۔ ان
کی نسبتیں راستہ تھیں۔ اس لئے ان تعلقات سے ان کی توجہ الی اللہ کم نہیں ہوتی
تھی۔

حضرت خواجہ عبداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بڑا ساز و سامان تھا۔
سلطنت جیسے ٹھاٹھ تھے مگر مال سے بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ ایک فقیر
نے آپ کا امتحان لیتا چاہا کہ دیکھوں ان کو مال سے کتنا تعلق ہے۔ اس نے
ایک دن خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ اس سال

آپ کے ساتھ حج کروں۔ اُس نے دل میں سوچا ہو گا کہ خواجہ صاحب انتظام ریاست کا عذر کیسے کچھ طویل میرا و مقرر کریں گے۔ مگر وہاں کیا دیر تھی۔ خواجہ صاحب فوراً رونال جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا بہت اچھا چلو۔ فقیر نے کہا، حضرت ریاست کا تو کچھ انتظام فرما دیجئے۔ فرمایا یہ تو خدا کا مال ہے، وہ خود اس کی حفاظت کریں گے۔ میں تو ایک برائے نام محافظ ہوں۔ اگر میں نہ ہوں گا، تو وہ کسی دوسرے کو میری جگہ مقرر کر دیں گے۔ مجھے انتظام کی ضرورت نہیں اُس نے کہا، اچھا میں ذرا مکمل اور کپڑے مگر سے لے آؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا بس اسی پر اپنے کو دنیا سے بے تعلق سمجھتے ہو۔ مجھے تو اتنی بڑی ریاست کی بھی فکر نہ ہوئی اور تمہارا دل ابھی تک مکمل اور کپڑوں ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ درویش اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوجودیکہ سلطنت کرتے تھے مگر اس سے ایسے بے تعلق تھے کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ بھی نامزد نہیں کیا۔ نہ اس کا مرنے ہوئے کچھ تذکرہ کیا۔ نہ یہ فکر ہوئی کہ میرے بعد سلطنت کا کیا حال ہوگا۔ صرف دو وصیتیں فرمائی تھیں۔

ایک یہ کہ خلافت چھ آدمیوں کے مشورہ پر ہے۔ یہ جس کو چاہیں، خلیفہ منتخب کر لیں۔

دوسرے یہ کہ عبداللہ بن عمر کا خلافت میں تو کوئی حق نہیں مگر خلیفہ کو اُن سے مشورہ کرنے رہنا چاہئے۔ لاشہ رجل صالح کیونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔
تو جو شخص ان تعلقات میں مبتلا ہو کر اُن سے ایسا بے تعلق ہو اس کو تو

ضرر نہیں ہوتا۔ ورنہ عام طور پر تعلقات مضر ہیں۔ ان سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت تو یہ بات تقلیداً مان لی جائے۔ پھر جب آپ کو تعلق مع اللہ کے نور کا احساس ہوگا اس وقت ان تعلقات کی ظلمت کا بھی احساس ہو جائے گا۔ غرض حصر کا یہ علاج تو غلط ہے اور اس سے ہرگز ہوس نہیں بھرتی۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم نے ایک دفعہ سو سو گناہ کے بعد جی بھر کر گناہ کر لیا تھا۔ پھر توبہ کر لی تھی تو پھر اس کے بعد واقعی ہم کو اس گناہ کی ہوس نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جی بھر کر گناہ کر لینے سے ہوس بھر جاتی ہے۔ تو وہ علاج غلط نہ ہوا۔

سوالین اس کا جواب کان کھول کر سن لیں کہ یہ نفع جی بھر کر گناہ کرنے کا نہیں بلکہ وہاں دو چیزیں تھیں ایک جی بھر کر گناہ کرنا۔ دوسرے یہ ارادہ کرنا کہ پھر نہ کروں گا۔ تو یہ برکت اس عزم ترک کی ہے جس کو تم جی بھر کر گناہ کرنے کا اثر سمجھتے ہو۔ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دوا گٹے سے نیچے نہ اترتی تھی۔ مریض نے پانی کے ساتھ اس کو نگل لیا تو گٹے سے اتر گئی اور اس سے نفع ہوا۔ اب وہ بے وقوف یہ سمجھنے لگا کہ یہ نفع پانی سے ہوا ہے اور اسے مفید سمجھ کر خوب پینے لگا۔ تو ظاہر ہے ایک دن مرے گا اور اس بے وقوف سے ہر عاقل بھی کہے گا کہ میاں نفع تو دوا سے ہوا تھا۔ پانی کو اس میں کچھ دخل نہ تھا اس نے محض گٹے سے اتارا تھا اور اگر تم ہمت کر کے ویسے ہی نگل جاتے جب بھی نفع ہو جاتا۔ تمہارا پانی کو مفید سمجھنا حماقت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھنا

کہ یہ نفع محض عزم ترک کا ہے۔ گناہ کرنے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ کچھ ہی سہی مگر نفع تو ہوا اور جی بھر کے گناہ کرنے سے تقاضا تو دفع ہوا۔ چاہے عزم ترک کے ہی اقتراں سے سہی۔

تو میں تقسیم کہتا ہوں کہ اقتراں کو نفع میں کچھ دخل نہیں بلکہ محض عزم ترک ہی کو دخل ہے بلکہ اس عزم کے ساتھ گناہ کے منقسم ہو جانے سے نفع دیر میں ہوا اگر

گناہ منقسم نہ ہوتا تو نفع جلدی ہوتا دیکھ الفہام گناہ کے ساتھ عزم ترک سے کچھ نفع ہو جانا شاذ و نادر ہے ورنہ زیادہ تر یہ ہے کہ ارتکاب گناہ سے پہلے

تو عزم ترک بعض میں ہوتا ہے مگر گناہ کر لینے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ گناہ سے اکثر یہ عزم ضعیف و معدوم ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شاذ پر کوئی حکم نہیں

لگا سکتے۔ اگر کسی کو اتفاقاً زہر نقصان نہ دے تو اس سے زہر کو نافع نہیں کہہ سکتے۔ خوب سمجھ لو

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازالہ حرم کا صحیح علاج بتاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ویتوب اللہ علی من تاب اس میں توبہ کو علاج حرم بتلایا گیا

ہے جس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ۔ اور اس کا حرم کے لئے علاج ہونا ایک قاعدہ فلسفہ سے سمجھ میں آجائے گا۔ قاعدہ یہ ہے۔

المنفس لا تتوجہ الی شئی

کہ نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا

فی آن واحد

اور ظاہر ہے کہ حرم کی حقیقت توجہ اور میلان الی الدنیا ہے۔ اب

اس توجہ کو کسی دوسری شے کی طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہے گی

پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جائے اگر وہ طبعاً بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہوگی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا اور اگر ایسی شے کی طرف توجہ کی جائے جو طبعاً محبوب نہ ہو تو اس صورت میں یہ توجہ کمزور ہوگی۔ اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور ذات **تعلق باللہ** حق کی طرف ہر اک کو میلان طبعی ہے۔ فقط مسلمان ہی کو نہیں بلکہ کافر کو بھی۔ کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے اور وہ اسباب یہ ہیں۔ حسن و جمال یا جود و نوال یا فضل و کمال۔ اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے۔ اس سے محبت بھی قوی ہوگی۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ اوصاف بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں۔ دوسری اشیاء میں بالعرض ہیں۔ پس یوں کہنا چاہئے کہ محبت اور میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہے کہ ان میں صفات حق کا ظہور ہو رہا ہے۔ لیکن ان چیزوں پر نظر کا منحصر ہو جانا اس لئے ہے کہ لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں حق تعالیٰ کے اندر ہیں۔ جس وقت یہ معلوم ہوگا کہ حضرت حق ہی حسن و منعم ہیں اور وہی حسین و جمیل اور صاحب فضل و کمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظہور ہے اس وقت ہر شخص حق تعالیٰ ہی کی طرف مائل و متوجہ ہوگا۔

پس حضورؐ کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اس لئے یہ توجہ اشد و اکمل ہوگی تو جتنی توجہ الی اللہ کی طرف ہوگی اتنی ہی دنیا سے توجہ ہٹے گی۔ کیونکہ اوپر چیزوں

کی طرف توجہ نہیں ہو سکتا۔

مگر اس علاج میں ایک غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتا ہے تو عجب و ناز میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے کہ میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ ہو کر کامل ہو گیا ہوں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح حدیث کے عنوان ہی سے کر دی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے یہاں پر توجہ الی اللہ نہیں فرمایا۔ یتوب اللہ علی من تاب فرمایا ہے جس میں من تاب میں تو حرج کا علاج مذکور ہے کہ توجہ الی اللہ اس کا علاج ہے۔ اور یتوب اللہ بڑھا کہ یہ بتلا دیا کہ محض تمہاری توجہ سے یہ مرض زائل نہ ہوگا بلکہ علت تامہ کا جزو اخیر ایک اور چیز ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری توجہ کے بعد حق تعالیٰ بھی تم پر توجہ فرمائیں گے۔ تب یہ مرض زائل ہوگا اور جب خدا تعالیٰ کی توجہ علت تامہ کا جزو اخیر ہے تو اصل علاج خدا کی توجہ ہے محض تمہاری توجہ کافی نہیں۔ اس میں عجب و ناز کا علاج ہو گیا کہ اپنی توجہ اور طاعات پر ناز نہ کرنا کیونکہ اس سے کچھ نہیں ہوا بلکہ کام تو خدا کی عنایت سے بنا ہے اب اس مختصر حدیث میں چار مضمون بیان ہو گئے۔

ایک یہ کہ حرج مرض ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے مقتضایہ عمل کرنے اور اس میں زیادتیاں کرنے سے

تقاضا فرو نہ ہوگا بلکہ و ناز بڑھے گا۔

تیسرے یہ کہ اس کا علاج توجہ الی اللہ ہے۔

چوتھے یہ کہ اصل علاج خدا کی توجہ ہے جو عادت بندہ کی توجہ پر مرتب

و متفرع ہو جاتی ہے۔

توجہ الی اللہ جب حصر کا صحیح علاج معلوم ہو گیا تو اب سمجھئے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے۔ پس اسی پر میں بیان ختم کر دوں گا۔ بعض نے تو

یہ سمجھا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے روزہ رکھے اور احکام شرعیہ بجالائے۔ ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کیا۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی تقاضائے معصیت مضاعف کیوں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے۔

بعض نے یہ کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ مگر ان کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے اور دل میں گناہوں کا تقاضا شددید پاتے ہیں۔

تو سنا کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے۔ پس دونوں کو جمع کرنا چاہئے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو اور ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو۔ طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو۔ نگاہ کو روکو اور ناجحرموں کی باتیں

بھی نہ سنو۔ اس کے بعد بھی اگر فوراً نیت حاصل نہ ہو تو ہم پر ہنسنا۔ اس وقت میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے۔

چشم بند و لب پر بند و گوش بند گر نہ بینی نور حق بر ما بخت۔

اس وقت غلطی یہ ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہرہ کے تارک ہیں اور بعض اعمال باطنہ کے تارک ہیں۔ اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی۔ دونوں کو جمع کرنا چاہئے۔ پھر انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ اب میں دونوں کی قدر سے تفصیل بتلاتا ہوں۔

اعمال ظاہرہ | اعمال ظاہرہ میں سب سے اہم نماز ہے۔ اس میں خصوصاً عورتیں بہت کوتاہی کرتی ہیں۔ بعض تو پڑھتی ہی نہیں ہیں اور

ایسی ہی زیادہ ہیں۔ اور بعض پڑھتی ہیں مگر ان کا قرآن صحیح نہیں ہے اور نہ تصحیح کا اہتمام ہے۔ اور بعض کا قرآن بھی صحیح ہے لیکن وہ وقت کو بہت تنگ کر دیتی ہیں۔ ظہر کی نماز عصر کے وقت اور عصر کی مغرب کے وقت پڑھتی ہیں (حالانکہ مردوں کے لئے تو بعض اوقات میں تاخیر مسنون بھی ہے مگر عورتوں کے لئے

تو سب نمازیں اول وقت پڑھنا افضل ہے مگر یہ اول تو اول اخیر میں بھی نہیں پڑھتیں بلکہ اکثر قضا پڑھتی ہیں) بعض ان نمازوں کو قضا نہیں کرتیں جو ہر مہینہ میں ان سے غسل کی تاخیر کے سبب فوت ہو جاتی ہیں۔ اگر احتیاط کریں اور مسئلہ کو

اچھی طرح معلوم کر لیں تو اول تو ایسی ذبت ہی نہ آئے اور جو غلطی سے ایسا ہو جائے تو جلدی قضا کرنا چاہئے۔ عرض اعمال ظاہرہ میں نماز سب سے زیادہ اہم ہے اس کی اچھی طرح پابندی کرنا چاہئے اور دل لگا کر نماز پڑھا کریں۔

جلدی جلدی سر سے بیگار نہ اتاریں۔

باقی روزہ میں تو عورتیں بڑی بہادر ہیں۔ چاہے بیماری ہو یا تکلیف ہو اور حکیم بھی افطار کی اجازت دے دے مگر یہ روزہ قضا نہیں کرتیں لیکن اس کے ساتھ روزہ میں غیبت بھی بہت کرتی ہیں۔ کیونکہ صبح سے شام تک کچھ کام تو ہوتا نہیں بس بیٹھی ہوئی ادھر ادھر کی باتیں بتاتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان میں وہ عورتیں بہت اچھی ہیں جن کو تمباکو کی عادت کی وجہ سے روزہ بہت لگتا ہے۔ اگرچہ تمباکو بڑا برے۔ کیونکہ وہ روزہ کو الگ بھر ایک طرف کوٹا میں سر ڈالے پڑی رہتی ہیں۔ ان سے بغیر بان کھائے بات تک نہیں ہو سکتی تو وہ ان قصوں سے یعنی غیبت شکایت سے محفوظ رہتی ہیں۔ مگر اب جاڑوں کے روزے آرہے ہیں۔ اس لئے جن کو روزہ بہت لگتا ہے اب ان کو بھی کم لگے گا۔ بہر حال روزہ رکھنے کی توجہ غیب دینے کی ان کو ضرورت نہیں۔ اس کو تو عورتیں خود بہت شوق سے کر لیتی ہیں البتہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کی میں انکو تاکید کرتا ہوں کہ فضول اور گناہ کی باتوں میں روزہ کو برباد نہ کیا کریں بلکہ قرآن پڑھا کریں۔ بزرگوں کی حکایات دیکھا سنا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو ایک طرف پڑ کر سوچا کریں

ایک بات عورتوں کے متعلق یہ کہنے کی ہے کہ یہ پردہ میں احتیاط کم کرتی ہیں جن عزیزوں سے شرعاً پردہ ہے ان کے سامنے آتی ہیں۔ نیز کافر عورتوں سے جیسے بھنگن اور چھاری وغیرہ سے بدن چھپانے کا اہتمام نہیں کرتیں حالانکہ شرعاً ان سے بھی پردہ ہے گویا گہرا پردہ نہیں۔ جتنا مردوں سے ہوتا ہے۔ بلکہ کافر عورتوں کے سامنے صرف منہ اور ہاتھ گھٹنوں تک اور پیر کھولنے کی اجازت ہے۔

باقی سر اور سر کے بال اور بازو اور کلائی اور پنڈلی وغیرہ کھولنا جائز نہیں اس کا بہت خیال کرنا چاہئے۔

ایک کوتاہی عورتیں رسوم کے بارہ میں کرتی ہیں۔ شادی وغیرہ کی رسوم میں بہت بے احتیاطی کی جاتی ہے۔ بے پردگی کی بھی اور فضول مال ضائع کرنے کی بھی اور تفاخر و نام و نمود سچا ہونے کی بھی۔ یہ وہ گناہ ہیں جن میں آج کل عورتیں بہت مبتلا ہیں۔ ان سے ابھی طرح احتیاط لازم ہے۔ باقی جن گناہوں میں آج کل مرد مبتلا ہیں ان سے عورتیں اکثر محفوظ ہیں۔ ان کی نگاہ بہت کم بہکی ہوتی ہے بلکہ اس بارہ میں ان کی وہی شان ہے۔ قاصدات الطرف رکھ نگاہ کو اپنے شوہر تک نہ منحصر رکھتی ہیں، جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔

مفید مستحبات | اب بعض مستحبات کا بیان کرتا ہوں جن کی برکات بہت ہیں اور جن سے توبہ الی اللہ کو قوت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ نماز روزہ کے ساتھ کچھ ذکر اللہ بھی کرنا چاہئے۔ اس سے دل کو خدا تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے اور نماز میں دل لگتا ہے۔ مگر عورتوں میں ذکر اللہ کا رواج بہت ہی کم ہے۔ اسی لئے ان میں کوئی شیخ نہیں ہے۔ اہل شیخزادیاں بہت ہیں مگر شیخ بمعنی پیر کوئی نہیں ہے۔ گو عورتوں نے کسی کسی عورت کو پیرنی کا لقب تو دے دیا ہے اگرچہ وہ شیطان کی بنائی کیوں نہ ہو۔ سو ایسی پیرنیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا تو وجود ہی مفہوم ہے۔ عرض یہ ہے کہ ضرورت شیخ کی ہے جو خدا کا راستہ بتلا میں۔ عورتیں اپنے مردوں کے ذریعہ سے کسی شیخ کامل سے ذکر کا طریقہ پوچھ کر آپس میں اس کا رواج دیں کیونکہ ان کی طبیعتوں کو ذکر اللہ سے بہت مناسبت

ہے اس لئے کہ ذکر اللہ کا اثر ان پر زیادہ ہوتا ہے جن کے قلوب میں سکون اور
یکسوئی کی حالت ہو اور عورتوں کو یہ بات خاص مدبرہ میں حاصل ہے۔ ان کے
قلوب میں تشدد و تفرق نہیں ہے اور یہ پردہ کی برکت ہے کہ عورتیں گھر کی چار
دیواریں میں مقید رہتی ہیں اس لئے ان کے قلوب میں یکسوئی بہت ہے مگر آج کل
کے حکمیں اس کے دشمن ہو رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح
آزاد پھرا کر اور وہی علوم پڑھیں جو مرد پڑھتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر عورتوں میں
یہ جمعیت و سکون نہ رہے گا۔ جو پردہ میں بیٹھ کر علوم دنیا سے بے خبر ہو کر اس
وقت حاصل ہے۔

ایک دفعہ کانپور میں میرا بیان ہوا تو میں نے کہا کہ بعض لوگ آج کل عورتوں
کو جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آتی۔ مردوں کو تو اس
کی اس لئے ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ضروریات معاش کے لئے اصرار و سفر
کرتے ہیں تو مختصر شہروں کے حالات جاننے سے ان کو آسانی ہوگی۔ مگر عورتوں
کو جغرافیہ پڑھانے میں سوا اس کے کہ ان کو گھر سے بھاگنے کا رستہ بتانا ہے اور
کیا فائدہ ہے کیونکہ اب تک عورتیں گھر میں مقید ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ اپنے
شہر میں کتنی گلیاں اور کتنی سڑکیں ہیں اور اسٹیشن کس طرف ہے اور یہاں سے اگر
دہلی جانا چاہیں تو کس طرف کو جائیں۔ مگر جغرافیہ پڑھ کر یہ سب باتیں ان کو معلوم
ہو جائیں گی۔ تو اب وہ نہایت سہولت سے بھاگ سکتی ہیں۔
یہ مضمون میں نے ویسے ہی بطور عموم کے بیان کیا تھا۔ کسی خاص شخص کی
طرف اشارہ نہ تھا مگر اتفاق سے اس مجلس میں ایک صاحب ایسے موجود تھے

جو اس مرض میں مبتلا تھے بعد بیان کے وہ مجھ سے ملے اور کہتے گئے کہ جغرافیہ کے اس مفسدہ پر میری نظر نہیں گئی تھی میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ بھی ایک علم ہے اس کے پڑھانے میں بھی کچھ خرچ نہیں اس لئے میں نے اپنی بیوی کو جغرافیہ شروع کرا دیا تھا۔ لیکن اب مجھے آپ کے کہنے سے اس کے مفسدہ کا علم ہو گیا۔ انشاء اللہ اب نہ پڑھاؤں گا۔

واقعی عورتوں کو علوم جدیدہ کی تعلیم دینا ان کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ بس ان کو تو قرآن شریف اور بقدر ضرورت مسائل دینیہ کی تعلیم دینا چاہئے۔ لکھنا بھی نہ سکھائیں تو اچھا ہے کیونکہ عورتوں کے لکھنے سے بعض جگہ قصے ہو گئے ہیں اور اگر لکھنا سکھایا جائے تو اس کی بہت نگہداشت رکھی جائے کہ وہ از خود کسی کو خط نہ بھیج سکیں بلکہ جہاں خط لکھیں پہلے گھر کے مردوں کو دکھلا لیا کریں اور پتہ وہ خود نہ لکھیں بلکہ مرد اپنے قلم سے لکھے۔

مجھ سے ایک شخص مین جنت ملے وہ اس نکتہ کو سمجھ گئے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ میں لڑکوں کو تو سب علوم پڑھاتا ہوں قدیم بھی اور جدید بھی مگر لڑکیوں کو قرآن و حدیث و فقہ کے سوا کچھ نہیں پڑھاتا۔ کیونکہ ان کے اندر جو صفات حمیدہ ہیں وہ انہی علوم سے محفوظ رہتی ہیں۔ علوم جدیدہ سے ان کی حالت بگڑ جاتی ہے عورتوں کے اندر یہ صفت یکسوئی اور سکون و جمعیت کی بہت ہی اچھی ہے جو محض پردہ کی برکت سے ہے۔ اس حالت میں اگر یہ ذکر اللہ کرنے لگیں تو بہت نفع ہو۔ اس لئے ان کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے اور دل لگا کر ذکر اللہ کرنا چاہئے اور کچھ وقت تلاوت قرآن کے لئے بھی نکالیں۔ عورتیں قرآن کم پڑھتی ہیں حالانکہ

اس سے دل بہت صاف ہوتا ہے اور نیک کاموں کی طرف رغبت و شوق بڑھتا ہے۔ اس کا بھی اہتمام چاہئے۔ اور اس کے بعد تھوڑا سا وقت موت کی یاد کے لئے مقرر کریں جس میں اپنا ایک دن مرنا اور قبر میں دفن ہونا اور دنیا سے رخصت ہونا ذہن میں مستحضر کریں اور دنیا کے کاموں میں بھی موت کا دھیان کر لیا کر لیں پس پھر یہ حالت ہوگی کہ آدمی چلتا ہوا کام رکھے گا۔ زیادہ بکھیرا نہ رہے گا۔ یہ ہے کامل علاج حرص کا۔ اس کو کر کے دیکھیں۔ انشاء اللہ چند ہی روز میں حرص کم ہو جائیگی۔

حج اور تجارت

اب ایک یہاں طالب علمی شبہ ہے اس کا جواب دے کر یہیں ختم کئے دیتا ہوں شبہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تو زیادت مال کے حرص کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نص قرآنی سے اجازت معلوم ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں پس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم۔ یہ آیت احکام حج کے متعلق ہے۔ جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں باہر کے لوگ تجارت کی نیت سے مکہ آیا کرتے تھے۔ جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ شاید سفر حج میں مال تجارت کا ساتھ لے جانا خلاف خلوص ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے فضل کی طلب کرو۔ جس میں تجارت کی بحالت حج اجازت دی گئی۔ حق تعالیٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ خاص اپنے دربار کی زیادت کو آتے ہوئے بھی تجارت کی اجازت دے دی۔

بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ میں تجارتی مال

بھی لے جاؤ تو اس کو یہ بات معلوم کر کے کتنا ناگوار ہوگا۔ اس کے دل میں تمہاری ملاقات کی کچھ بھی وقعت نہ ہوگی۔ بلکہ کان پکڑ کے دربار سے نکال دیئے گئے کہ تم ہم سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ سوواگری کو آئے تھے مگر حق تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔ یہاں تو اباحت ہی ہے مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب کہ یہ نیت کہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی فقرا کی امداد کریں گے۔

رہا یہ کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے۔ وہ یہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تجارت کا سامان ہوتا جب بھی ضرورت حج کو جاتا۔ تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج کم نہ ہوگا۔ اور اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر ہو میں ہے، تو اس حالت میں تجارت سبائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا۔ اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک کے ساتھ ایک فعل مباح ہی کو منضم کیا ہے فعل حرام کو تو منضم نہیں کیا اور اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص یا رہے ہوگا کیونکہ یہ مخلوق کو دھوکا دے رہا ہے کہ جاتا ہے تجارت کے لئے اور پھر کہتا ہے کہ میں حج کو جا رہا ہوں۔

رہا یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مال تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا افضل ہے۔ تو اگر زادِ راہ بقدر کفایت موجود ہے تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لے جائے کیونکہ اس میں خلوص زیادہ ہے۔ اور اگر زادِ راہ بقدر ضرورت ہی ہے بقدر کفایت نہیں اور نیت

تجارت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت و اعانت ہوگی مال تجارت لے جانا موجب ثواب ہے۔

اب اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اور اس آیت میں تو کچھ نہیں۔ کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا جو اول ہے بلکہ انہماک اور زیادت حرص سے منع کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ قید سے اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق بھی ہو اور ابتغاء معاش ابتغاء فضل میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ابتغاء رضا بھی ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ابتغاء فضل کے ساتھ بعض جگہ ذکر اللہ کو بھی بڑھایا ہے سورہ جمعہ میں فرماتے ہیں۔ وابتغوا من فضل اللہ واذکر اللہ کثیراً واذکر اللہ کو بڑھا کر بتلارہا ہے کہ طلب معاش کو ابتغاء فضل سمجھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو ورنہ وہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طلب نقصان ہے۔ اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اس طلب کی ممانعت ہے حد سے متجاوز نہ ہو۔ خوب سمجھ لو۔

پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے حرص مال کی مذمت بیان فرمائی ہے اور حرص کے کم کرنے جو تدبیر غلط فہموں نے سمجھی تھی اس کی غلطی ظاہر فرمائی ہے۔ پس لوگوں کو چاہیے اس تدبیر کو استعمال نہ کریں۔ جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ذرا بیٹے کی شادی یا

نکاح سے فراغت کر لیں تو پھر دنیا کے دھندوں کو الگ کر کے اللہ اللہ کرینگے
 اور فرماتے ہیں کہ اس طرح کبھی یہ حرم کم نہیں ہو سکتی بلکہ اور بڑھے گی یہی حالت
 کی جیسے خارش والا کہا کرتا ہے کہ ذرا سا کھجلا لوں پھر نہ کھجلاؤں گا۔ مگر وہ جتنا کھجلا
 اتنی ہی خارش بڑھتی ہے۔ ایسے ہی آج تو آپ ایک بیٹی کی شادی کا بہانہ
 تھے ہیں۔ کل کو نہ معلوم کتنی بیٹیاں ہو جائیں گی اور تمہاری نہ ہوں تمہاری اولاد کی
 جائیں گی۔ تو یہ سلسلہ تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اور وہی حال ہو جائے گا۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک این سودا کنم
 باز بچوں فردا شود امروز را فردا کنم

صاحبو! اس کا علاج وہی ہے جو اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ جس اسی
 ت ان دھندوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور اگر توجہ الی الدنیا
 کرنے پر اس وقت قدرت نہیں اور ان تعلقات کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر صورت
 ہے کہ اس سلسلہ کو بھی چلنے دو اور اس کے ساتھ دوسرا سلسلہ توجہ الی اللہ کا بھی
 شروع کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ناکامی نہ ہوگی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ صلے
 اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و اخروعدونا
 ان الحمد للہ رب العلمین۔

نوٹ :- درمیان وعظ میں بارش آنے لگی تھی اس لئے حضرت مولانا او
 اکثر سامعین باہر سے مکان کے اندرونی حصہ میں آگئے۔ پھر ذرا بارش کم ہوئی تو
 حضرت مولانا کی وجہ سے پھر باہر تشریف لے آئے۔ اس آمد و رفت کی وجہ

سے ذہن مشتوش ہو گیا۔ اس لئے بیان جلدی ختم فرما دیا۔ ۱۲ جامع

انشراف علی!

۱۲۔ رجب ۱۳۵۱ھ

وعظ میرٹھ

ہدی و ہوئی کے متعلق یہ وعظ ۲۸ مارچ ۱۳۴۲ھ بعد مغرب
محلہ کوٹلہ میرٹھ میں فرمایا۔ ————— پارہ ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا

خطبة بالوردة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمد و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل
 عليه و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له و من يضلل الله فلا هادي له
 و نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له و نشهد
 أن سيدنا و مولانا محمدًا عبده و رسوله صلى الله تعالى
 عليه و على آله و أصحابه و بارك و سلم آتاه فاعوذ
 بالله من الشيطان الرجيم - بسم الله الرحمن الرحيم
 و إنما من خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوى
 فإن الجنة هي المأوى

طلب اور ذریعہ | یہ آیت سورہ والنازلحات کی ہے۔ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا ہر شخص خواستگار ہے جس کو ذرا بھی اطلاع اُس کی ہو جائے وہ مقتول ہو جائے۔

مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کی خواہش معتبر وجہ ہی ہوتی ہے کہ جب اُس کے ذرائع میں بھی سعی کی جائے۔ جو شخص کسی شے کا طالب ہو مگر اُس کے اسباب حاصل نہ کرے اُس کو اس شے کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً کوئی مالدار ہونا چاہے مگر جب اُس سے کہیں اُن علوم کو حاصل کر جو اکتساب روپیہ کے لئے ضروری ہیں پھر کسی واقف کار کی صحبت میں رہ کہ ان علوم پر عمل یعنی اکتساب میں مہارت ہو پھر کوئی کام شروع کر اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھ کہ خرچ آمدنی سے کم ہے تاکہ کچھ پس انداز ہو اور حقوڑا حقوڑا جمع ہو کر ایک رقم ہو جو اسے اور قاتل حاصل

ہو تو کہتا ہے واہ صاحب مجھ سے علوم میں محنت نہیں ہوتی کسی کے خرچے کیوں اٹھائے جانے لگے۔ پھر بتادی کا بار خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں لوں اور خیر کو محدود کیے کے دل کو کیوں ماروں۔ جتنا جی چاہے گا خرچ کروں گا۔ اس شخص کو متوکل کا طالب نہیں کہتے۔ اس کو بواہوس کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ان راستوں کو نہیں اختیار کرتا جن سے جامع مسجد میں پہنچے اور قدم نہیں بڑھاتا۔ یہ شخص جامع مسجد میں چلے پہنچے گا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثواب کا طالب ہے یا کوئی شخص چاہتا ہے کہ غلہ اُس کے پاس آجائے اور جب کہتے ہیں کھیتی کر زمین میں بیج ڈال، پانی دے، کھیت کی نگہداشت کر، تو کہتا ہے کون کھیتی کرے اور سچائی کس سے ہو سکتی ہے۔ کون گھر چھوڑ کر حفاظت کے لئے جنگل میں جا کر پڑے۔ مجھے تو غلہ چاہیے۔ یہ شخص احمق ہے اور غلہ کا طالب ہی نہیں ہے۔

یا جیسے کوئی اولاد چاہے اور جب کہا جائے نکاح کر اولاد ہو جائیگی تو کہتا ہے کون بکھرے میں پڑے۔ نکاح میں ایک رقم صرف کروں۔ پھر نان و نفقہ کا مطالبہ ہو۔ مکان چاہیے، مہر کی فکر ہو اور طرح طرح کی مصیبتیں کون مولے۔ نکاح تو کرنے کا نہیں۔ بس میں تو لڑکا چاہتا ہوں۔ یہ احمق ہی ہے! اللہ مہربان ہے اس نے اس فعل خاص کو ولد کے لئے سبب قرار دیا ہے۔ اس کو اختیار کر و اولاد بھی مل جائے گی۔

یا جیسے کہ کوئی چاہے کہ پیٹ بھر جائے اور جب کہیں کھانا کھاؤ، نفقہ

کو چھاؤ اور نگلو پیٹ بھر جائے گا، تو کہتا ہے کہ صاحب میں تو یہ کرنے کا نہیں۔
ظاہر ہے کہ محض الحق ہے۔

توضیح کے لئے یہ کئی مثالیں دی گئیں تاکہ یہ مقدمہ ذہن نشین ہو جائے۔ میں
آگے انشاء اللہ ان سے کام لوں گا۔ غرض طالب اگر ذرائع کو اختیار کرے، تو
طالب ہے ورنہ بوا لہوس ہے۔ ایسا آدمی ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے اور
سننے والے کہا کرتے ہیں کہ آدمی تو معقول ہیں مگر خبط ہو گیا ہے۔ دیکھتے پڑھ لکھ
کر دماغ خراب ہوا ہے۔ نکاح تو کیتے نہیں اور اولاد کی وجہ سے۔ کیسا افسوس
ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلم ہے کہ اگر سعی نہ کرے ذرائع میں تو پاگل ہے پس اب
تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں تو ہر کس و ناکس، عالم جاہل، بڑے اور
چھوٹے سب کے نزدیک تسلیم کیا ہوا ہے۔

جب دین کا معاملہ آپڑتا ہے تو بڑے بڑے
اسباب وراثت عقلا احمق بن جاتے ہیں و ماں مقصود کی زبانی طلب
کو ہی طلب کہتے لگتے ہیں اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب ہیں اور اس
طلب پر نتیجہ ضرور مرتب ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے
کو بھی طالب ولد کہنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس کے اولاد ہوگی معلوم
نہیں کس طرح ہوگی۔ شاید مرد کے بچہ ہوگا،

معلوم نہیں کیا بات ہے فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں تو اسباب کو دخل
ہو اور آخرت میں نہ ہو بلکہ معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا
دخل اپنے مقاصد میں نہیں ہے جتنا کہ آخرت کے اسباب کو مقاصد آخرت

میں ہے۔ یہ بات ظاہر مشکل معلوم ہوتی ہوگی کیونکہ ذہن نشین بھی ہو رہا ہے کہ دنیوی کام تو اختیاری ہیں اور اخروی نہیں۔ جو لوگ ذرا عقلمند ہیں وہ اتنا اور کہہ لیتے ہیں کہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر ہی سے ہے مگر اسباب حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں مسئلہ تقدیر کو سمجھا مگر غلط سمجھا۔ چاہے فاسق ہوں یا فاجر ہوں۔ اگر تقدیر میں جنت ہے تو عیاں ہی گئے۔ دنیا میں بھی یوں ہی کیوں نہ کہا کہ اسباب کو حاصل کریں یا نہ کریں اگر تقدیر میں مسبب لکھا ہے تو ملے ہی گا۔ نہ کوئی پیشہ کریں نہ کھیتی کریں نہ کھائیں۔ اگر قسمت میں تمول اور غلہ اور پیٹ بھرنا لکھا ہے تو ہو ہی جائے گا۔

بلکہ جیسا یہ خیال ہے کہ فسق و فجور کر کے اطمینان سے بیٹھے ہیں کہ جنت ملے ہی گی۔ غلطی یہی ہے کہ دنیا کو اختیاری سمجھا اور آخرت کو نہیں۔ یا تو دونوں کو اختیاری سمجھا ہوتا یا دونوں میں تقدیر پر بیٹھ رہے ہوتے۔ ذرا غور سے سمجھیں آجائے گا کہ واقعی بات کیا ہے۔

عقائد کا مسئلہ ہے کہ ہر سبب پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ باذنہ تعالیٰ ہے جلالاً، آگ کا لگانا اثر دائمی اور متفق علیہ ہے مگر جب تک اذن نہ ہو اختراق مرتب نہیں ہو سکتا۔ سبب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں نے نہایت تیز آگ میں ڈالا۔ مگر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہہ دیا ٹھنڈی ہو جا کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا اور اختراق مرتب نہ ہوا۔ اگر یہ اثر آگ کے لئے ذاتی ہوتا یا جزو ماہیت یا لازم ماہیت ہوتا تو کیوں منقک ہوتا۔ کیا آگ نہ رہی اور یہی قصہ اعمال صالحہ میں بھی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کوئی اپنے عمل کی

وہ جسے جنت میں نہ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عمل تاثیر بالذات نہیں کہ کسی کو جنت میں لے جائے۔ مشیت ایزدی شرط ہے۔ دین کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل دخول جنت میں کچھ بھی دخل نہیں رکھتا، عمل کو وہی دخل ہے دخول جنت میں۔ جو آگ کو ہے احراق میں۔ آگ کے احراق کے لئے بھی مشیت شرط ہے اور دخول جنت کے لئے بھی۔ بہر حال ایک آیت اور ایک حدیث سے ثابت ہو گیا کہ کسی چیز میں تاثیر بالذات نہیں ہے اگرچہ اثر کیسا ہی یقینی اور دائمی ہو مگر ذات میں کسی چیز کی داخل نہیں کہ اثر کرے۔ سب مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے مرتب کرنے سے سب مرتب ہوتا ہے۔ تو اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ آیا اسباب دنیویہ پر مرتب کرنے کا حق تعالیٰ نے یقینی وعدہ کیا ہے یا اسباب اخرویہ پر اس کے مرتب کرنے کا یقینی وعدہ کیا ہے۔ تو نفوس و واقعات دونوں سے دیکھئے کہ دنیوی اور دینی دونوں اسباب میں سے کس پر ترتیب اثر یقینی ہونے کا وعدہ ہے باری تعالیٰ کا اور تجربہ سے بھی کون یقینی ہے۔ سو کہیں نہیں فرمایا گیا نفوس میں کہ اسباب دنیوی پر اثر ضرور مرتب ہوگا اور تجربہ واقعات سے بھی یہی نکلتا ہے۔ بسا اوقات کھیتی کرتے ہیں اور ایک دانہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اسباب اور اثر | یہی حال جاہ و ثروت کا ہے۔ بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر عمر گزر جاتی ہے اور غربت ہی رہتی ہے اور کبھی بے تدبیر مالدار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ خود کریں گے تو کبھی نہ کہیں گے کہ جاہ و ثروت تدبیر پر ہے۔ میں نے خود ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ جن کی اوقات کسی وقت

میں دو آنے کی تختی آج وہ لاکھ پتی ہو گئے۔ اگر آپ کہیں کہ انہوں نے تدبیر سے اس قدر مال حاصل کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ ان کے پاس جانیے اور اول سے آخر تک ان کی سوانح عمری لکھئے اور ان کی کل تدبیریں بھی لکھئے کہ پہلے ان کے پاس دو آنے تھے اس کا انہوں نے فلاں سودا خریدا اور صبح سے شام تک پھیری کر کے بیچا۔ اس میں ایک آنہ نفع ہوا۔ ایک آنہ میں سے نصف کھایا اور نصف اصل میں شامل کر دیا۔ اگلے دن اڑھائی آنے کا سودا لے کر پھیری کی۔ ساڑھے تین آنے یا چار آنے ہو گئے۔ اسی طرح اس المال بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب تعداد انوں سے نکل کر روپوں میں آگئی تو کچھ پس انداز کرنے لگے۔ جب ایک کافی رقم جمع ہو گئی تو جائیداد خرید لی۔ پھر اس کی آمدنی کو بقدر ضرورت خرچ کیا اور کچھ داخل خزانہ کرتے گئے۔ یہاں تک کہ خزانہ بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گیا۔ لکھ پتی ہو گئے۔ اس کو مفصل لکھئے بلکہ تمام تغیرات کو تاریخ وار قلمبند کیجئے۔ اب اگر یہ تدبیر سبب ہے ان کے جاہ و ثروت کی تو آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ جیسا انہوں نے کیا کہ دو آنہ کا سودا لیجئے اور پھیری کیجئے اور نفع کو شامل اس المال کرتے جانیے بعد چند سے کچھ پس انداز کیجئے اور جائیداد خرید لیجئے۔ پھر خزانہ بڑھائیے یہاں تک کہ لکھ پتی بن جائیے۔ میں کہتا ہوں کہ کبھی بھی تو ان تدبیروں سے آپ ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا وجہ ہے کہ تدبیر سے اس نے حاصل کیا اور تم نہیں کر سکتے وجہ یہی ہے کہ سب کچھ باری تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیا پر ہمیشہ اللہ اثر ممتزب نہیں فرماتے۔

میرے دعوے کا ایک جز ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر نتیجہ کامرتزب

ہونا ضروری اور دائمی نہیں۔ رہا دوسرا جزو یعنی آخرت سو دیکھئے فرماتے ہیں۔
 من اراد الاخرة وسعى لها سعيها وهو موثر فاولئك

كان سعيهم مشكورا

یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہ
 جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں نزولہ فی حدیثہ یعنی اس کا نتیجہ بقدر عمل ہی نہیں
 زیادہ دیا جائے گا۔ دیکھ لیجئے وعدہ کے یقینی ہونے سے نتیجہ مترتب ہونا
 ضروری اور یقینی ہوا یا نہیں۔

میراد عاتبات ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر اثر مترتب ہونے کا کہیں وعدہ
 نہیں اور اسباب آخروی کے لئے وعدہ ہے۔ پھر تعجب ہے کہ دنیا میں جس چیز
 کا ارادہ کرتے ہیں وہ اکثر جتنا چاہتے ہیں نہیں ملتی مگر پھر اکتساب ذرائع سے
 کوئی غفلت نہیں کرتا اور غفلت کرنے والا احمق سمجھا جاتا ہے اور آخرت
 میں اس قدر ملتا ہے جس کا ارادہ بھی نہیں کیا جاتا اور پھر اکتساب ذرائع سے
 غفلت ہوا اور غفلت کرنے والے کو کوئی احمق نہ کہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
 فلا تعلم نفس ما اخفى لهم من فتنه اعین۔

حدیث قدسی میں فرماتے ہیں۔ اعدوا

طلب جنت کا ذریعہ

عبادہ الصالحین مالا عین رات و

لا اذن سمعت ولا خطر قلب لشعری میں نے اپنے نیک بندوں کے
 لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے
 دل میں اس کا خیال تک گزرا۔ حالانکہ خیال بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث

وہ چیزیں اسباب آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہان تک سوچیں گے۔ جمال، باغ، نہریں، خادوم، ماکولات و مشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے۔ پھر ایک مرتبہ ایسا نکالئے کہ خیال سے بھی باہر ہو اور عقل اُس کے ادراک سے قاصر ہو مگر وہاں ملے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتب اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ ہے کہ سبب سے اور اُس سے کچھ نسبت بھی نہیں۔ جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں اور بعض عینجے وہاں کے وہ ہیں کہ اُن کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہیت تو عقل میں بھی نہیں آتی۔ وہ رویت الہی ہے۔ عرض ترتب اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور متفرع کریں گے ثم ذرائع کو حاصل کرو۔

لوگوں کے خیال میں یہ جا ہوا ہے کہ آخرت بے اختیاری ہے اور دنیا اختیاری ہے۔ اسی نے لوگوں کو بٹھا دیا۔ کچھ نہیں کہتے اور دنیا کے معاملات میں یہ حال ہے کہ جب چاہتے ہیں دنیا حاصل کرنا اسباب کو جمع کرتے ہیں حالانکہ بارگاہ اسباب کے تخلف کو بھی مقاصد سے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جن اسباب کو دخل نہیں وہ تو جمع کئے جاتے اور جن کو دخل ہے اُن کو نہ اختیار کیا جائے۔ کیسے کہا جائے کہ ایسا شخص جنت کا طالب ہے۔ اسی کو فرمائے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب ہے جنت سے کہ اُس کا طالب کیسے ہوتا ہے۔

اس سے اور ماضی سے ثابت ہو گیا کہ جو اسباب کو حاصل نہ کرے اُس

اُس کے دماغ میں خلل ہے۔ طلب صرف معتبر نہیں بلکہ طلب صادق ضروری ہے اور اُس کے لئے کسب ذرائع لازم ہے جیسا کہ بسط کے ساتھ اب تک بیان کیا گیا۔ سو اس آیت میں اللہ میاں نے جنت کے طلب کا ذریعہ بتایا ہے جس کے سب لوگ مشتاق ہیں۔

حال و کمال | یہاں ایک بات اور قابل تحقیق ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت سے جنت کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے گزرے ہیں جن کے کلام میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کو جنت کی طلب ہے نہ دوزخ کا خوف ہے تو یا تو جنت مطلوب نہیں یا وہ لوگ مخالف قرآن ہیں۔

جیسے ایک صاحب حال کی نقل ہے یہ فقہ حضرت رابعہ بصریہ کا ہے کہ ایک روز علیہ حال میں ایک مانتھیں آگ اور ایک مانتھیں پانی لے کر نکلیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت یہ کیا۔ کہا تمام عالم کو جنت اور دوزخ ہی کے خیال نے تباہ کر دیا۔ میرے مالک کا نام کوئی نہیں لیتا۔ آج میں فیصلہ کئے دیتی ہوں۔ پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کروں گی اور آگ بہشت میں لگاؤں گی۔

سو بات یہ ہے کہ یہ اقوال و حکایات اہل حال کے ہیں اور غلبہ حال سے ان کو معذور سمجھا جاوے گا۔ ہم سوالوں کو تو ان لوگوں کے اقوال کو نقل کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بات جذب میں کوئی کہہ جائے باقی قصدا کہنا یا اُس کو کمال سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ جذب کوئی کمال نہیں اور نہ وہ اختیاری چیز ہے۔ جو لوگ اختیار سے ایسے لفظ کہتے ہیں سناؤ و کلا

جو اعلیٰ و ادنیٰ کسی درجہ میں بھی وہ شمار ہوں۔ غلبہ کے تو معنی ہی بے اختیار ہونے کے ہیں پھر بے اختیاری کا اختیار سے ہونا کیا معنی۔ آج کل لوگوں نے اسی کو کمال سمجھ رکھا ہے۔ جو کوئی وہابی تھا ہی کلمات بیباکانہ بکتا ہوا اُس کو بڑا پہنچا ہوا سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ مسرت ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جن بزرگوں سے ایسے کلمات منقول ہیں اُن کے لئے بھی یہ حالت کچھ کمال کی نہ تھی۔ ہاں علامہ حال کی وجہ سے معذور تھے۔ کوئی الزام اُن پر عائد نہیں ہوتا۔ اور رہے نقال سو وہ تو کسی طرح معذور ہی نہیں ہو سکتے۔ اُن کے اقوال کے دعوئے کے ساتھ نقل سخت بیہودگی ہے۔ غرض اُن لوگوں کی یہ ایک حالت معذوری کی تھی ورنہ جس چیز کا مطلوب ہونا قرآن سے ثابت ہو اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طلب فرماویں۔ اللہم انی اسالک الجنة وما تحب الیہا من فعل او عمل اُن کی نسبت دوسرے کا کیا منصب ہے کہ ایسا کہے۔ آیات و احادیث میں صاف طور پر طلب جنت کی فضیلت آئی ہے۔ اہل حال معذور تھے حال کی وجہ سے اور اب تو لوگوں میں حال ہی نہیں رہا۔ نقل ہی نقل رہ گئی۔ اسی کو فرماتے ہیں مولانا۔

حرف رویشاں بدزد و مردوزن تاہر پیش جاہلاں خواہد فزوں
جن میں کچھ ہے نہیں وہ اُن کے دعووں کی نقل کر کے جاہلوں میں بزرگ بنتے ہیں۔

مجھ کو ایک شخص اسی سفر میں ملے کہ وہ کچھ مالی اعانت چاہتے تھے ادھر ادھر کی باتوں میں اپنی محویت بھی ظاہر کی لمبی لمبی باتیں کرنے لگے۔ کیا یہ واسطہ

جنت کی اور کیا خیال ہے دوزخ کا۔ میں نے کہا میاں بیٹھے بھی رہو۔ چار روپیہ کے لئے تو گھر چھوڑے پھرتے ہو جنت کی طرف التفات بھی نہ کرو گے۔ ان نقالوں میں رنگ البتہ اصل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سو ہر چیز میں تجربہ کر لیجئے کہ اصلی میں نقلی کی سی آب و تاب نہیں ہوتی۔ رنگ و روغن کو دیکھ کر شیفتہ ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص نے اصل چیز نہیں دیکھی اور محض نا واقف ہے غرض اہل حال تو بحث سے مستثنیٰ ہی نہیں اور جنت کا مطلوب ہونا بحالہ باقی رہا البتہ یہ ضرور ہے کہ مشہور تقسیم میں اس کے مطلوب ہونے کی دو صورتیں ہیں اور میرے

حصول جنت کے طریقے

نزدیک ایک تیسری صورت اور بھی ہے۔

ایک تو یہ کہ اس کی نعمتوں کو مقصود سمجھ کر کھانے کو، پینے کو، باغوں کو، مکانات کو، نہروں وغیرہ کو غرض اصلی جان کر طلب کیا جائے۔ مذاق مختلف ہوا کرتے ہیں کسی کو مکانات کا شوق ہے کسی کو دلکش فضاؤں کا، کسی کو بچوں کا، کسی کو حسن و جمال کا، کسی کو ماکولات و مشروبات کا اور جنت میں سب کچھ ہے۔ تو جو چیز جس کو مرغوب ہو ملے گی۔

حدیث شریف میں ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ ایک شخص تمنا کرے گا کہ وہ کھیتی کرتا۔ اللہ میاں فرمائیں گے ابن آدم کا پیٹ ہی نہیں بھرنا اور دم کے دم میں سب چیز موجود ہو جائے گی۔ بات کہنے میں ہرا بھرا حکیت، پھر انبار کے انبار غلہ تیار ہے تو کتنی کھیتی چاہئے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بچہ طرح طرح کی صدیں کیا کرتا ہے۔ اور صوب پوری کی جاتی ہیں۔ والدین

جانتے ہیں کہ باولی خدین ہیں مگر جو مانگتا ہے دیتے ہیں۔ تو بعض لوگ جنت کو اس لئے طلب کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ ہیں جو جنت کو اللہ میاں کی تقاء کے لئے طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ طالب در حقیقت اللہ میاں کے ہیں مگر اُن کو معلوم ہوا ہے کہ لوتہ اور رضا خاص جنت میں ہوگی۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تاکہ مقصود اصلی حاصل ہو۔ غرض نعمت کے طالب نہیں بلکہ منعم کے ہیں۔

مثال اس کی یہ ہے کہ ایک محبوب نے باغ میں لوگوں کو بلایا جس میں ہر قسم کا عیش و نشاط موجود ہے۔ جو میوے کہیں نہیں ہیں وہ وہاں موجود۔ وہ مکانات جن کا نقشہ تک کسی کے خیال میں نہ گزرا ہو۔ وہاں تیار نہریں، حوض، دلکش فضا میں، خادوم، غلام غرض جملہ چیزیں موجود ہیں۔

بعض جاننے والے ایسے ہوں گے جو غسل کرنے اور حوضوں میں غوطہ لگانے کی غرض سے جائیں گے اور بعض تازہ تازہ ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اور بعض میووں سے لذت حاصل کرنے کے لئے و علیٰ ہذا۔ اور ایک جاننے والے وہ ہیں کہ اُس محبوب پر عاشق ہیں اور باغ میں اس واسطے جاتے ہیں کہ اللہ کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارا محبوب باغ میں ہے۔ یہ سُن لیا ہے اور باغ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل باغ کو نہیں ڈھونڈتے، باغ والے کے شہدائی ہیں اس وقت چونکہ محبوب باغ میں ہے۔ اس واسطے باغ کی طرف جاتے ہیں اور وہ اگر جنگل میں آجائے تو باغ کا خیال بھی اُن کے ذہن میں کبھی نہ گزرے۔ باغ کی طرف جانے والے یہ دو قسم کے لوگ ہوئے۔ ایک وہ کہ نفس باغ کے طالب

ہیں دوسرے وہ کہ نہ انہیں باغ کا خیال ہے نہ جنگل کا۔ محبوب کی طرف نگاہ ہے۔

مشہور قسمیں طالبانِ جنت کی تو یہی دو ہیں اور میرے نزدیک تیسری قسم اور ہے لیکن ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ کہ طالبِ تو نعمت کے ہیں لیکن نہ حظ کی وجہ سے بلکہ اپنے نذل اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ بلا واسطہ طالبِ منعم کے ہوں۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس کے کوچہ کا ایک گوشہ مل جاوے۔ یہ تیسری قسم ہوتی ہے۔ پس طالبِ نعمت کا مبتدی ہے اور طالبِ منعم کا متوسط ہے اور طالبِ نعمت للعبادیۃ کا کہ واقع میں طالبِ کامل منعم کا سے فشتی ہے اور صاحبِ جمال بحث سے خارج ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کا خیال مطلقاً یہ ہے کہ طلبِ جنت سے عدمِ طلب کا درجہ بڑھ کر ہے۔ حالانکہ خور کرنے سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کہیں آیات و نصوص میں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عدمِ طلب کوئی شے حسن ہے۔ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدمِ طلب والا معذور ہے۔ سو معذوری میں فضیلت کہاں!

خلاصہ یہ کہ طالبِ جنت کی تین قسمیں ہو گئیں کہ یا مبتدی ہے یا متوسط یا فشتی۔ سو متوسط کا حال تو اکثر فہمائز ہوتا ہے لیکن مبتدی اور فشتی کا حال بہت تشابہ ہوتا ہے لکہ واقع میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مبتدی ایک کام میں لگا ہوا ہے کہ حقیقت نہیں پہچانتا مگر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے کبھی حقیقت شناس بھی ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں وجد میں آجائے، ڈھاریں مارنا منغولوں کا کام ہے

جو صاحب کمال ہے وہ حال پر نہ آنسو ٹپکا سکتا ہے نہ حال اس کے بدن پر
حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ نہ حال اس کی زبان سے بیجا نختہ کلمات نکلا سکتا ہے
شاہ عبدالحق ردو لوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

”منصورہ بچہ بود کہ از یک قطره بغریاد آمد۔ این جام روانا نند کہ دریا را
فرو برد و آرد و رخ نزنند۔“

منتہی کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے مگر چونکہ منتہی راستہ کے
کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس واسطے ہر مقام پر اس کے افعال سے واقفیت
ٹپکا کرتی ہے اور مبتدی مقلدانہ چلتا ہے۔

اسی طرح جنت کے مانگنے والوں میں جو مبتدی یا منتہی ہیں ان میں فرق
ہے کہ مبتدی طالب ہے مزہ کے لئے اور منتہی مزہ سے گزرا ہوا ہے۔ پھر
جنت کی طلب جو کرتا ہے سو وہ محبوب کے حکم سے ہے۔ گویا منتہی عبدین
ظاہر کرتا ہے کہ جو حکم ہو اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں اور مبتدی کی فہمیں
کی ہے۔ اس کا انتہا مزہ کی طرف ہونہ باقی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسی چیز
طلب کا حکم ہوتا کہ مزہ اس میں نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اس صورت میں مبتدی
پیراکھڑ جاتے اور منتہی جما ہوا ہے اس کی لغزش کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ مزہ کا طلب
یہی نہیں جس کے رہنے نہ رہنے پر اس کی طلب کا دار و مدار ہو۔ چونکہ طلب کا
پایا ہے اس واسطے تعمیل کر رہا ہے۔ فلیتنا من المتنافسون امر کا صبیغہ ہے
شخص زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

چوں طمع خواہد زین سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد ازین

جب اُدھر سے ہی طلب کا حکم ہے تو طلب نہ کرنا عدول حکمی ہے۔
 طبع اطاعت میں ایسا محو ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو شراب پلا دیں شراب دو میں
 حلال اور حرام شراب محبت حلال ہے۔ شراب پی کر اُدھی سب طرف سے
 بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو بندہ ہے وہ انتقالِ امر میں محو ہوتا ہے۔

محویت اور بخودی | یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ محویت بخودی نہیں ہے۔ بعض
 ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں محویت
 ہو جائے تو رکوع و سجود کیسے ہوں۔ محویت کے معنی بکیبوتی کے ہیں۔ صرف
 باری تعالیٰ کی طرف خیال ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبادت بطریقِ احسن ہوگی
 رکوع و سجود نہ ہونا کیا معنی۔

عام لوگ محویت اس کو سمجھتے ہیں کہ کچھ واہی تنہا ہی کلمات زبان سے
 نکال دیں یا آئندہ کی باتوں پر دعویٰ کے ساتھ حکم لگا دیا کریں۔ اس کو بڑا کمال
 سمجھتے ہیں اور کہا کرتے ہیں اللہ میاں پر ایسا ناز ہے کہ جو منہ سے نکل گیا، پورا
 ہو کر رہتا ہے۔ یہ مسلم سہی کہ دعا قبول ہوتی ہے مگر ہر چیز کو مانگ بیٹھنا اور دعویٰ
 سے حکم لگا دینا۔ انہیں سے ہو سکتا ہے جو بے خود ہیں۔ یہ محویت محمود نہیں محویت
 محمود میں حق سبحانہ تعالیٰ سے نہایت قرب ہوتا ہے اور جتنا جس کو قرب ہوتا
 ہے اتنا ہی عظمت کا اس پر ظہور ہوتا ہے۔ اور اتنا ہی اپنے نفس کا تذلل کھل
 جاتا ہے۔ پھر جس پر محبوب کے اعلیٰ درجہ کی عظمت اور اپنی ذلت کھل گئی ہو
 اس کی نسبت کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جہاں چاہے بے دھڑک قدم اٹھا بیٹھے
 گا۔ بادشاہ کہ دو بیچے ہیں ایک نا سمجھ اور ایک سمجھ دار۔ نا سمجھ تو جب آتا ہے

سیدھا گو دین جگہ لیتا ہے۔ نہ آداب مجلس کی کچھ خبر نہ اراکین کا لحاظ نہ بادشاہ کا
ادب نہ شاہی پوشاک کا خیال۔ پیر صاف ہیں یا خاک آلودہ آئے اور زانو پر
چڑھ بیٹھے۔ اور ہوشیار بچہ جو آتا ہے تو بیچی نگاہ کئے ہوئے۔ چہرہ پر
اراکین کا لحاظ ظاہر مجلس کا رعب چھایا ہوا اور نہایت ادب سے پاؤں پکڑ
کر حاضری کی اجازت مانگ کر مودب کھڑا ہوتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سمجھ دار کو
کو عظمت شاہی کی خبر ہے اور نا سمجھ کو نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ نا سمجھ
بادشاہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس قدر قرب اس کو حاصل ہے کہ
شاہی پوشاک پر میلے پیروں سے جا چڑھتا ہے اور جو الٹی سیدھی ضدیں کرتا ہے
پوری کی جاتی ہیں۔ نہیں! قرب زوری اس کو حاصل ہے اور قرب حقیقی سمجھ دار کو۔
اگرچہ سمجھ دار گو دین نہیں ہے اور کسی قدر فضل سے کھڑا ہے۔ میلے پیروں سے
پکڑوں پر جا چڑھنا اور الٹی سیدھی ضدیں کہ ناگستاخی ہے باعث فضیلت نہیں
زائد سے زائد یہ ہے کہ بچہ ان حرکات میں معذور سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل حال کہہ اٹھتے ہیں کہ نہ دوزخ، نہ بہشت نہ اُس کا خوف
ہے نہ اُس کی خواہش۔ ان دونوں میں سے کسی کی خبر ہی نہیں۔ یہ کمال نہیں ہیں ان
پر اعلیٰ عظمت کا انکشاف پورا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اتنی جرات ہے کہ قرب
کے اعلیٰ درجہ کا دعویٰ ہے۔

دیکھئے ایک نہایت ذلیل شخص کسی عالیشان محبوب کی طرف جانا چاہتا
ہو تو اہل تو برہمن چاہتے۔ اس کو کشش کے لئے کہ کسی طرح راستہ کے موانع
رفع ہوں۔ دریاں و چوہدار و غیرہ سے سناڑ ہو جائے تب توقع کی جائے کہ

اُن کی درخواست محبوب تک پہنچ سکے گی۔ اگر اس میں کوشش اُن کی چل گئی کہ درخواست محبوب تک پہنچ گئی اور پھر قسمت کی یاوری سے محبوب نے بہت ہی لطف فرمایا کہ حاضری کی اجازت دے دی۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دربار میں جاتے وقت اُن کی بڑی سی بڑی آرزو کیا ہوگی۔ یہ تو کبھی خیال بھی نہ جاتے گا کہ مجھے محبوب بنالیں۔ بڑا حوصلہ یہ ہوگا کہ چوکھٹ کو بوسے دینے کی اجازت مل جائے۔ اس کا یہ حوصلہ کرنا کیا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چوکھٹ کا طالب ہے بلکہ اپنی حالت کو دیکھ کر اس سے زیادہ کی ہمت نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اس کو چوکھٹ سے بڑھانا چاہیں تو پیروں میں رعشا پڑ جائے گا۔ سو منتہی اسالک الجنۃ کہے گا۔ نہ اس واسطے کہ جنت کا طالب ہے بلکہ طالب محبوب حقیقی ہی کا ہے مگر اس سے بڑھ کر حوصلہ اپنی ذلت اور اُن کی عظمت کو دیکھ کر نہیں کر سکتا۔

مبتدی اور منتہی کا فرق | معلوم ہو گیا ہوگا کہ طالب تین قسم کے ہیں مبتدی یعنی طالب جنت کے حوصلے اور منتہی یعنی

طالب جنت عظمت محبوب کی وجہ سے اور متوسط الحال۔ مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر ہوتا ہے۔ حال سے مغلوب ہوتا ہے۔ گویا مغلوب نہ ہو کہ حد شرع کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیونکہ ایسا شخص تو جیسا اوپر عرض کیا گیا مباحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا بات پر رو نہ لگتا ہے۔ ذرا بات پر دھرا جاتا ہے۔ زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو

عوام کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آجائے اور حال کوئی تغیر اس میں نہ پیدا کر سکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لئے بڑی بصیرت چاہئے۔ اس کی حالت بالکل بتدی کی سی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ غنتی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیا کو تو لوگوں نے پہچان لیا اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کو نہ پہچان سکے۔ قالوا ان انتہی الاشوش مثلنا متوسط اولیاء میں تو جوش و خروش دیکھتے ہیں اور اولیائے کاملین اور انبیاء علیہم السلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زین سبب گمراہ شد	کم کسے از ستر حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشان بشر	ما و ایشان بستہ خوابیم و خور
این تداستند ایشان از علم	درمیاں فرقے بود بے منتہا
این خورد گرد و پلیدی ز وجہا	وال خورد گرد و ہمہ نور خدا

کارِ پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشن شیر و شیر

مگر ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ پہچاننے جائیں۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغنا ہوتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ قصداً اظہار تو کہاں ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو کیا اگر کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ شگ ابلیتہ کمالات دکھاتے

پھرتے ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعیب سے ہی ہوتے ہیں جس کے اندر کچھ سے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جو دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ ہے نہیں۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے۔ قلذکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

غیرت از چشم برم رُستے تو دیدن ندہم
گوشت را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

میری آنکھ آپ کی طرف دیکھے۔ میرا کان آپ کی بات سنے۔ یہ لوگ ان مثال امر میں لگے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو پہچانے یا نہ پہچانے کچھ پروا نہیں۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے۔ ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء سبب ادبی ہے کیونکہ اطاعت تعمیل حکم اور فنا ہے جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہیے جب کہیں خاموش رہو خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جاؤ بلا تامل کھل جائے یہ کھل جانا بھی طاعت ہے۔ اس وقت اخفا اتباع نفس ہے۔ اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہوگی جو پہلے اخفا میں تھی۔

عرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا نہ اخفا میں نہ اظہار میں۔ بس فنا ہوتا ہے تعمیل حکم میں۔ اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرنا پھرتا ہے وہ اب تک فنا ہی نہیں ہوا۔ جب صاحب کمال سرتاپا محو ہوا مثال امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے۔ اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طالب بھی نہ کرتا۔ مگر حکم ہے اس لئے بغرض اس کی تعمیل کے طلب کرتا ہے۔ بتدی بھی طلب کرتا ہے اور منتہی بھی

خادم کو پیش آئے گی کہ ایک فہرست بنائے گا جس میں یہ سب نام درج ہوں اور ہر آئے والے سے نام پوچھ کر اوپر سے نیچے تک ساری فہرست میں تلاش کریگا کہ یہ نام اسمائے مندرجہ فہرست میں سے ہے یا نہیں۔ ہر بار ساری فہرست دیکھنی پڑے گی۔ نیز کسی قدر وقت آنے والوں کو ہوگی کہ ہر شخص کو اتنی دیر ٹھہرنا پڑے گا کہ جب تک وہ تمام فہرست کو دیکھے۔ سہولت اسی میں ہے کہ مختصر سی بات بتا دی جاوے کہ جس کو تو پہچانتا ہو اس کو آنے دینا۔ اس سے نہ فہرست کی ضرورت رہے گی نہ کچھ اور وقت پیش آئے گی۔ اسی کو گرو کہتے ہیں۔

جنت کے حصول کے لئے بہت سے طریق ہیں جن کا فردا فردا یاد رکھنا نہایت دشوار تھا۔ اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسا امر بتا دیا کہ جب اس کی رعایت رکھی جاوے تو جو فعل بھی کیا جائے گا وہ وہی ہوگا کہ اس کو کچھ نہ کچھ دخل ہے جنت میں۔ اللہ میاں کے کلام کی قدر اسی کو آتی ہے جو طالب ہے جب کسی کے جنت پیش نظر ہو تو انتہا درجہ کا شوق پیدا ہوگا اور جب بتایا جاوے کہ اس کی طلب کے فلاں فلاں طریق ہیں اور چونکہ جنت بڑی چیز ہے اس کے طرق بھی کثیر ہی ہوں گے، ان کی کثرت کو دیکھ کر یہ شخص گھبرا اٹھے گا۔ مگر چونکہ شوق انتہا درجہ کا پیدا ہو چکا ہے، اس لئے یہ تو ہوگا نہیں کہ چھوڑ بیٹھے بلکہ ایک حالت سخت اضطراب کی پیدا ہوگی۔ اس شخص کے سامنے اگر کوئی قاعدہ کلیہ پڑھ دیا جائے جو جامع ہو تمام طرق کو تو ہر کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی کیا حالت ہوگی۔ وجد کی سی کیفیت ہو جائے گی۔ اس کو قدر آئے گی کہ کلام باری تعالیٰ کیا چیز ہے۔ اس کو گرو کو فرماتے ہیں۔

واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى

اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف۔ دوسرا ونهى النفس عن الهوى الف لام عوف مضاف الیہ ہے اے عن ہواہا نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا۔ یہ دونوں عمل جملہ طرق حصول جنت کو جامع ہیں۔

ہر چہ کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مفہوم ذہن نشین ہو جائیں تو ہر فرد عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہو جائے گی۔ گمراہی میں بھی ہوا گمراہ ہے کہ افراد کم نہیں ہو جاتے صرف طریق شناخت میں اختصار و سہولت ہو جاتی ہے۔

دیکھئے کتنی سہولت ہو گئی۔ جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر عمل پر حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ کرے گا اور خیالی رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلاف مرضی باری تعالیٰ نہ ہو۔ اس سے ایک بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ ہر برے عمل کو پہچان لے گا۔ اور اس سے بچ جائے گا۔ اور جو سمجھ میں نہ آوے گا اس خوف کی وجہ سے اس کو علما سے پوچھے گا۔ اس طرح سے کوئی فرد معصیت اس کی نظر سے نہ چھوٹ سکے گا۔ ورنہ جنت جیسی بڑی چیز کے لئے کثرت سے ذرائع ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے ان کا ابتداء ذہن میں منضبط کرنا امکان سے بھی باہر معلوم ہوتا ہے۔

افراطِ خوف اور کفر | آپ نے جان لیا کہ طرقِ طلبِ جنت کا حامل دو
امر ہیں۔ اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل

ہے اور دوسرا معین یا دونوں اصل ہیں۔ مجھیوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے
کہ اصل نہیں انفس ہے اور خوف اُس کے لئے معین ہے۔ میں یہ اپنے دل
سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اُس حدیث سے کہ نسا لک میں خشیتک ماحول بہ
بیننا و بین معا صیک۔ دعا مانگتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ
اے اللہ ہم مانگتے ہیں خوف میں سے اس قدر کہ حائل ہو جاویں آپ اُس سے
ہم میں اور معصیت میں۔

تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیتِ معصیت سے بچنے کے لئے
مطلوب ہے بالذات مقصود نہیں ورنہ نسا لک خشیتک مطلقاً فرماتے کسی
چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے
زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد فرمادی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے
مانع ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محذور نہیں۔ خوف
مع الہ جاری ہی ہے اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رہا نہ رہے اور نا امیدی تک
ذبت پہنچ جائے تو یہ کفر ہے اس سے معصیت چھوڑتی نہیں بلکہ آدمی یہ
سمجھ کر کہ طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑ جاتا ہے۔ میں نے
خود دیکھا ایک مغلوب کو تہم معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اُس میں
یہ مصلحت ہے۔

ایک وکیل صاحب تھے نماز روزہ کے خوب پابند تھے۔ خوف غالب

ہوا تو عجیب حالت ہوئی پریشان ہو گئے۔ ایسی حالت تھی کہ زبان سے بات نہ
ٹھیک نہیں ادا ہوتی تھی۔ قریب تھا کہ نماز بھی چھوڑ دیں اور یہ سب کچھ ہوا تھا
ایک کتاب کو دیکھ کر۔

کتابوں کو بطور خود دیکھنے میں یہ تخرابی ہے۔ لوگ کہتے ہیں استادوں کے
نحرے کون اٹھائے۔ عبارت اردو ہوتی ہی ہے اس کے سمجھنے میں کیا
وقت ہے کیونکہ اردو ہماری زبان مادری ہے۔ اگرچی بات ہے، تو ہر
شخص جس فن کا چاہے بلا استاد پورا عالم بن سکتا ہے۔ کتابیں ہر فن کی موجود ہیں
حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ اس کے خلاف ہے۔

جائے استاد خالی است

وجہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کتاب میں ایک جگہ نہیں
لکھی جاسکتیں۔ ہر بات علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہے۔ ابواب و فصول اسی لئے مقرر
کئے جاتے ہیں اور اگر ایک جگہ متفرق باتیں لکھ دی جائیں تو کتاب کی ترتیب
میں فرق آجائے اور ڈھونڈنے والوں کو بڑی دقت پیش آئے۔ کوئی خاص مضمون
کہاں تلاش کریں۔ مثلاً نماز و روزہ و زکوٰۃ کے مسائل کتب فقہ میں بلا تفصیل ابواب
کیقما التفق جمع کر دیئے جائیں تو کس قدر دقت ہو جائے کہ ایک ذرا سے مسئلہ
کی ساری کتاب پر نظر ڈالنی پڑے۔ جملہ علوم و فنون میں یہی حالت ہے کہ
کتاب میں متفرق مضامین ایک جگہ نہیں لکھے جاسکتے۔ تو بطور خود کتاب دیکھنے
والے کو اگر کوئی شبہ واقع ہو تو اگرچہ حل اس کا کتاب میں کہیں مذکور ہو مگر چونکہ
اس کو اطلاع نہیں ہے کہ وہ حل کہاں مذکور ہے اس لئے دل میں وہ اشکال

جسم جاتا ہے اور ایسا اوقات یہ خیال ہو جاتا ہے کہ کتاب میں غلط لکھا ہے مصنف
خود نہیں سمجھا۔ حالانکہ کتاب میں غلطی نہیں ہے سمجھ کا قصور ہے۔ جو شبہ ذہن میں
آیا ہے وہ کسی دوسری بحث کے مناسب کتاب میں اس باب میں اس کا
حل ہوگا۔ اور پڑھانے والا تمام کتاب پر حاوی ہوتا ہے۔ متعلم کے شبہ کرنے
سے یا از خود تنبیہا ہر موقع پر اس کی ضروریات کو بتاتا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں
سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے اور فنون کی کتابوں سے زیادہ تصوف میں خاص کہ
یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلا استاد کبھی مطالعہ نہ کرے۔ دیگر فنون میں
تو یہ ہے۔ بہت سے بہت بطور خود دیکھنے سے وہ فن نہ آئے گا اور تصوف

میں خطرہ ہے کہ آدمی ہلاکت میں پڑ جائے اور ایمان سماتا رہے۔

گر روی صد سال در راہ طلب راہبر نبود چہ حاصل زان تعب

گر ہوائے این سفر داری ولا دامن راہبر بگیر و پس برآ

در راہت باش صادق ای فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق

عمر بگذشت او نہ شد آگاہ عشق

ان وکیل صاحب نے احیاء العلوم کی کتاب الخوف کو دیکھا تھا اور ایک

مقام کو نا تمام سمجھے اس سے ایسا خوف دل میں بیٹھا کہ بات نہ کر سکتے تھے

اور نیند اڑ گئی۔ مگر یہ خیریت تھی کہ آپ ہی آپ کوئی رائے قائم نہیں کی جیسا کہ

آج کل عادت ہے کہ بزرگوں کے اقوال کتابوں میں دیکھ کر کسی واقف کار

سے ان کے سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں، اپنی طبیعت سے جو چاہتے ہیں

حکم لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ اُن بزرگوں سے بدعتیہ ہو جاتے ہیں اور وہی تباہی
 کلمات کہنے لگتے ہیں یا اس کے موافق غلط عقیدہ رکھ کر خراب ہوتے ہیں میرٹھ
 پاس آئے کہ کچھ امید نہیں کچھ ہی کرے کہ جنت ملے گی۔ تمام عمر کوشش کرے
 اور دنیا کو تلخ کر دے مگر کتاب کا لکھا ہوا اگر پرچ ہے تو خاتمہ ذرا میں بگڑ سکتا ہے
 جس وقت میرے پاس کتاب لے کر آئے تو یہ حالت تھی کہ ہاتھ کانپتے تھے
 نہ زبان لڑکھڑاتی تھی۔ کتاب کی عبارت نہ پڑھی جاتی تھی۔ جیسے کسی کو پچھانسی کا
 حکم سنا دیا جائے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ حد سے زائد غلبہ خوف
 اچھی چیز نہیں۔ میں نے اور مقام اسی کتاب کے دکھلائے۔ بحمد اللہ! اُن کے
 سب شبے حل ہو گئے اور قلب کو سکون ہوا۔ کہنے لگے آپ نے مجھے بچا
 لیا۔ جانے کیا ہوتا میری جان نہ رہتی یا ایمان جاتا۔ لکھا کتاب ہی میں سب کچھ
 ہے مگر دوسرے سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ لکھتے والوں نے حتیٰ الامکان
 سہولت اس قدر کر دی ہے کہ اکثر جگہ شبہات بھی حل کر دیئے ہیں لیکن پھر
 بھی استاد کی ضرورت باقی ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی حقیقت کا زیادہ
خوف محمود انکشاف بھی مضر ہو جاتا ہے۔ جیسا اُن وکیل صاحب پر استغناء

حق زیادہ متحلی ہوا اور یہ حالت ہو گی۔ اسی واسطے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے
 کہ جیسے تجلی رحمت ہے استنار بھی رحمت ہے۔ واللہ! اگر تجلی تمام ہو جائے تو
 قوائے عالم ہو جائے یا جان جاتی رہے یا ایمان جاتا رہے۔ میں نے خود
 دیکھا وکیل صاحب کو کہ قریب تھا کہ نماز تک چھوڑ دیں۔ وجہ کیا تھی صرف غلبہ خوف

اس واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خشتیک ما تحول بہ
 بیننا و بین معاصیک۔ صرف اتنا خوف چاہتے ہیں کہ معصیت کو مانع ہو
 اتنا نہیں چاہتے کہ ہم مشغل نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ خوف محمود وہی ہے جو معصیت
 سے روکے اور جو خوف خود باعث معصیت ہو جائے وہ معصیت کی طرح
 بُرا ہے۔

اسی واسطے لکھا ہے کہ بڑھا پیے میں امید غالب رکھے اور جوانی میں خوف
 بڑھے آدمی سے ویسے ہی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر اور خوف غالب ہو جائیگا
 تو رہے ہے بھی مانتھ پیر پھول جائیں گے اور امید میں کچھ نہ کچھ کٹے رہی
 جائے گا اور جوانی میں قوت ہوتی ہے خوف کا تحمل ہو سکتا ہے جتنا خوف
 زیادہ ہوگا نفس کو تنبیہ ہوگی۔ معصیت سے اجتناب ہوگا۔ اور اعمال حسنہ
 کی کوشش کرے گا۔ ہر وقت کے واسطے تدبیر جایا گا نہ ہے۔ باطن طرب بھی ظاہری
 طرب کی طرح ہے۔ کبھی دوا سرد دیتے ہیں کبھی گرم۔ کبھی تنقیہ کرنا پڑتا ہے کبھی
 تقویت۔ اسی طرح باطنی امراض کی تدبیریں بھی مختلف ہیں۔

معلوم ہو گیا ہوگا کہ خوف معین ہے اور ترک خواہشات اصل۔ اب صاف
 ہے کہ خاف مقام ربہ ذریعہ ہے اور مقصود نفی النفس ہے۔ ذریعہ
 اسی حد تک محمود ہوتا ہے کہ مقصود تک پہنچا ئے اور اگر ذریعہ کو اس حد تک
 پہنچا دیا جائے کہ مقصود فوت ہونے لگے تو یہ مذموم ہے کیونکہ ذریعہ ذریعہ نہ
 رہا۔ خوف اسی قدر چاہئے کہ نفس کو تنبیہ ہو۔ پس خلاصہ طریق کا ترک ہوا ہے
 اور خوف اس کا معین اور یہی حاصل ہے اس کو کا۔

ضرورت غور و فکر

اب دیکھو کہ نوکر کو یہ بتا دینا کہ ناشناسا کو اندر نہ لائے
دیتا کہتے ہیں ذرا سا ہے کرنے میں بہت ہے جو

کام کہ فہرست بتانے سے نکلتا وہی اس سے نکلتا ہے بلکہ فہرست میں
افراد محدود ہو جاتے۔ اگر ان کے سوا کوئی ناشناسا آنے والا ہوتا تو اس کو منع
کر سکتا اور اس لفظ کے بعد ایک کے منع سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور
کسی تعداد تک ناشناساؤں کی حد نہ رہی۔ اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ نے گھر بنا دیا
کہ اگر سوچے تو ولی ہو جائے۔ ایک فرد بھی نافرمانی کا اس سے خارج نہیں
دیکھئے نافرمانی ہوتی کیوں ہے۔

مثلاً نماز پڑھی یا تاخیر کر کے پڑھی یا بے توجہی ہوئی۔ حضور قلب کے
ساتھ ادا نہ ہوئی۔ اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد
خواہش نفسانی کے ہو گا۔ فرض کیجئے کہ نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہو کہ نیند آ رہی
تھی عشاء کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا۔ سو کہ صبح کر دی۔ آرام اور تازگی
پوری خواہش نفسانی ہی ہے۔ تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے
کسی کام میں لگا ہوا ہو۔ اس کام کے اوجھڑیج میں رہ جانے سے نقصان مال کا
اندیشہ ہوتا ہے اس نقصان کو گوارا نہ کیا اور نماز میں تاخیر کر دی۔ یہ حُث بالمال
ہے کہ منجملہ خواہشات نفسانی ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جتنی ہو
کہ جب توجہ دوسری طرف ہو۔ توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نقص ہی
کام ہے۔ اس کی خواہش سے ہوتا ہے۔

غرض کسی نے ترک طاعت کیا یا اتنا تک موصیئت تو صرف نفسانی

خواہش سے۔ اس کے اندر بھی کچھ آگیا۔ ہر چیز میں خیال رکھے کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں۔ جب اس پر کوئی محافظت کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے معصیت ہو سکے۔ کھڑے دونوں عادت ڈالنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے۔ ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کیجئے کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ضرور ایک فرد معصیت کا ہے۔ پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جاوے اور اس کی مصرت کو پیش نظر رکھئے۔ اکثر گناہوں میں سب جانتے ہیں کہ مصرتیں ہیں مگر پھر خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر اس کو کرتے ہیں۔

مثلاً غیبت کرنے والا جانتا ہے کہ اگر اس شخص کو خبر پہنچ گئی تو مجھ سے لڑائی ضرور ہوگی اور بہت سے نقصان پہنچیں گے۔ نفع تو کوئی مرتب نہ ہوگا مگر پھر کرتا ہے اور کرنے سے طبیعت کو سکون ہوتا ہے جیسے کسی سے بدلا لے لیا۔ یہ خواہش نفسانی ہی ہے جس کے سامنے مصرت کا خوف بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ ایسے بھی پرہیزگار ہیں کہ خود غیبت نہیں کرتے مگر سنے میں مزہ آتا ہے بہت کیا تو جب کسی نے غیبت کی، رفع الزام کے لئے کہہ دیا، میاں بھانے دو اور پھر غبت کے ساتھ گن رہے ہیں، دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میں غیبت سے محفوظ ہوں۔ بہت احتیاط کرتا ہوں۔ دوسرے کو بھی منع کر دیتا ہوں زنا تو فی برتاؤ اللہ میاں سے، جناب اللہ میاں کو دل کی بھی خبر ہے۔

کار با اور است باید داشتن رایتِ اخلاص و صدقِ افراشتن

فرب نفس اور اتباع نفس | فقط زبانی باتوں سے کیا کام چلتا ہے اگر ان کے باپ کو کوئی گالیاں دینے لگے

تو کیسے لڑنے لگیں گے۔ ممانعت اس کو کہتے ہیں۔ اس وقت یہ نہ ہو گا کہ ایک دفعہ اُسے منع کر دیں اور پھر بیٹھے سنتے رہیں۔ حضرت اس منع سے برائت نہیں ہوتی۔ غیبت میں یہ بھی شامل ہے۔ دیکھئے کہ بعد ممانعت کے اگر وہ خاموش ہو جائے تو اُن کے دل میں اشتیاق و انتظار رہتا ہے۔ ظاہر غیبت نہ کی سہی، ظاہر بینوں کی نگاہ میں پرہیزگار بن جائیں مگر باطن میں تو یہ مرض موجود ہے نفس نے جو خواہش کی تھی اُس کا ظاہر تک اثر نہ آیا سہی قلب میں تو اُس سے التذاذ اور اُس کی طرف میلان عزم کے ساتھ موجود ہے۔ یہی اتباع نفس ہے غرض سوچنے والا سمجھ سکتا ہے کہ معصیت کس حد تک ہوگی۔ جہاں تک خواہش نفسانی پائی جائے۔ یہ ایسا جامع لفظ ہے۔ کوئی فرد معصیت اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ جب کوئی معصیت ہوگی خواہش نفسانی سے۔ بُرائی باوجودیکہ ظاہر ہے مگر نفس کی چال میں بڑے بڑے ہوشمند آجائے ہیں۔ کوئی پیر زنت میں مثلاً ملنے لگے تو نفس ضرور بتاتا ہے کہ فلاں فلاں کام تجھے کرتے ہیں اُن کے لئے اتنے خرچ کی ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص خوشی سے دیتا ہے اور تجھے ضرورت ہے ہی اس وقت لے لینا چاہئے۔ پھر اللہ میاں کہیم ہیں یہ ضرورتیں بھی رفع ہو جائیں گی اور پھر تو بہ سے گناہ بھی نہ رہے گا۔ کیسی اچھی بات ہے۔ حضرت یہ سب تدبیریں ہیں جن سے نفس چال میں پھانستا ہے اور اس تاویل کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے کہ جب دل میں خوف ہوتا ہے ورنہ تاویل کی بھی کون سی ضرورت ہے اور اتنی دیر کب گوارا ہے۔ گردن پکڑ کر حکم دے دیا کہ رقم ہرگز جانے نہ پائے

بس اس کی تعمیل ہو گئی۔ مال جن کو محتاط پاتا ہے اُن کے لئے خواہ مخواہ کی ضرورتیں پیدا کر دیتا ہے اور سمجھا دیتا ہے کہ ان کو پورا کرنا ہے۔ حالانکہ یہ اسراف ہے مگر ضرورتیں ایسی تراش لیتے ہیں کہ اس کو اسراف بھی نہیں سمجھتے آج کل کے عقلمند اس مرض میں بہت مبتلا ہیں۔

مجھے ایک شخص ملے اور خوش خبری سنائی کہ لڑکا نائب تحصیلدار ہو گیا میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے اب ذرا صاحبزادہ کو یہ تنبیہ کیجئے کہ اسراف نہ کریں۔ کہا جناب کچھ سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بھلے مانس آکر بیٹھیں اور میز کریسی لیمپ وغیرہ گھنٹیا رکھے ہول یا مکان شاندار نہ ہو

اسراف اور فیشن | یہ اسراف ہے جسے ضروری سمجھ رکھا ہے حالانکہ ضرورت و قسم کی ہوتی ہے۔ ایک واقعی اور ایک فرضی۔ واقعی ضرورت کی تو انتہا ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت کی کہیں انتہا نہیں ظاہر ہے کہ فرضی میں بے انتہا گنجائش ہے۔ فرض میں محالات تک بھی آ سکتے ہیں۔ جب فرضی ضرورت کی کوئی انتہا نہیں تو اس کے رفع کے لئے کون سی رقم کافی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی تنہا ہی ہو گی۔ پھر تنہا ہی لا تنہا ہی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے۔ اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال آخروی تو آخرت میں ہو گا مگر دنیا میں بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ خاندان کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہو گئے۔ ایک شادی بھی جس نے کی اس میں فرضی ضرورتیں پوری کیں تو نقدی اور جائداد اور مال و متاع سب اس کی نذر کر دیا

اور پھر بھی پورا نہ ہوا قرض لے کر مشکل آبرو بچائی۔ پھر اس قرض کے بعد چندے آبرو بھی گئی۔ ذرا سا خلتہ سے یا بسم اللہ ہے اور اس کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے آنی چاہئے خواہ رشوت لے کر ہو یا سودی قرض لے کر ہو یا گھر بیچ کر۔ ایسا نہ ہو کوئی رسم رہ جائے۔ یہ سب فرضی ضرورتیں ہیں۔ بیوی کے کان میں پانچ سو کا نہ لود ہو خواہ میاں کی اوقات وہ ہی پیسہ کی کیوں نہ ہو۔ کہیں سے پانچ سو لاؤ تب منہ دکھاؤ۔ میرزہ سی پوشاک سب قاعدے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑا آدمی انہیں جھوٹا کہہ دے۔ حضرت بڑے آدمی کو یہ بھی تو معلوم ہو گا کہ میاں کی اوقات صرف پچاس ہی روپیہ کی ہے پھر بڑا کیسے کہہ دے گا۔ یہ ضرورت نہیں صرف فیشن ہے۔

لطف یہ ہے کہ علماء و سمول کو منع کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کے شریک ہو جاتے ہیں اور بڑے شکریہ گزار ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو آپ بڑا کام کہتے ہیں کہ فضولیات کو چھوڑاتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ اتنا سونا لا دیا جائے جس سے کان کسٹ پڑیں۔ یہ روپیہ کسی ایسے کام میں کیوں نہ لگایا جائے جس سے اس المال محفوظ رہے اور چار پیسے اور ملنے لگیں۔ تجارت کی جائے یا جائداد خرید لی جائے۔ شادی کی رسمیں مطلقاً چھوڑ دی جائیں۔ اس روپیہ سے لڑکی کے لئے کوئی صورت بسر اوقات کی کیوں نہ کر دی جائے۔ آتشبازی وغیرہ سے ذرا سی دیر کا حفظ نفس نہ ہو انہی غرض علماء کی تائید کرتے ہیں البتہ پرانی وضع کے لوگوں کو ضرورت شاق ہوتا ہے۔ اور ان نئے فیشن کے لوگوں کو جب ترک دین آسان ہوا تو رسم دنیا کیا۔ یہ لوگ ساتھ دیتے ہیں اور بھولے

سیدھے لوگ خوش ہوتے ہیں کہ یہ بھی علماء کے ہم خیال ہیں۔ بڑی باتوں سے منع کرتے ہیں۔ چوری ان کی پکڑی گئی کہ رسموں سے بیوی کو روکتے ہیں اصلاح میز و کرسی کے لئے نہ اس کے لئے کہ اسراف نہ ہو یا روپیہ کسی منفعت کے کام لگے۔ بلکہ اس لئے کہ ادھر سے روپیہ بچے تو اپنے فیشن کو درست کریں میز و کرسی سے کمرہ سجائیں۔ مارمونیم باجا منگائیں کوئی نیلام سے خالی نہیں جاتا بیوی پر تو تقاضا ہے کپڑا کم پہنو۔ سال بھر کے لئے صرف دو جوڑے کافی ہیں اپنے گھر میں سب طرح بسر ہو سکتی ہے۔ بہت کرواہیں جانے کے لئے ایک اجلا جوڑا بنا لو۔ زیور جو کچھ میکہ سے لائی ہو وہی کیا حقوڑا ہے۔ بہت ہوں اچھی نہیں ہوتی۔ سادگی کے بھی خلاف ہے۔

ایک صاحب نے بیوی سے کہا ہم کمانے کمانے مرے جانتے ہیں اور تمہیں ذرا خیال نہیں۔ جتنا آتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے ایک پیسہ نہیں بچتا۔ خرچ میں کمی نہیں کرتی۔ بیوی نے کہا، میرے یہاں کوئی بازار کی چاٹ نہیں آتی۔ کوئی چیز ضرورت سے زائد نہیں منگاتی۔ کسی کو ایک پیسہ تمہاری بلا اجازت میں نہیں دیتی۔ جو کچھ خرچ ہے تمہارا ہی ہے۔ میں کس چیز میں زیادہ خرچ کرتی ہوں۔ اور کون سے خرچ میں کمی ہو سکتی ہے۔ کہا نہیں تم نے خرچ بڑھا ہی رکھا ہے۔ اگر ماما نہ رکھو تو اس کی تنخواہ اور خوراک نیچے یا نہیں۔ ہم ایک چکی خریدیں خوشیاں لیا کر دو روز کی پسندیدہ یوں کی وقت نہ رہے اور پسائی کے دام بچیں اس میں تمہارا ایک اور بھی نفع ہے کہ تندرستی اچھی رہے گی۔ ریاضت کرنا آدمی کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔ گھر کی لیمپ پوسٹ بھی خود کر لیا کر دوڑا

ذرا سے کاموں کے لئے مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ ان سب ترکیبوں سے
ایک کافی رقم بچ سکتی ہے۔ مٹوڑا ہی مٹوڑا کر کے بہت ہو جاتا ہے مگر حب
نہیں خیال ہو۔

غرض بیوی کو سب مڈول میں تحفیف کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ بیوی
بیچاری گلا گھونٹنے کے لئے ہے۔ ہر طرح بسر کر سکتی ہے۔ مگر تمہاری کسی تدبیر
ذرا بھری نہ ہو۔ مگر وہ میں معمولی لیمپ سے کام نہ چلے برقی لیمپ ہونا ضروری
اور وہ بھی بقدر ضرورت نہیں بلکہ دس پانچ رکھے رہیں۔ نازک چیز سے شاید کوئی
ٹوٹ جائے تو دوسرا موجود رہے۔ اور ان میں بھی آج ایک نئی ایجاد ہو جائے
تو پہلے خریدے ہوئے سب ردی ہیں۔ اب نئے طرز کے خریدنے سے بچیں
و علی ہذا۔

بیوی کے لئے تو زیور بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے کوئی چیز
بھی اسراف نہیں۔ بیوی کا اسراف ایک طرح کا ہے پرانے فیشن کا اور میاں
کا اسراف دوسری طرح کا ہے نئے فیشن کا۔ دونوں کو چھوڑو تو نکتہ الامت
والعزیزے جمیعاً۔ یہ سب فضولیات ہیں جن کو نفس ضروری بتا کر طلب کرتا
ہے۔ ان کی تکمیل خواہش نفس کی تعمیل ہے جس میں بڑے بڑے عقلمند گرفتار
ہیں۔ معلوم نہیں عقل کس طرح روار کھتی ہے کہ اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھ پر
دے دیا جاوے جس کی دشمنی دنیا میں بھی ظاہر ہو چکی۔ اسراف کے نتائج
آپ نے دیکھ ہی لئے۔ مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ ہر کام میں پوچھتا کہ حق تعالیٰ
کا کیا حکم ہے بجائے اس کے ہر کام میں شیطان اور نفس سے پوچھا جاتا

کہ سرکار کا کیا حکم ہے اور جو اس نے کہہ دیا ہے وہ ٹرک کر ڈالا خواہ اللہ کے خلاف
یا رسول کے۔

احسانات اور کفران نعمت | مسلمانوں کیا جواب ہوگا اگر پوچھا جائے گا
المدا عہد الیکم یا بنی آدم

ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین وان عبدونی
ہذا صراط مستقیم ولقد اضل منکم حیلاً کثیراً انکم
تکونوا تعقلون ہذا جہنم الیٰ کنتم بہ تعدون
پوچھیں گے اے بنی آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ
شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے۔ میری عبادت کرنا
یہ سیدھا راستہ ہے اور دیکھ چکے تھے کہ بہتوں کو اس نے گمراہ
کر دیا تھا۔ کیا تمہیں عقل نہ تھی اب یہ ہنم موجود ہے۔

میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو یہ کیا ٹھوڑا
ہے کہ کہا جائے کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے۔ ہم سے تعلق قطع کر کے
باوجودیکہ ہم ہر وقت ہر بان سے اٹھنے سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا
جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو
قاعدہ مسلمہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس کیا جاتا
ہے۔ جس قدر اس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر اس طرف
سے کفران نعمت ہوتا ہے جس قدر اُدھر سے ساتھ دیا جاتا ہے اسی قدر اُدھر
سے قطع کیا جاتا ہے اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی ہوتی ہے۔ دشمن نے

جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے اور اللہ میاں نے
 جس کا حکم کیا وہ قدرت سے باہر ہے اور ترقی سے روکنے والا ہے۔ حقیر
 یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے اُن میں انہماک سے حق تعالیٰ
 سے بُعد بڑھتا ہے اور غفلت پیدا ہوتی ہے۔

عاقبت ساز و ترازیں بری ایں تن آرائی و ایں تن پروری
 باہواؤ آرزو کم یاش دوست چوں یغفلک عن سبیل اللہ دوست
 تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست
 چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

دیکھو ایک جگہ کیا شکایت فرماتے ہیں۔ ارایت من اتخذ اللہ ہوا
 اسی شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا معبود خواہش نفسانی کو بنایا۔ ہم کو چھوڑ کر
 اپنے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السلام
 کو بھیجا احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سنا۔ اور نفس نے اندر
 سے ایک شرہ چھوڑ دیا کہ افعّل بكذا۔ پس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت
 نہیں دل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی جو حکم ہوا فوراً
 تعمیل۔ اللہ میاں کے احکام میں کبھی ہر بات کی علت و صحت ہی جاتی
 ہے اور اس کی مصلحت پوچھی جاتی ہے۔ حالانکہ شرائع میں علل اور مصالح ضرور
 ہیں مگر ہر شخص کی عقل نارسا کی رسائی تو وہاں تک نہیں۔ پھر ہم کو علت نکالنے
 کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب دلیل صحیح سے ثابت ہو گیا عمل کر لیا۔ کبھی اس
 میں گنجائش نکالی جاتی ہے کہ کیوں صاحب اس کے خلاف کرنے میں کچھ

اسلام سے تو خروج نہیں ہوتا۔ پس جب اسلام سے خروج نہیں ہوتا اور نفس کا حکم خلاف پر ہے ہی جس کو ضرورت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ حالت بھی ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام کا کسی قدر پاس ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔ رخصلاف شریعت شاید منحصر فرد واحد ہے یعنی وہ عمل جس میں خروج عن اسلام ہی لازم آجائے۔ اور جو لوگ کہ پورے آزاد ہیں ان کو تو دلیل غیر دلیل سے بحث ہی نہیں۔ ان کے نزدیک گویا خود احکام کا خلاصہ ہوا ہے نفس ہی ہے اللہ میاں کے احکام کوئی چیز ہی نہیں۔

جو لوگ اسلام کا پاس رکھتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب جس قدر جتنیں اللہ میاں کے احکام میں ہوتی ہیں اگر نفس کے حکم میں ہوتیں تو کیا سوچ تھا۔ اتنی جھٹ تو کیا اگر نفس سے خواہش کے وقت صرف اتنا ہی پوچھ دیا کریں کہ اس میں کیا مصلحت ہے جس کی وجہ سے اختیار کیا جائے اور پھر مصلحت میں غور کر لیا کریں کہ واقعی ہے یا فرضی تب بھی تو بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جائے۔ مگر کہاں، اُس کے تو ہاتھ میں ایسی باگ دی ہے کہ جب وہ کہے چل چلنا پڑتا ہے اور جب کہے ٹھہر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ نفس اگر خندق میں گر لے تو خندق ہی میں گرنا پسند ہے اور اگر آسمان پر چڑھ جائے تو آسمان پر چڑھنا قبول ہے اللہ میاں نے ایک حکم کیا کہ اس میں مصلحت تھی۔ اُس کو نہ کیا اور نفس نے ایک خواہش کی جس میں سراسر مضرت تھی اُس کو کر ڈالا۔

ایک تاجر سے کوئی سوکا مال بچیں اوپر سو کو خریدتا تھا مگر نہ دیا اور دیا کہا

جہاں بچیں اور کم ملے۔ نہ معلوم اول خریدار سے اس کو اتنی منافرت کیوں ہے۔ اس کو اتنا خیال کہ بچیں زیادہ دیتا ہے گویا اپنا نقصان کرتا ہے کہ تجارت میں کچھ اس کے پلے پڑ رہے اور اُن کو ایسی ضد کہ اپنا مال بھینکیں گے اور خسارہ ہی دیں گے مگر تمہاری مخالفت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ افسوس!

خواہش نفسانی وہ بُری چیز ہے کہ
معصیت کی دنیاوی مضرتیں | دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی ضرر

معصیتیں ہیں کہ اُن میں دنیاوی نقصان ہیں۔ معصیت میں دنیا کی بھی مضرتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ میاں ساٹھ پھوڑ دیتے ہیں۔ آدمی اسباب کو جمع کرتا ہے مگر وہ اسباب مودی الی السبب بہت کم ہوتے ہیں۔ ہر کام میں پریشان رہتا ہے بعض آدمی ذرائع کم رکھتے ہیں اور کام زیادہ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اس کو ذرائع زیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور کام اتنا بھی نہیں ہوتا۔

ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ ہم پر تو تنگی نہیں میں کہتا کہ رزق سے مقصود کیا ہے، اطمینان! یہ معصیت کے ساٹھ حاصل نہیں ہوتا۔ اطمینان فراغ قلب کا نام ہے۔ ناجائز طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجئے مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو محفوظ رکھے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے و جدانی سی بات ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی حبست
 گفتیم کہ چو ماشوی بدانی
 عین محض کو کتنا ہی سمجھاؤ کہ عورت کی یہ لذت ہوتی ہے مگر وہ ہرگز

نہ سمجھے گا اور الٹا تمہیں کو بیوقوف بنائے گا۔ اگر اُس کو سمجھانے کی کوئی تدبیر ہے تو بس یہ کہ اُس کا علاج کرو۔ جب وقت رجولیت پیدا ہو جائے گی آپ بیوقوفی اور عقلمندی کو سمجھ لے گا۔ معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو۔ دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے۔

اس پر دلیل فلسفی بھی ہے۔ وہ یہ کہ معصیت کرنے والا غیر اللہ کا طالب ہے۔ اور اس تک پہنچ جانا اور اُس کو پالنا ضروری نہیں اور مطیع طالب ہے اللہ میاں کا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہیں۔ ادھر سے ذرا سی کوشش چاہئے اور اُس سے خود کرم فرماتے ہیں غیر اللہ کی طلب پر۔ چونکہ نتیجہ کا ترتیب ضروری نہیں اس لئے کامیابی نہیں ہوتی اور دل کو فراغ حاصل نہیں ہوتا اور اللہ میاں کی طلب پر نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے اس لئے قلب کو راحت ملتی ہے۔ اسی کا نام اطمینان اور فراغ ہے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ اُس کی لذت وہی سہاقتا ہے جو پاتا ہے۔ ساہا تو سنگ بودی دل خواش آزمون ایک نہ مانے خاک باش اے خافل پھر تو برسوں رہا ہے امتحان کے لئے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھو۔

پھر تو پتھر ہونے کا نام بھی نہ لے گا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور پتھر بہتر سے خاک ہو گئے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں جی بھی تک وہ علیحدہ ہے۔ جہاں تھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ دوڑ دوڑ کر

لیتی ہے۔ کر کے دیکھو۔ امتحان ہی ہے۔

طاعت کا اثر | میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے
بھی طاعت اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی۔ کپڑا بھولے
سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا مگر وجہ
تو ضرور یہی پڑ جائیں گے۔ تجربہ ہوا ہے کہ لوگوں کو دھوکے سے طاعت ہو گئی اور
اثر ہو گیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر عاشق تھا۔ ایک دن کہیں
چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہاں بادشاہ اور بیگم میں اُنسی لڑکی کی
شادی کی نسبت گفتگو تھی بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے
شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد و زاہد اور متقی ہو۔ یہ چور صاحب چوری تو بھول
گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا۔ وہاں آکر ایک مسجد میں جا بیٹھے
اور دن رات عبادت کرنا شروع کی۔ تہجد بھی، اشراق بھی، چاشت بھی، غرض عبادت
ہی سے کام تھا۔ لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب تشریف لائے
ہیں۔ رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہو گئی۔ ادھر بادشاہ نے آدمی تعینات کر
رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پرہیزگار کون ہے۔ ان مخبروں
نے خبر دی کہ ایک عابد صاحب فلاں مسجد میں قیام رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ
متقی و پرہیزگار کوئی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے خاص وزیر کو ان کے پاس پیغام
دے کر بھیجا۔ اور یہاں کام ہو چکا تھا۔ انہوں نے التفات بھی نہ کیا۔ خبر وزیر
نے نہایت ادب سے پیغام شاہی منایا۔ کہا دراصل نیت تو میری فاسد تھی اسی

غرض سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا۔ اب مجھے نہ آپ کی بیٹی کی ضرورت ہے نہ آپ کے جاہ و حشم کی۔ بس تشریف لے جائیے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔

طاعت ایسی ہی چیز ہے کہ بعض اوقات گواہوں میں غرض صالح نہ ہو۔ مگر انجام کار اسی سے درست ہو جاتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت لوگ اعراض فاسد سے اسلام قبول کرتے ہیں لیکن آخر کو وہی اسلام کامل ہو جاتا ہے۔ البسوں کے اسلام کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ بعض لوگ نوافل نادان کہتے ہیں کہ ان بھکاریوں کو مسلمان نہ کرنا چاہئے۔ ان لوگوں نے پیشہ کر لیا ہے۔ ان کے مسلمان کرنے کا نتیجہ ہی کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے روپیہ ٹھگتے پھریں۔ کوئی کہتا ہے کہ میرے ذمہ اتنا فرض تھا۔ مسلمان لوگ مل کر ادا کر دیں۔ کوئی کہتا ہے مجھے روزہ نماز سیکھنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کی ضرورت ہے مسلمان لے دیں اس میں اسلام کی بدنامی ہے کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔

مجھ سے ایک صاحب یہی فرماتے تھے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ اگر ایسی بدنامی کی وجہ سے اخراج عن الاسلام کہیں، تو آپ میں بھی ایسے عیوب ہیں جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے آپ کو اسلام سے کیوں نہ نکال دیں۔ نیا مسلمان تو خواہ بنید بغدادی ہی ہو یا موروٹی شیطان بھی ہو تو پروا نہیں ہے۔

میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ بعض اوقات مسلمان کسی طرح سے ریا اور عبادت ہوتا ہے۔ مال کی طرح ہو یا اور کسی چیز کی۔ مگر اسلام وہ چیز

ہے کہ خود دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے۔

تعلمت العلم بخیر اللہ میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ
فابی العلم الا ان یکون اللہ کہ میں نے علم نہ خود نہ مانا
اللہ ہی کا ہو کر رہا۔

آگ بجلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے۔ تھوڑی دیر میں لکڑی راکھ ہو جائیگی
آگ میں یہ اثر کہ لکڑی خود گھس جاتی ہے، آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی
بزرگ سے کسی نے کہا، دیکھئے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے کا ذکر کیا کرتا ہے
کہا تو دکھلاوے کا بھی نہیں کرتا۔ وہ دکھلاوے کا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے۔ کبھی نہ
کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا اور تجھے کیا امید ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے تھے عبادت اول ریا ہوتی ہے۔ چند روز
میں عادت ہو جاتی ہے۔ پھر عبادت اور اخلاص۔ واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے
دیکھ لیجئے کہ بچپن میں آدمی نماز پڑھتا ہے اس وقت کیا حالت ہوتی ہے۔ پھر
سن شعور میں اور کیفیت ہوتی ہے اور بڑی عمر میں کچھ اور ہی بات پیدا ہو جاتی
ہے۔ بچپن میں استاد یا والدین کے خوف سے پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی وقت
ان کی نگرانی نہیں ہوتی تو ٹال بھی دی جاتی ہے یا سب سے اونٹنی اڑا دیتے ہیں یہ ریا
ہی ہے۔ پھر پڑھتے پڑھتے سن شعور میں پہنچ کر طبیعت مانوس ہو جاتی ہے اور
جیسا کہ اور امور ضروری کا اتفاق ہوتا ہے ایسا ہی نماز کا ہونے لگتا ہے تا وقتیکہ
ادانہ کر لی جائے طبیعت پر بار رہتا ہے۔ اگر نفس کبھی ٹالنا چاہتا ہے تو زائد
سے زائد تاخیر کی نوبت آتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ قصاکر دیں۔ یہ مرتبہ عادت کا

ہے۔ اس کے بعد تو بجا اللہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بلا نماز پچھن ہی نہیں پڑتا یہ مرتبہ اخلاص کا ہے۔

عزم عبادت ابتداء کسی کیفیت کے ساتھ ہو مگر کبھی نہ کبھی خود دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اس کا تجربہ مدرسہ میں رہ کر اچھی طرح ہوا۔ بہت سے طلباء کو دیکھا کہ اول اُن کی نیت اچھی نہیں ہوتی مگر فارغ ہوتے ہی مخلص بن جاتے ہیں بالکل حالت پدٹ جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اول اگرچہ نیت ٹھیک نہ تھی مگر شروع ایسی چیز کو کیا ہے کہ وہ خود ٹھیک کر لیتی ہے۔

یہی بات ہے کہ اس کو جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ طالب علموں کی ابتدائی حالت دیکھ کر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل مہمل ہوتے ہیں۔ دنیا سے تو نا آشنا ہیں ہی دین میں کیا کمال پیدا کیا۔

میں کہتا ہوں ابھی ان کی حالت کیا دیکھتے ہو۔

پڑھتے رہو۔ انہیں میں مقتدا لوگ ہوں گے اور

انہیں میں غزالی وقت بھی ہوں گے۔ طالب علموں سے اگر ذرا ملاحظہ ہو جائے تو تمام شہر میں سن لیجئے اسلامی مدرسہ والوں نے یوں کیا۔ کس قدر مغائرت اس لفظ سے شکیں ہے۔ آپ کو ان سے تعلق رکھنا چاہئے یا قطع کرنا۔ یہ تمہارے دین کے حامل ہیں۔ ان سے قطع کرنا کس سے قطع کرنا ہے۔ آپ کو ان سے تعلق ہی رکھنا چاہئے۔

اگر آپ کا بیچ بازار میں کسی سے لڑائے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو جائے کہ سراسر زیادتی اسی کی تھی تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے اگر لڑائی

کے وقت آپ پہنچ جائیں گے تو لڑکے کی زیادتی اور عدم زیادتی کی طرف
تو خیال بھی نہ ہوگا۔ اس وقت تو اسی کی حفاظت کریں گے اور جس طرح ممکن ہوگا
اس کی بات نیچی نہ ہونے دیں گے۔ پھر اس عرصہ کے فرو ہونے کے بعد علیحدگی
میں بچہ کو فہمائش کریں گے کہ آئندہ ایسی زیادتی نہ کرنا دیر بھی جب ہے کہ آپ
بہت ہی حق پسند ہوں ورنہ باطل ہی کی پیروی ہوگی اور اس کو کچھ ملامت وغیرہ
نہ ہوگی، اور اگر کوئی غیر آدمی پوچھے گا کہ میاں کیا بات تھی تو یا تو اپنے بچہ کو
بے قصور کہیں گے اور اگر بالکل ہی صریح خطا ہوگی تو کہہ دیں گے کچھ نہیں بازا میں
ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ لڑکا تیز مزاج ہے، دوتا کسی سے ہے نہیں
بات بڑھ گئی۔

اپنے بچہ کے عیب کو کیوں مشہور نہ کیا۔ اس کا عیب عیب نہیں ہے
وجہ یہ ہے کہ اس سے آپ کو طبعی تعلق ہے۔ اس کی بدنامی اپنی بدنامی ہے
بچہ سے طبیعت کے حکم سے تعلق ہے، طالب علم سے حق تعالیٰ کے حکم سے
تعلق رکھا ہوتا۔ اس کے قصور کو بھی اپنے بچہ کے قصور کی طرح دبایا ہوتا۔ بچہ کی
بدنامی میں اپنی بدنامی سمجھی تھی، طالب علم کی بدنامی میں اپنے دین کی بدنامی سمجھی ہوتی
بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر ان کے قصور نہ پکڑے جائیں تو ان کو تنبیہ کیوں کہہ
ہو۔ میں کہتا ہوں اپنی طبیعت سے ہی انصاف کر لو کہ جس طرح اپنے بچہ کو تنبیہ
کرتے ہو اسی طرح طالب علم کو کرتے ہو یا نہیں۔

فرض کر لو کہ تمہارا بچہ اس قدر شریر ہو کہ یا وجود فہمائش کے بھی نہ مانے اور
بد سے بدتر حرکتیں کرے جس سے خاندان بھر پر دھبہ آجائے۔ تنگ و ناموس

کو بڑے لگ جائے تب آپ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ کیا اس سے بالکل قطع تعلق کر دیتے ہیں۔ قطع نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی قطع بھی کر دے، تو دل پر وہ صدمہ رہتا ہے کہ موت سے بدتر ہے۔ باوجود قطع کے تمام عمر بھی چاہتے ہیں کہ کاش یہ اچھن اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔ خود سمجھانے سے جب اثر نہیں ہوتا تو جن کا وہ لحاظ کرتا ہے ان سے فہمائش کرائی جاتی ہے۔ طالب علم کے کسی بڑے بڑم پر تو کیا ایک چھوٹے سے تصور پر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اسی طرح مشفقانہ تنبیہ ہوتی ہے یا اجنبیانہ۔ اگر اسی طرح مشفقانہ تنبیہ آپ کرتے ہیں تو الحمد للہ وہاں مقصود اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر کہتا ہوں کہ ان سے آپ نے قطع کیوں کیا۔ کیا وہ آپ کے دین کے محافظ نہیں ہیں یا آپ کے ذمہ دین کی حفاظت نہیں ہے۔ ایک کے تصور پر آپ سب کو بدنام کرتے ہیں کیا آپ کے سب نیچے ایک ہی سے صالح ہوتے ہیں یا بچپن ہی سے آپ کے نیچے تمیز دار ہوتے ہیں۔ ان میں بھی اگر ایک کم سمجھ ہے تو بڑے بڑے سمجھ دار بھی تو ہیں۔ آج اگر یہ کم استعداد ہیں تو کل امام وقت اور غزالی وقت بھی تو انہی میں سے ہوں گے۔ ابتدائی حالت دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کرو۔ ہر طاعت کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ طاعت ہونی چاہیے خواہ کسی طرح ہو پھر طاعت آدمی کو خود درست کر لیتی ہے اور طاعت ایسی چیز ہے کہ اس میں دینی اور دنیاوی دونوں نفع ہیں۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے۔ اگرچہ آدمی چنداں مالدار نہ ہو، مگر طاعت کے ساتھ عجیب طرح کا اطمینان اور فراخ قلب ہوتا ہے اور برعکس

اس کے معصیت سے رزق میں تنگی ہوتی ہے اور اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی مضریتیں ہیں جو معصیت پر متفرع ہیں۔

غرض فرمانبرداری سے ہمیشہ مسرت ہوتی اور معصیت سے مصرت اور یہ تو لازمی مضریتیں ہیں۔ اکثر مضریتیں

ایمانداری کی مثال

متعدی ہو جاتی ہیں جیسے کہ غیبت کہ جب ایک آدمی کسی کی غیبت کرے گا تو دوسرے کو خبر پہنچے ہی گی پھر وہ کیوں نہ کرے گا۔ بلکہ اس سے زیادہ کہے گا اس سے دونوں میں عداوت پیدا ہوگی۔ پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دونوں میں پڑ جاتی ہے تو دونوں کا نماز روزہ سب عداوت ہو جاتی ہے۔ اسٹھنے میں بیٹھنے میں سونے میں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کو نقصان پہنچے۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل میں دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ یہ کیا نماز ہوئی شغل قلب ہوا اور کا ہے سے حرام چیز ہے۔ منہ میں روزہ ہے اور زبان دوسرے کی غیبت سے آلودہ ہے۔ دل میں خوش ہیں کہ روزہ ہے۔ یہ خبر نہیں کہ روزہ میں ان چیزوں کو تو چھوڑا جو فی نفسہ حلال تھیں یعنی کھانا پینا اور جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس کو نہ چھوڑا تو کیا روزہ ہوا۔

غرض یہ عداوت اسی غیبت کی بدولت ہوتی اور عداوت وہ چیز ہے کہ قلب کو ایک ہی طرف کا کر لیتی ہے اور صرف ایک کام کا رہ جاتا ہے مصرت رسائی۔ آپ جانتے ہیں کہ چھوٹا سا لفظ کس قدر شر کو جامع ہے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اظہر من الشمس ہے۔ یہ اتحاد کا ضد ہے۔ جتنی چیزیں نبوی و دینی اتحاد میں ہیں اتنا ہی شر بمقابلہ اس کے اس میں ہے۔ یہ سب کا ہے سے ہوا صرف ذرا سی

غیبت سے۔ یہ معصیت کی متعدی مضرت کی مثال ہوئی۔ یہ بھی خواہش نفسانی کا ایک فروغ ہے۔

خواہش نفسانی کی ایک اور خوابی سینٹے میرا اور آپ کا جائداد پر مقدمہ ہے ہر شخص کی خواہش ہوئی کہ مجھ کو ہی پورا مل جاوے۔ بس لڑائی ہو گئی۔ اگر دونوں یہ کہتے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے تو طول کا ہے کو کھچتا۔ مقدمہ بازی کی نوبت کیوں آتی اور باہمی نفاق اور عداوتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں ایک قصہ ہے راحم سابقہ میں بھی بڑے بڑے اچھے لوگ ہوئے ہیں، ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ ایک مکان بیچا بشری سے جب دخل لیا تو اس میں ایک گھڑا سونے کا بھرا ہوا پایا۔ وہ گھڑا لے کر بائع کے پاس آیا کہ لو اپنا گھڑا لے لو۔ تنہا رے مکان میں سے نکلا ہے۔ اس نے کہا میں تو مکان کی قیمت لے چکا۔ میرا اس میں کیا ہے۔ اس نے کہا میں نے تو قیمت مکان کی دی ہے۔ اس پر عقد ٹھہرا ہے۔ یہ گھڑا عقد میں شامل نہیں میں کیسے لے لوں۔ ایمان داری اسے کہتے ہیں۔ اگر آج کل گھڑا نکل آئے، تو مزہ آجائے۔

کانپور میں دو آدمیوں نے کہیں من لیا تھا کہ شبِ برات میں جو کچھ دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ شبِ برات کو دونوں ایک مٹی کا بڑا ڈھیلہ لے کر بیٹھے اور اس پر ایک روٹال ڈھانک دیا اور دعا مانگنی شروع کی کہ یا اللہ یہ مٹی سونا ہو جائے تمام رات جاگے اور اسی دعا میں رہے جوں جوں صبح قریب ہوتی تھی اشتیاق بڑھتا جاتا تھا کہ اب یہ سونے کا ہو جائے گا۔ بمشکل صبح بکری

اور جلدی سے اس کو کھولا، دیکھا تو وہی مٹی۔ ساری آرزو میں خاک ہو گئی اور
 دل مر گیا کہ شب قدر بھی خالی گئی جس پر بڑا اعتماد تھا۔ طرح طرح کے شیطانی
 خیال دل میں آئے کہ دُعا کو ویسے بھی سنا کرتے تھے کہ قبول ہوتی ہے اور
 آج تو شب قدر تھی۔ اسی نزد میں بیٹھے تھے خیریت ہوئی کہ بندہ خدا ایک
 درزی آگیا۔ یہ کچھ اہل علم کی صحبت پائے ہوئے تھا۔ اس نے پوچھا، کیسے
 سست ہو۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ کہا بھائی شکریہ کرو۔ اسی میں کچھ حکمت ہوگی
 ایک ذرا سی بات تو مجھے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ میاں تمہارے بدخواہ نہیں ہیں
 تم نے تو یہ سمجھا کہ مٹی سونا بننے میں تمہارا نفع ہے مگر تھا نقصان۔ ابھی جب صبح
 تم نے ڈھیلے کو کھولا اگر وہ سونے کا نکلتا تو تم دونوں میں لڑائی تو ابھی ہوتی
 پھر جانے کہاں تک طول کھینچتا۔ ممکن ہے کہ ڈھیلے کسی تیسرے کا ہو جاتا اور تم
 دونوں میں لڑائی مفت میں بندھ جاتی۔ آدمی سمجھ دار تھے دونوں کی تسکین ہو گئی
 موہوم سونے کے لئے تو اتنی محنت کی کہیں سونے کا گھڑا نظر پڑ جائے تو جانے
 کیا ہو۔ اس کو دیکھئے کہ گھڑا مالک مکان کو دینے آیا اور مالک کو دیکھئے کہ لینے
 سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ ایسے تھے۔

ایثار کی نادر مثال | صحابہ کا ایک قصہ کتاب میں آتا ہے کہ ایک
 غزوے میں بہت سے آدمی شہید ہوئے۔ چند
 آدمی نزع کی حالت میں تھے۔ موت کے وقت تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایک
 شخص نے آواز دی کہ کوئی میرے حلق میں ذرا سا پانی ڈال دے تو بڑا کام
 کرے ایک بندہ خدا کا سہ میں پانی لے کر پہنچے اور چاہتے تھے کہ ان کے

منہ میں ڈالیں کہ اتنے میں ایک طرف سے اور آواز آئی کہ ذرا سا پانی کوئی پلاتا
 انہوں نے پڑے پڑے کہا کہ پہلے اُن کو پلاؤ، پھر مجھے پلاتا۔ یہ شخص پیالہ لے
 کر اُن کے پاس پہنچے۔ پلاتا ہی چاہتے تھے کہ اسی طرح اور ایک آواز آئی۔
 عرض مقتل میں چھ سات بجے اسی طرح پانی لئے پھرے اور سب یہی کہتے رہے
 کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ۔ اخیر میں جن کے پاس پہنچے اُن کو پلانے کی نوبت
 نہ آئی تھی کہ دم آخر ہو گیا۔ یہ شخص واپس ہوئے اور پہلوں کے پاس پانی لئے
 جس کو دیکھا دم آخر ہو چکا ہے۔ ایک نے بھی پانی نہ پیا اور پیالہ بھرا ہوا لے کر
 چلے آئے۔ ایشار اس کو کہتے ہیں۔

پانی وہ چیز ہے کہ سفر ج میں دیکھا ہے کہ باپ بیٹے کو پیاس میں چھوڑ
 دیتے ہیں۔ موت کے وقت کی پیاس کا کیا حال ہوگا۔

اتباع ہوا | عرض ہم میں جو بجائے ایشار کے کشاکشی اور نزاع و جدال ہے
 اس کی وجہ ہی اتباع ہوا ہے۔ یہی باہم اتفاق نہیں ہونے دیتا
 آج کل سب نے یاد کر لیا ہے، اتفاق اتفاق۔ یہ خبر نہیں کہ اتفاق کا ہے سے
 ہوتا ہے۔ اتفاق ہوتا ہے خواہش نفسانی کو روکنے سے۔ دو شخصوں میں جب
 جھگڑا ہو گا کسی ایسی چیز پر ہو گا کہ ہر ایک ان میں سے اس کی خواہش رکھتا ہو گا
 اگر وہ دونوں اپنی خواہش کو روک لیں اور اس چیز کی طلب چھوڑ دیں تو پھر جھگڑا
 کیسا اور نا اتفاقی کہاں۔ اتفاق اتفاق کہتے رہتے اور نفس کو روکنے نہیں تو اس
 سے کیا ہوتا ہے۔

عرض جملہ شرور کی جڑ اگر ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے۔ خواہش نفسانی

روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر روکا نہ جائے نفس کو تو کیا انجام ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو سب ہی نے سمجھا حتیٰ کہ حکام میں سے ان لوگوں نے جن کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں۔ حاکم کیا کرتا ہے بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے۔ جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جن کو لوگ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نزدیک باعث مفرت ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحتوں کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو۔ ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے چوروں کو چوری کرنے دے، زبردستوں پر زبردستوں کو ظلم کرنے دے، غرض ہر شخص کو محلے بالطبع کر دے کہ اپنی خواہش کے موافق ہو جاہو کرو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس نطف سے زندگی بسر ہوگی۔

قانون کیا ہے ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے یا کوئی اور۔ جو کوئی حد سے گزرے اس کو جزا و سزا ہوتی ہے۔ جب اس گزرنے میں کچھ برائی سمجھی گئی ہے تب ہی تو اس پر جزا اور سزا ہے۔ سب کو محلی بالطبع کیوں نہ چھوڑ دیا گیا۔ فرض کیجئے کسی کو روپیہ کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں بھی ہے یوں ہی کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے تو اس کو کیوں منع کرتے ہو اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے یا میرے جی کو کیوں مار رہے ہو۔ خواہش پوری کرنے دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مفرت ہے کہ اس کے مقابلے میں ضرورت کا بھی خیال نہیں کیا جاسکتا۔

عجبت الہی اور مصلحت دنیوی | دنیاوی انتظاموں کو بھی دیکھ کر یہ بتا
صاف نکلتی ہے کہ خواہش نفسانی روکنے

ہی کی چیز ہے۔ اگر خواہش نفسانی روکنے کی چیز نہیں ہے تو اپنے گھوڑوں بی بی
کو کیوں روکتے ہو۔ اس کو تو طرح طرح سے سمجھاتے ہو زیادہ زیور فضول ہے
پوشاک میں زیادہ تکلف سے کیا فائدہ مگر اپنے نفس کو نہیں روکتے۔ اگر آزادی
ہی پسند ہے تو بی بی کو بھی آزادی دو جس طرح چاہے خرچ کرے اور اگر آزادی
میں نقصان ہے تو جس طرح بی بی کو بے فائدہ کاموں سے روکتے ہو اپنے
نفس کو بھی پابند کرو۔ مگر دونوں کے آزاد ہونے کو تو کوئی پسند نہ کرے گا تو لامحالہ
دوسری ہی شق رہ گئی کہ دونوں پابند ہوں۔ پابندی وہ چیز ہے کہ کسی کو اس
سے بچاؤ نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جو عقلمند ہیں بالاختیار کرتے ہیں اور کم عقل غبرا
اور غبرا پابند بنا رہے جاتے ہیں۔ آپ نفس کو بالکل آزاد کسی طرح نہیں کر سکتے
اگر قانون خداوندی سے آزاد کر دیا اور اللہ میاں نے دنیا میں کچھ نہ کہا، تو قانون
دنیاوی پابند بنانے کے لئے موجود ہے اور دست بدست سزا تیار ہے
بہت سی خواہشیں ہیں کہ قانون کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑتی ہیں کیونکہ ان پر عمل
کرنے سے سزا ہوتی ہے۔

اے مسلمانو! قانون کی وجہ سے تم نے خواہش نفسانی کو چھوڑ دیا اور اللہ
رسول کے حکم سے نہیں چھوڑتے۔ کیا غضب کی بات ہے۔ اگر قانونا ممانعت
ہو جائے تو ایک بھی جیلہ باقی نہ رہے اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت
کریں تو اس میں جیلے نکالے جائیں اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے

مرتبہ سے نکل کر تخریف تک پہنچ جائیں اور اگر بالکل ہی مرتجح حکم ہو تو اس کے مقابلہ ضرورت سے کیا جاتا ہے کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت سے قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبت الہی مصلحت دنیوی کے برابر بھی نہ ہوئی۔

عشق مولیٰ کے کم از پیلے بود گئے گشتن بہر او اولے بود
ایک مردار عورت اگر کہے رات بھر کھڑے رہو تو کہ گزریں اور اللہ میاں
کے حکم سے عشا کی نماز بھی بھاری ہے۔

انتباہ حق کی ضرورت | ایک شخص کا قصہ ہے یہ ایک بزرگ ہیں پہلے حالت ایسی ہی تھی بعد بڑے شخص ہوئے ہیں، ایک عورت سے عشق تھا۔ بڑی ٹنڈوں کے بعد ایک دن کہیں شام کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور صورت یہ تھی کہ کھڑکی کے نیچے بات کرنے کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے محو ہوئے کہ تمام رات اسی طرح گزر گئی۔ عشا کی نماز بھی فوت ہوئی۔ جب مؤذن نے صبح کی اذان دی تو حضرت کیا کہتے ہیں بھلا مانس تجھے بھی آج ہی عشا کی اذان سویرے کہنی رہ گئی تھی۔ کسی نے کہا جناب خبر بھی ہے صبح ہو گئی۔ صبح کی اذان ہے۔ منہ پھیر کر دیکھا تو واقعی صبح ہے۔ دل پر اثر ہوا بہت روئے۔ ایک عورت کے خیال میں حق سبحانہ تعالیٰ کا فرض قضا ہوا۔ ایک بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور اس خیال کو چھوڑا۔ پھر صاحب کمال ہوئے اور سمجھی کچھ ہوا۔

ایک عورت کی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے۔ عذر کریں تو آج کل

احکام الہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک کسی کے احکام کی۔ احکام الہی خواہ کیسے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہی حکمت ہوں مگر شاق ہوتے ہیں اگر کسی اپنی احکام کو کہے جن کو اللہ میاں نے فرمایا تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کبھی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں تب بھی کچھ شاق نہ ہوں معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہ شاق نہیں صرف محبت کی کسر ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے کا قلم فی ید الکاتب ہوتا اور غیر کے سامنے لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔ انصاف کی بات ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بندہ پر کس قدر انعام و افضال ہر وقت ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف سے ناک بھی نہیں ملتا۔ پھر اپنے منعم کے سامنے نرم ہونا چاہیے یا اپنے جیسے عاجز بلکہ دشمن کے سامنے۔ ظاہر ہے کہ منعم ہی کے سامنے ہونا چاہیے۔

چونکہ برمیخت بر بند و بستہ باش چوں کشاید چاکبک بر جنتہ باش
ہیچو کلکم در میان اصبعیں نیستم در صف طاعتین بین
مسلمان کو اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہیے جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم کہ اس کو کچھ غار نہیں۔ کاتب کو اختیار ہے جس طرف چاہے چلائے اور چلائے یا نہ چلائے۔ کیا غضب ہے کہ اللہ میاں کے ماتحت میں تو ایسے نہ ہوں اور ہوں کس کے ماتحت میں نفس کے۔ بت پرستی کو منع کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کی بغل میں بت ہے۔ ظاہر کی بت پرستی پر تو طرح طرح کے طعن کئے جاتے ہیں اور ان کو احمق بتایا جاتا ہے اور اپنے آپ بالطنی بت

پرستی میں مبتلا ہیں اور عقلمندی کا دعویٰ ہے۔ کسی سلف ایک بت کو پوجا کسی نے دوسرے کو۔ کیا فرق ہے لات کو پوجنے والے میں اور عزی کو پوجنے والے میں۔ جہاں ظاہری بت پرستی چھوڑی ہے باطنی بھی چھوڑو۔ اپنی باگ نفس کے ماتحت میں مرت دو۔ حق تعالیٰ اپنے منعم حقیقی کے تصرف میں ہمہ تن اپنے آپ کو دے دو۔ احکام الہی کے سامنے سر جھکاؤ۔ اتباع تو وہی ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو چھوڑ دے اور دوسرے کے ارادے کے تابع ہو جائے۔ دیکھ لیجئے قانون کے سامنے کیا حال ہوتا ہے کہ اپنی خواہش چھوڑنی پڑتی ہے اور حاکم کے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ اب لوگوں نے حق سبحانہ تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا اور وہی کا اتباع اختیار کر لیا۔

اتباع کے کرنے کی دو چیزیں تھیں۔ عقائد اور اعمال | **اتباع کی چیزیں**

اور یہ احکام مصلحت وقت کے موافق نہیں۔ مگر اب عقائد میں بھی خواہش نفسانی کو ترجیح ہونے لگی ہے۔ اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر ان کے ادا میں قصور کرتے تھے۔ اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اڑ گئی۔ ادا کے اعمال کو تو چھوڑا تکلیف کی وجہ سے مگر ان کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف تھی۔ ہاں اس میں بھی ایک تکلیف تھی۔ وہ یہ کہ نفس نے دیکھا اگرچہ میں نے ادا کے اعمال سے روک دیا مگر تا وقتیکہ ان کے وجوب کا عقیدہ اس کے ذہن میں ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی ادا پر مستعد ہو جائے۔ اس وقت پھر مجھے کوئی تدبیر اس کے روکنے کی کرنی پڑے گی اور احتمال ہے کہ روکنے سے نہ رکے۔ اس لئے

اس احتمال کے قطع کرنے اور اپنی بار بار کی تکلیف بچانے کے لئے نفس نے یہ تدبیر نکالی۔ سرے سے ان کے وجوب کا عقیدہ ہی اڑا دینا چاہیے۔ عقائد اعمال کے لئے بمنزلہ جڑ کے ہیں۔ جڑ کاٹ دینے سے احتمال ہی نہیں رہتا کہ شاخیں پھر پھری ہوں گی۔ عقائد کے بدلنے سے نفس بہت سی تکلیفوں سے بچ گیا۔

ایک صاحب فرمانے لگے کہ دین میں جو کچھ خارج ہے وہ نماز ہے غیر مذہب کے بہت سے آدمی اس وقت اسلام میں آنے کو تیار ہیں مگر یہ خیال مانع ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنی ہوگی۔ پانچ وقت کی پابندی سرپٹے ہے گی۔ مولوی لوگ نماز کی قید اٹھاویں تو آج ہی دیکھئے کتنے کافر مسلمان بنتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت کتنی بڑھ جاتی ہے (نماز ایسی مولویوں کی ہے کہ معاف کر دیں)۔

ایک صاحب کہتے ہیں سود کی ممانعت سے افلاس آگیا اور قومیں سود ہی کے ذریعہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں۔ عرض جو جس کی سمجھ میں آتا ہے احکام الہی میں اصلاح دینے کو تیار ہے۔ گویا اللہ میاں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم سے رائے لے کر کیوں احکام مقرر نہ کئے تھے۔ کثرت رائے پر کیوں فیصلہ نہ کیا۔

ہم لوگوں کا کیا حال ہے۔ عقائد میں یہ حال، اعمال میں یہ حال۔ صورت میں آزادی۔ آمدنی میں حلال حرام کی خبر نہیں۔ زمینداروں نے طرح طرح کے ناجائز ابواب باندھ رکھے ہیں۔ بیع و شراعت میں عقد کے صحت و بطلان کی پروا نہیں۔ آم کی بہار بکتی ہے حالانکہ آم کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ یہ بیع باطل ہے۔ بیع باطل میں

مال مشتری کی ملک نہیں ہوتا۔ اس کا رد واجب ہے۔ یکے بعد دیگرے جہاں تک
سلسلہ چلا جائے کسی کی ملک نہ ہوگا۔ گناہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ غرض معاملات
کی صفائی کی طرف اصلاً خیال نہیں۔

صحیح طریق تعلیم | زبان غیبت میں اور طعن میں مبتلا۔ قلب حرص میں اور
طمع میں گرفتار۔ اونٹ سے کسی نے پوچھا، اونٹ

رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ کہا کوئی بھی نہیں۔ ایسی ہی ہم لوگوں کی حالت
ہے۔ ظاہر کی طرف دیکھتے وہ ٹھیک نہیں، باطن کی طرف نظر کیجئے وہ درست
نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے صرف احکام ہی نازل نہیں کئے بلکہ ایک اتنا بڑا
نبی بھیج کر یہ بھی بتا دیا کہ اس نمونے کے ہو کر آؤ۔

تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شے کی پیمائش زبانی بتادی جائے
اور کہہ دیا جائے کہ اتنی لانی اتنی چوڑی اتنی موٹی بنا کر لاؤ۔ اور ایک طریقہ
ہے کہ اس کا ناپ تول بتانے کے ساتھ بنا ہوا نمونہ بھی دکھا دیا جائے کہ
آخری صورت ایسی پیدا ہونی چاہئے۔ یہ نہایت ابلغ ہے۔

خوشنویس لکھنے والوں کو بتاتا ہے کہ الف تین قسط کا لکھو اور اوپر کی
نوک، ایسی ہو اور نیچے کی ایسی۔ مگر یہ بتانا کافی نہیں۔ لکھنے والوں کو ہرگز الف
بنانا نہیں آسکتا تا وقتیکہ استاد اس کی صورت بھی اپنے ہاتھ سے کھینچ کر نہ دکھائے
اگر ہاتھ سے لکھ کر دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو استاد کے نخرے اٹھا
کی کیا ضرورت رہتی۔ کتابوں میں سب حروف کی پیمائش لکھی ہے، اسی کو پیٹ
کر خوش نویس بن جاتے حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ سوا احکام

ظاہر و باطن کی تحدید کا نام ہے جس سے ظاہر و باطن کی ایک خاص صورت پیدا ہوتی ہے جس طرح کہ تین قط سے الف کے طول کی حد قائم ہو اور نصف قط یا کم و بیش سے اس کے عرض کی انتہا مقرر ہو کر ایک خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ اللہ میاں صرف احکام نازل فرما دیتے جو ظاہر و باطن کی ناپ تول ہیں اور یہ فرما دیتے کہ یہ ناپ تول ہیں۔ ان کو پورا پورا درست کر دیتے یہاں تک کہ وہ صورت پیدا ہو جائے جو ہماری مرضی کے موافق ہو اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم لوگ کس قدر حرج میں پڑ جاتے اور کسی کسی وقتیں پیش آئیں۔ تمام عمر احکام کی پابندی کرتے اور پھر اطمینان نہ ہوتا کہ وہ صورت پیدا ہو گئی جو حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے۔

مگر نہیں حق سبحانہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ احکام بھی نازل فرمائے اور محض اپنی رحمت سے نمونہ بھی دکھا دیا کہ اصلاً تو وہ نہ رہے کہ احکام کی پوری پوری تعمیل ہو گئی یا نہیں۔ اپنی صورت کو نمونہ سے ملا کر دیکھ لو۔ ذرا سا بھی فرق ہو تو معلوم ہو جائے گا کس حکم کی تعمیل میں کسر رہ گئی۔ مگر اس رحمت کی کیا قدر ہوئی۔ ہم کس قدر نمونہ کے موافق بن کر آئے۔

اگر درزی کو اپکن سینے کو دو اور وہ ساری اپکن بہت ٹھیک اور خوبصورت بدن کے موافق سینے۔ کہیں جھول تک نہ رہے۔ سلائی کہیں ٹیڑھی نہ ہو۔ عرض سب طرح ٹھیک ہو۔ صرف ایک آستین کو چار انگل چھوٹا کر لائے تو کیا آپ اس کو لے لیں گے اور کیا یہ بات اس کی سن لیں گے کہ جناب ساری اپکن تو ٹھیک ہے۔ آستین بھی دو ہیں۔ صرف ایک آستین چار انگل کم رہ گئی تو

کیا ڈر ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس اچکین کو آپ اُس کے ہر دوسے ماریں گے اور اُس نے قصداً ایسا کیا ہے تو قیمت واپس لینے پر بھی اکتفا نہ ہوگا۔ کچھ جو مان بھی لیا جائے گا۔ حالانکہ نمونہ سے صرف چار انگل مخالفت ہے۔

یہاں نمونہ سے چار انگل بھی مطابقت نہیں۔ اللہ میاں کا حکم تھا کہ نمونہ کے مطابق ہو۔ ان کنندہ تحبون اللہ، فاتبعون یحببکم اللہ، عباد علیہ واصحابی۔

افسوس مسلمانوں نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا۔ جو وضع بتائی اُس کے خلاف

وضع نراشی، نکاح نیا تراشا، اخلاق نئے اختیار کئے، اب عقائد میں بھی تراشی خراش ہونے لگی۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے اتباع کا۔ معلوم نہیں کہ اتباع کس چیز کا نام ہے۔ اگر کوئی ایسے لوگوں کو دیکھے تو کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ قوم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ سے ہے۔ گروہ میں ہونے کے لئے کسی بات میں بھی مطابقت نہیں بلکہ جان بوجھ کر مخالفت کی جاتی ہے۔ اس گروہ میں ہونا تو کہاں اب تو اس گروہ کے لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہئے کیونکہ اس گروہ میں ترقی نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے لکھنؤ میں بیان کیا کہ آج کمیٹی ہوئی جس میں ان اسباب پر بحث کی گئی جو مسلمانوں کو ترقی سے روک رہے ہیں۔ بہت سے اسباب بیان کئے گئے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ مذہب مانع ہے ترقی سے۔ اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔

اس لائق ہی ترقی ہی نے خوابی ڈالی ہے جو کچھ ڈالی ہے۔ کہیں اس
ہوس کی انتہا بھی ہوگی۔ حالانکہ یہ ترقی ہرگز اطاعت کے ساتھ جمع نہیں ہو
سکتی کیونکہ اطاعت میں کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرنی پڑے گی اور یہ ترقی مطلق
الغنائی کو چاہتی ہے۔ یہ ترقی وہی حاصل کر سکتا ہے کہ نہ یہ دیکھے کہ روپیہ حق
سے آیا نہ یہ دیکھے کہ ناحق سے آیا۔ چوری سے وہ نڈر ہے ظلم سے اسے
خوف نہ ہو۔ روپیہ حاصل ہو جس طرح ہو۔ حالانکہ قطع نظر خلاف دین ہونے
سے ایسا مال دنیا ہی میں فلاح نہیں دیتا، بلکہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ جاتا
ہے۔ اس میں برکت مطلق نہیں ہوتی۔ رشوت کے ہزار اور حلال کے سو برابر
ہیں۔

جو غرض ہے روپیہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ بیان کیا گیا، تو
اب سوچو اپنے اوپر ایسی چیزیں کیوں لازم کر لیں جن کے لئے کوئی تعداد روپیہ
کی کافی نہیں ہوتی اور کسی مرتبہ ترقی پر بس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چیزیں لازم کس نے
کہیں۔ اسی ہوائے نفس نے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے اسی کا علاج بتایا ہے اب
میں اس پر بیان کو ختم کرتا ہوں۔

غرض سارا فساد خواہش نفسانی سے ہوا ہے
خواہش نفسانی کا علاج سو علاج کیا ہے کہ نفس کو خواہش سے روکو

مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے جب
سبب جاتا رہے گا مرض بھی نہ رہے گا۔ مسلمانو! نفسانی خواہشوں کو چھوڑو
اور حق سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ کیا اللہ میاں کا کچھ حق نہیں ہے آپ لوگوں

پر۔ دیکھئے اللہ میاں ایسے ایسے امراض کا علاج بتاتے ہیں جن کو تم اپنے آپ کسی طرح سمجھ نہ سکتے اور وہ اندہی اندر تمہارا کام تمام کر ڈالتے۔ تعجب ہے کہ طب اکبر کی قدر ہو مگر احکام الہی کی قدر نہ ہو۔ جانتے ہیں کہ طب اکبر کے خلاف کریں گے تو صحت محفوظ نہ رہے گی اور مرض گھیر لے گا۔ صابو! طب اکبر پر عمل کرنے سے صحت جسمانی میں خرابی آتی ہے اور احکام الہی پر عمل نہ کرنے سے قلبی اور روحانی صحت برباد ہوتی ہے۔ پھر جو شرف قلب اور روح کو جسم پر ہے وہی اس کی صحت کو اس کی صحت پر اور اس کے محافظ کو اس کے محافظ پر ہونا چاہئے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ احکام الہی کی کیا عظمت ہونی چاہئے۔

اللہ میاں کا بتایا ہوا علاج کس قدر قابل قدر چیز ہے۔ وہ علاج یہی ہوتا ہے نفس کا چھوڑنا ہے۔ اس کا آسان طریق میں بتلائے دیتا ہوں۔ چند روز کرنا پڑے گا۔ بہت ہی تھوڑے دنوں میں انشاء اللہ تعالیٰ نفع معلوم ہوگا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر کام ابتداء تکلیف سے ہوتا ہے پھر کرتے کرتے اس میں ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے۔ سو آپ اس کا التزام کر لیجئے کہ کوئی قول کوئی فعل معادل میں آئے ہی نہ کر ڈالا کیجئے کہ وہ خواہش نفس کے موافق ہوگا بلکہ ہر کام سے پہلے ذرا سوچنا چاہئے۔ اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جو کام کیا جائے پہلے سوچ لیا جائے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے خلاف تو نہیں۔ یہ میرے لئے مفید ہے یا مضر ہے دھڑک ہو کہ کام کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دی جائے۔ اول اول یہ ذرا شاق ہوگا مگر تھوڑے دنوں

میں عادت ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام میں خیال رکھو۔ یہ حالت ہو جائے کہ
 بات منہ سے نکالتی ہے مگر رک گئے کہ حق تعالیٰ کا امر کیا ہے اور نفس کی
 خواہش کیا ہے۔ جس بات میں نفس کی خواہش پائی اس کو زبان سے نہ نکالانا
 اس پر عمل کیا۔

یہی بات کہ تمیز کیوں کر ہو، حق تعالیٰ کے امر نفس کی خواہش میں اس
 کے لئے علم دین کی ضرورت ہے۔ تھوڑا علم ضرور چاہئے کہ کتاب نہیں پڑھ
 سکتے ہو تو پوچھ لو۔ چند روز یہی عادت ڈالو۔ اس سے کسی قدر آپ کے
 بولنے میں کمی ہوگی اور کسی قدر آپ کے کھانے میں کمی ہوگی۔ مگر جس وقت
 لذت اس کی حاصل ہوگی تو آپ پھر تھوڑے سے کو بہت پر ترجیح دیں گے۔
 تھوڑی چیز ہو اور اچھی ہو وہ بہتر ہے۔ اس سے کہ بڑی ہو اور بہت ہو غلبہ
 کتنا ہی ہو ایک چمچہ فیرینی پر اس کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ جب طاعت میں کسی کو
 لذت آنے لگتی ہے تو معصیت کی خفارت اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی
 ہے۔ پھر معصیت کا کرنا اس سے زیادہ دشوار ہونے لگتا ہے جتنا کہ پہلے
 طاعت کرنا تھا۔ مسلمان پر طاعت کرنے میں عادی ہونے سے پہلے بھی
 جو بار ہوتا ہے وہ ایک کلفت ہوتی ہے کہ نیا کام کرنے میں محسوس ہوتی ہے
 جیسا کہ دیگر امور عادی میں تغیر ہونے سے معلوم ہونے لگا کرتے ہیں ورنہ طاعت
 کو کر کے تو مسلمان کو ہمیشہ نشاط اور فرحت ہی ہوتی ہے، عادی ہو جانے
 کے بعد تو معصیت سے نفرت ہو جاتی ہے اور اگر احیاناً معصیت ہو بھی
 گئی تو طبیعت کسرت رہتی ہے اور کسی طرح چین نہیں آتا تا وقتیکہ استغفار

نہ کرے۔

طاعت کی لذت

طاعت میں محبت لذت ہے کہ آدمی لاکھ

روپیہ پر ایک نماز کو ترجیح دیتا ہے۔ کوئی

بات تو ہے کہ اگر مسلمان سے کہیں کہ لاکھ روپیہ لے لے اور آج ظہر کی نماز

نہ پڑھ تو روپیہ نہ لے گا اور ظہر پڑھے گا۔ ضرور کوئی ایسی چیز پاتا ہے کہ لاکھ

روپیہ سے زیادہ ہے۔ حالانکہ ہماری نماز کچھ نماز نہیں۔ اقل سے اخیر تک

کوئی نہ کن بھی قابل اعتبار نہیں۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل ادھر ادھر

ہے۔ زبان سے قرائت کر رہے ہیں مگر مطلق منہ نہیں کہ اللہ میاں سے کیا کہہ

رہے ہیں۔ خیریت یہ ہے کہ زبان الفاظ پر حاوی ہو گئی۔ آپ ہی آپ قرائت

کر لیتی ہے ورنہ باعتبار احکام ظاہری بھی عدم صحت کا فتویٰ دیا جاتا اور عادی

واجب ہوتا۔ سرسجدہ میں ہے مگر خیال اور ہی کہیں ہے۔ اس حالت پر بھی

آدمی لاکھ روپیہ سے زیادہ کوئی چیز اس میں پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ پر اس کو ترجیح

دیتا ہے اور اگر نماز نماز ہو جائے تو اندازہ کر لیجئے کہ کیا اثر رکھے۔

جرعہ خاک آمیز بھول محنوں کند صاف گر باشد ندانم بھول کند

واقعی طاعت وہ چیز ہے اگر اس میں ایک لمحہ کا لطف بھی میسر ہو جائے

تو آدمی دنیا و مافیہا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ خواہش نفسانی کا تو دشمن

ہو جائے۔ نفس کے پھندے میں آدمی جب ہی تک آتا ہے جب تک

کہ طاعت کی لذت سے واقف نہیں ہوا۔ عادت ڈالنے پھر لذت آنے

لگے گی اور کچھ کلفت نہ رہے گی۔ ابتدا میں کسی قدر کلفت ضرور ہوتی ہے

عزیز یہ عادت ڈالنی چاہئے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے۔ اگر وہ کام خواہش نفس سے ہو تو نہ کیا۔ اس طرح معصیت چھوٹ جائے گی اور طاعت ہی طاعت رہ جائے گی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترک ہوا سے نفس کے لئے معین ہے خوف۔ اور یہ ظاہر بھی ہے۔ جس کام سے بھی کوئی باز رہتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف خوف سے باز رہتا ہے۔ جہاں نماز کا خوف ہو یا مال کے نقصان کا یا ہم چشموں میں سبکی کا یا جس چیز کا بھی ہو مگر ہو گا خوف ہی۔ ڈاکو ڈاکہ کیوں نہیں ڈالتا، سزا کے خوف سے۔ بچہ نثرارت سے کیسے رکتا ہے پٹنے کے خوف سے۔ بہت سے جرائم سے لوگ باز رہتے ہیں جرمانہ کے خوف سے مجفل میں آدمی تہذیب سے کیوں بچتا ہے اور خلاف متانت حرکات سے کیوں باز رہتا ہے سبکی کے خوف سے وحشی ہذا۔ خوف ہی تو اٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن قائم نہیں رہتا اور قدر ہو جاتا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ طاعت کا ذریعہ ہے۔

البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خوف تو ہر مومن کو ہے پھر کیا وجہ کہ ہوا نفسانی نہیں چھوٹی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خوف کا استحضار نہیں! اور استحضار نہ ہونے کی وجہ صرف ایک ہے عذاب کا نہ سوچنا۔ پس غتہائے معاملہ یہ سوچنا ہوا۔ اس سے خوف کا غلبہ واستحضار ہو گا جو ترک ہوا کے لئے کافی ہو جاویگا۔ اب صرف اس کا طریق سہل بتائے دیتا ہوں

طاعت کی تدبیر کہ سوچنا شروع کیجئے اور اس کے لئے ایک

وقت مقرر کیجئے۔ مثلاً سونے کا وقت۔ اس وقت آپ کے کسی دنیا کے کام میں بھی حرج نہ ہوگا۔ دنیا کے لئے تو سارا وقت دیا ہے اللہ میاں کے لئے نکما ہی وقت دو۔ اتنا تو کرو۔ اللہ میاں اس میں تمہارا کام بنا دیں گے۔ وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بندہ ذرا ادھر کو منہ کرے اور رحمت کے انبار اس پر پھر دیں۔ بندہ میں منٹ دیر میں سوئے لیٹ کر یا بیٹھ کر یاد کیا کیجئے کہ آج کیا کیا گناہ کئے۔ فہرست گناہ تیار کیجئے۔ پھر دل میں خیال جمائیے۔ گویا میدان قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے۔ اپنا مددگار کوئی بھی نہیں۔ دشمن بہتر ہے ہیں۔ جیلہ کوئی چل نہیں سکتا۔ زمین گرم تانبے کی طرح کھول رہی ہے۔ آفتاب سر پر دوزخ سامنے ہے اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے۔ کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ یہ سب حالات پیش نظر ہوں گے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کرے گا کہ بے شک خطا وار ہوں۔ کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں بات کو یہ کیجئے پھر صبح اٹھ کر یاد رکھئے کہ کل فلاں فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا ہے۔ سو آج وہ گناہ نہ ہونے پائے۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ یک لخت نہ چھوٹ جائیں گے تو کمی تو ہو ہی جائے گی۔ اور چند روز میں تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گناہ رہ سکیں۔ یہ ایسی تدبیر ہے کہ چند ہی روز کرنے سے آدمی معاصی سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے اور دل میں گناہ کے وقت خود ایک ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔

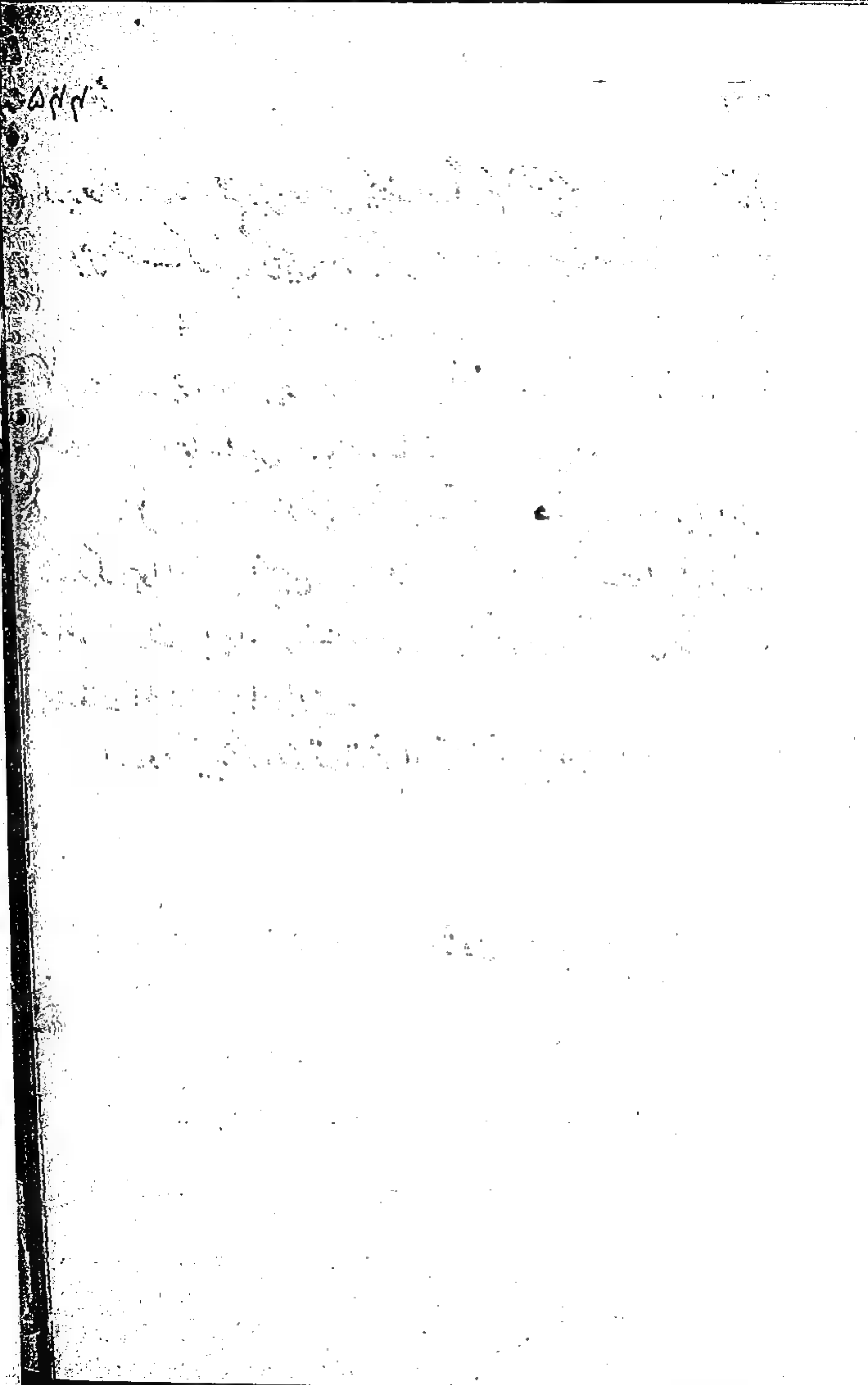
پھر اس کے لئے علم کی ضرورت ہوگی کہ معلوم ہو یہ کام معصیت ہے

اور یہ طاعت۔ سو علم دین حاصل کیجئے اور اگر کم فرصتی کا عذر ہے تو چند کتابیں
اُن دو میں منتخب کر دی گئی ہیں۔ ان کو کسی سمجھ دار سے سبقاً سبقاً پڑھ لیجئے۔ یہ
ضرورت کے لئے کافی ہے۔ کتابوں کو خود نہ پڑھئے کہ اس سے طبیعت
میں پہلے سے جو اشکال ہوتے ہیں وہ حل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات نئے
اشکال پیدا ہو جاتے ہیں اور باعث مفرت ہوتے ہیں۔

حاصل سارے وعظ کا یہ ہوا کہ جنت مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ
ہے ترک ہوا اور اس کا معین ہے خوف اور اس کا طریق ہے مراقبہ جب
مراقبہ کیا خوف پیدا ہوا۔ اس سے خواہش نفسانی چھوٹ گئی۔ اس پر نتیجہ مرتب
ہوا۔ فان الجنة هي العاوی۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم اور توفیق عمل کی عطا فرمادیں۔

اشرف علی!



وعظ الحیوة

آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کے متعلق یہ وعظ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ
کو مولوی محمد انوار الحسن صاحب ریش کا کوری ضلع بکھنو کے مکان
پر تحت پر بیٹھ کر فرمایا۔ سامعین تحیناً ایک ہزار مستورات کا
مجمع بھی تھا۔ ۴ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ حکیم محمد یوسف بخوری نے قلمبند
کیا

خطبة ما توره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله ونحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونشركل
عليه ونعوذ بالله من شرورنا ونافسنا ومن سيئاتنا أعمالنا
من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد
أن سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالى
عليه وبارك وسلم أما بعد فاعوذ بالله من الشيطان
الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم بل توثرون
الحياة الدنيا والآخرة خير مما يبقون -

فلاح کا طریقہ | اس آیت کے اختیار کرنے کی وجہ جیسے یہ ہے کہ اس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہے ایسے ہی اختیار کرنے کا معین یہ امر بھی ہے کہ قریب ہی زمانہ ہوا کہ اس کے قبل اس سے پہلے کی آیات کے متعلق بیان ہو چکا ہے چونکہ یہ اسی سلسلہ میں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو پورا کر دیا جائے۔ اس لئے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے اور اس کے قبل بھی ایک ضروری مضمون بیان ہو رہا ہے جو مرتبط اس جملہ سے ہے۔

■ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کے قبل فلاح کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاح کامل کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو تزکیہ ہو کہ اُس کو بُرے عقائد اور اخلاق ذمیرہ سے پاک کرے۔

دوسرے ذکر ہو کہ خدا تعالیٰ کا نام لیا کرے اور ذکر زبان کی عبادت ہے جیسے کہ تزکیہ عقائد فاسدہ اور اخلاق ذمیمہ سے قلب کی عبادت ہے تیسرے صلوٰۃ ہے کہ اس کو مع اس کے حقوق کے ادا کرے کیونکہ نماز کامل وہی ہے جو مع حقوق کے ادا کی جائے۔

غرض تین چیزیں ہیں۔ فلاح کا طریقہ، قلب و نفس کا پاک کرنا اور زبان سے ذکر کرنا اور جوارح سے اعمال کرنا اور اگر زبان کو جوارح سے مانا جائے تو دو چیزیں نکلیں گی۔ ایک قلب و نفس کا پاک کرنا جو باطن کے متعلق ہے۔ دوسرے جوارح کو اعمال ظاہری سے آراستہ کرنا۔ یہ ظاہر کے متعلق ہے خلاصہ یہ کہ ظاہر و باطن دونوں کو درست کرنا۔ یہ ہے فلاح کا طریقہ۔

اس مضمون کا مفصل بیان ہو چکا ہے۔ اس لئے اب بقیہ مضمون جو اس آیت کے اندر مذکور ہے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔ بل توشرون الحیوة الدنیا بل اس میں اضراب کے واسطے ہے جس کے معنی ہیں اعراف کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے یوں کہیں جاؤ زید بل عمرو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلایا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہئے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ بل توشرون الحیوة

الدنیا۔ بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنے ہو۔ جس سے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے نہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ یوں فلاح تو سب کو مطلوب ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں مقصود اصلی سب کا یہی ہے باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور بتلا رہے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرو گے تو فلاح ہوگی۔ نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ تعیین میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ ہم لوگ **وَلَا تُدْرِكُهُ الْبَصَرُ وَلَا هِيَ تُدْرِكُ الْبَصَرَ** ترجیح دے رہے ہیں دوسری زندگی کو آخرت پر دوسرے

یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی۔ پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شب روز دنیا ہی میں مہمک اور اسی کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے۔ حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی چنانچہ اہل ایمان کی شان کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ

لَا تَلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَاتَّقُوا الصَّلَاةَ
وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ

یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے
غافل نہیں کرتی۔

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے
معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے
غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل
ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہو
سکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔

مثلاً کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور مدت کے بعد اس کی تمنا
پوری ہو کہ محبوب اُس سے ملنے کے لئے بلائے تو وہ چاہے گا کہ ایسا بن کر
جاؤں کہ اُس کے نزدیک بے قدر نہ ہوں۔ آدمیوں کی شکل سے جاؤں کیونکہ
اس میں محبوب کی بے قدری ہے کہ چہاروں کی طرح اس کے سامنے چلا جائے
نظر پر ہے کہ جب محبوب کے سامنے انسانیّت کی شکل اور آدمیت کے حامیہ
میں ہو کر جانا چاہیے گا تو اول تخطی ہو جائے گا۔ غسل کرے گا۔ خط بنوا کر پاک
صاف ہو کر اور اچھے کپڑے پہن کر تب اُس کے سامنے جاوے گا۔ پس وہ
صورۃً تو غیر محبوب میں مشغول ہے مگر حقیقتاً محبوب ہی کی یاد میں مشغول ہے۔
اس واسطے کہ وہ سارے کام محبوب ہی کے واسطے کر رہا ہے۔ جو شخص
ناواقف ہے وہ یوں خیال کرے گا کہ یہ عاشق نہیں ہے اور کہے گا کہ یہ

کیسا عاشق ہے۔ اگر واقعی عاشق ہوتا تو جب محبوب نے بلایا تھا فوراً دوڑ پڑتا
 ذرا بھی تاثر نہ کرتا۔ اس کی کیا حالت ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر سنگار میں مصروف
 ہے۔ ادبیوں کہے گا کہ شاید یہ محبوب کو بھول گیا اسے محبوب کا دھیان
 نہیں رہا۔ اس پر محبت کا غلبہ نہیں۔ لیکن اس بات کو عاشق جانتا ہے کہ وہ
 ہر حالت میں محبوب ہی کی یاد میں لگا ہوا ہے۔ خط بنوا رہا ہے تو وہ بھی محبوب
 ہی کے واسطے اور غسل کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے لئے۔ اور سنگار
 کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کی خوشی کے واسطے۔ غرض ہر فعل اس کا محبوب
 ہی کے لئے ہے۔ ہر کام میں اس کی یاد ہے۔ کوئی کام اس کا اپنے نفس
 کے لئے نہیں۔ اس کا تو کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں یہ کہہ سکے کہ یہ شخص محبوب
 سے غافل ہے۔ گویا ہر عمل وہ ایسے کام کر رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
 یہ محبوب سے غافل ہے۔ نگہ واقع میں ذرا برابر بھی اس کو محبوب سے غفلت
 نہیں ہے۔

جب یہ بات اذنی سے عشق میں ٹکے ہے کہ نہ خط بنواتا محبوب کی یاد
 سے غافل کرتا ہے نہ غسل اور سنگار کرنا غافل بناتا ہے۔ پھر کیا تعجب کی بات
 ہے کہ حق تعالیٰ کے عاشق کو تجارت اور بیع اس کی یاد سے غافل کرے
 خدا تعالیٰ کا عاشق تجارت کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے اور بیع کرتا
 ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے۔ جیسے عاشق مجازی ہر کام محبوب کے تعلق سے
 کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ہر کام محبوب حقیقی کے تعلق سے کرتا ہے۔ یہ کوئی کام
 اپنے نفس کے لئے کرتا ہی نہیں۔ پس اس کی تو نظیر دنیا میں موجود ہے۔ بہر حال

مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کا کام کرے تو اس میں بھی دین ہی ملحوظ رہے۔

نیت کی اہمیت | ایک حکایت ہے کہ کسی بزرگ کے ایک مرید نے مکان بنوایا تھا۔ جب بن کر تیار ہو

گیا تو شیخ کو مکان دکھانے لے گئے۔ اس مکان میں روشندان کھلے ہوئے تھے۔ شیخ نے پوچھا کہ یہ روشندان کس عرض سے رکھے گئے ہیں۔ مرید نے کہا کہ یہ اس واسطے رکھے ہیں کہ مکان میں روشنی آیا کرے۔ یہ سن کر شیخ نے ایک آہ کھینچی اور کہا کم بخت اگر بنانے کے وقت یہی نیت کر لیتا کہ ان سے اذان کی آواز آیا کرے تو تیرا مقصود تو جب بھی حاصل ہو جاتا۔ کیونکہ روشنی کا آنا تو اس کی نیت کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کے ساتھ جو تک روشندان باقی رہتے ابھر بھی جاتا۔

آخر یہ کیا بات تھی جو یہ بزرگ روشنی کی نیت سے روشن دان بنانے پر خفا ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں بھی دین ہی مطلوب ہونا چاہئے۔ واقعی اگر دنیا میں دین مطلوب ہو تو اس سے منافع دنیوی منقطع تھوڑا ہی ہو جائیگا کہ دنیا کے وہ منافع تو حاصل ہوتے ہی ہیں مگر نیت درست ہونے سے دین کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔

مثلاً نکاح دنیا کا قصہ ہے اور کوئی اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ دین محض تو وہ ہے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہو اور نکاح کافر و مسلم دونوں میں مشترک ہے۔ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف دنیا کا قصہ ہے۔

مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نیت یہ ہونا چاہیے کہ اس سے
عفت محفوظ رہے اور طبیعت منتشر نہ ہو اور بھیت خاطر کے ساتھ عبادت
ہو سکے۔ اگر اس نیت سے کریگا تو نکاح عبادت ہو جاوے گا۔

اس سے بڑھ کر اور لیجئے۔ کھانا پینا اور پہنتا ہے دنیا ہی کا کام کافر
بھی کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں۔ اس میں دنیا ہی کا تو نفع ہے مگر اس میں بھی مسلمان
کی شان وہ ہونی چاہیے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو یہ نیت
رکھنا چاہیے کہ میں اس لئے کھاتا پیتا ہوں کہ طاعت پر قوت ہو۔ حق تعالیٰ
کی نعمت کا تذکرہ ہو۔ پس اس نیت سے کھانا پینا بھی عبادت ہو جاوے گا
اسی طرح سے جتنے دنیوی امور ہیں ان سب میں دین کی نیت ہو سکتی ہے۔

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسب الحلال
خولیفۃ بعد الفریضۃ یعنی جو فرائض شرعیہ ہیں نماز روزہ وغیرہ ان کے بعد
کسب حلال بھی فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو فرض فرماتے
ہیں تو پھر یہ دین کیسے نہ ہو گا۔

فرض کا تو دین کے اندر سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ دین کے اندر بہت
سے درجے ہیں واجب اور سنت اور فرض۔ ان سب میں فرض اعلیٰ درجہ ہے
لہذا کسب حلال اعلیٰ درجہ کی فرد ہوئی دین کی۔ جب کہ اس میں نیت ہو کہ اہل
و عیال کی خدمت کریں گے۔ حقوق کو ادا کریں گے۔

حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ انسان جو بی بی کے پاس جاتا ہے
اس سے بھی ثواب ملتا ہے۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو

اپنی خواہش کا پورا کرنا ہے۔ اس پر کیوں ثواب ملتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر اپنی خواہش کو بے محل صرف کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا تو جب حلال موقع میں صرف کرتا ہے تو ثواب بھی ملتا چاہئے۔

عرض مسلمان اس بنا پر دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ معاوہہ چھوڑ دینا چاہئے کہ ہم دنیا دار ہیں مسلمان تو دنیا دار ہی ہے۔ مسلمان کی دنیا بھی دین ہی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نیت کر کے اس کو دین بنانا چاہئے۔ لیجئے اس سے زیادہ کیمیا گر کون ہو گا جس کو تانبے کا سونا بنانے کی ترکیب بتا دی گئی ہے۔ متعارف کیمیا میں اوّل تو حکما کا بھی اختلاف ہے کہ تانبے کا سونا بنتا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ پھر اگر ممکن بھی ہو تو اس کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ مگر یہ کیمیا کیسی کستی اور آسان ہے کہ دنیا کا تانبہ تھوڑی سی آہن سے جس کا نام نیت ہے سونا بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ایسی کیمیا عطا فرمائی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے نفع نہیں ہوتے۔ اسی بات میں ہم دنیا کو دین بنا سکتے ہیں۔

ہماری شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ ہر امر میں دین ہی مقصود ہو۔ دنیا کی دھن ہوتا۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہم دین کو بھی دنیا بنا رہے ہیں۔ بڑی چیز سے علم اور عبادت۔ ہم عالم اور عابد ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو آخر نیت سے کہ ہماری آبرو اور عزت ہو۔ ہماری طرف لوگوں کا احتقاد ہوا۔ لیجئے اللہ ﷻ کو سب سے بڑے طبقہ میں شمار ہیں جن کو صوفیاء

لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی کثرت سے وہ لوگ ہیں جن کو کیفیات مقصود ہوتی ہیں۔ کیفیات کیا ہیں اغراض دنیویہ ہی تو ہیں۔ پس عام طور پر یہی حالت ہے کہ دین کو دنیا بنا رکھا ہے۔

بہر حال میں نے یہ تقریر اس پر کی ہے کہ مسلمانوں کو یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہیے کہ ہم دنیا دار ہیں مسلمان تو دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا دار تو اور ہی لوگ ہیں۔ اور یہ نہیں ہے اس شعر کے معنی بھی حل ہو گئے کہ

اہل دنیا کا فسران مطلق اند روز و شب رزق رزق و رزق بنی اند

ظاہراً تو یہ بہت سخت حکم معلوم ہوتا ہے کہ سارے دنیا دار کافر ہیں۔

کیونکہ اکثر مسلمان بھی تو دنیا دار ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ وہ بھی کافر ہوں۔ مگر ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اس شعر کی ترکیب سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ اہل دنیا کو مبتلا اور کافران مطلق کو خبر قرار دیا ہے بلکہ اس کی ترکیب برعکس ہے یعنی کافران مطلق مبتلا و مؤخر اور اہل دنیا خبر مقدم ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اہل دنیا کون لوگ ہیں کافر مطلق ہیں۔ اہل دنیا کا مصداق بس کفار ہی ہیں۔ مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ حقیقتہً اہل دنیا نہیں۔ اس معنی کا قرینہ خود آگے موجود ہے کہ فرماتے ہیں

روز و شب رزق رزق و رزق بنی اند

کیونکہ یہ نشان تو کفار ہی کی ہے کہ دن رات دنیا کی رزق رزق اور بنی ہیں مبتلا ہیں اور شب و روز دنیا ہی کی ان کو دین ہے کسی وقت بھی خدا کی یاد ان کی زبان اور دل میں نہیں آتی چنانچہ تجربہ سے دیکھ لیجئے کہ جب ذکر کریں گے

تو تجارت اور دنیا ہی کے جھگڑوں کا ذکر کریں گے۔ ریلوں میں دیکھتے تو یہی دنیا کے فتنے لے کر بیٹھیں گے کہ تمہارے یہاں گیارہویں کیا بھاؤ ہیں فلاں چیز کا نرخ کیا ہے۔ یہی باتیں ہر وقت زبان پر رہتی ہیں اور اس کے سوا کوئی ذکر ہی نہیں اور مسلمان چاہے کیسا ہی ہو اس کی یہ حالت ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی نہ کوئی ساعت ایسی ضرور ہوگی کہ جس میں وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوگا۔ مسلمان کسی نہ کسی وقت ضرور گھبراٹے گا اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ اگر نہ بان سے نہیں تو قلب میں تو ضرور خدا کو یاد کرے گا۔

طاعون میں دیکھتے کیا حالت تھی۔ حق تعالیٰ اور آخرت کی طرف کیسی توجہ تھی۔ اگر مسلمانوں کے دل میں آخرت بسی ہوئی نہیں ہے تو اس کی یاد کیسے ہوتی ہے۔ بہر حال دنیا دار کسی مسلمان کو نہیں کہہ سکتے۔ مسلمان تو اہل دین ہی ہوگا۔

راحت قلب | اہل دین کے مراتب مختلف ہیں کوئی کم کوئی زیادہ جیسے عربی مدرسہ میں طلبا ہوتے ہیں۔ کوئی میزبان پڑھنے والا ہے۔ کوئی مشکوٰۃ پڑھتا ہے، کوئی شمس باز غہ نگہ میں سب عربی پڑھنے والے۔ پس جتنے اہل اسلام ہیں سب اہل دین ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کو بھی دین ہی بنائے مگر ایسا کرتے نہیں۔ چنانچہ اپنی حالت کے نتیجے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی آمیزش دنیا کی ہوتی ہے اور اس میں زیادہ مقصود دنیا ہی ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی یہ حالت کر رکھی ہے اور اس کو کچھ

یہ ہے ہیں کہ یہی طریقہ ہے فلاح کا۔ جب ہی تو رات دن دنیا میں کھپ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کسی کو سلطنت حاصل ہو جائے۔ اعلیٰ درجہ کی ترقی ہو کہ بادشاہ ہو جائے مگر حقیقت میں جس کا نام کامیابی ہے وہ اس کو بھی میسر نہیں۔ ہاں اللہ والے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کامیابی میسر ہے۔

میں مختصراً کامیابی کا ذکر کئے دیتا ہوں کہ وہ ہے کیا چیز۔ اول مقصود کا نعتین ہونا چاہئے کہ مقصود کیا چیز ہے۔ تب معلوم ہوگا کہ وہ کس کو حاصل ہے تو وہ کامیاب ہے اور کس کو نہیں۔ سو وہ مقصود میں ایک چیز ہے۔ وہ کیا ہے راحت۔ جو بھی کوشش کرتے ہیں کامیابی کی اس سے مقصود سب کا راحت قلب ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اب مشاہدہ کر لیجئے۔ بادشاہ کی حالت دیکھ لیجئے۔ ان کو راحت بھی نصیب ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو راحت میسر نہیں ہے۔

راز اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقاصد متعین کر رکھے ہیں جن کے کچھ تو اسباب ہی اختیار میں نہیں اور بعض کو اختیار ہی تو ہیں مگر ان پر مقاصد کا توتل یقینی نہیں کہ جب وہ پائے جائیں تو مقصود بھی ضرور پایا جائے بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اسباب کو جمع کرتے ہیں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ سو وہ لوگ چونکہ اپنے خیال میں اول ایک ثمرہ متعین کر لیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے یہ ثمرہ حاصل ہوگا اور اس کی توقع پر ان اسباب کو مہیا کرتے ہیں اور پھر اکثر اس توقع کے خلاف پیش آتا ہے اور ان کی امید پوری نہیں ہوتی اس لئے پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ پریشانی کا حاصل کیا ہے۔ امید کا پورا نہ ہونا پس

جب وہ امید پوری نہیں ہوتی تو قتل ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے ان لوگوں کی بیشانی کی۔ بخلاف اہل دین کے کہ ان کا اصلی مقصد صرف آخرت ہے سو وہ اس کے اسباب مہیا کرتے ہیں اور اس کے بچنے اسباب ہیں وہ سب یقینی ہیں کہ عثرہ کا ان پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ تخلف ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نماز پڑھے اور خدا تعالیٰ خوش نہ ہوں۔ یا کوئی اسلام لائے اور جنت نہ ملے یہی یہ بات کہ شاید اسلام پر خاتمہ نہ ہونے کی وجہ سے جنت نہ ملے سو یہ اس کے یقینی ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ منافات اس وقت ہوتی جب کہ اسلام تو پایا جاتا اور پھر جنت نہ ملتی اور اس صورت میں تو اسلام ہی نہ رہتا اور وہ بھی اپنے اختیار سے۔ کیونکہ اسلام اس وقت تک نہیں جاتا جب تک کہ خود ہی اس کو نہ چھوڑے۔ چونکہ اسباب آخرت پر عثرہ کا مرتب یقینی ہے اس لئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی امید پوری نہ ہو۔ پس ان کو پریشانی کیوں ہوگی کیونکہ پریشانی کی حقیقت ملتی امید کا پورا نہ ہونا اور اس کا یہاں احتمال ہی نہیں اور اگر کسی موقع میں ان کو دنیا بھی مقصود ہوتی ہے تب بھی ان کو پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ گو اس کے عثرہ کا تخلف اسباب سے ممکن ہے مگر ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ اس پر مصر نہیں ہوتے کہ اسباب پر عثرہ ضرور ہی مرتب ہو جائے اگر عثرہ مرتب نہ ہو تو وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ جس وقت کسی مریض کا علاج کرتے ہیں تو وہ گو یہ چاہتے ہیں کہ اچھا ہو جائے مگر قلب کو اس کے ساتھ ایسا متعلق نہیں کہ کہ اگر صحت نہ ہو تو پریشان ہو جائیں۔ اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی وہ راضی ہی

رہتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ یہ رضا عقلی ہے یا طبعی تو سمجھ لیتا چاہئے کہ رضا طبعی تو ضروری نہیں۔

اہل حال و اہل مقام

البعثۃ رضا عقلی ضروری ہے۔ ان حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مریض کی صحت پر بھی راضی ہوتے ہیں اور عدم صحت پر بھی۔ اگر مریض مریضی جائے تو طبعا تو ایک قسم کا حزن ہوتا ہے مگر عقلاً اس پر بھی راضی ہوتے ہیں اور بعضوں کو طبعا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی حکایت سنی ہے اور کتابوں میں موجود ہے کہ وہ اولاد کے مرنے پر ہنس دیتے۔ ان کو اس میں لذت ہوتی۔

میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے۔ تو اس کو سن کر ہونٹوں پر تبسم تھا اور یوں کہا کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ ہنستے تھے۔ حالانکہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔

بعض اہل حال کی یہ حالت بھی ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ایسے لوگوں کو اعلیٰ ترقی ہو گئی ہے بلکہ ان سے آگے اور مرتبہ کے لوگ ہیں جو ان کے مرتبہ کو پہنچ کر اوٹا گئے بڑھ گئے ہیں۔ گو ان کی ظاہری حالت بڑھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور عوام ان کو کچھ نہیں سمجھتے۔

اس کو ایک مثال میں سمجھئے کہ ایک دریا بڑے عظیم الشان ہے اور اس کے اس کنارے پر ایک شخص ہے۔ اور ایک شخص اس کنارے پر اتر گیا ہے اور ایک قبیرا شخص دریا کے درمیان میں ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ زیادہ کمال کون ہے۔ عبور اور عدم عبور کے اعتبار سے مقام کس کا بڑھا ہوا

ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دریا کو عبور کر گیا ہے وہ بڑھا ہوا ہے اور کامل السیروی ہے جو دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ بتدی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس کنارہ پر کھڑا ہے۔ اور اہل سال کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو دریا کے پیر میں ہے۔ یہ شخص متوسط الحال ہے اور اہل مقام کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دریا سے پار ہو گیا ہے۔ یہ شخص منتہی ہے۔ بظاہر تو بتدی کی حالت میں اور اس کی حالت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کی حالت یکساں معلوم ہوتی ہے جو شخص ناواقف ہو گا وہ اس شخص کو جو پار اتر گیا ہے اس کنارے والے کی مثال سمجھے گا۔ کیونکہ جیسے یہ کنارہ پر ہے ایسے ہی وہ بھی کنارہ پر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اسے یہ گمان ہو کہ وہ اس کنارہ پر آنا چاہتا ہے اور جو شخص واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ دریا سے گزر کر اس جگہ آیا ہے تو وہ اس کو افضل سمجھے گا۔

بہنیں قسم کے لوگ ہوئے۔ بتدی، متوسط، منتہی۔ منتہی کی حالت ظاہر میں بتدی کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے عوام کو دونوں میں امتیاز نہیں ہوتا اور اہل سال کی حالت ہے ممتاز۔ اس لئے عوام ان کو بہت بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ابھی درمیان میں ہیں۔ چونکہ منتہی کی حالت مشابہ ہوتی ہے بتدی کے اس لئے جیسے بتدی کو بیٹے کے مرنے سے رونا آتا ہے منتہی کو بھی آتا ہے گو کہ اس کے رونے اور اس کے رونے میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔

و یکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم

کے انتقال پر روئے اور جب بعض صحابہ نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا کہ یہ رونا
تو رحمت ہے۔ ترجم اور شفقت سے رونا آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کمال ہوگا اور آپ کی حالت یہ تھی کہ آپ کو
صاحبزادہ کے انتقال پر رونا آیا۔ پس معلوم ہوا کہ رونا کمال کے منافی نہیں جو
کمال ہوتا ہے اس کو ایسے واقعات میں ضرور رونا آتا ہے اور یہ شخص صاحب
مقام ہوتا ہے۔

البتہ صاحب حال نہیں روتا۔ عوام اہل حال کو کمال سمجھتے ہیں مگر واقع
میں کمال وہی شخص ہے جو بیٹے کے مرنے پر روتا ہے۔ بظاہر تو اس کا
رونا بتدی کے مشابہ ہے مگر واقع میں مشابہ نہیں۔ بتدی کا رونا تو محض داعیہ
نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بتدی کا رونا ترجم کی وجہ سے ہوتا ہے اس کے
اور اس کے رونے میں بہت فرق ہے اور صرف رونے ہی میں نہیں بلکہ
اس کے اور اس کے کھانے پینے اور ہر بات میں بہت فرق ہے۔ گو
ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے عوام نے انبیاء کو نہیں پہچانا اور ان کو
ظاہری نظر سے اپنے ہی مثل سمجھے۔ کیونکہ ان کی ظاہری حالت کوئی ممتاز نہ
تھی۔ اسی واسطے تو حضرت ہود کے بارہ میں ان کی قوم نے کہا تھا۔
ما هذا الا بشر مثکم یا کل مما تاکلون منه ولشعنا
بما تشرعون۔

نہیں ہیں یہ مگر ایک بشر تمہاری مثل۔ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے

ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو۔

غرض کہ اہل حال کو اہل مقام سے افضل سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ پس اہل حال کی رضا طبعی ہوتی ہے اور اہل مقام کی رضا عقلی۔ رضا ان میں بھی ہوتی ہے مگر وہ طبعی رضا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ پس یہ درجہ میں اہل حال سے زیادہ ہیں۔

تفویض اور راحت | یہاں ایک شبہ اور ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ جب اہل حال کو رونا نہیں آتا اور اہل مقام کو رونا آتا ہے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل حال طبیعت کی پاکیزگی میں اہل مقام سے بڑھے ہوئے ہیں کہ قضاء حق سے ان کی طبیعت پر بھی ناگواری نہیں ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اہل حال کی طبیعت چونکہ حال کے غلبہ کی وجہ سے بالکل مغلوب ہو جاتی ہے اس لئے ان کی طبیعت نہ واقعات کا پورا ادراک کرتی ہے اور نہ ان سے متاثر ہوتی ہے اور اہل مقام پر چونکہ حال کا غلبہ نہیں رہتا اس لئے ان میں امور طبعیہ پھر عود کرتے ہیں مگر عقلی قوت ان کی طبعی قوت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے بمقتضائے طبع ان کو رونا آتا ہے مگر از جارفتہ نہیں ہوتے۔ حد کے اندر رہتے ہیں۔ اور جب ان کی طبیعت مغلوب نہیں ہے تو پھر رونا کیوں نہ آوے۔ طبیعت تو اسی واسطے ہے کہ اس کو ادراک ہو اور ادراک نہ ہونا یہ تو اس کا نقص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام واقعات سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ادراک کامل ہوتا ہے

یہ معلوم ہوا کہ لطافت طبع میں بھی اہل مقام ہی بڑھے ہوئے ہیں کہ ان پڑاقت کا اثر ہوتا ہے۔ اور اہل حال کی طبع میں چونکہ اس درجہ لطافت نہیں اس لئے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ اہل مقام نے تو دو حق ادا کئے۔ طبیعت کا حق بھی ادا کیا وہ یہ کہ ان کو روٹا آیا اور عقل کا بھی حق ادا کیا کہ حد سے تجاوز نہیں کیا، اس لئے یہ اہل حال سے زیادہ ہیں۔

بہر حال یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ان کو اصرار نہیں ہوتا کسی شرہ پر کہ فلاں عمل کا شرہ مرتب ہو ہی۔ اگر شرہ مرتب نہ بھی ہو تو بھی راضی ہیں۔ البتہ الحاج سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ایسا کر دیجئے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ ہی کا ان کو ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب المتحین فی
الدعاء
کہ اللہ میاں دعا میں ہٹ کرنے
والوں کو دوست رکھتے ہیں۔

اس وجہ سے وہ الحاج کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔ مگر نہ اسی طرح کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو وہ ناراض ہوں بلکہ وہ اس وقت بھی راضی ہی رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کو شرہ پر اصرار نہیں ہوتا۔ بل اصرار بایں معنی ہوتا ہے کہ ان کی حاجت ہے۔ اس کو پیش کرتے ہیں۔ اظہار عبدیت کے لئے حق تعالیٰ کے سامنے مچلتے ہیں کہ ہم ضرور ہیں گے۔ جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی رضا اس میں سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس میں عبدیت کا اظہار ہے۔ اس سے وہ اپنی عبدیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سوال کا اصرار اس معنی کہ ہے۔

باقی اصرار کی نفی جو کی ہے کہ ان کو شرہ پر اصرار نہیں ہوتا تو وہ اس معنی

کہ ہے کہ ان کو شرہ نہ ملنے سے پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر شرہ نہ ملے
 تو وہ تاراج ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شکایتیں پیدا ہونے لگیں کہ سمجھاؤ
 تھا اور ہو گیا کچھ۔ اُن کی دعا تو یہ ہوتی ہے کہ ادھر ان کو دعا کے قبول نہ ہونے
 کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ معاً ہی اُن کے قلب میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خبری
 ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوا۔ گو کہ ہم اس کے خلاف کو خیر سمجھ
 ہوئے تھے۔ پس یہ سمجھ کر وہ اسی پر خوش ہو جاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے
 ہوتا ہے۔ ایسی حالت نہیں ہوتی جیسی کہ اہل دنیا کی ہوتی ہے کہ کوئی مر جائے
 تو یہ رمان کرتے ہیں کہ اگر چار برس اور زندہ رہتا تو لڑکے کی تعلیم پوری ہو جاتی
 اور یہ کام ہو جاتا اور وہ ہو جاتا۔ یہ رمان اللہ والوں کو پیدا نہیں ہوتے۔ قسم
 کھا کہ کہتا ہوں کہ وہ ایسے رمان سننے کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی سے کفر کا
 کلمہ سنیں۔ انہیں یہ بات اتنی گراں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے اُن کے کان
 میں کفر کا کلمہ ڈال دیا۔ گو مروت کی وجہ سے وہ اس کو ظاہر نہ کریں مگر اُن کو
 اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں اس امر کا یقین کیسے دلاؤں۔ اگر
 کہنے والے کو آپ سچا سمجھیں تو اس کا یقین کر لیجئے۔ اُن کی حالت تو تفویض
 کی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے کچھ تجویز ہی نہیں کرتے کہ میں یہ کام اسی طرح
 ہو۔

اور اس سے بڑھ کر لیجئے ان حضرات کی تفویض اس قدر کامل ہوتی
 ہے کہ اگر اس میں راحت معلوم ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کہیں اس میں نفس کا
 شائبہ نہ ہو۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ تفویض راحت کی وجہ سے کی جائے

یہ چاہتے ہیں کہ خالص تفویض ہو اور کسی نفسانی غرض کا ثابہ بھی نہ ہو۔
 خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ میں تفویض ہوتی ہے اور تفویض کے اندر ایک
 راحت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شے بھی مقصود نہ رہے گی تو اب جو
 بھی واقع ہوگا، اُس پر یہ راضی ہوں گے تو پھر پریشانی کہاں۔ پس تفویض کے
 اندر بڑی راحت ہے کہ تمام پریشانیوں سے نجات ہو جاتی ہے مگر تفویض
 سے اُن کو راحت بھی مقصود نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں وہ
 یہ کہ اسی نیت سے خدا تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ اس میں چین ہے۔ دگوا
 مقصود ان کا تفویض سے چین ہے، ایسے لازم کو ملزم کر لیتے ہیں راحت تو
 تفویض کے لئے لازم ہے۔ یہ نیت کر کے اس کو ملزم اور مقصود بنا لیتے ہیں،
 یہ بڑی غلطی ہے۔ محققین اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ وہ تو یوں کہتے ہیں کہ تفویض خدا
 تعالیٰ کا حق ہے۔ پس اس کو محض رضا حق کے لئے کرنا سچا ہے اور یہ شخص اس
 کو اپنی غرض کے لئے کرتا ہے۔ سو اُس نے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنی غرض کو
 شامل کر لیا۔ یہی شرک ہے۔ اس لئے محققین اس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی
 تفویض سے پناہ مانگتے ہیں۔ وہ تو یوں سمجھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور حق تعالیٰ
 مالک ہیں۔ اُن کے حقوق عظمت میں سے ایک حق تفویض بھی ہے۔ وہ حق
 عظمت سمجھ کر تفویض کرتے ہیں۔ نہ اس غرض سے کہ راحت ہو۔ وہ تو اگر اس
 کا ثابہ بھی ہو تو پناہ مانگتے ہیں۔

یہ لوگ کس درجہ کے ہوسے ہیں کہ عبادت کے اندر راحت کی
 نیت سے بھی سمجھتے ہیں۔ غرض کہ اصلی نیت تو اُن کی خدا تعالیٰ کی عظمت کا حق

ادا کرنا ہے۔ ہاں راحت اُس کو لازم ہوتی ہے مگر وہ اس طرف التفات نہیں کرتے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص دھوپ میں جا رہا ہو اور اُس نے کسی جانور کے سایہ کو زمین پر دیکھا اور وہ اس کو پکڑنا چاہتا ہے۔ اب وہ اُس کے پیچھے دوڑتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔ کسی عاقل نے اسے بتلانی کہ کم بخت یہ کیوں نہیں کرتا کہ جانور کو پکڑ لے سایہ خود تیرے پاس آجائے گا۔ نادان ہے وہ شخص جو سایہ کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ پرند کو پکڑ لے۔ سایہ تو خود اُس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص پرند کو پکڑے گا وہ سایہ کی طرف التفات نہ کرے گا۔ لیکن سایہ خود اُس کے ساتھ ہوگا۔

تو جیسے اس شخص کے ہاتھ میں پرند ہے اور باوجود سایہ کی طرف التفات نہ ہونے کے سایہ اس کو لازم ہے۔ اسی طرح تفویض کے لئے راحت لازم ہے۔ تفویض کو اختیار کرو۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا حق عظمت ادا ہو۔ پھر راحت تو خود ہی حاصل ہو جاوے گی۔ نادان ہے وہ شخص جو راحت کی غرض سے تفویض کو اختیار کرے۔ عرض یہ کہ جس شخص میں تفویض ہو اُس کو کسی طرح پریشانی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے جو اصلی وقت ہے پریشانی کا جس کا نام فزع اکبر ہے اس میں بھی ایسے لوگوں کو پریشانی نہ ہوگی۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لا یحزنہم الفزع الاکبر۔ اس دن میں ان لوگوں کو ذرہ برابر رنج نہ ہوگا۔ پھر دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے وہ تو ان کے نزدیک

کھیل اور دل لگی ہے پس ایسا شخص دنیا میں کیا رنجیدہ ہوگا۔

اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اہل سلطنت
لحمتِ نیا و آخرت کو بھی راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ کسی جگہ
 پناہ ڈھونڈے نہ ملے گی۔ اگر پناہ ہے تو اس میں ہے جس کو حق تعالیٰ ارشاد
 فرماتے ہیں۔

الابسذکر اللہ تطمئن القلب کہ دلوں کو راحت اللہ کے فکر

ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

میرے بیان سے معلوم ہو گیا کہ فلاح اور کامیابی کا کون سا طریقہ ہے
 کامیابی کا وہی طریقہ ہے جو خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے نہ وہ جو ہم لوگوں نے
 اختیار کر رکھا ہے۔ اسی واسطے لفظ بل لاکہ فرمایا بل تو تشدد الحیوۃ
 الدنیا کہ جو حقیقت طریقہ فلاح ہے اس کو چھوڑ کر تم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا
 ہے کہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ سو یہ طریقہ نہیں فلاح کا بلکہ دوسرا طریقہ
 ہے۔ پس ہم لوگوں میں جو یہ مرض ہے کہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دے
 رہے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے۔ یہ مرض ہمارا
 اندر عام ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس وقت اس آیت کو لیا ہے۔
 چنانچہ ہر وقت ہمیں یہی فکیر ہے کہ کسی طرح سے دنیا ہو۔ مال و دولت بڑھے
 دنیا کا طرح طرح کا ساز و سامان ہو۔ دن رات اس میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ حالت
 ہے۔

چو میر و مبتلا میر و چو خیز و مبتلا خیز و

جس وقت دیکھو یہی دمن ہے یہی فکر ہے۔ آگے وجہ شکایت کی بیان فرماتے ہیں۔

والاخوة خیر والبقی کہ آخرت بہتر اور البقی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان حیات دنیا کو ترجیح دیتا ہے حالانکہ آخرت بہتر اور باقی تر ہے۔ ترجیح اس کو دینا چاہئے اور زیادت و قسم کی ہوتی ہے کما اور کیفاً۔ اس لئے خیر سے تو آخرت کا کیفاً زائد ہونا بیان کیا ہے اور البقی سے کما زائد ہونا مطلب یہ ہے کہ آخرت دنیا سے کما بھی زائد ہے اور کیفاً بھی زائد ہے۔

کما تو اس لئے کہ آخرت چونکہ زمانہ کے اعتبار سے البقی ہے اور اس کی شان ہے لا تقف عند حدی کہ وہ غیر محدود ہے کہ اس کی نہایت ہی نہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کب تک رہے گی ظاہر ہے کہ غیر محدود چیز کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے وہ کما زائد ہے اور کیفاً اس لئے زیادہ ہے کہ نعمائے آخرت اور نعمائے دنیا میں لذت وغیرہ کے لحاظ سے بھی کوئی نسبت نہیں۔ حاصل یہ کہ آخرت دونوں اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے مگر تم پھر بھی دنیا کو ترجیح دے رہے ہو۔ یہ وجہ ہے شکایت کی۔

ترجیح دنیا کی مذمت | اس مضمون کو سن کر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کرتا ہے کہ مولوی بھی عجیب ہیں کہ دنیا کو چھڑانا چاہتے

ہیں۔ ایک تو مسلمان مفلس ہیں ہی سہی ان کے پاس نہیں بھران کے پاس نہیں۔ یہ اور بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے مرستے کو مارے شاہ مدار

یہ چاہتے ہیں کہ اور بھی مفلس ہو جائیں۔ میں نے اس وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا ہے تاکہ یہ بتلا دوں کہ شارع علیہ السلام کا مقصود کیا ہے۔ آیا دنیا کا چھوڑنا مقصود ہے یا کچھ اور مقصود ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس مقام پر نو ثرون ارشاد فرمایا تطلبون یا تکسبون ارشاد نہیں فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الحیوة الدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا کہ تم دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو۔ سو اور الفاظ کو چھوڑ کر جو ثرون فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑائی نہیں جاتی۔ دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا۔ قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مدت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں۔ نہ دنیا کی طلب اور اس کی تحصیل پر۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص ہے جس نے جیب میں گنیاں اور پیسے بھر رکھے ہیں۔ سو اس پر تو اس کو ملامت نہ ہوگی کہ پیسوں کو گنیوں کے ساتھ کیوں جمع کر رکھا ہے۔ اب سمجھئے کہ اس نے یہ کیا کہ جیب میں سے گنیاں تو پھینکنی شروع کر دیں اور اس کی بجائے اور پیسوں کو بھر لیا۔ اس پر اس کو ملامت نہ کی جائے گی۔ پس اس نے جو گنیوں کے ہوتے ہوئے پیسے حاصل کئے اس پر ملامت نہ ہوگی بلکہ ملامت اِثار پر ہوگی کہ گنیوں کو تو چھوڑا اور پیسوں کو حاصل کیا۔ بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ دنیا طلب کرنے اور کمانے پر

لامرت نہ ہوگی۔ بلکہ دین کی گنیوں کے پھینک دیئے اور دنیا کے پیسوں کو اختیار کر لینے پر لامرت ہوگی۔ حق تعالیٰ نے تو شر وں کا لفظ ارشاد فرمایا کہ اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

حاصل یہ کہ دنیا کے ارادہ کرنے کے دو درجہ ہیں۔ ایک ایثار اور ایک محض طلب ایثار جائز نہیں۔ یہی طلب اس میں حرج نہیں۔ اگر دنیا کا طلب کرنا ہی مذموم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ طلب الحلال قریبۃ بعد کہ طلب کرنا حلال کا فرض ہے بعد اور فراغ کے۔

دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلیغ الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے۔

حب الدنیا اس کل خطیئة کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔

یوں نہیں فرمایا کہ کسب الدنیا اس کل خطیئة کہ دنیا کما ناست اس خطاؤں کی جڑ ہے۔ کسب کا لفظ چھوڑ کر حب کا لفظ اختیار کیا۔ اس کی کیا وجہ؟ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ حب دنیا اور چیز ہے اور کسب دنیا اور چیز۔ اگر کسی کو کسب دنیا کی ضرورت پیش آئی اور اس نے اسباب اختیار کر لئے تو کوئی حرج نہیں۔

علامت حرب اللہ | مگر ایک شرط ہے کہ اس کی محبت غالب ہو بلکہ محبت حق تعالیٰ ہی کی غالب ہو۔

کی علامت یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ تعارض کے وقت یہ شخص کیا کرتا ہے
آیا دین کو ترجیح دیتا ہے یا دنیا کو۔ اگر دین کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جاوے گا
کہ حب دین غالب ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ
حب دنیا غالب ہے۔

مثلاً کوئی شخص تجارت کرتا ہے اور اس میں کوئی معاملہ خلاف شرع
پیش آیا اور اس کے کرنے سے اس کو دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر
شرعیات اس کو منع کرتی ہے تو اب تعارض ہوا دین میں اور دنیا میں اب
اگر اس نے نفع دنیا پر خاک ڈال دی اور دین کو اختیار کیا تو سمجھا جائیگا
کہ محبت الہی اس میں غالب ہے۔ اور اگر دنیا کو لے لیا اور شرعیات کو
پس پشت ڈال دیا تو سمجھا جائے گا کہ حب دنیا غالب ہے۔

اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ جب دنیوی معاملات واقع ہوتے
ہیں تو ہم کیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو دنیا کو ترجیح دیتے ہیں خواہ آخرت کا
نقصان ہو جائے۔ یوں کہتے ہیں کہ ہم گنہگار ہیں۔ ہم دنیا دار ہیں۔ یہ یہ ہیرا ہم
سے نہیں ہو سکتا۔ بس باتیں بنا کر اور تاویلیں کر کے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں،
دین پر یہ علامت ہے اس کی کہ یہ لوگ محب دنیا ہیں۔ گو معتقد دنیا نہیں
معتقد تو دین ہی کے ہیں۔ ورنہ اپنے کو گنہگار کیوں کہتے۔ مگر نرا اعتقاد
اطاعت کے لئے کافی نہیں۔ جب تک محبت نہ ہو۔ اسی کو تو عراقی
کہتے ہیں۔

منار و قندر سردار بن غمائی کہ دراز و در دیدم رہ و رسم پاپا

رہ قلندر کے معنی ہیں وہ محبت۔ رہ قلندر اور رہ پار سائی میں جزو کل کی نسبت ہے نہ یہ کہ رہ قلندر رہ پار سائی کا تقابن ہے۔ جیسے آج کل لوگ قلندری اسی کا نام سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت سے بالکل آزاد ہو جائے میں مطلب یہ ہوا کہ رہ قلندر جو جامع ہو محبت اور پار سائی کو وہ مجھ کو دکھا کیونکہ بدولن محبت کے صرف رہ پار سائی دور و دراز ہے۔ جب تک محبت نہ ہو پار سائی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی محبت ایسی چیز ہے۔

دیکھئے بادشاہ کی ایک اطاعت تو ہوتی ہے قانونی کہ قانون کی رو سے جتنا کام ذمہ تھا اس کو پورا کر دیا اور ایک بادشاہ کا عاشق ہے او وہ محبت کی وجہ سے اطاعت کرتا ہے۔ اس میں اور پہلے شخص میں بڑا فرق ہے سو یہ مطلب ہے اس شعر کا۔ نہ وہ جیسا کہ بعض نے غضب ڈھا یا ہے کہ نماز روزہ بالائے طاق اور وارٹھی اور مونچھ صفا چٹ کر کے بیٹھ گئے ہیں اور اپنے آپ کو قلندر سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں انتہام ہے تمام شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ بدولن محبت نہ اعتقاد کافی نہیں تو بس دنیا داروں کو نہ اعتقاد ہے محبت نہیں۔ اور محبت نہ ہو تو پھر طاعت اس قسم کی ہوتی ہے کہ بطواف کعبہ رستم بھرم رہم نہ اوند تو بڑن در چہ کردی کہ درون خانہ آئی بنی میں چو سجدہ کردم زمین نہ ابرام کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی یعنی بدولن محبت کے کامل اطاعت نہیں ہوتی اور جس کو محبت ہوگی وہ طاعت میں تو کیا کمی کرے گا وہ تو مصائب سے بھی نہ گھبرائے گا۔ کوئی مصیبت اس کو پریشان نہیں کر سکتی۔ اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ عراقی

کہتے ہیں ۔

نشد و نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغیت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی وہ عبادت سے تو کیا گھبراتا وہ تو ہلاکت سے بھی نہیں گھبراتا ۔ سو

یہ کلمہ کا اثر ہے ۔ محبت ہی کا تو ہے ۔ پس طریق محبت ایسی چیز ہے اور

چونکہ ان لوگوں کو آخرت کی محبت نہیں ہے اس لئے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں

آخرت پر ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت بل قوشحرون ۔ الخ میں ترجیح کی مذمت

ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ

ہے ۔ چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔

من كان یویدا العاجلة عجلنا له فیہا ما نشاء لمن

نخیدا ثم جعلنا له جہنم ۔

یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے

دیتے ہیں ۔ پھر ہم اس کا ٹھکانا جہنم کو بناتے ہیں ۔

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ اگے

فرماتے ہیں ۔ ومن اراد الاخرة ۔ الا یہ ۔ پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے

جو مقابل ہے من اراد الاخرة کے ۔ یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو ۔ پس

ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوتیں ۔ ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لہ لہو

الاخرة ہو ۔ پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے ۔ ایک اور موقع پر ہے

من كان يريد حرث الآخرة نزوله في حرثه ومن
كان يريد حرث الدنيا لوقتتها منها وماله في الآخرة
من نصيب -

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ من کان یرید حرث الدنیا ولم یسجد و
حرث الآخرة - تقابل قرینہ ہے اس کا۔ اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس
کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے
من کان یسجد الحیوة الدنیا وزینتها لوفاء الیہم اعمالہم
فیہا وہم فیہا لا یخسرون اولئک الذین لیس لہم فی
الآخرة الا النار وحبطوا نہا وبکل ما کانوا
یصلون -

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے
مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے من کان یسجد الحیوة الدنیا وزینتها ولم
یسجد الآخرة - پس یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب
دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھوڑا نا جائیے
ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔
میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معتز نہیں
اتنے معتقد نہیں۔ آپ نو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری
کہتے ہیں۔ لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے۔ مگر ضروری
ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ ضروری بقدر اقل

کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز
مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہئے۔ پس بقدر ضرورت اس کو حاصل
کر لو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں اس لئے
وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ
دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بنا پر قابل ترک
ہے۔ آیت میں بھی دینتھا کا لفظ جو بڑھا یا ہے اس سے بھی اس کا مذموم
ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

پس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا
کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت
یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو۔ سوا اول کی مذمت نہیں،
ثانی کی مذمت ہے کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے۔ اب جو دنیا اس
کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھیکا
تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا ہی قابل
مذمت ہے۔

اعمال کی حقیقت | اس بیان سے ایک روایت کی تفسیر نہایت
پاکیزہ ہو گئی۔ قرآن شریف میں اُحد کے واقعہ

کو بیان کیا ہے۔ اس واقعہ میں بعض صحابہ سے لغزش ہو گئی تھی کہ وہ غلطی اجتہادی
تھی۔ صحابہ کو اپنے اوپر توبہ نہ کیجئے۔ یہ گمان نہ کیجئے کہ جیسے ہم لوگ قصداً
مخالفت کرتے ہیں، وہ بھی قصداً مخالفت کرتے تھے۔ وہ حضرات حضور کے

سچے محب تھے۔ گو زبان سے محبت کے دعوے زیادہ نہ کرتے تھے مگر ان میں اطاعت کامل و درجہ کی تھی۔ اور ہم لوگ زبان سے تو محبت کے بہت دعوے کرتے ہیں مگر ہم میں اطاعت خاک نہیں۔ ہماری اور ان کی محبت میں یہ فرق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

گرچہ تفسیر زبان روشن گزرت لیکن عشق بے زبان روشن ترست
عشق نہ زبان کو روشن کر اور عشق بے زبان کو روشن تر فرما رہے ہیں عارف
کامل وہ ہے کہ اپنے دعوئے عشق کو بھی فنا کر دے کیونکہ فنا عشق کے لوازم سے ہے۔ محبوب کے سامنے دعوے کو فنا ہی کر دینا چاہیے۔ سو محبت ہی ہے جس میں فنا ہوا اور دعویٰ نہ ہو۔ صرف دعوے کرنے کا نام تو محبت نہیں ہے۔ آخر اس کی کوئی علامت بھی ہے۔ کیا عشق کی یہ علامت ہے کہ محبوب ایک راستہ پر لے چلے اور یہ دوسرے راستہ پر چلے۔ ہرگز نہیں۔ عاشق تو وہ ہے کہ محبوب کے راستہ پر ہو لے۔ پس ہم لوگ جو عشق کا دعوے کرتے ہیں اور حضور کے طریقہ پر نہیں چلتے۔ سو یہ کیسا عشق ہے۔ عاشق کو تو محبوب کے سامنے مرٹ جانا چاہیے۔

اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہتے تھے۔ شب و روز عبادت میں مشغول تھے۔ ایک روز آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں خواہ کچھ بھی کرو۔ مگر وہ پھر بھی عبادت ہی میں مصروف رہے۔ ان کے ایک مرید نے کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آئی ہے کہ وہ تو رخ پھیرتے ہیں اور تم اس قدر مشقت اٹھاتے ہو۔ وہ تو دفعہ

میں اور تم پیٹے جاتے ہو۔ آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ اس پر وہ روتے گئے اور کہا کہ یہ تو میں جب کروں کہ اور کوئی درد ہو کہ اس درد کو چھوڑ کر دوسرے درد پر چلا جاؤں۔

تو انہ کہے دل پر داغ تھن کہ دانی کہ بے او تو اس داغ تھن اب تو میرا یہ مذہب ہے۔

زندہ کنی عطا تے تو ور بکشی رضا تے تو

جاں شدہ بتلا تے تو ہر چہ کنی رضا تے تو

خلوص و صدق خالی ٹھوڑا ہی جاتا ہے۔ بس ذرا آواز آئی ہے

قبول ست گر چہ ہمز نیست کہ جز ما پنا ہے و گر نیست

جواب بھی دیا اور اس میں ایک چہرہ کہ محبوبانہ بھی لگا دیا کہ گو تم اس قابل

تو ہو نہیں مگر خیر آ جاؤ۔ واقعی یہ ہے کہ ہمارے اندر کمال ہی کون سا ہے۔ ہماری

کوئی حالت کمال ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے پاس بڑی چیز اعمال ہیں۔ سو اول تو ان

میں ویسے ہی ہزاروں نقصان ہیں۔ پھر اگر کمال بھی ہوئے تو یہ دیکھتے کہ وہ پیدا

کہاں سے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ قوت ارادہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ ان

ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ مگر پاؤں اور جتنی چیزیں اعمال کے لئے شرط ہیں

وہ بھی ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہماری ہے ہی کیا چیز!

ان اعمال کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک شخص ہو، کیفیت بھی اسی کا، لڑکے

بھی اسی کے، پانی بھی اسی کا، زمین بھی اسی کی، بیج بھی اسی کا، غلہ بھی اسی کا۔

یہاں تک کہ کھیتی پیدا ہوئی۔ اب کوئی دعویٰ کرنے کہ کھیتی کا میں مالک ہوں

تو کیا اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ مالک یہی کہے گا کہ یہ تبتلاؤ کہ تم کون سے قاعدہ سے مالک ہو۔ ظاہر بات ہے کہ غلہ اسی کی ملک ہے جس کے اسباب ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے ماتھے پاؤں جو بمنزل نوکر اور غلام کے ہیں خدا کی ملک ہیں۔ آپ کی قوت ارادہ حق تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس مجموعہ سے جو ثمرہ ہوگا وہ دیکھ لو کس کی ملک ہوگا۔ اگر ہمارے اعمال کامل بھی ہوتے تو اس میں ہمارا کیا کمال ہوا۔ اب ان پر جو انعام ہم کو ملے گا وہ مبادلہ محض اسی ہوگا۔ مبادلہ کے معنی تو ہیں کہ ان کی چیز لے لیجئے اور اپنی دے دیجئے اور یہاں اپنا کچھ ہے ہی نہیں پھر مبادلہ کیا۔ فرمائیے کہ پھر کوئی کیا ناز کر سکتا ہے کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔

اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی عبادت اور رسالت | شخص عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا اس پر حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور آپ بھی نہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کہ میں بھی عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جاؤں گا۔ ہاں اگر حق تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھ کو ڈھانپ لیں اور اس میں یہ بھی تصریح فرمادی کہ میں بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہوں اور آپ کا یہ کمال ہے اور جتنا افتخار آپ کا خدا تعالیٰ کی طرف ثابت کیا جائے گا، اسی قدر آپ کی فضیلت ہوگی۔ ایاز کے واسطے یہی فضیلت ہے کہ محمود سے وابستہ رہے اس کی طرف حاجت مند رہے حتیٰ کہ جتنے کمالات بھی ہیں سب عبادت کی فرع ہیں۔ بڑا کمال عبادت ہے۔ اسی لئے جس قدر عبادت کامل ہوگی اسی قدر رسالت کامل ہوگی۔

ہو گی کیونکہ عبدیت کی فرع رسالت ہے نہ کہ رسالت کی فرع عبدیت۔ عبدیت تو فطری ہے اور رسالت اس پر مرتب ہے۔ رسالت سے پہلے بھی آپ میں شانِ مٹی اطاعت اور عبدیت کی۔ آپ خدا تعالیٰ کے ایسے عاشق تھے کہ جس وقت تک کچھ بتلایا بھی نہ گیا تھا اس وقت بھی آپ مطیع تھے۔ اسی عبدیت کا ملہ کے صلہ میں آپ کو رسالت ملی تھی۔

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور جنت میں نہ جائیں گے یہ نہ سمجھ لے کہ حضور کے اعمال میں کچھ

عمل اور جنت

نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے۔ اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اوستا اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھئے کہ عمل عامل کا کتنا ہی بڑا ہو اور کتنا ہی کامل ہو مگر وہ محدود ہی ہوگا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود ہی ہوگا۔ رحمت حق کا اول تو تجزیہ ہو نہیں سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ بھی غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے ہر اتم متناہی ہی ہوتا ہے۔ ہر حال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے یعنی سبب ناقص

کو مشرہ بھی ناقص اور سبب کامل تو مشرہ بھی کامل۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا، تو تنہا ہی ہوگا۔ کیونکہ عمل تنہا ہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا، تو غیر تنہا ہی ہوگا کیونکہ رحمت غیر تنہا ہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔

غرض آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں حضور کے اعمال ہر طرح کامل ہیں مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بتایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے، چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا مشرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا کمال ہوا جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیا جاوے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔

خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا تو پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ چاروں نماز پڑھ کر یہ سمجھنے لگیں کہ ہم جنت کے مستحق ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ بندہ کے اندر کوئی کمال نہیں ہو سکتا اگر اعمال بھی کامل ہوں

تسبیحی بندہ کا کوئی کمال نہیں کیونکہ وہ اعمال بھی خدا تعالیٰ ہی کی رحمت پر مرتب ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے۔

لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْتُمْ کہ اگر اللہ میاں رحمت نہ

فرماتے تو ہم ہدایت نہ پاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ نماز کی توفیق ہوتی نہ روزہ کی۔ ہم میں ہی کیا چیز۔ جب یہ ہے تو ہم اس عمل پر کیا ناز کر سکتے ہیں۔ بس رحمت ہی ہے کہ ہمیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ مضمون تو استفسار و بیان ہو گیا۔

اصل میں بیان یہ ہو رہا تھا کہ جب ہم حضور

محبت اور اطاعت

کے طریقہ پر نہیں چلتے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کریں۔ بلکہ اگر کسی قدر ہم کو محبت بھی ہے تو وہ آپ ہی کی محبت کا عکس ہے۔ دیکھئے ہماری کوئی رات ایسی نہیں کہ درود شریف پڑھنے میں ختم کی ہو بخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ہمارے لئے ساری ساری رات کھڑے رہتے اور ہماری بخشش کی دعا کرتے تھے۔ ہماری محبت کا تو صرف یہ حاصل ہے کہ زبان سے دعویٰ ہے محبت کا اولہ دلیسے نافرمانی کرتے ہیں۔ صحابہؓ کی محبت ایسی نہ تھی۔ وہ زبان سے نہ کہتے تھے مگر کرتے تھے۔ صحابہؓ کو جب حضورؐ کے ساتھ یہ محبت تھی تو اگر صحابہ سے جنگ اُحد میں لغزش ہو گئی تو ضرور وہ اجتہادِ غلطی ہو گئی۔ قصداً ہرگز نہ ہو گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچاس آدمی تیرا ناز نگہبانی کو

گھائی پر مقرر کر دیئے باقی لشکر لڑنے لگا۔ جب ان تیر اندازوں نے فتح اور غلبہ کی
 تو چاہا کہ اس جگہ سے چلے آویں اور فتح میں شریک ہوں اور غنیمت لوٹیں۔ ان
 کے امیر نے اس سے منع کیا وہ نہ مانے۔ وہاں صرف تھوڑے سے آدمی رہ
 گئے۔ پس کافروں کی فوج پیچھے سے آپڑی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی
 اس میں خطا اجتہادی ان کی یہ تھی کہ وہ لوگ اس مورچہ پر کھڑے رہنے کے حکم
 کو اس وقت تک محدود سمجھے کہ جب تک غلبہ نہ ہو۔ جب مسلمانوں کا غلبہ ہو
 تو وہاں سے ہٹ گئے۔ اس وجہ سے کہ اب تو غلبہ ہو ہی گیا ہے اب یہاں
 کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ غلطی اجتہادی ان سے ہوئی۔ خدا تعالیٰ
 نے اس قصہ کو بیان کیا ہے اور پھر فرمایا ہے۔ منکم من یرید الدنیا
 منکم من یرید الآخرۃ۔ یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض
 صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے
 ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطار اسکندری کا ہے۔

وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب
 ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا
 للدنیا اور ایک ارادہ دنیا للآخرت۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں۔
 چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت
 میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی
 مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بیباک ہوا ہی کہتا ہے۔ اس وجہ سے
 ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔

نہ مروست آنکہ دنیا دوست دارد

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان
خشت برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آکر اُن کو پکڑ لیا اور کہا
وہ پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند
پیچھا چھڑاتے ہیں وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی
آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا
ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالعہ ہے اس میں سے ادا کرو۔ اُن
کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب اُن کی آنکھ کھلی تو دیکھا خواجہ صاحب کی
سواری آ رہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محبوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ
وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار
کرنے پر پڑھا۔

نہ مروست آنکہ دنیا دوست دارد

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ ناتمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہئے
اگر دار و برائے دوست دارد

دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا
میں کیا حرج ہے۔ ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے
لئے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ وہ
اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف
کرتے ہیں۔ آپ کچھری میں جا کر دیکھیں۔ وہاں خزانچی کا عہدہ ہے۔ اس کے

پیر و خزانہ کی حفاظت ہے وہ مالک نہیں۔ خزانہ میں سے بلا اجازت لے نہیں سکتا۔ اگر وہ خزانہ کو قفل نہ لگائے اور چوری ہو جائے تو اس پر مقدمہ قائم ہو۔ اسی طرح ان حضرات میں سے بعض کو دنیا کی مال و دولت حق تعالیٰ کی طرف سے سپرد کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس کو انتظام سے نہ رکھیں تو حق تعالیٰ ان سے ناراض ہوں اور بعض کو یہ حکم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھیں۔ اہل اللہ کی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔

بگوں گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است

بہ عذیب چہ فرمودہ کہ نالال است

ہر ایک کے ساتھ حق تعالیٰ کا جدا معاملہ ہے۔ اسی طرح ہر نبی کی شان جدا ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ باقی ان کے اندر تمام صفات ہوتی ہے۔

آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کمالاتِ انبیاء کتاب لکھی ہے اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دے کر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کی توہین کا۔ آپ کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے۔ ان کی تنقیص کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی، ترحم تھا باقی اور انبیاء میں سے کسی میں سیاست نہ تھی، کسی میں ترحم نہ تھا۔ کسی میں یہ صفت نہ تھی اور کسی میں وہ صفت نہ تھی۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک درج کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی۔ ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی تو ہین کریں۔ تو ایسی طرح سے حضور کب خوش ہو سکتے ہیں۔ اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے۔ دیکھو نوح میں ترجم نہیں ترجم کا مادہ کم تھا۔ عیسیٰ میں سیاست کا مادہ کم تھا۔ درویشانہ زندگی تھی میرے سامنے یہ کتاب لائی گئی۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ سفید قیمتی۔ خط نہایت نفیس پُر رونق۔ ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہے کہ لہجہ میں ترجم نہ تھا۔ عیسیٰ میں سیاست نہ تھی۔ کس قدر بے ادبی ہے انبیاء کی شان میں۔ اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے۔ کیا مادہ کے لئے ظہور بھی لازم ہے۔

اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے۔ اس وقت دیکھا کہ وہ کچھ بھی خرچ نہیں کر رہا تھا۔ بس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے۔ اس کو یہی کہا جاوے گا کہ جس وقت آپ گئے ظہور کا موقع نہ ہو گا۔ ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ کتنا بڑا سخی ہے۔

ایسے ہی انبیاء میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ نوحؑ تو ایسے رحیم تھے کہ

لے میرۃ النبیؐ اس کا نام ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ہے۔

نوسو پچاس برس تک قوم کے ماتھے سے مصائب اٹھاتے رہے مگر بددعا
نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا ترجم ہوگا۔ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترجم کی۔ پھر
بددعا اس وقت فرمائی جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آگیا۔

انہ لن یومن من قومک کہ تمہاری قوم میں سے اب
الامن قدامن۔ کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔

معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشینیں تھیں۔ نوسو پچاس برس تک ترجم کی
مشین چلائی اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو اب
جدھر اللہ تعالیٰ اُدھر وہ۔ دیکھو تو لوح میں ترجم کیسا تھا کہ نوسو پچاس برس تک
قوم کی تکلیف پر صبر کیا اور بددعا نہیں کی۔

ایک حضرت عیسیٰ مصنف صاحب کے تھنہ مشق بنے ہیں۔ کہتے ہیں
کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے۔ ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی۔ ان کی تو
یہ تعلیم تھی کہ اگر کوئی ایک کلمہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا سامنے کر دو مصنف
صاحب نے حضرت عیسیٰ کا یہ حق ادا کیا ہے۔

اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب مدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے
اور کیا دلیل ہے اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ عدم ظہور سے تو
عدم وجود لازم نہیں آتا۔ دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ
میں حضرت عیسیٰ سلطنت کریں گے۔ ان کے سامنے ساری سلطنتیں مرث
جائیں گی۔ سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب
تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں ان سے کیے ہو سکتی ہیں۔ کون کہہ سکتا

ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔

حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے
خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادہ سے
کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں۔

نشانِ اولیاء | اسی طرح اولیاء اللہ کی حالت ہے۔ ہر ایک کی جدا شان ہوتی
ہے جیسے دنیا کے عہدے ہیں۔ کوئی اہل قلم میں سے ہے

اور کسی کو اہل سیف میں سے کیا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ میں شائیں مختلف رکھی
ہیں۔ کسی کو غریب اور کسی امیر بنا دیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے
بعض اولیاء اللہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا اور
بعض تنگ دست ہوئے ہیں۔ ہر زمانہ میں ہر شان کے بزرگ پیدا کر دیتے ہیں
اگر مختلف شائیں نہ ہوں تو کام نہ چلے۔

راز اس کا یہ ہے کہ طالبین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے
اس کے مناسب حال شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے مولانا
فضل الرحمن صاحب کی نسبت مجھ سے کہا کہ وہاں تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ ایسا پیر
بتلاؤ جہاں قدر ہو۔ وہاں تو جا کر غلامی کرنی پڑتی ہے۔ سو طالب اس شان کے
بھی ہوتے ہیں۔ اگر سارے بزرگ ایسی ہی شان کے ہوں تو بتلائیے ایسا شخص
کہاں جائے۔ اس لئے ضرورت ہے مختلف قسم کے بزرگوں کی۔ یہ تو خدا

تعالیٰ کا باغ ہے۔ اس میں ہر قسم کے پھول ہیں۔
ہر گلے دار رنگ و بوئے دیگرست

کسی کو کسی سے مناسبت ہے اور کسی کو کسی سے۔ کسی کی گردن ایسی جگہ جھکتی ہے جہاں نشان و شوکت ہو، اس لئے ایسے مشائخ کی بھی ضرورت ہے جتنا نچے آج کل اکثر مشائخ کے یہاں بہت نرمی کی جاتی ہے اور میرے یہاں گونہ سختی کی جاتی ہے پس جس کو جو نسا مذاق پسند ہوتا ہے وہ وہ ٹال چلا جاتا ہے ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ کیا اچھی شان ہے کہ ان کے یہاں کھانے کو خوب ملتا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ اگر ان کے یہاں لوگوں کا کھانا وغیرہ ہوتا تو میں ان کے یہاں کبھی نہ آتا۔ بس یہ سمجھتا کہ لوگ پیٹ کی خاطر یہاں ان پر سے ہیں۔

غرض کہ اہل اللہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں کسی کے اندر مارت کی شان

۱۔ اسی طرح دوسرے مشائخ کے یہاں نہ بیعت میں تنگی ہے نہ مریدین کے افعال پر گرفت ہے نہ معمولات اور قواعد میں ہیں اور حضرت والا کے یہاں یہ سب باتیں ہیں اور ان کی ضرورت بھی ہے بعض طلباء کو یہ باتیں ناگوار ہوتی ہیں اور وہ اس کو سختی سمجھتے ہیں اور ناقدری خیالی کرتے ہیں حالانکہ ان باتوں میں راحت ہی راحت ہے اور خانقاہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

بہشت آتما کہ آزار سے نباشد کسے رابا کسے کار سے نباشد

ان امور کی قدر وہی جان سکتا ہے جس نے وہاں رہ کر دیکھا ہو۔ ان باتوں کے جو فوائد ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتے مشاہدہ کے متعلق ہیں

ہوتی ہے اور کسی کے اندر فقر کا رنگ ہوتا ہے۔ پس اصل مشترک یہ ہے کہ غنا ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے اور فقر ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے۔

حضرت سلیمان اور سلطنت
حضرت سلیمان کے بارہ میں ارشاد ہوا۔
ہذا عطاؤنا فامتن اور امت

بغیر حساب۔ یہ ہماری عطا ہے چاہے کسی کو دیکھتے یا نہ دیکھتے۔ آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ مواخذہ کے خوف سے جاہ و ثروت اور سلطنت سے گھبراتے تھے۔ اُس پر یہ ارشاد ہوا۔ ہذا عطاؤنا۔ الخ کہ تم سلطنت سے گھبراؤ نہیں۔ تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ کو سلطنت دینے میں خدا تعالیٰ کی حکمت تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت میں بڑے بڑے متکبرین اور جاہریادشاہ تھے ان کی گویں پست کرنے کے لئے آپ کو ایسی سلطنت دی کہ سب کی گویں پست ہو گئیں۔ سب کے دعوے کو توڑ دیا۔ سلطنت تو آپ کا معجزہ تھا۔ سو دیکھتے آپ کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ آپ تو سلطنت سے گھبراتے تھے اور ادھر سے دلاسا دے دے کہ سر کی جاتی تھی۔ پس جس کے لئے ہو مناسب ہوتا ہے اُس میں اُس کو مقید کر دیتے ہیں۔

بہر حال دنیا اگر حد کے اندر ہو تو مذموم نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا للدنیا اور دوسری ارادہ دنیا للآخرت۔ تو جو ارادہ

دلیقیہ حاشیہ از ص ۵۸۸ جب کہ عقل سے بھی کام لیا جائے ورنہ ظاہر میں
تو سختی ہی سمجھو گا۔ ۱۲۔ جامع

دنیا آخرت کے لئے ہوا اس میں کیا حرج ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ جتنا رزق تمام عمر کے اندر میری قسمت

ایمان اور برود

میں لکھا ہے وہ مجھے ایک دم سے مل جاوے۔ اس پر خطاب ہوا کیا ہمارے وعدہ پر وثوق نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ وثوق تو پورا ہے مگر شیطان پریشان کرتا ہے۔ جب عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ تو کھائے گا کہاں سے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دے گا۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اللہ دے گا مگر یہ تو معلوم نہیں کہ کب دے گا۔ وہ مجھے پریشان کرتا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ساری عمر کا ایک دم سے مل جاوے تو اس کو کوٹھڑی میں مقفل کر دوں۔ جب شیطان کہے گا کہاں سے کھائے گا فوراً کہہ دوں گا کہ اس کو کوٹھڑی کے اندر سے کھاؤں گا۔ بس پھر وہ وسوسہ نہ ڈالے گا۔ وہ بزرگ عقلاً تو غالب تھے شیطان پر لیکن طبعاً غالب نہ تھے۔

اس حکایت کو سن کر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ کیسے بزرگ تھے کہ ان کو حق تعالیٰ پر اطمینان نہ تھا۔ یہ بات تو بزرگی کے خلاف ہے۔ مخلوق کے وعدہ پر تو ایسا وثوق ہو جاوے کہ وسوسہ بھی نہ آوے اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اتنا بھی وثوق نہ ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے۔ اور یہی شبہ اکثر واعظوں کی زبان پر عام مسلمانوں کے حق میں دائر ہوتا ہے کہ کوئی دعوت کر جاوے تو کیسے بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر ایسا بھروسہ نہیں مگر سمجھ لیجئے کہ یہ الزام ہے مسلمانوں پر۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وقت معین نہیں

ہے اور ایہام میں خاصیت طبعیہ ہے بے اطمینانی نہ کہ بے یقینی اور مخلوق کی طرف سے وقت معین ہوتا ہے اور تعین میں خاصیت طبعیہ ہے اطمینان چنانچہ اگر مخلوق کی طرف سے بھی وقت متعین نہ ہو۔ مثلاً کوئی اس طرح دعوت کرے کہ ہم جب دل چاہے ایک وقت کا کھانا کھیں گے تو ان کے وعدہ سے بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے تو اطمینان ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ یہ کوئی الزام کی بات نہیں۔ یہ تو امر طبعی ہے ان اگر حق تعالیٰ کا وعدہ معین ہوتا پھر اگر کوئی یقین نہ کرتا تو الزام تھا۔ پس چونکہ خدا تعالیٰ کے وعدہ میں تین قسم کا ایہام ہے ایک یہ کہ کب ملے گا۔ ایک یہ کہ کس درجہ سے ملے گا۔ زراعت سے یا تجارت سے یا اور کسی طریقہ سے۔ ایک یہ کہ کتنا ملے گا پیٹ بھی بھرے گا یا نہیں۔ پناہ کبھی کم ملتا ہے اور کبھی زیادہ ملتا ہے۔ اس واسطے تردد ہوتا ہے کیونکہ طبعی بات ہے کہ ایہام سے تردد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ پر وثوق نہیں اور یہ تردد ایمان کے منافی نہیں بلکہ کمال ایمان کے بھی منافی نہیں۔

سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کا ایمان ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل الایمان ہیں مگر حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ہے کہ وہ عرض کرتے ہیں۔ لیکن لیطمئن قلبی۔ آخر لیطمئن کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو کسی درجہ کا تردد تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمایا کہ ابراہیمؑ کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان

کے نہیں۔ ایک فرد تروڈو کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تروڈو کی بہت سی
قسمیں ہیں۔ یہ تروڈو جو حضرت ابراہیم کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ اقل
تو ابراہیم کی شان ایسی ہے کہ ان کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں
ایسا تروڈو تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود
ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اولم تو من کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو
انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لئے یہ
درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہو جاوے۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا، شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تروڈو کا وہ زمانہ
تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

قرآن اور ترجمہ | اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون ہیں
یقین کا مراد نہیں ہے البتہ اردو میں اطمینان بمعنی
یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ بھی
کہ اس سے دھوکا ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے
انداز ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا یہی توجہ ہے کہ قرآن شریف
کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا
بھی نہ چاہیے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ان آیت کے متعلق مجھ کو
پوچھنا ہے مگر اول اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ ووجدك ضالاً فهدى وہ
سمجھے ہوئے تھے کہ میں ضالاً کا ترجمہ گمراہ کر دیں گا۔ اور گمراہ فارسی میں تو

عام ہے۔ اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اس کو جو واقف ہو کر راہ سے
بھٹکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصداً راہ سے الگ ہو گیا ہو
کسی مترجم نے ضالاً کا ترجمہ فقط گمراہ سے کر دیا ہے۔ پس اس کو دیکھ کر دل
میں اعتراض آیا ہوگا۔ میں نے کہا سنتے ترجمہ یہ ہے۔ پایا اللہ تعالیٰ نے آپ
کو ناواقف پھر واقف بنا دیا۔ اس کو سن کر چپکے ہی تو ہو گئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن میں بہت سے علوم کی ضرورت
ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لئے صاحب کثاف نے مفسر کے لئے چودہ
علوم کی ضرورت لکھی ہے۔ میں نے ایک موقع پر (فتح پور کے وعظ میں) بتایا
کہ دیا تھا کہ اگر نخو نہ جانتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے
واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کر دیا تھا کہ
استنہ علوم کی ضرورت ہے قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے آج کل ہر شخص
اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیسے کہ لفظ گمراہ ہے، اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے
یہ اردو میں تو مرادف سے ایمان کا مگر عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں
اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے تردد یعنی اضطراب قلب یعنی
قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ
وساوس اور اسباب

زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے
کریں گے۔ یہ دیکھا دیجئے۔ جیسے حضرت ذکریا علیہ السلام نے عرض کیا تمنا الخ
یکون لی غلام کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ بیٹا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتا دیجئے

کہ کس طرح ہوگا۔ آیا ہم میاں بیری جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا۔ انی استبعاد کے لئے نہیں انی بمعنی کیفیت یعنی سوال عن کیفیت کے لئے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں۔ رجب ارنی کیفیت تھی الموقی کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کوئی نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا۔ فخذ اربعة من الطیر۔ الخ ان کو بلا لو پھر ذبح کر کے خوب ان کا تقیمہ کر لو اور چار حصے کر کے چار جگہ رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا۔ پس سب زندہ ہو کر ان کی طرف چلے آئے۔ ابراہیمؑ نے اپنی آنکھ سے تماشا دیکھ لیا پس اس سے معلوم ہو گیا کہ مطلق تزدو نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سائلین کے کام کی بات ہے ان کو بعض اوقات وسوسے پکرتے ہیں تزدو پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے سمجھتے ہیں کہ پہلی حالت کی طرف حود ہو گیا ہم مردو ہو گئے۔ یہ غلطی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ وساوس کے آنے میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے اطمینان کی حالت پیش آگئی تھی۔ اس وقت ناز ہونے لگا تھا۔ حق تعالیٰ اس کی اصلاح کیواسطے تزدو میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ تزدو خطرات و سوا اس مطلق منافی نہیں کمال کے۔ یہ علامت ضعف کی نہیں۔

خیر ان بزرگ کی حکایت یہ ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے عرض

کیا کہ یا اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دفعہ دیے دیجئے تاکہ وسواس سے نجات ہو جاوے۔ تو یہ حضرت جمعیت قلب کے لئے اسباب دنیا اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال کا وظیفہ خیال کے لئے جمع کر لیتے تھے۔ آپ نے ہماری تعلیم کے لئے ایسا کیا۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ امت کے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو امت یوں سمجھتی کہ جائز تو ہے مگر کمال کے خلاف ہے۔ آپ نے عمل کر کے تہلا دیا کہ یہ کمال کے بھی خلاف نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذاق کے خلاف امت کے مذاق کی رعایت فرمائی۔ اگر آپ اسباب کو ترک فرما دیتے تو باوجود جائز ہونے کے بھی ذخیرہ رکھتے ہوئے بہت سے متبعین کی طبیعت رکتی۔ کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بڑا فیصلہ ہو اور وہ بچہ کی رعایت کر کے تو تہلا بولنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اسباب کو اختیار نہ فرماتے تو آپ کا کوئی ضرر نہ تھا۔ بس صرف شفقت تھی جس کی وجہ سے ایسا کیا۔ مگر آپ نے اسباب کو ایک حد کے اندر رکھا ہے۔

اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ بہت تن اسی کی طرف مصروف ہو جاویں۔

فصلیت آخرت

اور ان کو دنیا میں انہماک کا ایک بہانہ ہو جاوے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک

شخص نے کسی سے پوچھا تھا کہ تمہیں قرآن میں کون سا حکم پسند ہے تو کہا کھانا
 واشعلو کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا تو کون سی پسند ہے، تو کہا رہنا انزل
 علینا مائدة من السماء۔

اسی طرح بہت سے نئے تعلیم یافتہ کو صحابہ میں سے وہی حضرات
 پسند آئے ہیں جو مالدار تھے جیسے عبدالرحمن بن عوف، حضرت عثمان غنیؓ، جہاں
 مال جمع کرنے کی مذمت ہوتی ہے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ مال حاصل کرنا
 تو اچھی چیز ہے۔ دیکھئے یہ حضرات کیسے مالدار تھے اور جو مالدار نہ تھے وہ
 ان کو پسند نہیں۔ تو بات کیا ہے وہ ان کے مذاق کے موافق ہیں اس لئے
 پسند ہیں۔

غرض یہ کہ ہمارے اندر کثرت سے بل تو شرف الحیوة الدنیا
 کا قصہ ہو گیا ہے خاص کر عورتوں میں۔ میں تو عورتوں سے کہا کہ تانہوں کہ
 کبھی سو میں گھنٹے میں کسی وقت تمہیں خدا تعالیٰ بھی یاد آتے ہیں۔ گوٹے پٹھے
 زیور کی دھن میں دن رات رہتی ہیں۔ یہ حالت ہے کہ آج ایک زیور بنایا
 ہے۔ کسی عورت کے پاس دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا اب اس کو مہیاں سے
 ضد کر کے نوڑوا رہی ہیں اور دوسرے نمونہ کا بنوا رہی ہیں۔ وہ سمجھتا تھا
 بھی ہے مگر ایک سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک بنوانہ لیں چین ہی نہیں آتا خاوند
 کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان میں غالب دنیا کی محبت ہے۔
 خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو ترجیح دینا یہ شکایت کی بات ہے کہ دنیا
 کو طلب کرنا۔ اسی لئے یوں ارشاد فرمایا بل تو شرف الحیوة الدنیا

اور یہ نہیں فرمایا۔ بل تطلبون الدنیا۔ آگے فرماتے ہیں والاخرة خیر و
البقی یعنی تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور البقی بھی
اس کو ترجیح دینا چاہئے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو درجہ سے دنیا پر فضیلت
رکھتی ہے۔

ایک تو اس درجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل اعلیٰ درجہ
کے باغ، نہریں بہتی ہوئی جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا، نہایت شیریں
عزیز پر نعمت اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

دوسرے اس درجہ سے کہ البقی ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے ہوں گی۔ کبھی زائل نہ ہوں گی۔ نذرستی ایسی کہ کبھی سر میں در و تھک نہ
ہوگا۔

اگر ایک محل ہو نہایت ہی اچھا کہ جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ سب
اس میں پائی جاتی ہیں مگر ہو ایک دن کے لئے تو وہ کچھ بھی نہیں اور ایک
مکان ہو عمدہ نفیس اور ہو بھی عمر بھر کے لئے تو وہ بڑی دولت ہے۔ تو
آخرت میں دونوں صفت جمع ہیں۔ خیر بھی ہے اور باقی بھی۔ واللہ دنیا اور
آخرت میں اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک قطرہ اور سمندر میں نسبت ہے
فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا۔

سو حق تعالیٰ نے شکایت اس کی فرمائی ہے کہ آخرت کو تو اختیار
نہیں کرتے ہو اور دنیا کو اختیار کرتے ہو۔ یہاں سے فیصلہ ہو گیا اس کا کہ دنیا
کے طلب کرنے کی شکایت نہیں بلکہ دنیا کو ترجیح دینے کی شکایت ہے۔

مومن اور دنیوی متاع

اب میں مخاطبین کو متوجہ کرتا ہوں کہ اپنا اپنا امتحان کر لیجئے۔ جانتے کر دیکھ لیجئے

کہ مال و دولت اور دنیوی مشاغل میں آپ سے اتھرت ترک ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ترک ہوتی ہے تو ایسی دنیا قابل احترام ہے اور اگر ترک نہیں ہوتی تو وہ حال ہے جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں ۛ

گمیت مال و زر بہست زرع و تجارت

چو دل با خدایست خلوت نشینی

غرض دنیا کو قلب میں سے نکالئے، ہاتھ سے دنیا کو نہ نکالئے۔

ہاتھ سے نکالنے کو ہم نہیں کہتے۔ مولانا نے مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں ۛ

آب و کشتی ہلاک کشتی سرت آب اندر ز کشتی پستی است

کیا عجیب مثال ہے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے ہو تو اس کے جاری ہونے

کا سبب ہے اگر وہ نہ ہو تو چل نہیں سکتی۔ اور جو کشتی کے اندر پہنچ جاوے

تو ہلاک کر دے۔ مال کی مثال پانی کی سی ہے۔ اگر دل سے باہر رہے تو

دین میں معین ہے اور جو دل میں گھس جائے تو باعث ہلاکت ہے۔ مومن کو

دنیوی متاع کی بھی ضرورت ہے مگر جب کہ باہر رہے قلب سے ایسی کی

بابت مولانا فرماتے ہیں ۛ

مال را گر بہر دین باشی جمول نعم مال صالح گفت آن رسول

حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نعم المال الصالح للرجل

الصالح۔ مال سے مدد لینا سکتا ہے۔ مساکین کی خدمت، طلباء کی اعانت

کر سکتا ہے، حقوق ادا کر سکتا ہے دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی اس سے مدد کر سکتا ہے۔ کتنے نفع کی چیز ہے۔ کون کہتا ہے کہ مال مضر ہے البتہ حُرَبِ مال مضر ہے پس ہاتھ میں رہے قلب میں نہ رہے۔ یہ حالت ہو کہ دل بیارہ دست بکار۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص دنیا دار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسول کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو وہ دین کے مقابلہ میں لاکھ روپے پر لات مار دے۔ سو ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے کہ جس کے دل سے دنیا کی محبت نکل جائے۔ جب محبت دنیا کی دل سے نکال دے گا تو پھر دنیا دار نہ ہوگا۔

تارک الدنیا اور متروک الدنیا | اب اس مضمون کی تکمیل کی ضرورت ہے کہ دنیا کی محبت دل سے

نکالے کیسے تاکہ ہر مسلمان اسی طریقہ کو اختیار کرے۔ جہاں بی، اے، ایم، اے کے پاس کرنے کی ضرورت ہے، اس دوسرے بی، اے، ایم، اے کا بھی سامان کرنا پڑے گا۔ بس ایک پاس اور کرنا ہوگا۔ اگر کوئی کہے کیا فقیر بناؤں میں کہتا ہوں کہ آپ فقیر تو اب ہیں۔ اس وقت فقیر نہ رہو گے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ مال تو ہے مگر چین نہیں۔ یہ کیا مارت ہے۔ جہم ایسا امیر بنائیں گے کہ الغنی غنی النفس اس وقت حقیقی امیر ہو گے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب تھے۔ آپ کے بارہ

میں جو مسکین کا لفظ آیا ہے اُن کے یہ معنی نہیں جیسے آج کل غریب مسکین میں
 کیا غریب کی یہ شان ہوتی ہے کہ قربانی میں سو اونٹ ذبح کر دے۔ سو سو
 اونٹ مساکین کو تقسیم کر دے۔ غریب اُسے کہتے ہیں کہ لینے پر مرتنا
 پھرے اور نہ ملے۔ نہ یہ کہ ملتے ہوئے کو چھوڑ دے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منجانب حق پوچھا گیا کہ اگر آپ کہیں تو
 آپ کے لئے احمد پہاڑ کو سونا کر دیں اور آپ کے ساتھ ساتھ راکہ سے
 تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ مجھ کو تو یہ اچھا معلوم ہوتا
 ہے کہ جس وقت ہو تو کھا کر آپ کا شکر بجالاؤں۔ اور جب نہ ہو تو آپ
 سے مانگوں۔ غریب متروک دنیا ہوتا ہے آپ تارک دنیا تھے حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سلطنت تھی۔ آپ کو سلطنت کے اختیارات
 تھے۔ سو اس کو غریب نہیں کہتے۔

غرض کہ آپ کو فقیر ہونے کو نہ کہا جاوے گا۔ یہ غلط ہے کہ مال و
 متاع دنیا کا ترک کرایا جاتا ہے۔ نہیں کمائے کھائے۔ ہاں طلب دنیا
 مذموم طریقہ سے نہ ہو۔

حُزْبِ حَقِّ | یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ حُزْبِ حَقِّ آپ کے
 اندر غالب ہو جہاں سب چیزیں حاصل کی ہیں ایک
 حُزْبِ حَقِّ بھی حاصل کر۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حُزْبِ حَقِّ آپ کے اندر بالکل نہیں
 آپ میں حُزْبِ حَقِّ ہے مگر بہت کمزور ہے۔ اس وقت آپ کی ایسی مثال
 ہے جیسے چراغ میں تیل بھی ہے بتی بھی ہے، سارا مصالحہ بھی موجود ہے مگر

اُس کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ ذرا ابھار دو گے تو روشنی ہو جائے گی
آپ کے پاس کی نہیں کسی چیز کی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کسی اور سے
لینے کی ضرورت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :-

ایک سبد پر نال برابر فرق سر تو بھی جوئی لب نال در بدر
سب کچھ ہمارے پاس ہے مگر اُسے بڑھانے کی ضرورت ہے
سو آپ میں حُب حق تو ہے مگر غالب نہیں۔ حُب حق کا غلبہ ہونا چاہئے اسکی
ضرورت ہے۔ شاید آپ یوں خیال کریں کہ تسبیح لینے کو یا مرید ہونے کو
کہے گا۔ میں اس کو نہیں کہتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ٹھوڑی سی مشقت کی ضرورت
ہوگی۔ یہ نہیں کہ تکلیف ہوگی۔ آپ کا کھانا یا ہونا چھوڑا یا جائے گا مشقت
یاں معنی ہے کہ نفس ایک بات کو نہیں چاہتا اور یہاں اُس کو کہنا پڑے گا
پس مشقت صرف یہ ہے کہ نفس کے خلاف کرنا ہوگا۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اس کام کے اختیار کرنے
میں آسانی ہوگی۔ وہ یہ کہ آپ نے کبھی مسہل لیا ہوگا۔ اگر خود نہ لیا ہوگا تو
دیکھا تو ہو ہی گا۔ طبیب ٹھوڑے دنوں پر ہیز کراتا ہے۔ منضج پلاتا ہے
پھر مسہل دیتا ہے۔ جس دن مسہل دیتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ گھر میں بیٹھے
چلے پھر بیٹھے نہیں۔ مسہل میں نہ باقیں کیور نہ سنو، نہ سوؤ۔ اگر ایسا کیا تو دست
نہیں آئیں گے۔ بس تم اس تصور میں بیٹھے رہنا کہ اب آیا دست، اب
آیا دست۔ وہ اس قدر پابندی کراتا ہے پھر بھی صحت کے بعد اُس کا
شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ اُس سے یہ بھی نہیں کہتے کہ اب مفدمات کا وقت

ہے۔ اب فلاں کام درپیش ہے بلکہ سب چھوڑ چھاڑ کر اس کے متابع ہو جاتے ہیں اور اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

پس اسی طرح مشائخ مسہل دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مسہل کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ طبیب مسہل میں ٹھوڑی دیر کے لئے مشورہ خلوت کا بھی دیتا ہے۔ اس کو بجان و دل منظور کرتے ہیں اور اگر شیخ اس کو کہے تو دم نکلتا ہے۔ طبیب تو بڑے بڑے پرہیز کرتا ہے اور یہاں شیخ ٹھوڑے سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہے۔ یعنی معاصی کا پرہیز کرنا ہے۔ مگر ان کے ساتھ لوگ الجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لوجی اتنے دن اپنے پاس رہنے کو ہی بتلا دیا۔ کوئی اتنی فرصت کہاں سے لائے۔ اتنے دنوں کی خلوت اور خاموشی تجویز کر دی۔ کوئی کہاں تک خاموش رہے۔ ان کی تجویزوں پر لوگ الجھتے ہیں اور طبیب کی تجویز پر کوئی نہیں الجھتا۔ طبیب کی تجویز پر بھی تو الجھنا چاہئے کہ بس جی ہم باز آئے علاج سے مگر وہاں کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ یہاں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام طبیب کرتا ہے وہی شیخ کرتا ہے۔ مگر شیخ کو تو الزام دیں اور طبیب کے معنوں ہوں۔ کیسے تعجب کی بات ہے اگر کوئی کہے کہ تم ساری عمر گھومتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ٹھوڑے دنوں پرہیز بتلاؤں گے۔ ساری عمر نہ رگڑیں گے۔ پھر تو خود ہی جاٹ ایسی پڑھاؤں گے کہ چھوٹے ہی کی نہیں اور نیز جیسے کہ اپنی اصلاح ضروری ہے بچوں کی بھی ضروری ہے۔ پس خود اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے بچوں کی اصلاح کرو۔

کی بھی ابھی سے فکر کرو۔ کیونکہ بچپن میں اخلاق زیادہ درست ہوتے ہیں اب اس کا طریقہ کیا ہے وہ میں بتلاتا ہوں۔

طریق اصلاح | وہ طریقہ ایک ہی چیز ہے۔ وہ کیا ہے صحبت اہل اللہ۔ اگر کوئی کہے کہ بچوں کے لئے اتنا خرچ کہاں سے آئے کہ اہل اللہ کے پاس بھیجیں اور وہاں اُن کو رکھیں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا بچہ کے لئے اتنا نہیں رکھتے۔ ماسٹر کو تنخواہ نہیں دیتے۔ اس کے لئے بائیسکل نہیں خریدتے۔ لندن نہیں بھیجتے۔ کیا سینکڑوں روپے خرچ نہیں کرتے۔ جہاں اور تمام باتوں کا انتظام کرتے ہو اللہ والوں کی صحبت کا بھی انتظام کر دو۔

اس کی صورت بہت ہی آسان ہے کچھ مشکل نہیں۔ وہ یہ علاج رُحانی کے لئے دو عمل کی ضرورت ہے جس میں ایک جزو یہ صحبت بھی ہے ایک تو یہ کہ روزانہ کوئی وقت لے لو جس میں کسی کام کا حرج نہ ہو۔ تو سب سے زیادہ بیکار وقت سونے کا ہے یہی لے لو۔ بس اس میں سے تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے لے کر اس میں یہ کرو کہ کوئی کتاب دین کی بچہ کو دیجئے کہ وہ خود پڑھے یا آپ اس کو سنا دیں۔ کوئی دن اس سے خالی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی دو دن چار دن جب زمانہ چھٹی اور اسکول کی تعطیل کا ہو صحبت اہل اللہ اختیار کریں بلکہ اگر تمام زمانہ چھٹی کا اس میں خرچ نہ کریں تو یوں کریں کہ اسکول میں ہفتہ بھر کی چھٹی ہوتی ہے اس کے دو حصے کریں۔ ایک حصہ کھیل کود میں گزاریں اور ایک حصہ اہل اللہ کی صحبت میں۔ مگر یہ ضرور ہے

کہ پہلے انتخاب کسی محقق کا کر لیجئے اور وہ محقق ایسا ہو گا کہ ان پر کچھ تشدد نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ نماز وغیرہ کو بھی ان سے نہ کہے گا۔ وہ ایسا طرز اختیار کرے گا کہ بلا کہے تمام باتوں کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے پاس بیٹھنا ہی سب باتوں کی اصلاح کے لئے کافی ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزانہ کا عمل تو وہ ہے کہ کتاب خود پڑھا کریں یا آپ سنایا کریں اور کبھی کبھی کا عمل یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ اول ہی سے ان بچوں کے لئے اس طریق کا التزام کر لیجئے۔ پس اس طریق کے اندر دو چیزیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ دوسرے مسائل دین اور احکام دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔ پس اس کا التزام کیجئے اور ابتداء ہی سے کیجئے۔ ابتداء سے کریں گے تو وہ آسانی سے پابند ہو جاویں گے۔ اور اس کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں۔ مثلاً اگر غیبت کریں تو روک دیجئے اور کہئے کہ بڑی چیز ہے۔ ان کو نفرت دلائیے۔ ان سے کبر کی شان ظاہر ہو تو روک دیجئے اور بتلائیے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ جھوٹ بولے تو اس کی خرابی بتلائیے۔ جماعت کی نماز کے ترک پر تنبیہ کیجئے اگر سکول میں جماعت کی پابندی نہ ہو تو تعطیل کے ایام میں تو ضرور ہو۔

اب تو خود مساجد کی حاضری ہی امر میں متروک ہو گئی ہے جس کی ایک کھلی خرابی یہ ہے کہ ان

بچوں کی تربیت

حضرات کو مسجد کی ضروریات تک کی خبر نہیں رہتی۔

میں شاہجہان پور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسجد میں گیا تو دیکھا کہ مسجد میں

مٹی کے تیل کی ڈبیا رکھی ہوئی ہے۔ اور اس کے دھوئیں سے تمام مسجد کالی ہو رہی ہے۔ اور مسجد کے قریب ہی ایک رئیس صاحب رہتے تھے اس وقت ان کے یہاں میری دعوت تھی۔ ان کے یہاں جو گیا تو بجلی کی روشنی تھی۔ میں نے ان کو اس پر شرم دلائی۔ ان کے ہاں تو بجلی کی روشنی ہے اول مسجد میں ڈبیا جلتی ہے۔ تب انہوں نے تیل کا انتظام کیا۔

وجہ یہ ہے کہ مسجد میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نماز اپنے گھر پڑھتے ہیں۔ جب یہ حالت ہے تو مسجد کی طرف توجہ کیسے ہو۔ کسی چیز پر نگاہ پڑھنے سے بہت خیال ہوتا ہے۔

ایک رئیس صاحب تھے۔ میں نے ان سے مسجد میں نماز پڑھنے کو کہا تو کہنے لگے کہ صاحب مسجد کی توجہ حالت ہے کہ نہ فرش ہی ٹھیک ہے نہ وضو ہی کرنے کا انتظام ہے۔ مسجد میں کیا جاویں۔ میں نے کہا کہ یہ اعتراض تو اپنے ہی اوپر ہے۔ یہ تصور تو آپ کا ہے۔ آپ مسجد کی خبر نہیں رکھتے تو بچوں کو ابتداء ہی سے اس کا پابند کیجئے کہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھا کریں۔ اسی طرح بچوں میں بچپن سے یہ بات پیدا کیجئے کہ ان کو مسلمانوں سے اجنبیت نہ ہو۔ ان کو غربا سے اختلاط کی تعلیم دیجئے۔ صاحبو! غربا کے ساتھ اختلاط میں دنیوی جاہ بھی ہے۔ ان سے ملو گے تو وہ قدر کریں گے اور امیروں کے ساتھ اختلاط میں کچھ عزت نہیں ہوتی کیونکہ اسراء تو خود ہی اینٹھ مروڑ میں رہتے ہیں۔ ان کی نظریں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ پس یہ مادہ بچپن ہی سے پیدا کرو کہ غربا سے نفرت نہ ہو۔ یہ

باتیں بچپن سے پیدا ہوں گی بڑے ہونے کے بعد پھر ذرا دشوار ہے اسی طرح بچوں کو اس کی تاکید بھی کیجئے کہ لباس خلاف شرح نہ پہنیں۔ دوسری قوموں کی وضع نہ اختیار کریں۔ بعض لوگ تشبہ کے مسئلہ میں کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب غیر قوموں کے ساتھ تشبہ میں حرج کیا ہے۔ کیا کافروں کے ساتھ مشابہ ہونے سے کافر ہو جاویں گے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی مرد زنانہ لباس پہنے تو اس کو کیا ہو گے۔ اگر تشبہ میں شرابی نہیں تو تشبہ بالنساء کیوں نہیں کرتے۔ کوئی عورت کا لباس پہن کر دکھا تو دسے عورتوں کا لباس پہننے سے بھی تو عورت نہ ہوگا۔ پھر کمیوں نہیں پہنتے۔ بس کچھ بھی نہیں دین کو اپنے تابع بنا رکھا ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہ اس کے پہننے پر عہدے موقوف ہوں۔ بعض اسلامی روٹن پر ہیں مگر بڑے بڑے عہدے ان کو ملے ہوئے ہیں۔

حاصل یہ کہ بچوں کے لئے صحبت اہل اللہ کا بھی انتظام کیجئے اور تعلیم دین کا بھی سلسلہ رکھئے اور پھر اس پر عمل بھی کرائیئے۔ یہ اجمالی تدبیر ہے اصلاح کی نہ یہ تمام عمر کے لئے دستور العمل ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ

اہل اللہ کی صحبت

جاوے کہ اس میں اہل اللہ کی صحبت متصل مسیر ہو جاوے تو یہ بہت ہی نافع ہے۔ سال بھر نہ ہو تو چھ ماہ سہی۔ یہ بھی نہیں تو چالیس ہی دن سہی۔ حد میں اس حد کی بڑی فضیلت آتی ہے۔ اسی کو حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

شنیدم رہے رہے در سر زینے ہمیں گفت این معما باقرینے
 کہ اسے صوفی شراب آنگہ بود صاف کہ در شیشہ بماندار بعینہ
 پس چالیس دن نکال کر کسی شیخ کامل کے پاس رہ پڑے۔ مگر گھر بار
 اور جتنے تعلقات ہیں سب کا بند و بست ایسا کر کے جائے کہ قلب کو
 تشویش نہ ہو۔ نوکری میں رخصت لے لے۔ غرض بے فکری سے رہے۔
 چالیس دن کے لئے اپنے کو بالکل شیخ کے سپرد کر دے۔ شیخ دو کام کریں گے
 کچھ نوا عمل بتلائیں گے کچھ اوراد۔ اور اس سے بے فکر رہے کہ تحمل سے
 زیادہ نہ بتلائیں گے۔ اور وہاں کسی سے تعلق مرت رکھو۔ کسی سے بلا ضرورت
 شدید بولو بھی مرت۔ اصل کام ذکر اللہ اور اطاعت الہی رکھو۔ چالیس دن
 میں جو مادہ خبیث آپ کے اندر ہے حد، عفتہ، کیر، حب دنیا وغیرہ وہ
 سب نکل جائے گا۔ اور جو شبہ یا جو حالت پیش آئے بے تکلف شیخ کے
 سامنے پیش کر دو اور اطلاع کے بعد اپنے کو شیخ کے سپرد کر دو کہ جو ان کی
 سمجھ میں آئے وہ کریں۔ علاج مشکل ہو یا آسان سب کو برداشت کرو
 ہوگا تو آسان ہی مگر اول اول دشواری معلوم ہوگی۔ پھر کوئی دشواری نہ معلوم
 ہوگی۔

چنانچہ میں نے بھی ایک صاحب کا علاج کیا ہے۔ ویسے وہ عالم و
 فاضل ہیں۔ مگر مجھ کو اتارے سے معلوم ہوا کہ ان میں کبر ہے۔ میں نے علاج
 یہ تجویز کیا کہ خانقاہ والوں کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کبر کے رکھا کریں تاکہ
 ان کو پہننے میں سہولت ہو۔ اس کو سن کر ان کی یہ حالت ہوئی جیسے گولی ماری

اور خیال ہوا کہ اُنہوں نے یہ کیا کام بتلایا مگر مجبور تھے کرنا پڑا۔ جوتیاں سیدھی
تو کیں مگر عشا کے وقت کہ کوئی دیکھے نہیں۔ یہ نفس کی خباثت تھی۔ پھر دن
کو جوتیاں سیدھی کرنا شروع کیں۔ یہ حالت ہو گئی کہ اول تو وہ شرما تے تھے
اب لوگ شرمانے لگے۔ بعض لوگ اُن کو منع کرتے۔ میں نے کہا کہ ان سے
تعرض مت کرو۔ جیسے کریں کرنے دو۔ چند روز تک تو یہ رہا۔ اس کے بعد
میں نے کہا کہ نمازیوں کو وضو کے لئے پانی بھر دیا کرو۔ یہ بھی کیا۔ جب
ایک زمانہ گزر گیا تو میں نے کہا کہ بس چھوڑ دو۔ پہلے تو کرتے ہوئے تکلیف
ہوتی تھی اب یہ حالت ہو گئی کہ چھوڑتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے ایک
تو اس لئے کہ اُن کو اس سے ایک مناسبت ہی ہو گئی تھی۔ دوسرے نفس
کہتا تھا کہ سب کے سامنے ظاہر تو ہو ہی گیا اور لوگ بزرگی کے معتقد
بھی ہونے لگے۔ اب یہ کام چھوڑا یا جاتا ہے۔ نفس نے کہا کہ اب اگر
چھوڑوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب پھر انہیں نکبر ہو گیا۔ اب چھوڑنے میں
ذلت ہے جیسے پہلے کرنے میں ذلت تھی۔ نفس چھوڑنے میں بڑے رنگ
لایا۔ کہنے لگے کہ مجھ کو چھوڑنے کا حکم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ بس اب اس کو
چھوڑ دو۔ اب یہ کہہ کر وہ کسی سے ملو جلو، نہ بات کرو۔ تنہا حجرہ میں دروازہ
بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ پہلے تو کہتے تھے کہ اُنہوں نے یہ کیا کیا کہ جوئے سیدھے
کرنے کو کہہ دیا۔ مگر پھر قسم کھا کر کہتے تھے کہ حجہ کو اس عمل سے اتنا بڑا
نفع ہوا کہ سال ہا سال میں بھی نہ ہوتا۔

جس کے اندر کبر ہو یہ تو اس کا علاج ہوا۔ اب فرض کرو کہ کسی نے

زینت بہت ہے۔ مانگ پٹی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس کو اس سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ شیخ اس کا علاج یوں کرے گا کہ جھاڑو ٹاخٹ میں دیگا اور کہے گا شرک پر جاؤ اور جھاڑو دو۔ مسلمانوں کو آرام پہنچے۔ اس عمل کے کرنے سے وہ شخص زینت کو چھوڑ دے گا۔

پہلے بزرگ اس طرح کہتے تھے۔ وظیفہ زیادہ نہ بتلاتے تھے وظیفہ ثواب ہوئے ہیں کہ جہاں طالب نے کسی مرض کی شکایت کی بس ایک وظیفہ بتلا دیا۔ امراض کہیں وظیفوں سے جاتے ہیں۔ ان کا ازالہ تو اسی طرح ہوتا ہے۔ یا کسی میں حسد کا مادہ ہے تو شیخ محسود کے پاؤں دبانے کو کہے گا۔ سائنس کی رو سے اس کا لازمیہ ہے کہ اس سے محسود کے دل میں اس کی محبت ہونگی۔ تو پھر اس کو بھی ہوگی اور جب اس کو اس کے ساتھ محبت ہو جاوے گی تو پھر حسد جاتا رہے گا۔ سو اس طریقہ سے ازالہ ہوتا ہے ان امراض کا۔

علم و اصلاح | اب لوگ ان کے مذہب ہونے کے صرف علم کو کافی سمجھتے ہیں کہ جب ان کی بُرائی معلوم ہو گئی تو خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ اصلاح کے لئے تنہا علم کافی نہیں۔ دو جملے کے سننے سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ عملی صورت سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں۔

صوفی نشو و صافی تا در نہ کشد بجائی بسیار سفر باید تا پختہ شود خمائی
اخلاق کی درستی تو خبیث مادہ کے نکلنے ہی سے ہوگی۔ دیکھتے ہیں
کی نا اتفاقی سب جانتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے مگر پھر بھی اس کو نہیں

چھوڑتے وجہ یہ کہ مذموم ہونے کا علم صرف کافی نہیں۔ اس کے مادہ کو اپنے اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ پس سوچنا چاہئے کہ اس کا مادہ کیا ہے جس سے یہ نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کبر سے پیدا ہوتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق تو کہتے ہیں مگر ان کو اس کی جڑ معلوم نہیں۔ اس کی جڑ ہے تواضع۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے کم سمجھے۔ پس اتفاق ہو جائے گا۔ آج کل جو اتفاق نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اتفاق کے معنی سمجھ رہے ہیں کہ دوسرا میرے تابع رہے۔ میں تابع نہ ہوں۔ یہ حالت ہے کہ باپ بیٹوں میں لڑائی بلکہ پیر مرید میں لڑائی۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہر شخص اپنے کو بڑا بنانا چاہتا ہے۔ پس اس کی جڑ کبر ہے۔

ان خصائل کو بُرا تو سب کہتے ہیں مگر ان کو مٹاتے ہیں اہل اللہ۔ ان کے ازالہ کا علاج پس انہیں کو آتا ہے۔ ان کی تجویز پر عمل کرنا چاہئے۔ وہ ان اخلاق ذمہ کو نکالیں گے۔ یہ دذائل مٹ گئے تو ساری سعادت کی کنجی ہاتھ میں آگئی۔ عرض یہ کہ ایک تو وہ یہ کام کریں گے اور دوسرے اوراد میں مشغول کریں گے۔ وہ بھی ایسے جو آپ سے ہو سکیں۔ اللہ کا نام لینے سے نتیجہ ہوا کہ تعلق طبعی ہو جاوے گا اللہ سے۔ اس میں یہ خاصیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفس و قلب کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے بعد حدود سے تجاوز نہ کرو گے۔ معصیت سے ایسی نفرت ہو جاوے گی کہ

جیسے پاخانہ سے۔ اسی وقت گناہ چھوڑنا مصیبت ہے۔ اُس وقت گناہ کرنا مشکل ہوگا۔ بس کسی قدم پر نافرمانی نہ ہوگی۔ اگر مال بھی ہوگا تب بھی یہ حالت ہوگی کہ جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کو کارخانہ سپرد کرتا ہے۔ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُس کے انتظام میں پھرتا ہے اور اُس کے اندر وہی تصرف کرتا ہے جس سے محبوب خوش ہو۔ اُس کی مرضی کے خلاف اس میں کوئی تصرف نہیں کرتا۔ خاص کر جب کہ یہ علم ہو کہ محبوب دیکھ بھی رہا ہے۔ ساری دنیا اُس کے پاس ہوگی مگر قلب میں سوائے محبوب کچھ بھی نہ ہوگا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ اُن کے پاس بڑے بڑے کارخانے ہیں مگر وہ صغیرہ بھی نہیں کرتے۔ سوا اصلاح کا ایک اثر ہوگا کہ معاصی سے نفرت ہو جاوے گی۔ دوسرے اس کا یہ بھی اثر ہوگا کہ خلق کی نظریں جاہ بڑھے گا۔

اہل اللہ کی قوتِ قلبیہ و جسمانیہ | ایک اور عجیب بات ہے کہ اس سے قوتِ جسمانی بھی

بڑھتی ہے۔ اہل اللہ میں قوتِ جسمانیہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ گو کہ اُن کی ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ راتوں کو جاگنے اور مجاہدہ کرنے سے دبلے پتلے ہوتے ہیں مگر روح میں افسردگی نہیں ہوتی۔ ہر وقت تازہ رہتے ہیں اور رازِ تازگی کا یہ ہے کہ اُن کو معیت ہے محبوب حقیقی سے۔ آپ محبوب مجازی کو دیکھ کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ جب ادنیٰ سے محبوب کی معیت میں یہ اثر ہے، تو پھر خدا تعالیٰ کی معیت میں کیوں نہ اثر ہو۔ اسی واسطے وہ ہر حال میں خوش

کھاتا ہے۔

ان ہی کی قوم میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ لڑکیوں پر روپیہ لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے لڑکے کی شادی کرنی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ پیغام دیا وہاں سے روپیہ کی طلب ہوئی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ شرح میں ایسا روپیہ لینا حرام ہے۔ اس لئے میں ہرگز نہ دوں گا۔ چاہے شادی ہو یا نہ ہو۔ غصہ سے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ ہاتھ جوڑتے آئے اور کہا لڑکیاں موجود ہیں ہم روپیہ نہیں لیتے۔

لوگ ہر بات کی مائنس ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ صاحب اگر دین کے مقابلہ میں دنیا کے فائدہ کو چھوڑ دیا کریں گے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر بات میں خدا کو کیوں نہ دیکھو! انہیں بزرگ کو دیکھ لو کہ انہوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات مار دی تو خدا تعالیٰ نے ان کا کام کس طرح چلایا۔

خلاصہ یہ کہ جو دستور العمل میں نے بیان کیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کی یہ حالت ہوگی کہ اگر دنیا کا زیادہ کاروبار بھی کریں گے تو دل اس کے اندر مشغول نہ ہوگا۔ اس وقت تو آپ کو قدرت نہیں ہے کہ لمبے پیمانہ پر کام کریں اور قلب اس کے اندر مشغول نہ ہو۔ اور جب اصلاح ہو جاوے گی تو پھر بڑے پیمانہ پر بھی کام کر دے گے تب بھی قلب مشغول نہ ہوگا۔ پس اہل اللہ کے پاس رہنے کے لئے چالیس دن تو ضرور نکالنے چاہئیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کی صحبت کافی ہے

یہ ایسا آسان طریقہ ہے کہ ہر کسی کو موقع مل سکتا ہے۔ اس کے بعد اب گنہگار
نہیں رہی، اس عذر کی کہ ہم دنیا میں مشغول تھے ہم دین کا کام کیسے کرتے
چنانچہ لوگوں کا آج کل یہی گمان ہو گیا ہے اور واقع میں مذاق بگڑ گیا ہے کہ
ہیں کہ اگر دین حاصل کریں گے تو بھوکے مریں گے۔ یہ واقعات میں نے
بیان کئے ہیں۔ اس طریق میں یقینی کامیابی ہے۔ اب وہ لوگ بتلائیں تو یہی
کہ میں نے کون سی نوکری چھڑائی۔ کون سی مشقت کے کام لئے۔ اس طریقہ
پر عمل کرنے میں کون سی دشواری ہے۔ پس اب ہمت کر کے اس پر عمل شروع
کر دیجئے۔ جب تم اس طریقہ پر عمل کرو گے تو یقیناً کامیابی ہوگی اور پھر
تو ثروت الحیوة الدنیا کے مسداق نہ بنو گے۔

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق

حیاتِ آخرت

عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا
کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیوة الدنیا اور آخرت کے
ساتھ لفظ حیات نہ لائے۔ یوں نہیں فرمایا وحیوة الاخوة خیر والفقہ
یہ کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں کام
کا کچھ کام نہیں۔ پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیاتِ
آخرت تو جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے
ہو۔ پس جو کہ حیاتِ آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب
نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں

ورنہ اس کی طرف توجہ تمام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف
 رُخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو۔ اسی کو سوچو۔ اگر اس کی پوری تحقیقت
 سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا کے عاشق ہوئے ہو۔ ذرا اس کو دیکھو
 تو سہی۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بد ہیئت عورت نے پوڈرل رکھا
 ہو اور دو چار چہرے اُس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت
 ہے۔

حال دنیا را بد پر سیدم من اندر سوزانہ !

گفت یا خوابے ست یا بایے ست یا افساد

باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے ست

گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانہ

حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت
 فرمائی ہے۔ بل تو شرور الحیوة الدنیا والآخرۃ خیر والبقی کہ دنیا ایسی
 رذیل چیز کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت خیر اور البقی ہے۔ ہر چیز کہ عورتوں
 کے متعلق کوئی خاص معنوں ذکر نہیں ہوا۔ مگر جو مضامین بیان ہوئے وہ جیسے
 مردوں کے لئے نافع ہیں عورتوں کے لئے بھی مفید ہیں۔

کچھ عورتوں کے متعلق | خیر اب چند باتیں خاص اُن کے متعلق بھی
 عرض کرتا ہوں۔ حُب دنیا میں ہیں تو سب

بٹھا مگر یہ زیادہ ہیں۔ ان کو علم کم ہے صلحاء کی صحبت کم۔ کیونکہ یہ گھر سے تو

نکل نہیں سکتیں لیکن ان کے لئے یہی تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو اللہ کی خدمت میں نہیں تو ان کا کلام تو میسر ہو سکتا ہے۔ بزرگوں کے کلام اور ملفوظات تو موجود ہیں۔ اگر خود ان سے وعظ نہیں ہو سکتا تو چھپے ہوئے وعظ تو ہیں۔ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عورتیں جمع ہو اکیں۔ جو ان میں پڑھی لکھی ہو وہ پڑھا کرے اور سب سنا کریں جیسے اور دنیا کے کاروبار کرتی ہیں بس ایک اس کو بھی معمول کریں۔ جو برکت اہل اللہ کی خدمت میں حاصل ہو وہ اس طرح ان کو حاصل ہو جاوے گی۔

ایک یہ کہ ضروری مسائل کی کتابیں پڑھیں یا سنیں۔ اور خیال رکھیں کہ ان کے موافق عمل ہو۔ کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔ ایک یہ کہ اپنے عیوب کو ٹھٹھیں اور ان کا علاج کریں۔ کتابیں دیکھنے سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی بات کا علاج معلوم نہ ہو اور کتاب میں نہ ملے تو اپنے مردوں سے خواہش کریں کہ وہ کسی بزرگ کے پاس لے کر بھیج دیا کریں۔ وہ تجویز کریں۔ اس کے موافق عمل کریں۔ ایک تدبیر تمام معاصی کی مشترک تدبیر ہے۔ اس سے ہر معصیہ کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور وہ تدبیر مرد اور عورت دونوں کے کام ہے۔ وہ یہ کہ جس فعل کا مادہ تقاضا کرے اسے مت کر۔ مثلاً پرائی عورت کے دیکھنے کو جی چاہا تو نگاہ کو روکو۔ ہرگز مت دیکھو۔ غصہ آئے تو روکو۔ غرض جس مادہ کا تقاضا ہو اس کے خلاف کر۔ مثلاً ایک شادی ہی ہے۔ اس میں رسومات جو کی جاتی ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ نام ہو جاوے۔

اس کا کبر اور تفاخر ہے اور وہ ہے حرام۔ پس یہ رسومات بھی حرام ہوئیں تو ان کے نادہ کے مغلوب کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ رسومات کو مرت کر دے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نایح گانا ہی رسم ہے۔ نایح گانے کے علاوہ پس اور کوئی رسم نہیں۔ کھانا کھلانا وغیرہ اس میں رسم کیا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ نایح گانے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جتنی باتیں نام کی وجہ سے کی جاتی ہیں وہ سب رسوم قبیحہ ہیں۔

علاج یہ ہے کہ ان قصوں میں مرت پڑو۔ جہیز دینے کو طبیعت چاہے خوب دو مگر ساتھ مرت کر دے، دکھاؤ مرت۔ لڑکی کو خالی بھیج دو جب گھر واپس آوے تو اس کو ان تمام چیزوں پر قابض بنا دو۔ اب اس کی ملک ہو گیا جب چاہے لے جاوے۔ اُسے مشورہ دو کہ جس چیز کی بالفعل ضرورت نہیں اُسے مرت لے جا۔ جہیز کو مجتہداً مرت جانے دو۔ یہ ہے علاج کبر کا۔ نہ یہ کہ ان رسموں کو تو کرتے رہیں اور دل سے فخر اور نام کی نیت نکال دیں۔ یاد رکھو کہ جب تک ان کو ترک نہ کرو گے، اس وقت تک دل سے فخر اور تکبر ہی نہیں نکل سکتا۔ تا وقتیکہ علاج طریقہ سے نہ کرو ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھ کو ایک وقت میں تعجب تھا کہ علماء دیواؤں کے نکاح کی تائید اس قدر کیوں کرتے ہیں۔ کیوں اتنا پیچھے پڑتے ہیں۔ پس سمجھا دیا کہ یہی کہ نکاح سنت ہے یا مستحب۔ اصل مقصود تو عقیدہ کی اصلاح ہے اس کو بُرا نہ سمجھیں۔ ورنہ دوسرا نکاح کرنا واجب تو ہے نہیں۔ یہ شبہ کئی سال تک

رہا۔ اس کے بعد یہ شبہ مٹ گیا اور سمجھ میں آ گیا کہ واقعی اس پر عمل کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اس پر عمل نہ ہو گا تو عقیدہ سے بھی اس کی بُرائی نہ نکلے گی۔ اس میں کامیابی جب ہی ہو گی کہ عمل کریں۔ اگر عمل نہ کریں گی تو عیب بھی سمجھیں گی اور جب اس کا رواج ہو جاوے گا تب اس کو عیب بھی نہ سمجھیں گی۔ صرف اس کا سمجھ لینا کہ نکاح کرنا چاہئے کافی نہیں تا وقتیکہ نکاح نہ کیا جاوے پس جب تک کہ عملی علاج نہ ہو اس وقت تک عقیدہ کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اب اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ

علاج شیخ کی اہمیت

تجویز کرے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ مگر شیخ کے تجویز کرنے میں دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ شیخ طیب ہے علاج کو خوب سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کا علاج تجویز کیا ہوا اعلیٰ درجہ کا ہو گا۔ دوسرے اپنے ہاتھ سے اپنے نفس پر چھری چلانا مشکل ہے۔ نشتر لگانا مشکل ہے۔ جیسے محسوس کے خود پاؤں بانا مشکل ہے اور جب شیخ نے کہا کہ پاؤں دباؤ تو اب آسان ہو جاوے گا شیخ کے کہنے کے بعد اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر طبع سلیم ہو تو خود بھی علاج سمجھ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی شیخ کی تجویز میں تو برکت ہے، وہ کہاں سے لائے گا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت و لبری واند

نہ ہر کہ آئینہ دار داسکندری واند

شیخ فلسفی ہے مگر اس کا فلسفہ ظلماتی فلسفہ نہیں (جیسے اہل یونان کا فلسفہ ہے) بلکہ اس کا نورانی فلسفہ ہے۔ اگر کوئی چار تدبیریں یاد کر لے تو شیخ ٹھوڑا ہی ہو جاوے گا۔

ہزار نکتہ بار یک تر زمو این جااست
 نہ ہر کہ سر بر ترا شد قلداری داند
 خلاصہ یہ کہ ایک گڑبیکھ لو۔ وہ یہ کہ جس چیز کا تقاضا ہو اور ہو وہ معصیت
 اُسے چھوڑ دو۔ اس سے تقاضا معصیت کا ضعیف ہو جاوے گا ضعیف
 اس لئے کہا کہ یوں نہ خیال کیا جاوے کہ بالکل زائل ہو جاوے گا۔ بالکل ازالہ
 نہیں ہو سکتا۔ جیسے شریر گھوڑا کہ وہ پہلے بہت دق کرتا تھا اب بعد اصلاح
 کے دق نہیں کرتا مگر کبھی کبھی شرارت لے ہی آتا ہے۔ مگر فرق یہ ہوتا ہے
 کہ نفس پہلے بہ دشواری قابو میں آتا تھا اب آسانی سے آجاتا ہے مثلاً نگاہ
 ہٹانا غیر محورتوں سے پہلے نہایت دشوار تھا۔ اب بعد اصلاح کے آسان
 ہو جاوے گا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ نفس سے بالکل تقاضا ہی موقوف ہو جاوے
 ریاضت کا یہ طریقہ بہت عمدہ ہے کہ تقاضا معصیت کے خلاف کرے۔

یہ حاصل ہے سارے تصوف اور
 اصلاح نفس کا۔ میں سب کو فقیر نہیں بناتا

مداومت کی ضرورت

صرف اس پر عمل کرنے کو کہتا ہوں۔ پھر اس میں سختی کیا ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ
 تہجد نہ پڑھے۔ مگر اللہ کا نام لیجئے اور معاصی کو چھوڑ بیٹے لیکن پھر بھی اس میں
 نصرت حق کی ضرورت ہے اور وہ بوسائط ہوتی ہے کہ شیخ کی طرف

رجوع کرنے۔ اس لئے کہتے ہیں ۔

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سبب ہش ورق

بہن تصوف ایک مرکب تدبیر ہے ۔ وہ یہ کہ دواعی نفس کے خلاف

کرو اور التجا کو حق کی طرف ۔ ذکر کرو چاہے پندرہ منٹ ہو مگر بجاہ کرو

جیسے کنواں ایک بالشت روزانہ بھی کھودو مگر کھودو بجاہ کرو تو سال بھر میں

پانی نکل آئے گا ۔ کام مداومت سے کرو ۔ یہ نہیں کہ کبھی کیا اور کبھی نہ

کیا ۔

عورتوں کو یہ بھی چاہئے کہ عمدہ کپڑا پہن کر کہیں نہ جائیں ۔ جہاں جائیں

انہیں کپڑوں سے چلی جائیں جو پہلے سے پہنے ہوئے ہوں ۔ اس عمل سے

جو حصہ تکبر کا ہے وہ ٹوٹ جائے گا ۔ مگر ان کی یہ حالت ہے کہ جہاں جائیں

گی لد بھند کر جائیں گی تاکہ شان ظاہر ہو ۔ زیور بٹھا ہوا دکھاوے کی یہ حالت

ہے کہ کان اگے دوپٹے سے ڈھکے ہوتے ہیں کہ کسی کی نظر نہیں پڑتی تو کھجلا

ہی کے بہانے سے ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے پاس اتنا ہے ۔ اگر اپنے

پاس نہ ہو تو مانگ مانگ کر زیور میں لدتی ہیں ۔ اُن کا خیال زیور اور کپڑے

پر رہتا ہے ۔ جب اُن کا مجمع ہوتا ہے تو اوروں کے زیور اور کپڑے پر

نگاہ رہتی ہے ۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جب مردوں کا مجمع منتشر ہوتا ہے تو

کسی کو بھی یاد نہیں رہتا کہ فلاں کی ٹوپی کسی تختی کرتا کیسا تھا ۔ بخلاف عورتوں کے

کہ سب کا زیور اور کپڑا بتا دیں گے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اُن میں جب

دنیا کا غلبہ زیادہ ہے ۔ علاج یہ ہے کہ خاوند کے روبرو خوب پہنا کرین

مگر حالت یہ ہے کہ برادری میں جاٹیں گی تو خوب بن ٹھن کر اور جب آٹیں گی تو فوراً اتار دیں گی۔ تاکہ جس حال میں خاوند نے پہلے دیکھا تھا اُسی میں دیکھے اس کا علاج یہ ہے کہ خاوند کے سامنے بیٹھیں اور کہیں جاٹیں تو نہ پہنیں۔ ایسے ہی علاج غیبت کا ہے اس میں استغفار کافی نہیں بلکہ مغتاب سے کہو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے تم معاف کر دو۔

خاوند کے حق میں گستاخی ہو جاوے تو بہ کرو اور اس سے معاف کراؤ۔ تم خاوند کو برابر کا دوست سمجھتی ہو کہ اُس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتی ہو یاد رکھو کہ وہ جیسے دوست ہے حاکم بھی تو ہے۔ دوست تو اس واسطے ہے کہ اُس کے حقوق ادا کر سکو۔ کیونکہ محبت میں جیسے حقوق ادا ہو سکتے ہیں بغیر محبت کے ادا نہیں ہو سکتے۔ نہ اس لئے کہ اُس کے جو نیاں مارو۔ عورتیں اس میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں۔ خوش خلقی کے لئے تو سب اور بد خلقی کے لئے شہر۔ خاوند کی ناراضگی ایسی بڑی چیز ہے کہ اس سے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ عورتوں کی عادت ہے کہ شہر کے سامنے زبان درازی بہت کرتی ہیں۔ بھلا اس کو اس طرح تکلیف پہنچانی چاہئے۔ اول تو ہر وقت ہی اُس کا مزاج دیکھ کر بات کہو۔ ایسی بات نہ کہو جو اس کو ناگوار ہو۔ لیکن خاص کر جب وہ باہر سے گھر میں آوے تو اس وقت تو ضرور ہی اول اُس کے مزاج کو دیکھ لو کہ کہیں کسی سے لڑ کر نہ آیا ہو۔ کسی وجہ سے غصہ میں نہ ہو۔ مگر ان کو فوراً صبر نہیں ہوتا۔ بس آتے ہی ٹانگ لپیتی ہیں۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں

اس کی شکایت فرمائی ہے کہ لوگ زندگی دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ
 آخرت بہتر اور ابدی ہے۔ اس کے متعلق بقدر ضرورت مفصل بیان ہو گیا
 اور حجت الہی قائم ہو گئی۔ اب عمل نہ کرنے پر کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ جو
 مناسب حال تھا میں نے اپنی طرف سے سب پہنچا دیا۔ عمل کرنا آپ کا
 کام ہے۔

اب میں دعا کرتا ہوں اور حق تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق
 دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

مطابہ اہل اموال

تذکیہ نفس کے متعلق یہ وعظ بروز اتوار ماہ شعبان المعظم ۱۳۳۵ھ
سالانہ جلسہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں منبر پر کھڑے ہو کر
ارشاد فرمایا۔ جو ۱۳ گھنٹے میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد قریباً
۲۰۰۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبة بالوراء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله نحمدك ونستعينك ونستغفرُك ونؤمن بك ونتوكل
 عليك ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
 ونشهد أن لا اله الا الله واحد لا شريك له ونشهد
 أن سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى
 عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم ما بعدنا عوذ
 بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم
 خَلِّ مِنْ أَمْوَالِهِمْ حَقَّ قَرْضِهِمْ وَتُرْكِيَّتِهِمْ
 بِهَا وَصَلَّى عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ
 بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

مفسر | اس آیت میں ایک ضروری مضمون کا بیان ہے۔ اس لئے
 میں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اور ہر جہز کہ قرآن کی سب
 بول میں ایسے ہی مضامین ہیں جو سب ضروری ہیں اور خاص خاص ضرورتوں
 کے لئے کافی ہیں مگر اس وقت خاص اس آیت کے اختیار کرنے کی دو وجہ
 ایک یہ کہ میں ابھی دیوبند گیا تھا اور وہاں اس سے پہلی آیت
 وَأَخَذُوا عَصَايَ إِذْ لَوْ بِهِمْ خُلَعُوا عَمَلًا صَالِحًا
 وَأَخَذُوا سَيْتًا عَنِ اللَّهِ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
 رَحِيمٌ

اور بعض لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا
 انہوں سے ایک کام نیک اور ایک بد۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ
 کرے ان کو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کی تقریر ہوئی تھی جس میں اعتراف خطا کا بیان ہے اور اہل علم میں یہ خطا عام ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ بلکہ تاویلات و توجہات کرنے لگتے ہیں۔ وجہ سے اس کو دلائل اختیار کیا تھا۔ اور یہ مرض طالب علمی ہی کے وقت سے اس میں پیدا ہوتا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کتب درسیات میں بعض مصنفین سے غلطی ہو گئی ہے شراح اور محققین ان کی تاویلات و توجہات کیا کرتے ہیں مصنف سے اہل علم کو بدگمانی نہ ہو۔ اس سے طلباء کو تاویل و توجہ کی عادت پڑ جاتی ہے حالانکہ محقق اور شارح کی تاویل و توجہ کا منشا تو اصنع ہے باوجود دوسرے کی غلطی معلوم ہو جانے کے اس کے کلام کو محمل حسن کرتے اور اپنے مواخذہ کو ضعیف کر دیتے ہیں مگر طلباء نے اس سے سبق سیکھا کہ اپنی خطاؤں میں خود ہی تاویل کرنے لگے۔ جس کا منشا یہ ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس لئے میں نے دلائل اس مضمون کا بیان کیا تھا۔

پھر چونکہ سہارنپور کا سفر اسی کے متصل ہوا تو خیال ہوا کہ جب تک کہ سفر دیوبند کے سفر کے متصل ہے تو بیان بھی دلائل کے بیان سے متعلق یعنی مناسب یہ معلوم ہوا کہ یہاں بیان ایسی آیت کا ہو جو پہلی آیت سے متصل ہو تاکہ اتصال صوری کے ساتھ اتصال معنوی بھی جمع ہو جائے خیال کے بعد جو اگلی آیت میں عور کیا تو وہ اس جلسہ کی حالت کے مطابق ہی مناسب معلوم ہوئی۔ اس واسطے اس کو اختیار کر لیا گیا۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ بس یہاں

کا بیان کیا جا رہا ہے اس کا منشا صرف یہی ہے کہ اس سے پہلی آیت کا بیان اس سے پہلے ہو چکا ہے اور فی لغزہ اس آیت کا بیان ضروری نہ تھا۔ تو یہ ایسا ہوا جیسے ایک وزیر نے ایک قاضی کو لکھا تھا

اَيُّهَا الْقَاضِي بِقَمَرٍ قَدْ عَزَّكَ

نَقَمٌ
اے قاضی اٹھ جاؤ ہم نے تم کو معذول کر دیا پس اٹھ کھڑے ہو۔

اور اس نے خط دیکھ کر کہا تھا۔

وَاللّٰهُ مَا عَزَّ لَقِيْنِيْ اِلَّا هَذِهِ
الْمُتَجَعَّةُ۔

خدا کی قسم تو نے مجھے معذول نہیں کیا بلکہ اس رقعہ نے

معذول کیا ہے۔

سو یہ بات نہیں بلکہ واقع میں بھی اس آیت کا مضمون اس جملہ کے لئے بہت مناسب ہے۔ چنانچہ تقریر آیت سے معلوم ہو چاہئے گا۔

دوسری وجہ اس آیت کے اختیار کی وہ ہے، جو **مال اور مسلمان** امّو لہم کے سننے سے آپ کے ذہن میں آئی ہوگی چونکہ قرآن سے مسلمانوں کو عام طور پر مناسبت ہے۔ اس لئے وہ لوگ بھی جو عربی پڑھے ہوئے نہیں اجمالاً الفاظ ہی سے مقصود کو سمجھ لیتے ہیں۔

تو آپ نے خذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ہی سے سمجھ لیا ہوگا کہ میں آج اتفاقاً مال کا ذکر کروں گا۔ اس کو سببیت اختیار میں اس لئے دخل ہے کہ آج کل مسلمانوں کو اتفاقاً مال کے مضمون سے نہایت خوش ہے۔ اس کے سننے

سے بھی گھبراتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں اپنے بیانات میں مال کا ذکر بہت کم کرتا ہوں۔ مگر یہ ایک بڑی کوتاہی ہے میری بھی اور سامعین کی بھی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن میں سجا بجا ذکر فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے۔ تو یہ بھی شریعت کے ایک جزو ہے۔ پس میری یہ کوتاہی ہے کہ میں اس جزو کا بیان بہت کم کرتا ہوں اور مسلمانوں کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور گھبراتے ہیں شریعت کے کسی جزو سے متوحش ہونا سخت مرض ہے جس کی اصلاح ضرور ہے۔ اور توحش کا علاج یہ ہے کہ جس مضمون سے توحش ہو اس کو بار بار سنا جائے۔

جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک ہندو ریاست کے راجہ سے پنڈتوں نے شکایت کی کہ مسلمانوں کی اذان سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں سے کہا جائے کہ اذان اہستہ کہنا کریں۔ راجہ نے وزیر کو مخاطب کر کے کہا ہمارا ایک گھوڑا نوپ کی آواز سے بدکتا تھا تو ہم نے اس کی چمک اس طرح نکالی تھی کہ اس کو نوپ کے پاس بندھوا کر نوپ سے فائدہ کئے گئے۔ چنانچہ میں اس طرح کرنے سے اس کی چمک دور ہو گئی۔ اسی طرح ہمارے دیوتا مسلمانوں کی اذان سے بھاگتے ہیں تو بڑی مشکل کی بات ہے۔ اگر مسلمانوں پر یہ راز معلوم ہو گیا تو جب ہم دیوتاؤں سے کچھ کہنے جایا کریں گے مسلمانوں سے اذان دے دیا کریں گے۔ اور دیوتا ہماری ہانت بھی نہ سن سکیں گے۔

لازم ہے کہ ان کی اس وحشت کو دور کیا جائے جس کا یہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کے پاس کھڑے ہو کر بہت زور زور سے اذان دیا کریں تاکہ ان کی چمک دور ہو۔ یہ طریقہ مناسب نہیں کہ مسجدوں کی اذان کو بند کیا جائے یا آہستہ کیا جائے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں پر ہمارا راز کھلے گا۔

اسی طرح اس وقت مسلمانوں کو جو مضمون مال سے گھبراہٹ ہے اس کے رفع کرنے کے لئے بھی اسی تدبیر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین بار بار بیان کئے جائیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وحشت رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ سے چندہ مانگا جائے ہرگز نہیں۔ نہ اس وقت میرا یہ مقصود ہے نہ میرا جی چاہتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس مال ہی کہاں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان آیات کے صحیح معنی بیان کر دیئے جائیں تاکہ ان کی گھبراہٹ اور وحشت رفع ہو جائے۔ یہ جو آپ کو مال کے بیان سے وحشت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان آیات و احادیث کے صحیح معنی معلوم نہیں ہیں انفاق مال کا حکم ہے۔ ہمارے بھائی مسلمانوں کو زیادہ تر کھال کھسوٹوں سے پالا پڑا ہے۔ اس لئے یہ مال کے ذکر سے گھبراتے ہیں۔ اب سچا ہے کوئی واسطہ کھال کھسوٹ بھی نہ ہو اس سے بھی اگر مال کا ذکر سنتے ہیں تو گھبراتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے میرا ایک بھتیجا ایک بار میرے وعظ میں بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کو پیاس لگی اور وہاں پانی کا انتظام نہ تھا وعظ

دیر تک ہوا اور اس کا پیاس کے مارنے بڑا حال ہوا۔ اس روز سے وہ وعظ سے ہی ڈر گیا۔ اب جب کبھی اس سے کہا جاتا ہے کہ وعظ میں چلو گے، کہتا ہے نا، پیاسا مرنا پڑے گا۔

ایسے ہی ہمارے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ جس وعظ میں مال کا ذکر ہوگا، ہماری کھال کھوٹی جائے گی۔ چھاجو! قرآن و حدیث میں جو اتفاق مال کی ترغیب ہے اس کا یہ مطلب نھوڑا ہی ہے کہ ہر وقت مال خرچ کیا کر ویا۔ جب کسی واعظ کو اتفاق مال کا وعظ کہتے ہوئے سنو اس کے بعد ہر جلسہ مال دینا تمہارے ذمہ ضروری ہو جائے گا۔ بلکہ شریعت نے اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کئے ہیں ان حدود و قواعد کے سننے سے معلوم ہوگا کہ نہ ہمیشہ مال خرچ کرنا ضروری ہے نہ ہر وعظ اور ہر جلسہ میں ضروری ہے بلکہ خاص وقت و حالت میں دینا ضروری ہے۔ اب مسلمانوں کا ذکر مال سے گھبرانا اور یہ سمجھنا کہ ایسے مواعظ کے سننے سے مال دینا پڑے گا ایسا ہے جیسے کوئی فقیر مسہل سے اس واسطے گھبرائے کہ اس کے پینے سے ہمیشہ دست بہتر رہے گے کبھی بند ہی نہ ہوں گے۔ بتلایئے اگر کوئی مسہل کو ایسا سمجھے اور اس سے ہمیشہ مسہل سے ڈرے تو وہ غلطی پر ہے یا نہیں۔ یقیناً غلطی پر ہے۔ یہی آپ کی حالت ہے۔

طلب منصب

اس پر مجھے کانپور کا ایک واقعہ یاد آیا کہ وہاں کے دن ایک بزرگ آئے۔ اور انہوں نے درخواست کی کہ جمعہ کی نماز میں پڑھاؤں گا۔ مسجد والوں نے ان کی درخواست

ظہور کر لی۔ اول تو یہی بے قاعدہ کام ہوا کہ طالب کو امامت دی گئی جو قانون
شریعت کے خلاف ہے۔ اسلام کی تعلیم ہے اور ہم بڑے فخر سے اس کو
نیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

طَالِبُ التَّوَلِيَةِ لَا يُؤْتَى

کہ طالب منصب کو کوئی

منصب نہ دے۔

کوئی قوم اس حکم کی نظیر پیش تو کرے۔ انشاء اللہ اسلام کے سوا کسی مذہب
یہ تعلیم نہ ملے گی۔ آج کل ساری دنیا کے بادشاہوں کو بھی یوں ہی دیکھا جاتا
ہے کہ وہ طلبہ کرنے والوں ہی کو عہدے دیتے ہیں۔ ہر عہدہ کے لئے
کے پاس سینکڑوں درخواستیں پہنچتی رہتی ہیں۔ انہی میں سے کسی ایک کو عہدہ
مل جاتا ہے۔ منجملہ ان مناصب کے ایک منصب مولویوں کے واسطے بھی
دیکھا گیا ہے یعنی شمس العلماء کا خطاب یہ بھی گورنمنٹ خود کسی کو نہیں دیتی بلکہ جو
تخص کو شش کرتا اور بہت سی سفارشات پیش کرتا ہے اور وہ یہ خرچ کرتا ہے
میں کو یہ خطاب مل جاتا ہے۔ دنیا میں کیا کیا پلٹ ہوا ہے کہ لوگ اپنے
واسطے خود ہی لمبے چوڑے لقب تجویز کرتے ہیں اور حکومت سے درخواست
کرتے ہیں کہ ہم کو یہ لقب دے دو۔ اور حکومت بھی ایسی سخی ہے کہ ان
درخواست سے کرنے والوں ہی کو خطاب دے دیتی ہے۔ کسی کو شمس العلماء کہ
دیا کسی کو بدر العلماء خطاب دے دیا۔

پھر یہ لوگ خطاب ملنے کے بعد قوم کی اصلاح شروع کر دیتے ہیں
مگر ویسی ہی اصلاح جیسے حجام کیا کرتے ہیں۔ وہ تو بالوں کو مونڈتا ہے اور

یہ مسلمانوں کے دین کو مونڈنا شروع کرتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ زائد باروں کو مونڈتا ہے اور یہ اصلی اجڑائے دین کو۔

وجہ یہ کہ جو لوگ خود اپنے لئے القاب کی کوشش کریں گے ان کا دنیا ہونا تو معلوم۔ ان کی لیاقت و قابلیت بھی معلوم۔ جو شخص واقع میں صاحب کمال ہوتا ہے اس کو ہرگز یہ فکر نہیں ہوتا کہ کوئی مجھے کیا کہتا ہے۔ نہ وہ اپنے لئے القاب و خطابات تجویز کرتا ہے۔ یہ کام اپنی لوگوں کا ہے کہ کو حقیقی کمال حاصل نہیں۔ مگر ان لمبے چوڑے خطابات سے عوام دھوکا کھاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جب ان کو شمس العلماء کا خطاب دیا ہے تو یہ بہت ہی بڑا عالم ہوگا۔ وہ ان کی تحقیقات کو علمی اور شرعی تحقیقات سمجھتے ہیں حالانکہ علم دین اور شریعت سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا۔ غالب حالت اہل خطاب کی یہی ہے۔ شاذ و نادر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کو بدون درخواست کے خطاب مل جاتا ہے اور وہ واقع میں ان خطاب کا اہل ہوتا ہے، ورنہ عام حالت یہی ہے کہ یہ خطاب اکثر نااہلوں کو ملتا ہے اور ان کی درخواست اور کوشش کے بعد ملتا ہے۔

چنانچہ ایک شمس العلماء نے آج کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھی ہے جس پر ان کی جماعت کو فخر و ناز ہے اور نو تعلیم یافتہ مسلمان حضرات وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک خطاب یافتہ شمس العلماء ہے اس کو بہت شوق سے دیکھتے اور منگاتے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ یہ خطاب ایک جال سے جس میں ناواقفوں کو پھنسا یا جا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

زانکہ صیاد آورد بانگ صغیر تاکہ گیر مرغ را آن مرغ گیر
 میں نے اس سوانح عمری کا صرف ایک مقام اتفاقاً دیکھا
مدح میں قدح ہے میں انہی سے مجھ کو مصنف کے دین کا حال معلوم
 ہو گیا اور انہی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سوانح کیسی
 ہو گی۔ عنوان تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کا اختیار کیا ہے اور حضور صلی
 اللہ علیہ وسلم کا تو نام ہی ایسا ہے کہ سنتے ہی ہر مسلمان جان دینے کو تیار ہو جاتا
 ہے مگر مدح نبوی کے عنوان میں مضمون ایسا لکھا گیا ہے جس سے حضور صلی
 اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو سخت ایذا دی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تھے۔ آپ میں نبوت کے ساتھ سلطنت و
 انتظام کا بھی کمال مادہ تھا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سلطنت کا سلیقہ
 نہ تھا اسی لئے وہ جنگوں میں پھرتے تھے۔ روح علیہ السلام میں ترجم کلم تھا اسی
 واسطے عرق کی دعا فرمائی۔

صاحبو! کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہے کہ دوسرے انبیاء کی
 تحقیر تو دین کی جارہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام سب بھائی بھائی ہیں اور یقیناً
 ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی تحقیر کو گوارا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً و بندگان
 بھائی۔ خصوصاً انبیاء علیہم السلام جو کہ انصافیت سے بالکل مستزاد ہیں وہ ہرگز اپنی
 ایسی مدح سے خوش نہیں ہو سکتے جن میں ان کے دوسرے بھائی کی تنقید کی
 گئی ہو۔

رہا یہ کہ ہم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کہ غلام مدح میں دوسرے حضرات

کی تنقیص ہے۔ سو اس کا معیار یہ ہے کہ ہر بات میں یہ سوچ لیا کر و کہ اگر اس جلسہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام تشریف فرما ہوں تو کیا ہم اس بات کو سب حضرات کے سامنے کہہ سکتے ہیں۔ اس معیار کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا یہ شخص ایسے مجمع میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوں اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی ہوں۔ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات ہیں اور نوح علیہ السلام میں نفوذ باللہ رحمہ کا مادہ نہ تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کو سلیقہ تمدن و سلطنت نہ تھا۔ یقیناً ایسے جلسہ میں اس بات کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ پس لامحالہ تنقیص و توہین انبیاء میں داخل ہے۔

کمالات انبیاء | انہوں اس شخص نے محض اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زمانہ میں سلطنت کا موقع نہیں ملا یہ نتیجہ نکال لیا کہ ان میں اس کا سلیقہ ہی نہ تھا۔ کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع ہوتے ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض بعض سے اکمل ہیں لیکن ناقص ان میں کوئی نہیں۔ کوئی بنی رحم سے خالی نہیں اور نہ کوئی سلیقہ سلطنت سے خالی ہے۔ ہر ایک میں تمام کمالات حسنہ موجود ہیں۔ لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ کے اذن پر ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے ارادہ و اختیار کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ جس کمال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

من چو کلکم در میان اصبعین نیستم در صف طاعت بینین

اور

خستہ از احوال دنیا روز و شب بچوں قلم درینجہ تقلیب رب
 ان کی مثال ایسی ہے جیسے قلم کہ قلم سب کچھ لکھ سکتا ہے مگر کب؟
 جب کہ کوئی دوسرا ہاتھ میں لے کر اس کو چلائے۔ پھر وہ وہی لکھے گا، جو یہ
 شخص لکھنا چاہے گا۔ اگر وہ عربی لکھواتا چاہے تو یہ عربی لکھے گا۔ فارسی لکھواتا
 چاہے تو فارسی لکھے گا۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس قلم سے عربی لکھی گئی
 ہے وہ فارسی نہیں لکھ سکتا یا بالعکس۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ جس کے
 ہاتھ میں قلم تھا اس نے عربی ہی لکھوائی تھی اگر وہ فارسی لکھواتا تو قلم میں اس کی
 بھی قابلیت تھی۔

یوں ہی انبیاء علیہم السلام کو سمجھو کہ ان میں تمام اخلاق حمیدہ و ملکات
 فاضلہ موجود ہیں مگر حق تعالیٰ جس وقت جس ملکہ سے کام لینا چاہتے ہیں اس وقت
 وہ اسی ملکہ سے کام لیتے ہیں۔ اس سے دوسرے ملکات کی نفی پر استدلال
 کرنا اس موترخ کی عقلمندی ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اب تک
 حق تعالیٰ نے انتظام سلطنت کا کام نہیں لیا۔ اس لئے یہ ملکہ ظاہر نہیں ہوا لیکن
 جس وقت وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے اور بہت بڑی سلطنت کریں گے
 جس کی مدد و ثنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس وقت
 معلوم ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں سلطنت کا سلیقہ ایسا ہے کہ کوئی بادشاہت
 بھی ان جیسی نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ انتظام سلطنت و تمدن کا سلیقہ ان میں اس

وقت بھی بدرجہ اتم موجود تھا مگر ظہور نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرنا نہیں چاہا۔ اخیر زمانہ میں اس کا ظہور ہو جائے گا۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اس وقت یہ ملکہ موجود نہیں تھا تو کیا آسمان میں رہ کر یہ سلیقہ حاصل ہو گیا۔ وہاں تو سارے فرشتے نیک ہی ہیں۔ نہ وہاں کوئی مفسد نہ چور نہ کافر نہ مشرک نہ وہاں ٹیکس کی ضرورت ہے نہ فوج کی نہ محصول لینے کی نہ قواعد حرب سکھانے کی۔ ایسی جگہ رہ کر سلطنت کا طریقہ کیونکر آگیا اور اگر کہو کہ حق تعالیٰ نے سکھلا دیا یا فرشتوں نے بتلادیا تو یہ بات تو ان کو زمین میں رہ کر بھی حاصل تھی۔ کیونکہ وہ بنی الوالعزم ہیں جن کے پاس جبریل علیہ السلام ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ پھر اس مؤرخ نے ان کو سلیقہ تمدن و سلطنت سے کیوں خالی مانا۔

اب بتلائیے اس سوانح عمری کا پڑھنا اور دیکھنا اور خریدنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ نص میں صاف حکم موجود ہے۔

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُکْفَرُ بِهَا وَیَسْتَهْزِءُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا
مَعَهُمْ حَتّٰی یَخْرُجُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غٰیْرِہٖ اِنَّکُمْ اِذَا مِثْلُہُمْ
اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَہَنَّمَ جَمِیْعًا۔

جب کسی محفل میں یا کسی جگہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر انکار ہوتے

ہوئے یا ہنسی مذاق ہوتے ہوئے سنو تو نہ بیٹھو ایسے لوگوں

کے ساتھ یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوں را اگر ایسا

نہ کر وگے، تو تم بھی انہی جیسے ہو گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ منافقوں

اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ اکٹھا فرمائے گا۔
 یعنی جب آیات اللہ و احکام الہیہ کے ساتھ کفر و استہزاء ہو رہا ہو
 تو تم وہاں نہ بیٹھو جب تک یہ بیہودہ گفتگو ختم ہو کر دوسری بات شروع نہ ہو
 اگر تم کفر و استہزاء کی باتوں کو سنو گے تو تم بھی اپنی جگہ کے مثل ہو گے جو کفر و
 استہزاء کے مرتکب ہیں اور یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو ان باتوں کے
 بند کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ اور جس کو قدرت ہو اس کے لئے یہ حکم
 ہے کہ ان لوگوں کا منہ بند کر دے اور ایسی کتابوں کی اشاعت روک دے
 ان کو ضبط کر کے ضائع کر دے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہم کسی کا منہ بند نہیں کر
 سکتے نہ کسی کتاب کو ضبط کر کے ضائع کر سکتے ہیں۔ یہ کام حکومت کا
 ہے۔ واقعی حکومت بھی عجیب چیز ہے۔ ہمارے مولانا کا ارشاد ہے۔

الْوَعْدُ يَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحُكْمِ

وَالشَّيْءُ أَنْ يُلَاحِظَ عَلَى الْقِمَّةِ

حقیقت میں سب سے بڑا واعظ ہے مگر جب یہ نہیں تو اب
 وہی حکم ہے کہ ایسی باتوں کو سنو ہی نہیں اور جن کتابوں میں ایسی خرافات
 ہوں ان کو دیکھو نہیں نہ خریدو نہ ان کی اشاعت کرو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل حالت یہ ہے کہ طالبوں کو عہد سے اور
 خطاب دیئے جاتے ہیں۔ اس پر گفتگو طویل ہو گئی اور شریعت کا قانون یہ
 ہے کہ جو شخص عہدہ کا طالب ہو اس کو ہرگز مرتد و ویکو نہ وہ خود غرض
 ہو گا۔ نذ کا پیور کی جامع مسجد میں اول تو یہی کام سب سے قاعدہ ہوا کہ طالب کو

امامت دی گئی مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بزرگ طالب امامت ہونے کی وجہ سے بزرگ نہ رہے۔ نہیں وہ واقعی بزرگ تھے۔

بزرگوں کی قسمیں | مگر بزرگ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کامل نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حضرات بھولے نہیں

ہوتے بلکہ ہوشیار ہوتے ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام سب ہوشیار تھے۔ کوئی نئی بھولے نہیں ہوئے۔ انبیاء علیہم السلام کا عقل انکس ہونا کفار کو بھی مسلم ہے بلکہ وہ ہم سے زیادہ انبیاء کی عقل کے معتقد ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے جو کچھ کار نمایاں ہوئے ہم تو ان کو خدا تعالیٰ کا کیا ہوا سمجھتے ہیں اور مخالف سارا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سمجھتا ہے اور سب کارناموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و تدبیر کا نتیجہ بتلاتا ہے۔ تو وہ ہم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و دانشمندی کا معتقد ہے۔ ہم تو قرآن کو جو عقول کو حیران کرنے والا کلام ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور مخالف اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف بتلاتا ہے۔ تو بتلائیے وہ ہم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کا معتقد ہے یا نہیں؟

ایک بزرگ وہ ہیں جو مقام نبوت کے وارث نہیں بلکہ مقام ولایت کے وارث ہیں۔ ان میں بعض بھولے ہوتے ہیں بعض محذوب بھی ہوتے ہیں۔ گو وہ بزرگ بھولے تھے۔ انہوں نے سادگی کے طور پر امامت کی درخواست کی تھی۔ تکبر اس کا نشانہ تھا اور گرجی سخت پڑ رہی تھی اور بزرگ صاحب نے سورہ قس کی تلاوت نماز میں شروع کر دی۔ پھر بعض لوگ تو ایسی روانی سے

پڑھتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دریا بہتا ہوا جاری ہے۔ ایسے شخص کی طویل قرأت بھی گراں نہیں ہوتی بلکہ لذیذ ہوتی ہے مگر بزرگ صاحب نے ایسی تزیین کی کہ لفظ لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بعض کوفے ہو گئی۔ کسی کو چکر آ گیا۔ اور ایک آدمی کا عجیب قصہ یہ ہوا کہ وہ نیا نمازی تھا اس کو بعض لوگ گھیر گھار کر نماز کے لئے لائے تھے۔ جب بزرگ صاحب نے سورہ قے شروع کی اور کھڑے کھڑے دیر ہو گئی تو وہ نیت توڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اسی واسطے تو ہم نماز نہیں پڑھتے۔

تو جیسے یہ نیا نمازی ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ کر سب کو اُٹھنی پر قیاس کر کے نماز ہی سے ڈر گیا اسی طرح ہمارے بھائی کھال کھسوٹوں کے بیانات چندہ کے متعلق سن کر سب سے ڈر گئے۔ ادواب وہ کسی کی زبان سے الفاظِ حق کا مضمون سننا نہیں چاہتے اور واقعی بن و اطفالوں سے ان کا پالا پڑتا ہے ان کا بیان ہے ہی ڈرنے کے قابل۔ یہ لوگ اس بڑی طرح سے مسلمانوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ سامعین کو خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک جلسہ میں ایک مولوی صاحب نے چندہ کے لئے بڑی کوشش اور تقصیر میں بہت ہی زور لگایا مگر کسی نے کچھ بھی نہ دیا۔ تو مولانا کیا کہتے ہیں کہ افسوس علماء کی قدر زندگی کے برابر بھی نہیں۔ اگر اتنی دیر کوئی زندگی ناپتی گاتی تو اس کے اوپر ہزاروں روپیہ شمار کیا جاتا۔

اے! بھلا خود تو کیجئے۔ کیا یہ مضمون تہذیب سے خارج نہ تھا۔ کیا اس میں اس شخص نے علماء کو اور مسلمانوں کو ذلیل نہیں کیا۔ اب ایسے بیانات سن کر عوام

پتے سے کھولتے ہیں۔

يَسْأَلُكُمْ هَا فِيمَنْ كُمْ تَبْخُلُونَ
 کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے
 مال مانگنے لگیں پھر اصرار کے ساتھ
 مانگیں تو تم بخل کرنے لگو۔ اور (اُس وقت) اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری
 ظاہر کر دے پس اس سے بے فکر رہو۔

اللہ تعالیٰ تم سے تمہارا مال زور ڈال کر نہیں مانگتے اور صدقات واجبہ کی
 مقدار اتنی قلیل ہے کہ اُن میں ناگواری کا احتمال ہی نہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے
 هَا أَنْتُمْ هُمْ لَا عَزْوَكَمْ لَتَنْفَعُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فِيمَنْ كُمْ مِنْ
 يَبْخُلُ۔

تمہاری تو یہ حالت ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے
 لئے بلا جا جاتا ہے سو اس پر بھی بعضے تم میں سے بخل کرتے ہیں
 یعنی تم سے لپٹ کر سوال نہیں کیا جاتا۔ صرف ترغیب دی جاتی ہے جس کا نفع
 تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ شریعت نے جس مصارف میں صرف کی
 ترغیب دی ہے اُن کے معلوم ہونے کے بعد اس کا یقین ہو جائے گا کہ آخرت
 کا نفع تو جاریہ دنیا میں بھی ان مواقع میں صرف کرنا نافع ہے۔ پھر بھی بہت لوگ
 بخل کرتے ہیں۔ اُس کے نہایت استغنا سے فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّهُ مُبْتَخَلٌ مِّنْ
 کہ جو کوئی انفاق فی سبیل اللہ
 سے بخل کرتا ہے وہ (درحقیقت)

خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ یعنی اپنے ہی کو نفع دائمی سے

محروم کرتا ہے خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَانْتُمْ الْفُقَرَاءُ
اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں بلکہ
تم سب اس کے محتاج ہو۔

میں تمہارے بخل کرنے سے یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ خدا کو کچھ
ضرر پہنچے گا بلکہ خود تم کو ہی ضرر پہنچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن مواقع میں صرف
کی ترغیب دی ہے تمہاری ہی مصلحت کے لئے اور تمہارے ہی نفع کے
لئے دی ہے۔

اس میں بخل کرنا ایسا ہے جیسے کسی مریض کو طبیب نسخہ لکھ کر دے اور
کہے کہ یہ چار روپے کا نسخہ ہے۔ چار روپے خرچ کر کے اس کو بنا لو۔ اس پر
مریض کہے کہ میں تو چار روپے خرچ نہ کروں گا۔ تو حکیم کہے گا بھائی میرا کیا
نقصان ہے۔ اگر تم اس میں بخل کرو گے اپنی ہی جان سے بخل کرو گے۔

غرض اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے مال مانگتے
نہیں صرف ترغیب دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک قلیل حصہ کی جو زیادہ نہیں پھر وہ
ترغیب دے کر تم کو لپیٹتے نہیں بلکہ نہایت استغنا سے فرماتے ہیں کہ جو
بخل کرے گا اپنے ہی سے بخل کرے گا۔ اپنے ہی کو دولت ابدیہ سے محروم
کرے گا۔

ایک عجیب سوال و جواب

اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ
نے نعمت آخرت کو اتفاق نال

پر ہی کیوں موقوف کیا۔ مفت ہی دے دیتے۔ وہ تو ایسا بھی کر سکتے تھے۔

جواب یہ ہے کہ نہ

ہر کہ اور زان خرد اور زان وہد گوہرے طفلے فقر ص نال وہد
جو شخص کوئی چیز مفت پالیتا ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ ہم نے ارزاں
خروں کی حکایتیں سنی ہیں کہ ایک شخص پچاس روپیہ کی مثال سے دو روپیہ کا جوتا
صاف کر رہا تھا۔ کسی نے ملامت کی کہ ایسی قیمتی مثال کی تم نے کیسی بے قدری
کی۔ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جوتا تو میرا خریدا ہوا ہے اور مثال میرا اثاثہ میں باپ
کے ترکہ سے ملی ہے۔

ارزاں خر پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک ولایتی سے کسی رئیس نے گھوڑے
کی قیمت سن کر کہا تھا کہ تم بڑے گراں فروش ہو۔ اس نے بے ساختہ جواب
دیا کہ تم بڑے ارزاں خر ہو۔ غرض مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک کتاب طبع
کے لئے عطا فرمائی تھی کہ اس کو چھاپ کر شائع کر دینا۔ پھر فرمایا کہ کسی کو مفت نہ
دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی بلکہ کچھ قیمت رکھ دینا چاہیے دو تین ہی پیسہ ہو
اسی طرح بے شک حق تعالیٰ قادر ہیں کہ آپ کو مفت ہی سب کچھ نعمتیں دیدیں
کہ آپ کو نہ مال خرچ کرنا پڑے نہ محنت کرنا پڑے۔ مگر ان قیود میں یہ حکمت
ہے کہ اس سے نعمت کی قدر ہوتی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ یہ
حکمت تو کھلی ہوئی ہے جس کو ہم جیسے بھی سمجھتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو
واللہ حق تعالیٰ تو اب بھی آپ کو مفت ہی سب نعمتیں عطا فرماتے ہیں کیونکہ
جو نعمتیں انفاق مال کے بعد ملتی ہیں صرف ظاہر میں وہ مفت نہیں معلوم ہوتیں

مگر حقیقت میں مفت ہی ملی ہیں۔ کیونکہ جو مال آپ نے خرچ کیا ہے بتلایا
وہ کہاں سے آیا اور کس نے دیا۔ یقیناً وہ حق تعالیٰ کا مال ہے اور حق تعالیٰ
کا دیا ہوا ہے۔

تذہیر و نقد ہیر | اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوا
اسے جیسا کہ قارون نے کہا تھا۔ قال انما اوتیتہ
علی علم عندی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کہیں
کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا
و طالب علم بی سارے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب
طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں
پاس ہو گا مگر نتیجہ امتحان میں اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیل ہو جاتا
اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہو جاتا ہے۔ بتلایا عمر و کی تدبیر
کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا۔ اگر تدبیر بر ہی مدار تھا
تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیے تھا۔ مگر مشاہدہ بار بار اس کے خلاف ہوتا ہے
اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے دوسرا
بیوقوف اور جاہل ہے۔ تدبیر کا مقتضایہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف
سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بار بار اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت
بڑھ جاتی اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔
اسی طرح آپ غور کریں گے تو ذرا سخت اور ملازمت وغیرہ تمام امور
میں ایسی صد ہا نظر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر

کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوا
خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہوتا کون نہیں سچا ہوتا۔ پھر
سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہوا کرتے ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہد
یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس تیس کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام
ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں،
تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہئے کہ تدبیر وہ لوگ بھی کر رہے
تھے جو ناکام ہوئے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے
یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقدین ورنہ مسلمان تو
سب کے سب ہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر مؤثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست
ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت کی بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الہیہ ہی کا
نام ہے۔

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی
پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس
ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال
کیوں لگا۔ اگر تمہارے قبضہ میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں یہ ایجاد کر لی ہوتی
اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک
منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے قبضہ میں ہے پھر تدبیر کی کیا
وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضہ میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے
ایجاد کر لے بلکہ زمانہ و راز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے اب

بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی ہے یا بلا اختیار خود بخود دل میں آگئی۔ اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آئی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا یقیناً کہو گے کہ دفعۃً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے میں یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے۔ کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔ بہر حال یہ کسی کام نہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدبیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر ماننا پڑے گا۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ تمہارے کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں حقوڑا نہ صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں۔ یقیناً مفت ملی۔

حسرت کی کنجی

مگر انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی ناتمام تدبیر کے بعد جو کچھ اُسے ملتا ہے یہ اس کو اپنا مال سمجھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی علامہ ابراہیم کے جذبہ کی رعایت فرمائی ہے کہ اس کے مال کو اسی کا مال کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم تم سے تمہارے مال نہیں مانگتے ہاں اللہ کے راستہ میں جس نے تم کو یہ مال دیا ہے کچھ خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس کا نفع تم ہی کو ملے گا۔ مگر انسان کا اس سے بھی دل دکھتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ یہ حکم بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا تا کہ دل بھی نہ دکھتا تو یہ نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ ہم نے ہی تم کو دیا ہے اور

ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ بدولت تمہارا مال دکھائے جنت دے دیں مگر ایسا نہ ہوگا۔
 أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا
 يُفْتَنُونَ -

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کر کے چھوٹ جائیں گے کہ ہم تو ایمان
 لے آئے ہم اور ان کے اعمال کی آزمائش نہ ہوگی۔
 کیا تمہارا امتحان بھی نہ کیا جائے۔ تم کو آزمایا بھی نہ جائے۔ یاد رکھو مال ہمارا ہی
 ہے مگر تم اپنے ہاتھ سے دو بھی جنت ملے گی۔

حضرت غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا
 حق تعالیٰ نے جنت پر قفل تو لگا رکھا ہے مگر قفل کے اندر کنجی بھی موجود ہے۔
 بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ کنجی کو گھما دیں قفل کھل جاوے گا۔ پھر سب نعمتیں
 ہمارے ہی واسطے ہیں یعنی حق تعالیٰ نے جن کاموں پر جنت کو موقوف کیا ہے
 ان کے اسباب بھی سب ہم کو خود ہی عطا فرما دیئے۔ مال خرچ کر سنے پر بعض
 نعمتیں موقوف ہیں تو مال ہم کو خود ہی دیا۔ نماز پڑھنے پر بعض نعمتیں موقوف ہیں تو ہاتھ
 پیر زبان اور ارادہ و اختیار ہم کو عطا کر دیا اور اس کے بعد دل میں داعیہ بھی خود ہی
 پیدا کر دیا۔ بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اس داعیہ کا اتباع کریں مخالفت نہ کریں
 اب بتلائیے میرا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں کہ قفل تو ہے مگر قفل کے اندر کنجی بھی لگ
 رہی ہے۔ صرف گھمانے کی دیر ہے۔ اگر کوئی اتنا بھی نہ کرے تو وہ نہایت
 کام چور ہے۔

مُصِیبت و راحت

اس پر مجھے ایک کام چور کی حکایت یاد آئی وہ ایک بزرگ کے پاس رہتا تھا اور پول چاہتا تھا کہ میرا کام صرف توجہ و تصرف سے بن جائے کچھ کرنا نہ پڑے۔ شیخ نے بہت سمجھایا کہ کچھ کام کر اور تصرف کے بھروسہ پر رہنے سے منع فرماتے تھے کہ اس کو یہ وسوسہ ہو گیا کہ شیخ صاحب تصرف نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا بھی ہو تو کچھ نقص نہیں۔ مگر چونکہ وہ صاحب تصرف بھی تھے اس لئے انہوں نے اس خطرہ کو دفع کرنا چاہا۔ ایک روز مسجد کے دروازہ پر ایک مشکہ میں پانی بھر کر اور ایک بھکاری لے کر بیٹھ گئے اور راہگیروں پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جس پر پانی پڑتا تھا وہ بے اختیار کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔ سینکڑوں کافروں نے کلمہ پڑھ لیا۔ پھر اُن مرید کو بلا کر فرمایا کہ تصرف تو اللہ تعالیٰ نے ایسا دیا ہے مگر تجھ کو چکی ہی پسوا کر دوں گا۔ تجھے بدوں محنت کے مزدوں گا۔ تو ابتدا ہی سے کندھے سے جوا ڈال کر پہننا چاہتا ہے۔ اسے غوراً بہت خود بھی تو کچھ کیا ہوتا اس کے بعد ہی شیخ کامل کے کمال پر بھروسہ کرنا یہ کیا کہ شروع ہی سے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے۔

تو یاد رکھو جو شخص کچھ غوراً بہت کام کرتا ہے اُن کو تو اللہ تعالیٰ مفت بھی دولت دے دیتے ہیں باقی کام چوروں کو مفت نہیں ملا کرتی۔ *وَاللّٰهُ اَعْلَمُ*

ایک دفعہ مجھے بھی اس خیال نے ستایا تھا۔ طریق میں سے مجھے ایک الجھن پیش آئی۔ اس وقت خیال ہوا کہ ہم میں طلب بھی ہے گونا نقص بھی اور حق تعالیٰ کو ہماری طلب کا علم بھی ہے۔ اور وہ طلب ناقص کے بھی قدر دان ہیں

اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی کامل ہے اور قدرت بھی کاملہ ہے۔ وہ جلدی بھی طلب کا کام بنا سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ جلدی سے حاصل نہیں کر دیتے۔ اس خطرہ کا جواب میرے ذہن میں کچھ نہ آیا تو میں نے بسم اللہ کر کے مثنوی کھولی میں اس کا معتقد نہیں کہ مولانا کی روح اُتی ہے اور وہ تصرف کرتی ہے بلکہ صرف یہ خیال ہے کہ مثنوی ایک مقبول بندہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں تسلی کی بات ہم کو بتلا دیتے ہیں۔ چنانچہ بسم اللہ کر کے جو مثنوی کھولی تو یہ اشعار نکلے جو بعینہ میرے سوال کا جواب تھے۔

چارہ می جوید پے من درد تو

اس میں طلب کو تسلیم کیا گیا ہے۔

می شنیدم دوش آو سرد تو

اس میں طلب کے علم کا ذکر ہے۔

خی تو انم ہم کہ بے این انتظار رہنمایم وادہم راہ گزار

اس میں قدرت کا بیان ہے کہ غم کو بدول انتظار کے بھی مقصود تک

جلدی ہی پہنچا سکتے ہیں۔

تا ازیں طوفان و دریاں وارہی بر سر گنج و صالم پاہنی

تاکہ غم پریشانی سے محفوظ رہو اور راحت کے ساتھ پہنچ جاؤ۔ پھر ہم غم

کو انتظار میں کیوں ڈالتے ہیں اور جلدی کیوں نہیں پہنچاتے۔ اس کی وجہ سنو۔

لیک شیرینی و لذات مقرر ہست بر اندازہ رنج سفر

انگہ از فرزند و خویشاں بر خوری کہ عزیزی رنج و محنت با بری

کہ منزل پہ پہنچ کر لذت اور شہوتی اپنی قرار گاہ کی اسی قدر حاصل ہوتی ہے جتنی سفر میں تکلیف پیش آتی ہے۔ جس کو سفر میں جتنی مشقت ہو گی۔ منزل پہ پہنچ کر اتنی ہی راحت ہو گی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ہے

ہر کہ اوارزاں خرد اوارزاں دید گوہرے طغیے بقرص ناں دید

جواب کا حاصل یہ تھا کہ سارے مفدمات تو تمہارے ذہن میں آگئے مگر یہ مقدمہ ذہن میں نہ آیا کہ اللہ تعالیٰ احکیم بھی ہیں۔ حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ انسان کے بعد دولت دی جائے جلدی نہ دی جائے تاکہ مصیبت کے بعد راحت کی قدر ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم بارات میں کیرا نہ گئے تھے۔ راستہ میں لوٹتے ہوئے بادش زور سے ہونے لگی۔ تمام جنگل پانی سے بھر گیا۔ رات ہو گئی۔ سخت پریشانی ہوئی۔ بس اس وقت یہ شعر ہماری حالت کا ترجمان تھا

شب تاریک و بیم موج گرد و آبے چنین سائل
کجا داند حال ماسک ساران ساحل ما

اور یہ حالت ہے۔

اَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ
اَمَّا بَعْضُهُمْ فِيْ اِذَا نَزَلَ مِنْ الصَّوْاِغِ حَذَرَ الْمَوْتِ طَوَّالِہٖ
مُحِيطٌ بِاَنْكَافِہِمْ طَبَاۡلُ الْبَرْقِ يَخْطَفُ اَبْصَارَہُمْ كُلَّمَا
اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْہِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا۔

مگر بہت دور نہ تھا۔ صرف چار پانچ کوس رہ گیا تھا مگر اس مصیبت کی

وجہ سے وہ چارہ کوس طے ہونا مشکل ہو گئے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے جب گھر پہنچے تو گھر پر پہنچنے کی لذت مجھے اب تک یاد ہے کہ اس وقت کیسی راحت اور چین حاصل ہوئی تھی۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

ہنگامہ از فرزند و خویشاں بر خوری کز غریبی رنج و محنت مابری
تو جس کو سلوک میں جتنی زیادہ پریشانی ہوگی اتنی ہی وصول کے بعد اس کو راحت ہوگی اور اس نعمت کی بڑی قدر کرے گا۔ اسی طرح جس کو دنیا میں زیادہ کلفت ہوگی۔ آخرت میں اتنی ہی راحت اور جنت کی قدر ہوگی۔

میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضرت جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور جنت پھر بھی خالی رہے گی اور حق تعالیٰ سے وہ عرض کرے گی کہ مجھے بھر بیٹھے کیونکہ آپ نے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا تو حق تعالیٰ جنت کو بھرنے کے لئے اسی وقت ایک نئی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تو یہ سنے لوگ بہت اچھے ہوں گے کہ ان کو مفت جنت مل گئی۔ فرمایا کیا اچھے ہوں گے ان کو جنت سے خاک بھی لذت نہ ہوگی۔ وہ تو سمجھیں گے کہ زندہ ہو کر یوں ہی چین ہونا ہوگا جیسا جنت میں ہو رہا ہے۔ اچھے انشاء اللہ تعالیٰ ہم ہوں گے کہ جنت میں دنیا کی تکالیف بھیل کر پہنچیں گے۔ ہم کو جنت کی نعمتوں سے زیادہ حلائے گا کہ وہاں قدم رکھنے ہی بے ساختہ زبان سے نکلے گا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ
الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نُصَبٌ

وَلَا يَمَسُّنَّهَا لُغُوبٌ -

دبیزیم کو مجاہدہ اور طاعات دنیویہ کی وجہ سے قرب حق اور معرفت بھی ان سے زیادہ ہوگی۔ آپس جن لوگوں کو دنیا میں زیادہ سامان عیش نہیں دیا گیا وہ پریشان نہ ہوں بلکہ خوش ہوں کہ ان کو امرائے زیادہ جنت میں راحت ہوگی۔

زیادت مال کے اثرات

دوسرے یہ کہ زیادہ سامان تم کو دے دیا جاتا تو تم دنیا ہی کے پورے ہتھے

خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے۔ آج کل مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے دوسری قوموں کے سامان عیش کو دیکھ کر مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے۔ اگر ہم کو زیادہ مال دیا جاتا تو راست دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے۔ آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلہ رومال سے ٹھک کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ اس کو سونا بنا دے۔ غلط میں کسی مولوی سے سُن گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ وہ ظالم یہ دعا کرنے بیٹھے۔ صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلہ کا ڈھیلہ ہی تھا۔ بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں قبول نہ ہوئی۔ ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں۔ وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندہ کے لئے مصلحت ہو خدا کا شکر کرو کہ یہ سونا نہ بنا ورنہ تم آپس ہی میں مرکٹ جاتے۔

واقعی سچ کہا بعض لوگوں کے لئے یہی حکمت ہے کہ ان کو سامان عیش

زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شاید ان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں اور اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کریں، تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اسی وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد بھی باقی رہیں گی یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

حضرات صحابہ سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی جب میرے بعد مالک و بلا و مفتوح ہوں گے اور تمہارے پاس کثرت سے مال و متاع اور غلام و خادم ہوں گے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔ تَتَفَرَّغُوا لِّلْعِبَادَةِ وَ لَکِنِّیْ الْمَوْتُ نَفَہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آج کل ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے لئے زیادت مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ تنقی کی اور دنیا میں منہمک نہیں ہوئے پھر ہمارے لئے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔ بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹیکانا چاہئے۔ اُولَئِکَ مَجِئَتْ لَهُمْ طَیِّبَاتٌ مِّنْ فِیْ حَیٰوِہُمْ اَللّٰہُ یَا۔ ان کو سب راحت یہیں سے دی گئی۔ اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے

بہن مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنا چاہیے کہ پیٹ بھر کے روٹی مل جائے اور
متر عورت کے لئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان اور اتنا بھلا اللہ اکثر مسلمانوں
کو آج کل حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہ کو اتنا
بھی سامان میسر نہ تھا۔ ہم لوگ تو اس زمانہ کے اعتبار سے آج کل بادشاہ ہیں
کیونکہ حدیث میں ہے۔

اَقْبَبِم مَعَانِي فِيْ جَسَدِيْ اِمْنَانِيْ سُرِّيْهِ عِنْدَ قُوْتِ يَوْمِهِ
فَكَانَ مَا حِزْتُ لِيْهِ الدُّنْيَا بِحَذِّ اَقْبِيْوْهَا۔

کہ جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں
بے فکری۔ ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔

جب صحت و اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھوٹیں موجود ہو، تو
یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھوٹیں آگئی۔ اگلے دن کی فکری نہ کرو۔ ج
متریں اذہ بلائے کہ شب درمیانست

جس مصیبت کے درمیان میں رات حائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو جب
کل ہوگی دیکھا جائے گا۔ کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں۔ ایک بزرگ امی کو
فرماتے ہیں۔

چوں ترانانے و خرقانے بود ہر آن موئے تو سلبا سنے بود

غرض حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بعض لوگوں کو غریب رکھتے ہیں۔ اس

کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا۔ ایسے شخص کو ثواب دینے کے
لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کے لئے یہ نیت ہی رحمت

عالیہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ کرتا
حق تعالیٰ کے یہاں عجیب دربار ہے۔ وہاں کچھ اتفاق ہی پر مدار نہیں، غریب
کے حق میں نیت اتفاق بھی بمنزلہ اتفاق کے ہے۔ خود نص میں ارشاد ہے۔

قَوْلُ مَعْرُوفٍ وَمَنْفُورَةٍ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَرَىٰ
وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ۔

نرم جواب دینا اور ورگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے
دینے کے پیچھے ستانا ہو اور اللہ تعالیٰ مستغنی اور عقل والا ہے۔

پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے۔
لَا خَيْلَ عِنْدَكَ تَهْدِيهَا وَلَا مَالٌ
فَلْيَسْعِدِ الْمُتَطَلِّعَ إِنْ لَمْ يَتَعَدِ الْحَالُ

اور جس کو خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت کے موافق خرچ کر کے خدا
تعالیٰ کو راضی کرے۔

اس میں واعظین و علماء بھی داخل ہیں ان کو بھی خرچ کرنا
چاہئے۔ اگر زیادہ نہیں کر سکتے تو کچھ تو کریں۔ علماء کا

علماء کی کوتاہی

اکثر طبقہ اس میں بہت کوتاہی کرتا ہے۔ سارا امر بالمعروف اپنی ہی بچت کے
واسطے ان کو سو جھٹتا ہے۔ خود خرچ کرنا بہت کم جانتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ
کہ اپنے بھائی کی روٹی بچائیں اور اپنے پاس سے خرچ کریں اور جب کسی
کام کے لئے چندہ کی تحریک کریں تو سب سے پہلے خود بھی چندہ دیا کریں
یہ صورت اچھی نہیں کہ دوسروں ہی کو ترغیب دی جائے اور اپنے گھر سے

کچھ نہ نکالا جائے۔ اس صورت میں اثر بھی نہیں ہوتا اور لوگ متوحش ہوتے ہیں۔ اگر تم بھی خرچ کیا کرو تو لوگوں کو وحشت نہ ہوگی۔ اب تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چندہ کے سارے وعظ کا حاصل یہ ہے کہ مولوی اپنی بچت کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اگر علماء یہ کہیں کہ ہمارے پاس کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ کے مدرسہ میں جو مزدور و آنہ مہینہ دیتا ہے تم اس سے کم نہیں ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم دو آنے بھی نہ دو۔

ماموں رشید کے پاس ایک شخص سوال کرنے آیا۔ ماموں نے کہا کہ بیٹے کئے مضبوط آدمی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں ماموں رشید کے پاس فتویٰ لینے نہیں آیا۔ فتویٰ دینے والے بہت ہیں۔ میں آپ کو بادشاہ سمجھ کر آیا ہوں۔ اگر دینا ہو تو دے دو ورنہ صاف جواب دے دو۔ ماموں رشید نے اس کو بہت سا روپیہ دیا۔ اُس کے اخلاق بہت اچھے تھے۔ رعایا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا تھا جیسا ماموں بھانجہ کے ساتھ کرتا ہے مگر عقائد اچھے نہ تھے۔

میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ جب امر بالمعروف سے اپنی بچت مقصود ہو تو اس کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ پس علماء کو خود بھی خرچ کرنا چاہیے تاکہ عوام کا یہ خیال دور ہو جائے کہ مولوی اپنی بچت کے لئے ہم سے چندے وصول کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ چندہ میں استغناء کے ساتھ تحریک کرتا چاہیے۔ لگنا پٹنا نہیں چاہیے۔ صاف کہہ دو لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا۔ جیسا کہ انبیاء

علیہم السلام کا طریقہ تھا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَمْ كَسَبْتُمْ مَرْحُومًا مَّا جَاءَكُمْ مِنْكُمْ خَيْرٌ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ

کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے جو کفار اعراض

کرتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ آپ ان سے چندہ مانگتے ہیں

تو یہ وجہ تو ہرگز نہیں، کیونکہ خدا کی عطا سب سے بہتر ہے اور

وہ سب سے بڑھ کر روزی دینے والا ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے چندہ مانگنے کی کیا ضرورت

ہے، اس سے معلوم ہوا کہ چندہ مانگنا مخاطبین کی وحشت کا سبب ہوتا ہے

پس تم لگ بپٹ کہ ہرگز تحریک نہ کرو۔ ہاں استغناء کے ساتھ ترغیب دو۔

جیسا قرآن وحدیث میں ترغیب دی گئی ہے۔ پس صاحبو! شریعت کے حکم

انفاق سے آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ سے کوئی مانگتا نہیں ہے۔ ہاں خرچ

کرنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ اگر نیک کام میں اپنے نفع کے لئے خرچ

کرنا چاہو تو اس کی یہ صورت ہے۔ آگے تمہیں اختیار ہے اور یہ بھی تمہاری

مصلحت کے واسطے طریقہ بتلایا گیا ہے۔

حفاظتِ دین کا انتظام اور خدا تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت

کے واسطے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔

وَإِنْ تَنَوُّوا يَسْتَخْلِفْكُمْ مِّنْ أَمْوَالِكُمْ لَا يُغْنِيكُمْ عَنْهَا وَاللَّهُ غَافِلٌ عَنِ الْغَافِلِينَ

اَمْثَا لَكُمْ۔

اگر تم (دین کے واسطے خرچ کرنے سے) روگردانی کرو گے تو

اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم کو پیدا کر دیں ان کے ہوتے ہی ہر طرح
بجیل نہ ہوگی۔

بلکہ جان و مال سے خدا کے دین پر قربان ہوگی۔ دیکھئے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک یہ دین محفوظ چلا آ رہا ہے۔ کیا آپ کے ہی
تہان گاڑی چل رہی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہی قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ جس قوم نے
دین کی خدمت سے پہلو ہٹا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ دوسری قوم پیدا کر دی
صاحبو! مجھے اس کی شکایت نہیں کہ مسلمان چندہ نہیں دیتے یا کم دیتے ہیں
بلکہ اصل شکایت یہ ہے کہ دین پر توجہ نہیں۔ آپ چاہے کچھ بھی خرچ نہ کریں
لیکن اپنی حالت کی اصلاح کر کے دین پر توجہ کریں اور توجہ کا طریقہ یہ ہے
کہ قلوب کو یکجا کریں۔ سب مل کر دین کی حفاظت کا اہتمام کریں۔ اجتماع میں
برکت اور طاقت ہے۔

وودل یک شوند لشکرت کوہ را

جب توجہ کرو گے تو احکام دین پر عمل بھی کرو گے۔ پھر عمل کے لئے
جن چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کا بھی سامان ہو جائے گا۔ ہم کو دوسری
قوموں کی تقلید کی ضرورت نہیں کہ جس طرح وہ ترقی کر رہی ہیں اسی طرح ہم
بھی ترقی کریں۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ مسلمان بھوکے ہیں۔ ان کے گھر
میں ترقی کے ذرائع موجود نہیں دوسروں سے مانگتے پھرتے ہیں۔ صاحبو! ہم کو
واللہ اپنے گھر کی دولت کی خبر نہیں اس لئے ہماری یہ حالت ہے۔
یک سید پر نمان ترا بر قرق سمر۔ تو بھی جوئی لب نمان و در بدر۔

نابہ زانوی میاں فخر آب و زعش و زجور گشتی خراب

ہمارے گھر میں ترقی کے وہ ذرائع موجود ہیں جن کے سامنے تمام عالم گردن جھکا چکا ہے۔ پھر ہم دوسروں سے بھیک کیوں مانگیں اور وہ ذریعہ ہی ہے کہ اجتماعی حالت کے ساتھ سب اپنے دین پر توجہ کریں۔ اور دین کی پابندی کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مولوی بن جاؤ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دین سے باخبر بن جاؤ۔ کچھ تو پڑھ لکھ کر باخبر بنیں اور باقی لوگ علماء کی صحبت اختیار کریں اور ان سے مل کر دین کے احکام معلوم کریں۔ مگر صحبت انی علماء کی اختیار کرو جن کے یہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ زیادہ رہتا ہو نہ کہ دنیا کا۔ اور اس کے منتظر نہ رہو کہ علماء خود تمہارے گھر آکر وعظ کیا کریں بلکہ تم خود ان سے جا کر ملو اور دین کی باتیں دریافت کرو۔ اس طرح کر کے دیکھو۔ انشاء اللہ تم کو ترقی حاصل ہو جائے گی اور غرق قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھایا ہے۔

سادگی اور عزت | حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے شکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت

المقدس فتح نہیں ہوتا اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا علیہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں گے۔ اگر ان کا وہی علیہ ہوا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بدوین لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین

یہاں تشریف لے آئیں۔ شاید یہ قلعہ بدولن لڑائی کے فتح ہو جائے۔ امیر المومنین نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا۔ اب غور فرمائیے کہ یہ ایک ایسے شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسری و ہرقل بھی خیراتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ جس قبیل میں آپ نے سفر کیا ہے اس میں چند در چند بیوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام۔ آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورہ میں بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم کے دورہ میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورہ میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کے لئے رصدا کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستوا اور ایک تھیلے میں چھوار سے بندھے ہوئے تھے۔ منزل پر اتار کر ستوا گھول کر پی لئے اور چھوار سے کھا لئے۔ نہ رعایا سے مرغے لئے نہ انڈے نہ دودھ لیا نہ گھی۔

جب آپ اس شان سے کبھی سوار اور کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپ نے ممانعت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قبیل اتار کر دوسرا قبیلہ عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔

تاکہ ان کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
 عَجْزٌ قَوْمٌ اَعَزُّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے
 اسلام سے عزت دی ہے۔

ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت
 ہے مگر صحابہ کرام اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخواست منظور
 کر لی۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیض لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے
 دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا کہ میرے
 دوستو! تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا۔ واللہ! میں دیکھتا ہوں
 کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے۔ تم میرا وہی پیوند لگا
 قمیض اور اونٹ لے آؤ۔ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا
 اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے تو کیا
 ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے لے کر
 غافل کیوں ہیں اور ہم کو کس چیز نے مفلج کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس
 مضر نہیں۔ اودیہ جو حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ عَجْزٌ قَوْمٌ اَعَزُّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ واقعی بات یہی
 ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں
 ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی۔

ز عشق تا تمام ما جمال یار مستغنی ست

بآب رنگ خال و خط یہ حاجت روئے نیازا

نوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی حاجت نہیں وہ تو ہر لباس میں

حسین ہے۔ بناوٹ کی اختیاج اس کو ہے جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو چنانچہ حضرت عمرؓ اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور اسی سواری پر آپ کو دیکھ کر نصاریٰ نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفہ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب کھول کر حضرت عمرؓ کے حلیہ کو ان اوصاف سے ملائے لگا جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ ایسے لباس اور ایسی سواری پر تشریف لائیں گے۔ اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔ ع

کہ آپ چشمہ جیواں درون تاریکی ست
اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چیخ مار کر گر پڑا اور کہا جلدی سے قلعہ کھول دو۔ رنجدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراۃ میں سدید ہے، یہی فاتح بیت المقدس ہے۔ غم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ و جدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔ تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری عزت تو سادگی ہی میں ہے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج
سادی کی جینڈ مثالیں | مراد آبادی اسی زمانہ میں ایک بزرگ

ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹنگ گورنر نے ملنے کی اجازت چاہی۔ یہاں سے اجازت ہو گئی۔ اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹنگ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوبی کو سی پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چونکہ لفٹنگ گورنر اس وقت یہاں ہو کر آرہے تھے اور یہاں کی ملاقات اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لفٹنگ گورنر کس دن آئیں گے۔ چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنگ گورنر حضرت کی خاتقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنگ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرمایا جائے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خدام سے فرمایا کہ اسے دیکھنا مٹھائی کی ہینڈیا میں کچھ ہوا تو ان کو دے دے۔ یہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ ہینڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دیا گیا۔ جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے کہ مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال نہ تھا مگر آخر میں یہ سب منصوبے مٹ گئے اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی پٹی باد صبا کی بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی

غرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے۔ اگر کسی مہمان کی خاطر ہے
کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے۔ مبالغہ
نہ کیا جائے۔ اسی میں ہماری عزت ہے مگر آج کل مسلمان تعلید یورپ میں اپنی
عزت سمجھتے ہیں۔ اُن کا لباس، اُن کا طرز معاشرت، اُن کا طریقہ تمدن و تجارت
اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی اس میں عزت
نہیں ہے۔

ایک بار میں بریگی میں تھا۔ بھائی سے جنت نے کہا کہ ہم آپ کے
بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا ہم خود تو
حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا مناسب بھی
نہیں، ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے۔ میں سیولنگ
بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں
جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں اُسی میں جاؤں گا۔ چنانچہ میں اچکن اور کرتہ میں اُن
سے ملنے گیا۔ وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ عصر کی
نماز کا وقت آگیا اور میں نے اور بھائی نے اُن کے بنگلہ ہی پر نماز پڑھی۔ پھر وہ
اُگرے لے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بٹھلایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے۔
میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں اور
مختصری دیر میں رخصت ہو کر آ گئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انکی بڑی
لباس میں اُس سے ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔
کلکتہ میں مولوی عبد الجبار صاحب دالسر ہے جسے عبا اور چوغہ پہن

کیا اور عامہ باندھ کر ملے۔ دوسرے روٹیاں انگریزی لباس میں لگے تھے تو وائس رے نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شہزادہ معلوم ہوتے ہیں یہ لباس بڑی راحت کا ہے اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی ترقی وضع سے مجبور ہیں۔ ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو شریعت نے جو تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہئے۔ پس ہر چکا خاتمہ۔ ہم کو دوسروں کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں اپنی ہی ذلت ہے گویا زبان حال سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے گھر میں ترقی کے اسباب ذرائع موجود نہیں ہیں۔

طلب و اتباع | تعلیم شریعت کا اتباع یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علماء کا اتباع کیا جائے مگر ایسے علماء کا جو خود آپ کے

متبع نہ ہوں۔ یعنی وہ آپ کے مذاق کا اتباع نہ کریں بلکہ آپ سے اپنے مذاق کا اتباع کریں۔ کیونکہ جو طبیب مرلین کے مذاق کا اتباع کرے گا، وہ اُسے ہلاک کرے گا۔ طبیب وہ ہے جو مرلین سے اپنے مذاق کا اتباع کرے گا۔ آج کل بعض علماء نو طالب جاہ و مال ہیں۔ ان کو تو علماء کہنا ہی غلط ہے کیونکہ علم کتاب پڑھنے کا نام نہیں بلکہ علم دوسری چیز ہے۔

شاید ان نیست کہ موئے و میا نے وارو

بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

ایسے ہی مولویوں نے عوام کو چندہ کے نام سے متوجہ کیا ہے جنہوں نے صرف کتابی علم حاصل کیا ہے اور حقیقی علم یعنی دین کی روح حاصل نہیں کی۔

اور بعض علماء محقق ہیں صاحب علم ہیں اور طالب آخرت۔ وہ دنیا کے طالب نہیں مگر محقق ہیں۔ خوش اخلاق بہت ہیں۔ وہ اکثر دوسروں کے مذاق کا اتباع کرتے ہیں جس میں نیت صرف دوسروں کی دینی مصلحت ہوتی ہے مگر ان سے اپنے مذاق کا اتباع نہیں کرتے۔ ان سے مخلوق کو نفع عام تو ہوتا ہے مگر تمام نہیں ہوتا۔ اور بعض متعارف معنی کہ خوش اخلاق نہیں بلکہ کم فہول میں بد اخلاق مشہور ہیں کیونکہ وہ مریض کی رائے اور مذاق کا اتباع نہیں کرتے بلکہ مریض کو اپنی رائے اور اپنے مذاق پر چلاتے ہیں۔ ان سے نفع عام تو نہیں ہوتا کیونکہ لوگ ان سے گھبراتے ہیں مگر نفع تمام ضرور ہوتا ہے کہ جو ان کے مذاق کا اتباع کرتا ہے اس کی اصلاح پوری ہو جاتی ہے کہ پھر وہ کسی کے قابو میں نہیں آ سکتا۔ یہ لوگ محقق ہیں اور محقق سے طالب کے مذاق کا اتباع نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو طبیب کی خیانت ہے کہ مریض میں ایک مرض دیکھ رہا ہے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کو مرض پر مطلع نہیں کرتا کہ یہ ناراض ہو جائے گا اگر وہ کسمندر ناراض ہونے آیا ہے تو پھر علاج اور طلب صحت کا نام کیوں لیتا ہے۔ وہ جہان بن کر آئے پھر ہم اس کے لئے سونے کی کر سی تک کی فکر کریں گے۔ جیسے شاہ فضل الرحمن صاحب نے کی تھی۔ گو وقت پر یاد نہ آئے غرض ہم جہان کے مذاق کا اتباع کرنے کو تیار ہیں۔ کوئی صرف جہان بن کر دیکھے۔ انشاء اللہ ہم بھی خوش اخلاق بن کر دکھلا دیں گے۔ باقی مریض اور طالب علاج کے مذاق کا اتباع ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو درمیان میں آگئی تھی۔

بے جا گھبراہٹ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو استغناء کے ساتھ
ترغیب دینا چاہیے۔ لگ بپٹ کر چندہ نہ

مانگنا چاہیے جس سے دوسروں کو علماء پر احتجاج کا شبہ ہو۔ کیونکہ یہ طریقہ
شریعت کے خلاف ہے۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و صاحبے درباں دریں درگاہ نیست

بلکہ یہ طریقہ شرافت کے بھی خلاف ہے۔ شریف آدمی کو احتجاج بھی
ہو جب بھی وہ لگ بپٹ کر سوال نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے ہی فقراء کی شان قرآن
میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ إِذْ ذُكِّرُوا بِمِثْلِ آلِ إِبْرَاهِيمَ لَا يَسْتَطِيعُونَ حَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ الْقُرْآنِ تَعْرِفُهُمْ
بِسِيمَاهُمْ لَا يَتَمَثَّلُونَ النَّاسَ بِمُخَافَةٍ

ہم نے عرب میں مائیکوں کی یہ حالت دیکھی ہے کہ جہاں ان سے
کسی نے اللہ اکبر کہہ دیا تو فوراً اللہ کریم کہتے ہوئے چل دیئے۔ اس لفظ کے
سننے کے بعد دوبارہ ہرگز نہیں مانگتے۔ اب اگر کسی کو دینا ہو تو خود دوڑ کر
انہیں دے دے وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اور جو لوگ سر ہو جاتے ہیں وہ
اکثر ہندوستان کی نسل ہیں عرب نہیں ہیں۔ مگر وہاں رہ کر صورت عربوں کی سی بنا
لی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کو عربی بولنا بھی نہیں آتی۔

چنانچہ ایک عرب مجھ سے ملے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ عرب میں

آپ کتنے دنوں سے ہیں تو بولے۔

ثلاث پیڑھی فی المدینۃ کہ مدینہ میں تین پیڑھیاں گزر

چکے ہیں۔

میں نے دل میں کہا کہ تیرے پیروں میں تو بیڑیاں ڈالنا چاہئیں اگر تیری
ایک پشت بھی عرب میں گزرتی تو پیڑھی کا لفظ تیری زبان سے قیامت تک
نہ نکلتا۔ ایسے لوگ عرب ہرگز نہیں بلکہ ہندوستان و بنگال کی نسل ہیں۔ ورنہ جو
خالص عرب ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ اول تو وہ مدینہ سے نکلتا ہی نہیں جانتے
ان کو مکہ مدینہ سے ایسی محبت ہے کہ اُس کے باہر ان کو چین ہی نہیں مل سکتا
چنانچہ ایک بدو کے لڑکے کو بعض حاجیوں نے ہندوستان ساٹھ لاکھ پانچ سو روپے
اُس کے سامنے ہندوستان کی سرسبزی اور لذاتی کا خوب تذکرہ کیا۔ وہ سب
اوصاف سن کر کہنے لگا کہ ہندوستان میں کعبہ بھی ہے؟ کہا نہیں کعبہ تو وہاں نہیں
تو وہ صاف کہتا ہے کہ پھر ہندوستان میں کچھ بھی نہیں، جب وہاں کعبہ نہیں مائے
خوب کہا ہے

ومن دیدنی حب الدیار لاهلہا

وللناس فیما یعشوقون مذاہب

مولانا نے قنوی میں ایک عاشق و معشوق کی گفتگو نقل فرمائی ہے۔ اس
بدو کے لڑکے کا جواب بالکل اسی جواب کے موافق ہے جو مولانا نے عاشق
کی طرف سے بیان فرمایا ہے۔

گفت معشوقے بعاشق لائے فتا۔ تو بہ غربت دیدہ بس شہزاد

پس کد امی شہر زانہا خوشترست گفت اں شہرے کہ درے دلبرست
ہر کجا دلبر و خسترم نشین فوق گردول نرت نے قعرزین

ہر کجا یوسف رخنے باشت چو ماہ

جنت بست اں گرچہ باشت قعرچاہ

واقعی اہل عرب کی نظریں جہاں کعبہ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔ تو یہ لوگ اول
تو باہر کم جاتے ہیں اور کبھی جاتے ہیں تو بہت جلد واپس ہو جاتے ہیں اور جو
لوگ برسوں ہندوستان کا دورہ لگاتے رہتے ہیں ان میں خالص عرب کم ہیں، زیادہ
تو یہ ہیں کہ لوگ ہیں جو عبا قبا بہن کر عرب بن گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں عربوں
کی سی غیرت نہیں کہ سوال میں الحاح و لجاج کرتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حج میں ایک عالم پٹنہ والے تھے۔ انہوں نے وہاں پٹنہ
ہی کا کام کیا تھا۔ وہ یہ کہ جعفر آفندی پاشا کے مترجم۔ اصل میں ہندی تھے
اہل ہند سے محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حرم میں ان مولوی صاحب کا سامنا
ہو گیا۔ مصافحہ کیا۔ مولوی صاحب سمجھے کہ کوئی سائل ہے۔ بہت خشک لہجہ میں
پوچھا کچھ کہنا ہے۔ جعفر آفندی میں ظرافت بہت تھی۔ کہنے لگے حضور بھوکا ہوں
کچھ دے دیجئے۔ وہ مولوی صاحب بڑے غصہ سے بولے تم کو شرم نہیں آتی
ایسا عبا چٹخہ بہن کر سوال کرتے ہو اس کو پیچ کہ نہیں خرچ کیا جاتا۔ جعفر نے کہا،
حضور اگر معمولی لباس میں ہم سوال کریں گے تو آپ پیسہ دو پیسہ پر مثال دیں گے
اور اس لباس میں دیکھ کر کم از کم دو تین روپے تو دیں گے۔ مولوی صاحب اس
جواب سے اور بھی جھٹلائے اور بڑبڑ کرتے چل دیئے۔ دوسرے وقت وہ

مولوی صاحب خرم میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ جعفر افندی سامنے سے آئے۔ میں ان کی تعظیم کو اٹھا۔ وہ پتھر والے مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو کوئی سائل نہیں معلوم ہوتا کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جعفر افندی نے بیٹھ کر باتیں کیں اور یہ بھی کہا کہ آپ تو میری تعظیم کرتے ہیں اور یہ مولوی صاحب ہم سے بے رُخی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے فادوم ہوئے کہ سر نہ اٹھا سکے۔ کہا صاحب معاف فرمائیے گا میں معذور ہوں۔ میں نے کتاب میں دیکھا تھا کہ مکہ میں قیمتی عبا قبا والے سوال کرتے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی میں نے کیا ہے۔ اس لئے مجھے آپ پر بھی یہی شبہ ہوا۔ جعفر افندی نے کہا کہ آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ حالت عماسے والوں کی ہے یا ترکہ ٹوپی والوں کی کہنے لگے کہ ہاں صاحب جتنے سائل میں نے دیکھے وہ سب عماسے ہی والے تھے جعفر افندی نے کہا پھر آپ نے مجھے ان پر کیوں قیاس کیا۔ میں تو ترکہ ٹوپی پہن رہا تھا۔

چندہ کی تحریک

صاحبو! جیسے وہ پتھر والے مولوی صاحب عماسے اور عبا والوں کی صورت سے گھبراتے تھے ایسے

ہی آج کل مسلمان مولویوں کی صورت سے گھبرانے لگے ہیں کہ بس اب چندہ کا سوال ہوگا۔ حالانکہ علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں۔ وارثان رسول سے مسلمانوں کو وحشت ہونا سخت مضر ہے۔ اس کی اصلاح ضروری ہے جس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علماء چندہ کی تحریک نہ کیا کریں۔ اور بعد اللہ جو لوگ حضور کے پیچھے وارث ہیں وہ اس سے خود ہی پختہ ہیں۔ بس صحیح طریقہ

یہ ہے کہ استغفار کے ساتھ لوگوں کو ترغیب عام دی جائے۔ چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ پھر انشاء اللہ وحشت نہ ہوگی۔

ایک بات اور قابل اہتمام ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ چندہ کا وعدہ کریں پھر کسی وجہ سے وہ چندہ نہ بھیجیں تو ان کے پاس تقاضے کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ نہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے نام فہرست خارج کردگان میں شائع کئے جائیں۔ اس سے بھی لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔

یہ تو تمہید تھی مگر تمہید بہت طویل ہو گئی۔ اب میں آیت کا بیان شروع کرتا ہوں۔

آیت منلوہ کا شان نزول | اس آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ

تبوک میں تشریف لے گئے تھے اور بجز معذورین کے سب کو ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر کچھ لوگ غزوہ میں نہیں گئے۔ مدینہ ہی میں رہ گئے۔ جن میں زیادہ تر منافقین تھے اور دو چار مخلصین بھی تھے۔ آپ کی واپسی پر منافقین نے تو اگر جھوٹے بہانے کر دیئے کہ ہم کو فلاں عذر مانع تھا۔ یہ سبب پیش آگیا تھا مگر مخلصین نے اپنی خطا کا صاف صاف اقرار کر لیا کہ یا رسول اللہ ہم کو کوئی عذر مانع نہ تھا۔ محض کاہلی اور کستی سے پیچھے رہ گئے۔ حضور نے منافقین کا عذر سن کر ان کو تو معذورین میں داخل کر کے رخصت فرما دیا۔ اور ان مخلصین سے فرمایا کہ تمہارا معاملہ خدا کے پیروں سے ہے۔ خواہ معاف فرماویں یا سزا تجویز کریں چنانچہ پچاس روز تک سب مسلمانوں کو ان سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا کہ کوئی

ان سے بات چیت اور سلام و کلام نہ کرے۔ پچاس دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوتی تو یہ حضرات خوش خوش حضور کے پاس آئے اور شکریہ قبول توبہ میں اپنا مالی حضور کے پاس لائے کہ ان کو کار خیر میں صرف فرما دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مال قبول کرنے میں سوچ ہوئی۔ آپ نے فوراً نہیں لیا کیونکہ آپ کو کیا خبر کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ اس وقت محض جوش یر وے رہے ہیں کہ بعد کو پچھتاؤں گے یا اخلاص قلب سے دے رہے ہیں تو حق تعالیٰ ان مخلصین کی سفارش فرماتے ہیں کہ ان کے اموال سے صدقہ وصول فرمالیجئے۔ یہ لوگ مخلص ہیں۔

جیسا کہ بعض دفعہ ہمارے سامنے کوئی شخص بہت زیادہ رقم لاتا ہے اور اُس کے لینے سے رکاوٹ ہوتی ہے کہ شاید یہ اپنی وسعت سے زائد دے رہا ہو۔ تو احباب سفارش کرتے ہیں کہ یہ تو بڑی آمدنی والے ہیں مگر سادہ لباس پہنتے ہیں۔ اس لئے یہ رقم ان کی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس ساٹھ روپے لائے اور مجھے ان کے لینے سے تامل ہوا۔ پھر بعض لوگوں نے بیان کیا کہ ان کی آمدنی تو کبھی سو روپے ماہوار کی ہے جب میں نے قبول کیا۔ اور ان سے کہا کہ ذرا اپنی صورت ایسی بناؤ جس سے معلوم ہو کہ خدا نے تم کو کتنا دیا ہے۔ حدیث میں یہی حکم ہے۔

لَبِزْ اَشْرَ التَّعْمَةِ عَلَیْکَ تاکہ نعمت کا اثر تم پر معلوم ہو

تو ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ سفارش فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ہیں ان کا صدقہ

منظور کر لیا جائے اور اصلاحی کاموں میں لگا دیا جائے۔

اور عَنْ أَقْوَالِهِمْ میں ظاہر یہ ہے کہ من تبعیضہ ہے۔ گواہی یہ بھی ہے کہ بیان یہ ہو تو من تبعیضہ کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کا کوئی جزو قبول کر لیا جائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کل مال نہ لیا جائے۔ کیونکہ یہ ہر شخص کی حالت کے مناسب نہیں۔ صدیق اکبرؑ کی اور ثنان ہے وہ تو عاشق تھے۔ ان کی سخاوت تو جان دینا ہے۔ پھر ان کا کل مال لینے سے کیا انکار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

مال وادن خود بخائے صادق سستہ جان وادن خود بخائے عاشق سست

لیکن ہر شخص کی یہ شان نہیں اس لئے من تبعیضہ سے جزو مال لینے کا امر کیا گیا مگر جزو مال عام ہے۔ اگر تلمیذ سے لیا جائے جب بھی جزو صادق ہے اور ایک لاکھ میں ایک سو پمپے لیا جائے تو اس پر بھی جزو مال صادق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا مقتضایہ تھا کہ آپ جزو اقل پر کفایت فرماتے کیونکہ آپ کو دوسرے سے اسی میں تہذیب تھا کہ لوں یا نہ لوں۔ اب حق تعالیٰ کی سفارش کے بعد لینے کا خیال تو ہوا مگر جزو قلیل کی طرف مائل کیا ہو گا کہ تھوڑا سا لے لیا جائے لیکن اس سے دینے والے کا جی بھلا نہ ہوتا۔ تو حق تعالیٰ ائمہ اس کا معیار بیان فرماتے ہیں کہ کس قدر لینا چاہئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کسی کا دیر محض اس وجہ سے قبول فرماتے ہیں تاکہ دوسرے کا دل خوش ہو جائے کیونکہ واپس کرنے سے اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور یہی شان اہل اللہ کی ہے کہ لوگ سر ہو کر ان کو دیتے ہیں۔ ناک رکھتے

ہیں جب وہ ہدیہ قبول فرماتے ہیں۔

اس پر مجھے اپنے ایک بھتیجے کی بات یاد آئی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو شوقی کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اُسے بلایا کہ آؤ باتیں کریں۔ چنانچہ وہ آیا اور میں نے اُس سے پوچھا کہ تبتلا و عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا کہ عربی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا کہ قرآن عربی میں ہے میں نے کہا ٹھیک لیکن عربی پڑھ کر کھانٹیکا کہاں سے؟ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے تو وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں ڈالتا ہے کہ اس کو دو۔ وہ دیتے ہیں۔ میں نے کہا یہ سچ ہے مگر اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ کہنے لگا ذلت کی کیا بات ہے۔ یہ خود تو کسی سے نہیں مانگتا۔ لوگ خوشامد کر کے خود دیتے ہیں۔ مجھے اس کی عقل پر حیرت ہوئی کہ دراصل اسی عمر میں اُس نے حقیقت کو خوب سمجھا۔

میں نے یہ واقعہ بھائی سے بیان کیا اور کہا کہ اس بچے کو تو خواہ مخواہ تم نے انگریزی میں ڈالا۔ اس کو عربی پڑھائی ہوتی۔ وہ بھی بہت ذہین ہیں۔ کہنے لگے کہ جب اس کی طبیعت میں عربی سے مناسبت اور شوق ہے تو اس کو تو یہ خود بھی حاصل کر لے گا۔ مجھے تو وہی تعلیم دینا چاہئے جس سے اس کو مناسبت نہیں اور ہے ضرورت کی چیز تاکہ میرے اثر سے اس کو حاصل کر کے دنیا میں راحت سے رہے۔ پھر دین کا علم تو یہ اپنی مناسبت کی وجہ سے خود حاصل کر لے گا۔ میں نے کہا کہ یہ مناسبت جو اس وقت ہے وہ انگریزی پڑھنے سے زائل ہو جائے گی۔ پھر یہ محض دنیا کا رہ جائے گا۔ اور جو جو ہر اس میں اس وقت

ہے برباد ہو جائے گا۔

غرض میرا مطلب یہ ہے کہ شریعت تو اس چیز کو قبول کرتی ہے جس کی یہ حالت ہو کہ واپس کرنے میں دینے والوں کی دشمنی ہو اور وہ خود اصرار کریں کہ ہمارے مال کا معتد بہ حصہ لے لو اور اگر ہم حقوق اس لیے لیں تو اس سے ان کا جی خوش نہ ہو بلکہ زیادہ لینے کے لئے خوشامد کریں۔ تو ایسے چیز میں کوئی حرج نہیں۔

یہ سب بیان مقصود سے پہلے ہی کا ہے۔ ابھی میں نے مقصود عرض نہیں کیا مقصود آگے ہے۔ یہ تو تمہید تھی جس میں میں نے بتلا دیا کہ علماء مسلمانوں سے مال نہیں مانگتے بلکہ محض ترغیب دیتے ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے چاہے دو یا نہ دو اور جو لوگ ترغیب سے آگے بڑھتے ہیں وہ شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ پس ان کے فعل کی بنا پر مسلمانوں کو حکم شرعی سے متوجش نہ ہونا چاہئے۔ خیر یہ گھائی تو پار ہو گئی۔

اب مقصود سنئے۔ اس وقت میرا مقصود

طہارت ظاہری و باطنی

اس آیت کے اس جزو کو بیان کرنا ہے

صَدَقَةٌ تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔ جس میں حضور کو ارشاد ہے کہ صدقہ اتنا لیا جائے اور ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے آپ ان کو پاک کریں اور طہارت کریں۔ بہا میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ تُزَكِّيهِمْ کے متعلق ہو تَطْهَرُہُمْ کے متعلق نہ ہو۔ اس صورت میں تَطْهَرُہُمْ میں خطاب نہ ہوگا بلکہ یہ صیغہ فائز کا ہے جو صدقہ کی صفت ہے کہ وہ صدقہ ایسا ہو کہ گناہوں سے

پاک کرنے والا ہوا اور آپ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تزکیہ فرمائیں اس صورت میں اولاً صدقہ کی صفت مذکور ہوئی۔ پھر حضور کا فعل مذکور ہوا کہ آپ جو مسلمانوں کے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو نہ اپنی مصلحت کے لئے بلکہ مسلمانوں کے تزکیہ کے لئے۔ اور ظاہر ہے کہ تزکیہ اسی کا ہو سکتا ہے جو خود بھی طالب تزکیہ ہو۔ تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص صدقہ سے طالب تزکیہ نہ ہو اس کا صدقہ قبول نہ کیا جائے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ بھادوؤں کے متعلق ہو تھوڑے کے بھی اور تزکیہ کے بھی اور یہی میرے نزدیک ظاہر ہے کہ دونوں صیغے کے ہیں اور بھادوؤں کے متعلق ہے۔ اس میں تناسب و تناسب کلام بھی باقی رہے گا۔ بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک تو یہ کہ پاک صاف ہونا کوئی ضروری چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ مال خرچ کرنے کو پاکی میں دخل ہے۔ اب آج کل عام مذاق یہ ہے کہ لوگ پاک ہونا ہی نہیں چاہتے نہ اس کا قصد کرتے ہیں نہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ وقلیل ما ہم۔ اس پر شاکی کوئی یہ کہے کہ ہم کو استنجا کرنا تو آتا ہے ہم تو روز غسل کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہم کو کہا جاتا ہے کہ ہم پاک ہونا نہیں چاہتے۔

تو صاحبو! میں آپ نے اسی پاکی کو سیکھا ہے اور اسی پر کفایت کی ہے کہ بدن کو دھویا مانجا اور متعلق ہو گئے اس کے سوا اور کوئی پاکی آپ کو معلوم ہی نہیں۔ اس لئے اس کا قصد کیونکر کریں۔ سو اس پاکی کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

جس کو آپ پاکی سمجھتے ہیں بلکہ یہاں وہ پاکی مراد ہے جس میں صدقہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ ورنہ کیا معاذ اللہ آپ یہ کہیں گے کہ حضرات صحابہ کو استنجا کرنا اور نہانا دھونا نہیں آتا تھا۔ حضرت یہ وہ پاکی ہے جو سات سمندروں کے پانی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور ظاہری تا پاکی اس کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچاتی۔

رامپور کے ایک قاری صاحب کی میں نے حکایت سنی ہے کہ اُن کو حج کا اشتیاق ہوا لیکن روپیہ پاس نہ تھا کہیں سے اُن کو سوار و پیہل گیا تھا۔ اُس میں سے چار آنے کا ایک تھیلہ منگوا یا اور ایک روپیہ کے چنے بھنوا کر اُس میں بھر لئے اور پیادہ پا چل پڑے۔ راستہ میں کہیں کسی نے دعوت کر دی اور دل نے منظور کیا تو دعوت قبول فرمائی ورنہ چنے چاب کر پانی پی لیا اور اُس کے چل پڑے۔ اسی طرح کئی مہینے میں پہنچے۔ جب جدہ کو جہاز جانے لگا تو قاری صاحب جہاز پر پہنچے اور کپتان سے کہا کہ اگر جہاز میں کوئی نوکری خالی ہو تو میں نوکری چاہتا ہوں۔ کپتان نے کہا کہ نوکری تو ہے مگر آپ کے مناسب نہیں کیونکہ اُس نے صورت سے دیکھا کہ ایک شریف بزرگ انسان ہے اس کے لئے کوئی پاکیزہ کام چاہئے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ مناسب وغیرہ مناسب کو نہ دیکھئے اگر کوئی ملازمت خالی ہو مجھے دے دیجئے۔ کپتان نے کہا ایک بھنگی کی ملازمت خالی ہے مگر آپ اس کو نہیں کر سکتے کیونکہ قوت کا کام ہے اور آپ ضعیف و نحیف آدمی ہیں۔ فرمایا تم اس کی فکر نہ کرو میں سب کام کر لوں گا۔ اُس نے امتحان کے طور پر کہا کہ اچھا یہ بورا پڑا ہے اُس کو تو اٹھاؤ۔ وہ بورا اڑھائی تین من کا تھا جس کو قوی مزدور بھی نہ اٹھا سکتا تھا

قاری صاحب نے اُس کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں تک
تو میرا کام تھا اگے آپ کا کام ہے میری مدد فرمائیے۔ دعا کر کے جو بسم اللہ
کر کے اٹھایا ہے تو سر سے اوپر لے گئے اور نہایت سہولت سے دوسری
جگہ رکھ دیا۔ کپتان نے کہا شاباس! تم واقعی یہ کام کر لو گے اور آپ کا نام لکھ
لیا۔ دو غریب مسلمان شائق حج اور کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی کپتان سے
ملازمت کی درخواست کی۔ کپتان نے کہا کہ یہی ملازمت خالی ہے۔ اگر
تم کہتا سچا ہو تم بھی آ جاؤ۔ اس کام کو سن کر سب رک گئے کہ یہ تو ہم سے
نہ ہو گا۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے بندو! محبوب کے دربار میں جانے
کے لئے رستہ موجود ہے اور تم محض اس کام کی وجہ سے رکتے ہو۔ چلو تم نام
لکھوا لو میں تمہارا کام بھی کر دیا کروں گا۔ چنانچہ ان کا نام بھی لکھوا دیا اور خود
سب کے کام کا ذمہ لیا۔ اب جہاز میں دن بھر آپ بھنگی کا کام کرتے اور
نماز کے وقت نہاد صو کر پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھتے اور رات کو تہجد
میں قرآن پڑھتے۔ ہائے کیسے عجیب لوگ تھے۔

ایں چنین شیخے گداے کو بکو عشق آند لا ابالی فائقوا
ایک اور شاعر کہتا ہے۔

عشق را نازم کہ یوسف را بازار آورد
ہجو صنعا زادے لہ ازیر ز نار آورد

ایک رات قاری صاحب تہجد میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ قرآن
بہت اچھا پڑھتے تھے کہ کپتان ان کے پاس سے گزرا۔ اُس کو ان کا قرآن

پڑھنا پسند آیا۔ گھڑا ہو گیا۔ جب نماز سے سلام پھیرا تو پوچھا کہ تم کیا پڑھتا ہے۔ کہا یہ خدا کا کلام ہے۔ کہا ہم کو بھی سکھلا دو۔ فرمایا کہ ہاں مگر ایک شرط ہے کہ پہلے غسل کرے۔ پھر ایک کلمہ پڑھو۔ اس کے بعد قرآن سکھلائیں گے۔ چونکہ اُسے قرآن کا شوق ہو گیا تھا، اُس نے غسل بھی کیا اور کلمہ بھی پڑھا۔ الحمد اور قل ہو اللہ سیکھی اور شوق میں چلتے پھرتے اُن کو پڑھنا تھا دوسرے انگریزوں نے جو اُس کو قرآن پڑھتے سنا، کہا یہ تم کیا پڑھتے ہو؟ کہا ہمارے بھنگی نے ہم کو سکھایا ہے۔ ہم قرآن پڑھتے ہیں۔ انگریزوں نے کہا کہ تم تو مسلمان ہو گیا۔ کہا نہیں ہم مسلمان نہیں ہوا۔ انگریزوں نے کہا نہیں تم مسلمان ہو گیا۔ تو وہ دوڑا ہوا قاری صاحب کے پاس آیا کہ کیا ہم مسلمان ہو گیا۔ قاری صاحب نے کہا کیا آج ہوئے تم تو کئی روز سے مسلمان ہو چکے ہو۔ اُس کو یہ سن کر اول تو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ پھر کہنے لگا اگر اس کے پڑھنے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے تو ہم مسلمان ہی رہیں گے لیکن اس کلام کو نہ چھوڑینگے اس کے بعد اپنی میم سے کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں، اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو تم بھی مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم بھی ہم سے الگ ہو جاؤ۔ میم نے اسلام قبول نہ کیا۔ اُس نے اس کو الگ کر دیا۔ پھر جب جدہ آگیا تو قاری صاحب کے ساتھ وہ بھی جہاز کی ملازمت سے استعفا دے کر مکہ چلا گیا اور حج ادا کیا۔

تو حضرت یہ وہ پاکی ہے جو پاخانہ اٹھانے سے زائل نہیں ہوتی ہاں اس میں ردائل باطنی سے ضرورت کی آجاتی ہے۔

اہل اللہ کی اصلاح

اس پر اس وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب
والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک

واقعہ یاد آیا۔ مقصود تو یہی واقعہ ہے مگر اس سے پہلے ایک اور واقعہ اُن
ہی کا بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کا واقعہ مقصودہ سے تعلق ہے۔

وہ تمہیدی واقعہ یہ ہے کہ ایک بار بادشاہ دہلی نے آپ کو بلایا اور
یہ حضرات سلاطین کی توہین نہ کرتے تھے بلکہ اُن کے حقوق حاکمانہ کی رعایت
فرماتے تھے چنانچہ بادشاہ کے بلاسنے پر آپ چلے اور قیمتی لباس پہن کر
چلے۔ راستہ میں ایک کتے کا بچہ ایک گندی تالی میں سردی سے سسکا ہوا پڑا
دیکھا۔ اول سخاوم سے فرمایا اس کو باہر نکالے۔ وہ ذرا منقبض سا ہوا۔ آپ
سے نہ رہا گیا۔ فوراً اپنے ہاتھ سے نکالا اور حمام و ماں قریب تھا و ماں لے
جا کر اس کو گرم پانی سے غسل دیا۔ اس کو گرمی پہنچی تو وہ حرکت کرنے لگا۔
پھر اس حملہ کے آدمیوں سے فرمایا کہ اگر تم اس کی خبر گیری کا وعدہ کر لو تو میں
اس کو یہاں چھوڑ دوں ورنہ اپنے ساتھ لے جاؤں۔ کسی نے ذمہ لے لیا تب
آپ اس کے حوالے کر کے دربار شاہی میں تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ مقصودہ یہ ہوا کہ ایک دن آپ جنگل میں
بٹیا کے راستہ سے جاز ہے تھے۔ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بٹیا کے دونوں
طرف پانی اور کچھڑ تھا۔ صرف بٹیا کا راستہ خشک تھا کہ سامنے سے ایک کتا
اسی بٹیا پر آگیا۔ بٹیا اتنی تلی تھی کہ شاہ صاحب کتے سے بچ کر نہ نکل سکتے تھے
بلکہ دونوں میں سے ایک کو پانی کچھڑ میں اتارنا پڑتا تھا۔ اب شاہ صاحب بھر گئے

اور کتابھی سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے اس سے فرمایا کہ بھائی تم کیچڑ میں
 اترو۔ کہا کیوں میں ہی کیوں اتروں؟ کیا تم اپنے کو مجھ سے افضل سمجھتے ہو۔ فرمایا
 نہیں! صرف اس لئے تم سے اترنے کو کہہ رہا ہوں کہ میں مکلف ہوں۔ نماز
 وغیرہ پڑھتا ہوں کیچڑ میں میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ تو غیر مکلف ہے
 پانی سے نکل کر سوکھ جائے گا۔ تیرا کچھ خرچ نہ ہوگا۔ کتے نے جواب دیا کہ ہاں
 میرا اترنے سے کوئی خرچ نہیں لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم اترے تو صرف کپڑے ناپاک
 ہوں گے جو ایک لوٹا پانی سے پاک ہو جاویں گے۔ لیکن میں اتر گیا اور تمہارے
 دل میں وسوسہ آ گیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو تمہارا دل اتنا ناپاک ہو
 جائے گا کہ سات سمندروں سے بھی اس کی نجاست زائل نہ ہوگی۔ اب تم
 کو اختیار ہے جس شق کو چاہو اختیار کر لو۔ بس یہ سن کر شاہ صاحب نے کپڑے
 سنبھالے اور بسم اللہ کر کے خود ہی کیچڑ میں اتر گئے اور کتابتیا کے راستے
 سے چلا گیا۔

اس کے بعد شاہ صاحب کو الہام ہوا کہ عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ یہ
 علم عظیم غم پر کتنے کی زبان سے کیوں ظاہر کیا گیا۔ تم نے جو فلاں دن ایک کتے
 کے بچہ کی خدمت کی تھی۔ یہ اس کی برکت سے عطا ہوا اور ہم نے کتے ہی
 کے واسطے سے غم کو یہ علم دیا تاکہ تمہارا اس کتے کے بچہ پر احسان نہ رہے کیونکہ
 اسی کی برادری کے ایک فرد نے اس کی مکافات کر دی۔ حضرات اہل اللہ
 کی یوں اصلاح ہوتی ہے کہ کسی کو کیا خبر ہے کہ ان حضرات کو کیا واقعات
 پیش آتے ہیں۔

اے تراخار سے پانٹکندہ کے طائی کہ چسیت

حال شیرازے کہ شمشیر بلا برسر خورد

ان کو پریشانی بھی ایسی پیش آتی ہے کہ اہل دنیا کی پریشانی اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور خوشی بھی ایسی ہوتی ہے کہ دنیا داروں کو اُس کی ہوا نہیں لگی۔ اُس خوشی کا یہ حال ہے۔

بفراغ دل نہ مانے نظر سے بہاہ روئے

بہ از آن کہ چتر شاہی ہمہ روز و ماٹے ہوئے

بعض لوگ اہل اللہ کو ظاہر میں خوش پوشاک اور بے فکر دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کچھ فکر نہیں۔ ہاں سچ ہے جس چیز کی تم کو فکر ہے اُس کی انہیں فکر نہیں یعنی دنیا کی اور جس کی انہیں فکر ہے اُس کی تم کو خبر ہی نہیں یعنی خدا کے تعلق میں کمی نہ ہونے کا۔ تم اہل اللہ کی پس نہ کرو۔ اُن کی طرح خوش پوشاک نہ بنو، نہ اُن کے اقوال کی نقل کرو۔

در نیابد حال پختہ پیچ خام بس سخن کوتاہ باید والسلام

اگر تم نقل کرو گے تو وہی حالت ہوگی جیسے ایک بندہ نے بڑھئی کی نقل کی تھی کہ اس کو لکڑی چیرنے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ بھی اُس کے جانے کے بعد لکڑی پر آ بیٹھے اور میخ جو دو تختوں کو چیرتے ہوئے درمیان میں لگا دی جاتی ہے اُن کے درمیان میں اتفاق سے آپ کی سب جمع پونجی آگئی اور آپ نے اُسی میخ کو ہلانا شروع کیا۔ اُس پر جو زور پڑا وہ میخ نکل آئی اور دونوں تختے یا ہم مل گئے اور دونوں کے پیچ میں آپ کی سب جمع پونجی آگئی۔ اب

کیا تھا۔ قرطبیہ ہو گیا۔ لگا پیچنے چلانے۔ کچھ دیر کے بعد جو بڑھی آیا اس نے
خوب مرمت کی۔ اسی لئے کہتے ہیں۔ ج

کار بوزینہ نیست بخاری

یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بلا تحقیق اہل اسرار کی نقل کرتے ہیں۔
بس بزرگوں کا اتباع ان افعال و اقوال میں کرو جن کے اتباع کا وہ حکم کریں۔
باقی ان کی خاص حالت یا ان اقوال کی نقل نہ کرو جو اسرار کے متعلق ہیں۔ غرض
دل کی طہارت اور چیز ہے۔ وہ استنجا سے یا دھونے مانجنے سے حاصل نہیں
ہوتی۔ اس کے حصول کا طریق دوسرا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ ایک بار چلے جا رہے تھے۔ کتا سامنے آ گیا
آپ نے اس سے دامن بچایا۔ کتے نے کہا کہ مجھ سے دامن اس لئے بچاتے
ہو کہ میں ناپاک ہوں۔ مگر یاد رکھو میرا تو ظاہر ہی ناپاک ہے اور تمہارا باطن تکبر
کی وجہ سے ناپاک ہے۔ میری ناپاکی تو سات بار پانی بہانے سے دور ہو سکتی
ہے مگر تمہاری ناپاکی باطنی سات سمندروں سے بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ حضرت
بایزید روئے اور کہا او دونوں دوستی کر لیں۔ ہم بھی ناپاک تو بھی ناپاک۔ اس
نے کہا میری تمہاری کیا دوستی۔ تم جہاں جاتے ہو تمہاری تعظیم کی جاتی ہے اور
میں جہاں جاتا ہوں دھتکارا جاتا ہوں۔ آپ پھر روئے اور فرمایا جو شخص کتے
کی دوستی کے لائق نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کی دوستی کے کب لائق ہوگا۔

صاحبو! اہل اللہ کی اس طرح اصلاح ہوتی ہے اور یوں ان کے دل
کو پاک کیا جاتا ہے۔ ان ہی حضرت بایزید کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک

بار عید کے دن حمام سے نہا دھو کر عمدہ لباس پہن کر نکلے آ رہے تھے کہ راستہ میں ایک شخص نے اپنے مکان سے کوڑے اور راکھ کا ٹوکرا غلطی سے آپ کے اوپر ڈال دیا۔ تمام بدن اور لباس ملوٹ ہو گیا مگر آپ کے چہرہ پر ہل نہیں پڑا۔ فوراً نفس کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نفس تو تو جہنم کے لالچ ہے۔ اگر راکھ ہی پر صلح ہو جائے تو تیری خوش نصیبی ہے۔

صاحبو! یہ ہے دل کی پاکی جس کا اس جگہ بیان ہے اس سے آج کل مسلمان بالکل بے خبر ہیں۔ اس بے خبری کی بدولت ہماری یہ حالت ہے کہ دشمنوں سے تو کیا موافقت کرتے دوستوں سے بھی اختلاف و جدال کرتے رہتے ہیں۔

شدید کہ مردان راہ خدا دل دشمنان ہم نکر و نڈنگ
ترا کے پیسر شود این مقام کہ باد و سانت خلاف است جنگ
حضرت جس کو اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ہوتی جو کسی سے لڑائی جھگڑا کرے۔ اس کو دشمنوں سے لڑائی کا موقع تو کیا ملتا، دوستوں سے ملاقات کا وقت بھی نہیں ملتا۔ سب سے الگ رہتا ہے نہ کسی سے دوستی بڑھاتا ہے نہ دشمنی پیدا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ خود چہ جائے جنگ و جدل نیک بد کیں و لم از صلح با ہم سے برد
کیونکہ تجربہ ہے کہ دشمن اتنا وقت ضائع نہیں کرتا جتنا دوست ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ دوستی سے بھی گھبراتے ہیں۔ صاحبو! اللہ والے بن کر دیکھو اس وقت تم کو اس کا یقین آئے گا کہ ان کو نہ دوستی کی فرصت ملتی ہے

نہ عداوت کی۔ سعدی فرماتے ہیں کہ۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوی

گر ایں مدعی دوست بشناسختے

چو بگذشت بر عارف جنگ خوی

نہ پیکار دشمن پردازاختے

اس تقریر سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دل کا پاک ہونا کیا ہے اور اس کی کس قدر ضرورت ہے۔ بس ضروری مضمون تو اسی قدر تھا کہ لوگ جس چیز کی ضرورت سے غافل ہیں ان کی ضرورت کو ظاہر کر دیا جائے۔ اب ایک ضرورت اس کی رہ گئی کہ اس کے حصول کا طریقہ بتا دیا جائے۔

سو وہ بھی اس آیت کے سیاق و سباق اور شان نزول میں غور کرنے

طہارت باطن کے حصول کا طریقہ

سے معلوم ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ جن حضرات صحابہ سے یہ خطا ہوئی تھی کہ وہ غزوہ تبوک سے متخلف ہو گئے، انہوں نے اس کا تذکرہ یوں کیا کہ اول تو اپنی خطا کا اعتراف صاف صاف کیا۔ کوئی عذر یا بہانہ نہیں تراشا۔ پھر حضورؐ نے قطع کلام و سلام کا حکم فرمایا اور وہ اس سزا پر راضی رہے۔ یہ غزوہ تبوک سے واپسی میں ہوا، پھر جب ان حضرات کی توبہ قبول ہوئی تو حضورؐ کی خدمت میں اپنا مال لے کر حاضر ہوئے کہ اس کو اللہ کے واسطے میں خرچ کر دیا جائے۔ مجھے ان واقعات کی صورت مقصود نہیں بلکہ ان کی اصل مقصود ہے۔ اصل ان سب کی مجاہدہ ہے جس کے معنی لغت میں مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور شریعت میں مجاہدہ کی تفسیر یہ ہے کہ نفس کی ان خواہشوں کی مخالفت کرنا تو ہر شخص کے نزدیک ضروری ہے۔ علماء و ظاہری بھی اس کے وجوب کا

انکار نہیں کر سکتے۔ مگر شاید مقدمات معصیت کی مخالفت میں کسی کو کلام ہو لیکن علماء ظاہر نے بھی طے کر دیا ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب و مقدمۃ المحرم حرام۔ اس لئے اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ ان خواہشوں کی مخالفت بھی ضروری ہے۔ جو مقدمات معاصی ہیں۔ چنانچہ حضرات صوفیہ نے اپنے تجربہ سے کثرت کلام مباح و کثرت اختلاط مباح و کثرت طعام مباح و کثرت منام مباح کو مقدمۃ معاصی سمجھا ہے اور تفصیل کا موقع نہیں دینے میں ثابت کر دیتا کہ واقعی زیادہ تر معاصی ان مباسحات کی کثرت ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب تک ان میں تقلیل نہ کی جائے گی اس وقت تک مخالفت تقاضائے معاصی پر آسانی سے ہرگز قدرت نہ ہو گی۔ اس لئے صوفیہ تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام و تقلیل منام کا حکم فرماتے ہیں۔ اور تقلیل تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ وہ تو ترک کا حکم کرتے ہیں۔ لیکن مراد ان کی بھی تقلیل ہے جس کو ترک سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ برکیش گیر تا بہ تب راضی شود۔

صوفیاء کی یہ تعلیم ایسی ہے جیسے طبیب مسہل میں یاتین کرنے اور سونے سے منع کیا کرتا ہے کیونکہ یاتین کرنا اور سونا مسہل کے اثر کو باطل کرتا ہے اسی طرح صوفیاء کہتے ہیں کہ یہ اعمال صلوٰۃ و صوم و غیرہ جو شریعت نے بتلائے ہیں یہ باطل کے لئے مسہل ہیں۔ مگر ان کی تاثیر بھی ظاہر ہو گی جب کہ کلام و منام و اختلاط و طعام میں تقلیل کی جائے ورنہ مسہل کا اثر ظاہر نہ ہو گا۔

اس مثال سے میرا مقصود یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کوئی نئی بات نہیں بتلاتے بلکہ وہی طریقہ بتلاتے ہیں جو ہم معالجہ اجسام میں استعمال کرتے ہو مگر

حیرت ہے کہ علماء مطاہر اطہار پر تو اعتراض نہیں کرتے کہ یہ سکوت و سہر کو کدھر سے لازم کر رہے ہیں اور صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ دونوں کے الزام کا منشا ایک ہی ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ طہارت باطنیہ کا طریقہ مجاہدہ ہے یعنی مخالفت نفس جس میں اصل مقصود تو مخالفت تقاضائے معاصی میں ہے مگر تجربہ سے اس کا حصول مخالفت تقاضائے بعض مباحات پر موقوف ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ باتیں کم کرو اور سوچ کر کرو۔ کوئی بات خلاف شریعت نہ کرو اور کلام مباح بھی ضرورت سے زیادہ نہ کرو۔ اور سونا کم کرو۔ اگر زیادہ نہیں جاگ سکتے تو کم از کم عشاء کی نماز سے پہلے مرت سوو۔ وَتَجَانُّ جُنُوبَہُمْ عَنْ الْمُضَاجِعِ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر سوتے ہیں۔ اس لئے اگر تنہا میں نہ اٹھ سکو تو کم از کم اتنی ہی بیداری کے عادی ہو جاؤ کہ عشاء کے بعد سویا کر و اس سے پہلے نہ سوو۔ مگر اب تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ بس میں کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور خود بخود سارا کام ہو جائے باطن کی طہارت حاصل ہو جائے۔ اسے صاحبو! آخر کچھ تو ظاہری طہارت میں بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ پھر ستم ہے کہ باطنی طہارت میں جو اس سے اہم و اشد ہے اتنا اہتمام بھی نہ ہو جتنا ظاہری صفائی میں کیا جاتا ہے۔

حالت یہ ہے کہ نماز میں نیند کی شکایت ہے۔ روزہ میں گرمی اور پیاس کی شکایت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم یہ شکایت اسی وقت تک کر رہے ہو جب تک توجہ نہیں کی۔ بخدا تم توجہ کر کے دیکھو۔ اگر تم توجہ کر کے تو انشاء اللہ تم کو ایسے پاک کرنے والے بھی ملیں گے جو آسان راستہ سے

آپ کو پہنچا دیں گے۔ جیسے ظاہری سفر میں آج کل سہولت ہو گئی ہے۔ کہیں
پسنجیر ہے کہیں ڈاک کہیں اسپیشل ہے۔ اسی طرح آج کل طریق باطن میں بھی ڈاک
اور اسپیشل موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں وہ اپنے بندوں کی حالت سے
واقف ہیں۔ جب تک لوگوں میں قوت تھی اس وقت تک یہ سہولت کے سامان
موجود نہ تھے۔ جب سے لوگوں میں ضعیف آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہر میں
بھی سہولت کے سامان کر دیئے اور باطن میں بھی پس آپ مجاہدہ کا نام سن کر
نہ گھبراہٹیں۔ آج کل بعض لے جانے والے ایسے بھی ہیں، جنہوں نے راستہ کو
آسان کر دیا ہے۔ لیکن اتنا مجاہدہ تو کرنا پڑے گا کہ ارادہ کرو، قصد کرو، شیش
پینہ پینچو، ٹکڑ خریدو۔ پھر انشاء اللہ بہت جلد پہنچ جاؤ گے۔ نہ راستہ میں
کا خطرہ ہوگا، نہ پیاس اور بھوک کا اندیشہ۔ بلکہ ہر مقام پر راحت کا سامان
ملتا رہے گا۔ بہت سے اللہ کے بندے راحت کے ساتھ مقصود پر
پہنچ گئے ہیں۔ آپ بھی توجہ کر کے دیکھئے۔

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

تزکِ معاصی کی ضرورت

میں یہ بات تجربہ اور تحقیق سے کہہ رہا ہوں کہ آج کل بعض مشائخ نہایت سہولت

سے طریق طے کر رہے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ بعض مشائخ

ایک مقام سے دفعۃً دوسرے مقام پر پہنچا دیتے ہیں کہ درمیانی مقامات

کی بھی اطلاع نہیں ہوتی گویا طریق باطن کا یہ طعنا ہے۔ اسی کو مولانا جانا

فرما تھیں :-

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار لارند کہ ہم تدار از رہ پہنان بحر م قافلہ را
 ہمہ شیران جہان بستہ این سلسلہ اند روبر از جملہ جہان بکسلہ این سلسلہ را
 اور یہ محض نقشبندیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر محقق کی یہی حالت ہے اب
 بعض نادان یوں کہتے ہیں کہ ہم کو بعض کیفیات تو پیش آتی ہی نہیں جو دوسروں
 کو پیش آتی ہیں۔ اب یہ شیخ سے شکایت کرتے ہیں اور اس کے اخصان کا شکر
 نہیں کرتے کہ اس نے سب گھاٹیوں سے دفعہ پار کر کے اتنا جلدی پہنچا دیا
 ہے کہ کیفیات وغیرہ سب درمیان میں رہ گئیں اور یہ مقصود تک پہنچ گیا۔ اگر
 میں اس کی تفصیل کرنے بیٹھوں تو وقت بہت چاہئے۔ مگر تفصیل سے کیا ہوتا
 ہے۔ یہ تو کرنے کا کام ہے تفصیل یاد کرنے سے کام نہ چلے گا۔ توجہ کرو کام
 میں لگو خود مشاہدہ ہو جائے گا۔ یہ طریقہ پہلے مشائخ کا تھا کہ تمام رات بیداری
 کراتے تھے۔ اب تو شیوخ کا یہ طرز ہے کہ اگر مرید تمام رات جاگنا بھی چاہے
 تو اس کو روکتے ہیں اور تمام دشواری کی صورتوں سے منع کرتے ہیں پس اب
 طالبین کی وہ حالت ہے جو حدیث میں پرندوں کی حالت مذکور ہے کہ

تَحْدُوحًا مَآ وَتَرَوْحُ يَطَايَا صَبَحٌ كَوِ بَحْوٍ كَ اِطْطَنَ فِي شَامٍ

کو پیٹ بھر کے اپنے گھونسلے میں چلے جاتے ہیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں تدبیر کا ابطال کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں بلکہ اس مثال
 سے بھی تھوڑی سی تدبیر کا تو اثبات ہو گیا کیونکہ پرندے جو شام کو پیٹ بھر
 کے لوٹتے ہیں۔ وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صبح کو گھونسلوں سے نکل کر جنگل کی طرف

اڑ کر جاتے ہیں۔ تو اس تدبیر کی ضرورت تو ہر حال میں ہے کہ طالب علم کو کسی کے پاس پہنچ سناو میں مطلقاً تدبیر کا ابطال نہیں کر رہا بلکہ سہولت تدبیر بتا رہا ہوں کہ آج کل شیوخ محققین تو منطق کا اصرار کرتے ہیں۔ مبالغہ سے منہم کرتے ہیں۔ میں دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ معاصی کو قاطعہً چھوڑ دو اور یہ کچھ دشوار نہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ معاصی کا چھوڑنا بہت آسان ہے۔ اس میں کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ترک معاصی پر قلب کو لذت و راحت ہوتی ہے۔ جب کسی نامحرم پر نظر پڑتی ہے اس وقت دل چاہتا ہے کہ اس کو دیکھو مگر دیکھنے اور گھورنے کے بعد دل میں ایک وحشت و پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اور نگاہ نیچی کرنے میں اس وقت ٹھوڑی دیر تو گفت ہوگی لیکن اس عورت کے چلے جاتے کے بعد قلب پر نگاہ کرو تو ایک حلاوت موجود ہوگی اور دل خوش ہو کر یوں کہتا ہوگا۔

شکر اللہ کہ ہر دیم و ریدیم بدست آفرین باد بریں ہمت مردانہ نا
حدیث میں وعدہ ہے کہ جب کوئی شخص نامحرم سے نگاہ ہٹا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں خاص حلاوت پیدا کرتے ہیں اور ثواب آخرت جدا رہا۔ دنیا میں یہ مثرہ حاصل ہوتا ہے کہ دل کو چین و حلاوت نصیب ہوتی ہے جس سے اللہ موت بھی شیریں ہو جاتی ہے۔ اس کے واقعات سے بھی منہ لیتا ہے۔ اسی کو حضرت غوث اعظم فرماتے ہیں۔

گر تکیہ آید و پرستد کہ بگورب تو کیت
گویم آنکس کہ ربلود این دل دیوانہ مانا

ہیں گناہوں سے قاطعاً احتراز کرو اور اگر کسی سے سب گناہ دفعۃً نہ
چھوٹ سکیں تو کم از کم وہ گناہ تو چھوڑ دے جن کے ترک میں دنیا کا بھی کوئی
نقصان نہیں۔ جیسے بد نگاہی، جھوٹ، فریب، دغا بازی، تکبر، ریا، نخوت وغیرہ
اور صورتِ بالباس میں کفارِ فتنائی کا تشبہ کرنا وغیرہ اور جن معاصی کے
ترک میں دنیا کا نقصان معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی کی ملازمت ناجائز ہو یا تنخواہ
مخوڑی ہو اور رشوت لیتا ہوا ان سے یہ کہتا ہوں کہ ابھی آپ اس ملازمت
کو ترک نہ کریں بلکہ اسی وقت سے جائز ملازمت اور حلال روزی کی فکر میں پیچھے
دل سے لگ جائیں اور جب تک حلال روزی اور جائز ملازمت نہ ملے اسی حرام
ملازمت میں رہیں۔ مگر خدا کے لئے اس کو حرام سمجھئے اور یوں سمجھئے کہ میں مجبوری
میں کھار رہا ہوں۔ ایک کام تو یہ کیجئے۔

دوسرا کام یہ کیجئے کہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کیجئے کہ میرا اس
حرام ملازمت کا گناہ معاف کیجئے اور دعا کیجئے کہ اللہ مجھے حلال روزی عطا کیجئے
اس طرح آپ عمل کرتے رہیں۔ انشاء اللہ کوئی سبیل خلاصی کی پیدا ہو جائے گی اور
جب تک خلاصی نہ ہو آپ ناجائز ہی ملازمت میں رہیں۔ مگر اس عمل کو ترک
نہ کیجئے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناجائز ملازمت کی اجازت دے رہا ہوں
بلکہ اس ناجائز ابتلاء کو دوسری بلا کا وقایہ بنا رہا ہوں۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں مع
ایں بلا دفع بلا ہائے بزرگ

کیونکہ آج کل زمانہ ایسا ہے کہ بعض لوگ فاقہ اور تنگی میں ایمان کو خیر باد

کہہ دیتے ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور جو مفتی اپنے زمانہ سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔ اس لئے میں کسی کو جلدی ترک ملازمت کا مشورہ نہیں دیا کرتا بلکہ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم اسی حالت میں رہ کر محبت خدا دل میں پیدا کرو۔ جب محبت پیدا ہو جائے گی، تو پھر فاقہ اور تنگی سب آسان ہو جائے گی۔

حضرت رابعہؒ کی یہ حالت تھی کہ جب مسلسل کئی روز تک کھانے کو ملتا اور فاقہ نہ ہوتا تو وہ دیا کرتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے، روٹھ گئے جو فاقہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ اپنے دوستوں ہی کو فاقہ دیا کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت رابعہؒ کے یہاں مہمان آئے۔ آپ کے گھر میں کل دو روٹیاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں ایک فقیر سائل آگیا۔ آپ نے وہ دو روٹیاں سائل کو دے دیں۔ مہمانوں کو حیرت ہوئی کہ اتنے تو مہمان گھر میں ہیں اور سوائے دو روٹیوں کے کچھ اور ہے ہی نہیں وہ بھی گھر میں نہ رکھیں۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ خدا کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص خوان لایا کہ فلاں رئیس نے حضرت کے واسطے کھانا بھیجا ہے۔ فرمایا لاؤ دسترخوان کھول کر۔ آپ روٹیاں شمار کیں تو اٹھارہ تھیں۔ فرمایا واپس لے جاؤ۔ یہ میرے واسطے نہیں دی ہیں کسی اور کو دی ہوں گی کیونکہ میرے لئے میں سے کم نہیں ہو سکتیں۔ میں نے ابھی فقیر کو دو روٹیاں دی ہیں اور میرے محبوب کا وعدہ ہے۔ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَهْلًا تو اس حساب سے پوری ہیں روٹیاں ہونا چاہئیں۔ قاصد نے کہا حضور آپ کا

حساب در بہت ہے۔ دور وٹیاں میں نے چرائی تھیں وہ یہ ہیں۔ اب آپ نے وہ کھانا قبول کیا اور یہاں سمجھ گئے کہ حضرت رابعہؒ نے دور وٹیاں سائل کو کس لئے دی تھیں۔ حضرت جب نسبت رابعہؒ ہو جائے گی تو اس وقت آپ بھوکے بھی رہیں گے تو مزے میں رہیں گے اور یوں کہیں گے۔

نشو و نصیب دشمن کہ نشو و ہلاک تیغیت

سر و سناں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یوں کہیں گے۔

فان خوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من
اب آپ سے نوکری بھی چھوڑا دیں گے اور آپ کو کچھ تکلیف نہ ہوگی
اے صاحبو! ایک ادنیٰ معشوق کی محبت میں کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ اس کی
نظائر رات دن مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اُس سے کوئی پوچھے کہ اب یہ فاقہ کیونکر
گوارا ہو گیا۔ پھر عشاق خداوندی پر کیوں تعجب ہے۔ اگر وہ فاقہ سے خوش ہوں
حضرت اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب سے مل کر بھی اُن کا دل سیر نہیں
ہوتا۔ اُس وقت بھی وہ تڑپتے ہی رہتے ہیں۔ پھر وہ فاقہ اور بھوک کی کیا پروا کر
سکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے عشق کا اضطراب دنیا میں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو آخرت
ہی میں ختم ہو گا۔ عشاق مجاز تو وصال محبوب سے پہلے ہی کھانا پینا، سونا چھوڑ
ہیں۔ وصال کے بعد ہر چیز کے ہوش اُٹھاتے ہیں۔ مگر عشاق خدا کو عمر بھر کسی چیز
کا ہوش نہیں آتا۔ یعنی وہ کسی چیز کے طالب نہیں ہوتے۔

عجب داری از سالکانِ طریق کہ باشند در بحر معنی غریق

تگویم کہ برآب قاور نیست کہ برسا حل نل مستقیم!

اور یہ ایسی باتیں ہیں کہ جب چاہو اپنے اندر ان کا مشاہدہ کر لو۔

ستم است گر ہر ستم کشد کہ بپیر سز و سمن در!

تو ز غنچہ کم زدمسیدہ در دل کشا بچن ودا

ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک تو معاصی کو قاطبہ جھوڑ

دو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ حقوڑا سا مجاہدہ کیا کرو یعنی

مجاہدہ کی ضرورت

ففس کی مخالفت کیا کرو۔ اور مجاہدہ کے دو شعبے ہیں۔

ایک مجاہدہ بدنیہ دوسرے مجاہدہ مالیہ

مجاہدہ مالیہ میں بہت لوگ کوتاہی کرتے ہیں۔ اکثر نسا لیکن مجاہدہ بدنیہ

پر تو جلد جلد راہنی ہو جاتے ہیں مگر مجاہدہ مالیہ دشوار معلوم ہوتا ہے جس کی حالت

ہے۔ ج

گر جاں طلبی مضائقہ نیست و زہ طلبی سخن دریل است

حالانکہ مجاہدہ مالیہ بھی مجاہدہ کی ایک فرو ہے اس کو بھی اختیار کرنا چاہیے

بعض لوگ ایسے ہیں جو نہ مجاہدہ بدنیہ کریں نہ مجاہدہ مالیہ۔ وہ محض وظیفوں ہی سے

کام نکالنا چاہتے ہیں۔ بھلا جس کا قلب مرلین ہو اس کا علاج زبان کے فطائف سے

کیونکر ہو سکتا ہے۔ بس اس معالجہ کی وہی حالت ہے جو قنوی میں طبیب

روحانی کے قصہ میں مولانا نے فرمایا ہے کہ جب وہ طبیب روحانی آیا اور

اس نے دوسرے اطباء کا طریقہ علاج دیکھا تو کہا کہ

گفت آن دارو کہ ایشان کردہ اند آن عمارت نیست بران کردہ اند

بجائے لو دنیا نے حال دروں استعین اللہ ما یفترون
 ایک صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ رات کو آنکھ نہیں کھلتی۔ کوئی
 وظیفہ تیار دو۔ میں نے کہا اگر اس وظیفہ کو پورا نہ کر سکے تو پھر دوسرا وظیفہ اس
 وظیفہ کی تکمیل کے واسطے پوچھنے آؤ گے۔ اور اگر آنکھ کھل بھی گئی اور آنکھ
 میں شستی رہی تو پھر شستی کے لئے وظیفہ پوچھو گے۔ بس ایک دن یوں ہی مجموعۃ
 المظالفت ہو جاؤ گے۔ اس طرح کام نہیں چلا کرتا۔ پابندی تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ
 ایک دن نافر ہو تو چار آنے نفس پر جرمانہ کر کے کسی غریب کو دے دو اور جماعت
 صبح کی قضا ہو تو آٹھ آنے دو اور غیبت ہو جائے تو بیس رکعت پڑھو۔ چند دن
 میں انشاء اللہ تہجد کی عادت اور نماز باجماعت کی عادت ہو جائے گی۔ وظیفوں
 سے بھی کہیں امراض قلب کا علاج ہوا ہے۔ ان کا علاج بجز مجاہدہ کے کچھ نہیں
 ہاں ایک تدبیر اور ہے جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور مجاہدہ میں بھی برکت
 و تاثیر اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے اور ان
 کے پاس جایا کرے۔ اگر جانہ سکو خط و کتابت ہی رکھو اور غیبت کی حالت میں
 ان کے ملفوظات و مواعظ روزانہ مطالعہ کیا کرے۔ ناول ہی سمجھ کر ان کو دیکھ لیا کیجئے
 جیسے ایک گھنٹہ ناولوں کے دیکھنے میں صرف کرتے ہو۔ مختصر اس وقت اسی میں
 سے اہل اللہ کے مواعظ کے مطالعہ کے لئے بھی نکال لو۔ انشاء اللہ چند روز میں
 زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

مرافقہ موت کی ضرورت | ایک کام اس کے ساتھ یہ بھی کرنا کہ رات
 کو لیٹتے ہوئے اپنے اعمال کا محاسبہ کیا کرے

دن بھر کے کاموں کو سوچا کر دیکھ آج ہم نے کتنے گناہ کیے ہیں اور کتنے نیک کام
 کئے۔ گناہوں سے توبہ استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور رونا کی
 صورت ہی بنا لو اگر روزانہ آئے۔ اور نیک کاموں پر شکر کیا کرو۔ اس کے بعد
 سونے سے پہلے موت کا تصور کر لیا کر دیکھ جیسے ہم آج سو رہے ہیں ایسی طرح
 ایک دن ایسے سوئیں گے کہ قیامت ہی میں آنکھ کھلے گی۔ پھر ملک الموت کے
 آنے کا اور روح قبض کرنے کا اور قبر میں تنہا دفن ہونے کا تصور کرو۔ اس سے
 دنیا کی محبت اور اس کے ساتھ دل لٹگی کم ہوگی اور گناہوں سے نفرت ہوگی۔
 کیونکہ گناہوں کا منشاء غفلت عن الآخرة ہی تو ہے۔ جب موت اور آخرت کا
 دھیان غالب ہوگا تو گناہ خود بخود چھوڑنے لگیں گے۔ اس کو کر کے دیکھو پھر تو آب
 و حیات کی طرح پھینک کر بلا لئے جائیں گے کہ پاب دست و گیر سے دست بدست
 دگرے۔ پھر انشاء اللہ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ آپ بچن سے نکل کر بلوغ کی حد
 میں داخل ہو جائیں گے اور باطنی بلوغ کیا ہے۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں یہ
 خلق اطفالہ صبر مست احسن۔ انیسٹ بالغ جزرہ ہیدہ انہ ہوا
 بالغ وہ ہے جو ہوائے نفس اپنے نکل جائے۔ جب تک مسلمان ہوائے
 نفس سے نہ نکلے تا بالغ ہے طفل ہے اور جب اس سے نکل گیا بالغ ہو گیا۔ پھر
 جیسے بالغ ہو کر کوئی تا بالغ نہیں ہو سکتا گو اس سے سارا سامان عیش و چین لیا جائے
 کپڑا اور روپیہ کچھ بھی اس کے پاس نہ رہے۔ مگر اس سے وہ تا بالغ نہیں ہو سکتا ایسی
 طرح طریق باطن میں وصول کے بعد رجوع نہیں ہوتا۔ قبول کے بعد رجوع نہیں ہوتا
 جتنے لوگ ہیں راستہ میں اسے لوٹے ہیں۔ اصل ہو کر کوئی رجوع نہیں ہوتا۔ الغافی

لایرو دیکھیں یہی معنی ہیں۔

پھر ہر حال یہ طریق ہے پاکی قلب کا جن کا حاصل مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ بالمال ایک مجاہدہ بالبدن پس اب دونوں مضمون ادا ہونا گئے اور معلوم ہو گیا کہ طہارت قلب کا طریق کیا ہے اور طہارت قلب کی ضرورت پہلے معلوم ہو چکی تھی تو اب مقصود مکمل ہو گیا۔

اس مضمون کو سن کر معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس مقام کے مناسب خاتمۃ البیان یہی مضمون تھا اور اس کی یہاں ضرورت تھی اور یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ شریعت نے مال کے خرچ کرنے کی کس طرح ترغیب دی ہے۔ کہ کسی پر جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ اتفاق مال کو چونکہ تطہیر و تزکیہ میں دخل ہے اس لئے شریعت نے ہم کو اس کا امر کیا ہے۔ باقی سوال کسی سے نہیں کیا جاتا ہر شخص کو اختیار ہے جو پاک ہونا چاہے وہ مجاہدہ مالیہ کرے۔ جو پاک نہ ہونا چاہے وہ اپنے گھر بیٹھے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا، جو علماء احکام شریعہ کی تبلیغ کرنے والے ہیں وہ اتفاق مال کا مضمون بھی محض تبلیغ کے طور پر بیان کیا کرتے ہیں۔ کسی سے اصرار و الحاح نہیں کرتے ہیں۔

پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون سے اس مدرسہ کو بھی نفع ہو گا جہاں یہ بیان ہو رہا ہے اور میں صاف عرض کرتا ہوں کہ اس مضمون کے اختیار کرنے سے میرا یہ مقصود بھی ضرور تھا کہ سامعین کو امداد مدرسہ کی ترغیب ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی مقصود ضرور تھا کہ ان کو ترغیب کا طریقہ بتلا دوں کہ اہل حق اس طرح ترغیب دیا کرتے ہیں جس سے کسی کو وحشت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ محض

مبلغ احکام شریعت ہوتے ہیں اور شریعت نے جس استغناء کے ساتھ تہذیب
 دہی ہے اس سے وحشت ہو رہی نہیں سکتی۔
 میں اس وعظ کا نام تزکیہ و تطہیر رکھتا ہوں۔ دوسرے بیانات کے ناموں
 کی مناسبت سے انہی کے وزن پر مطہر الاموال رکھتا ہوں جس میں اضافت
 بسوئے سبب ہے اور جمع کا صیغہ ولالت علی الانواع کے لئے ہے۔ اب
 حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق ہو۔ وصلی
 اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ و باریک و سلم و
 اتخوذ عوننا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تائیس البینان

علی

تقویٰ من اللہ ورضوان

احکام و آداب عمارات کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲۵ھ
کو کاندھلہ میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولوی
اشفاق صاحب نے قلمبند فرمایا۔ حاضری ۱۵۰ کے قریب تھی

خطبة ماثورة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمدًا ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونستوكل
عليه ونعوذ بالله من شوره وإفساده ومن سيئات أعمالنا
من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له و
نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن
سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى
آله وصحبه وبارك وسلم أما بعد فاعوذ بالله من الشيطان
الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم آمين أسس بنيانه
على تقوى من الله ورضوان خيرا من أسس بنيانه على شفا
جوف هار فانه ربه في نار جهنم والله لا يهدي القوم
الظالمين لا يزال بنياهم الذي بنوا ريبة في قلوبهم
إلا أن تقطع قلوبهم والله عليم حكيم

تہذیب | یہ دو آیتیں ہیں جن میں ایک خاص مضمون ایک خاص موقع کے
 مناسب مذکور ہے مگر مجھے اس سے ایک عام مضمون بیان
 کرنا ہے۔ لیکن اس بنا پر اس خاص مضمون کی آیات کا تلاوت کرنا بیکار اور زائد
 نہ سمجھا جائے۔ نیز اس خاص مضمون سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ کل جو بنیاد
 مدرسہ کی رکھی ہے اس کے متعلق وعظ ہوگا۔ اور تحریک چندہ کے لئے وعظ
 ہوگا۔ ایسا خیال محض غلط خیال ہے۔ اس لئے کہ میں یہ مضمون بیان نہ کروں گا اور
 نہ مجھے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کو دینا ہوگا خود ہی
 دے گا۔ مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ میں اس وقت ایک دوسرا
 مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔

گویہ آیت خاص ہے اور خاص موقع پر نازل ہوئی ہے مگر اس وقت
 اس آیت سے کوئی خاص مضمون بیان کرنا مقصود اور مد نظر نہیں ہے بلکہ ایک

عام مضمون بیان کرنا ملحوظ خاطر ہے گو وہ زیادہ عام بھی نہیں جس کا تعلق تمام حالات سے ہو بلکہ ایسا عام اس خاص کے اعتبار سے اس میں ایک درجہ کا ایسا عموم ہے کہ اکثر لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے یعنی آیات تو خاص مساجد کے احکام کے متعلق ہیں اور میں ذکر کروں گا عام عمارات کے متعلق جس کا عموم بھی بہ نسبت خاص عمارات مساجد کے ظاہر ہے اور جس سے بکثرت لوگوں کو سابقہ بھی پڑتا ہے مگر جن بعض لوگوں کو مطلقاً عمارات سے سابقہ نہیں پڑتا ان کے لئے عام نہیں پس یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ عام تو ہے مگر زیادہ عام بھی نہیں ہے۔

تفصیل اس عموم و خصوص اور اس کے اعتبار سے درجات ضرورت کے تفاوت کی یہ ہے کہ مخاطب عام مکلفین ہیں۔ اور ان سے سب کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض مضامین وہ ہیں جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض کو نہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں جن سے اکثر کو سابقہ پڑتا ہے گو قدر قلیل کو نہ پڑتا ہو۔ اور جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہو نہ کہ اکثر کو وہ اس درجہ کے اہتمام کے لائق نہیں۔

اس میں اصل کلی یہ ہے کہ احکام تابع واقعات کے ہیں اور ہر واقعہ کے متعلق کچھ احکام شرعیہ ہیں جس کو وہ واقعہ پیش آوے اس کو وہ احکام سیکھنا فرض اور ضرور ہو جاتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے احکام ہیں کہ ملک مال سے متعلق ہیں جب تک آدمی مال کا مالک نہ ہو اس وقت تک اس کو احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا فرض اور ضروری نہیں۔ گو اعتقاد فرضیت کا فرض ہے اور جب

مال کا مالک ہوا اس وقت احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا ضروری اور فرض ہو گئے۔ اور احکام عملیہ کی قید اس لئے لگائی کہ عقیدہ کے درجہ میں تو ہر شخص سے زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ کا تعلق ہے جیسا اوپر بیان ہوا مگر عمل کے درجہ میں ہر شخص سے نہیں بلکہ اسی شخص سے ہو گا جس کے پاس بقدر نصاب مال ہو اور عملی سے بھی مراد عمل ظاہری ہے نہ کہ عمل باطنی کیونکہ عمل باطنی کا بھی ہر شخص سے تعلق ہے جیسا عنقریب آتا ہے۔

اعمال باطنیہ | ہر چیز کہ عمل باطنی کو آج کل عمل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ اعمال باطنی بھی ضروری ہیں بلکہ اس وجہ سے اعمال باطنیہ زیادہ ضروری ہیں کہ ان پر ہی مدار قبول اور عدم قبول کا ہے اور نیز اعمال باطنیہ کا تعلق بحسب العمل سب سے ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے اندر عمل باطنی یہ ہے کہ یہ عزم ہو کہ اگر مال ہوا تو میں زکوٰۃ دوں گا۔ یہ عمل باطنی ہے۔ تو یہ عمل ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اس عمل کا تعلق ہر شخص سے ہے۔ اس مفہوم کو جو مالدار نہ ہو یہ عزم رکھنا ضروری ہے کہ اگر میں مالدار ہوا تو زکوٰۃ دوں گا۔ اور یہ فرض ہے۔ اور اگر یہ عزم نہ کرے یا یہ عزم کرے کہ میں اگر مالک مال ہوا تو زکوٰۃ نہ دوں گا۔ تو اس سے گنہگار ہو گا۔ کیونکہ اس نے ایک عمل باطنی فرض کو ضائع کیا۔ فرض یہ عزم عمل باطنی ہے اور ضروری و فرض ہے اور اس عمل کا ہر شخص سے تعلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض احکام با اعتبار عمل ظاہر کے وہ ہیں جن کا تعلق سب سے نہیں بلکہ بعض سے ہوتا ہے۔ اس وقت کا بیان بھی ایسا ہی خاص

ہے کہ جس کو تعلق بعض اعمال ظاہرہ سے ہے اعمال باطنہ سے نہیں جس کا ہر عمل
فرد مکلف انسان سے تعلق ہوتا۔ اس وجہ سے ایسا تو عام نہیں ہے جیسا کہ
عمل باطنی یا بعض عمل ظاہری عام ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا خاص ہے جیسا کہ بعض
احکام ظاہرہ مخصوصہ ہوا کرتے ہیں۔ لہذا یہ مضمون بہ نسبت عمل باطنی و بعض عمل ظاہری
کے تو خاص ہے اور بلحاظ عمل ظاہری خاص کے عام ہے کہ سب سے تعلق
نہیں صرف اکثر سے تعلق ہے۔ چنانچہ آیت سنتے ہی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ وہ
عمل جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں مکان بنانا اور تعمیر کرنا ہے۔ سو اس کے
متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔ اور ان احکام کے وہی مخاطب ہوں گے جس کو
تعمیر کا اتفاق پیش آتا ہے اور جن کو کبھی ایسا اتفاق ہی پیش نہیں آیا اور انہوں
نے کبھی اینٹ بھی نہیں رکھی ان لوگوں سے ان احکام کا تعلق نہ ہوگا۔ جیسے جو
شخص مالک مال نہ ہو اس سے احکام زکوٰۃ کا تعلق نہیں۔
اسی طرح سفر حج کے احکام ہیں۔ یہ احکام بھی اسی شخص سے متعلق ہوں گے
جس پر حج فرض ہے۔ اسی طرح وہ احکام ہیں جن کا وہاں جانے کے بعد سیکھنا
اور معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے احکام طواف، احکام عمرہ، احکام احرام
احکام رمی وغیرہ۔ اور جس شخص پر حج فرض نہیں اسے منور احکام حج سیکھنا فرض
نہیں۔ اور جن کے ذمہ فرض نہیں ہے مگر وہاں پہنچنے سے فرض ہو جاتا ہے،
اس وقت ان کو بھی احکام سیکھنا فرض ہوں گے۔

در بیان اللہ شریعت بھی نہایت اعتدال اور سہولت
کا اور جامع قانون ہے۔ چنانچہ شریعت کی دلیل

اعتدال شریعت

یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر مشاغل کثیرہ ہیں کہ ہر شخص کے بے سود و حساب مشاغل ہیں مگر قانون شریعت سب کو محیط ہے۔ کوئی جزئی قانون شریعت سے خارج نہیں۔ عادتاً اس قدر مشاغل کثیرہ پر کسی قانون کا احاطہ تامہ سخت دشوار تھا یہی بڑی دلیل ہے قانون شریعت کے منجانب اللہ ہونے کی، اور اسی طرح سے کسی شخص نے نکاح نہ کیا ہو اور نہ ارادہ نکاح کا ہو۔ اس پر احکام نکاح سبکھنا ضروری نہیں اور جس وقت نکاح کا ارادہ کرے اس وقت احکام سبکھنا ضروری اور فرض ہے۔

اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ احکام شرعیہ کا معلوم کرنا اس طرح سے فرض ہو تو شریعت میں بے حد تنگی اور حرج لازم آوے گا۔ کیونکہ ایک عمل کے متعلق بہت بہت احکام ہیں جن کا مجتمعاً حاصل کرنا ظاہر ہے کہ سخت دشوار ہے۔ حالانکہ قرآن میں صاف واضح طور پر موجود ہے۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ جس سے بھی طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ دین میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرج اس وقت ہوتا کہ ایک وقت میں تمام احکام کا علم واجب ہوتا۔ اس لئے کہ یہ امر یہی بات سے ہے کہ سب احکام کا ایک وقت میں محفوظ کرنا سخت دشوار ہے مگر ایسا نہیں بلکہ جس وقت جس عمل کی ضرورت ہو اس وقت اس کے احکام کا جاننا ضروری ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ لہذا روز روشن کی طرح معلوم ہو گیا کہ حرج علمی بھی دین میں نہیں اور حرج عملی نہ ہونا تو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس میں اعمال کا اجتماع نہیں

ہوتا۔ ایک ایک وقت میں ایک ایک عمل ہے اور وہ بھی بہت سہل اور کوئی حکم و شوار نہیں۔

سہولت احکام | تمام احکام سہولت پر مبنی اور سجد سہل ہیں۔ باقی اگر خود ہی کوئی شخص و شوار سمجھنے لگے اور عہدی بن جائے اس کا علاج نہیں ورنہ کسی کام میں بھی تو مصیبت اور تنگی نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت ہے۔

چنانچہ دیکھئے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے۔ اگر کسی شخص کو قیام پر قدرت نہ ہو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے اور اس کے لئے حکم ہے کہ بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے فرض ہیں لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو اور اس کو رمضان کے روزے پر قدرت نہ ہو تو اسے اجازت ہے کہ اور ایام میں رکھے اور اگر یہ یقین ہو کہ اب مجھے عمر بھر قدرت نہ ہوگی تو فدیہ دے دے اور اگر فدیہ پر بھی قدرت نہ ہو تو استغفار کرے۔

غرض اسی طرح سے احکام میں تشقیق و تفصیل ہے جو محض سہولت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ تو دین پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔ اسی طرح جو شخص نکاح کا ارادہ کرے اس پر نکاح کے احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہیں مگر اس وقت وہی احکام فرض ہوں گے کہ جو وقت تزوج کے ہیں طلاق کے احکام اس وقت سیکھنے فرض نہ ہوں گے۔ کیونکہ نکاح بہ نیت طلاق موجب مصیبت ہے یعنی اس نیت سے نکاح کرنا کہ میں طلاق دے دوں گا موجب

گناہ ہے۔ اور اس نیت سے گناہ ہوتا ہے البتہ نکاح ہو جاوے گا مگر گناہ ضرور ہوگا۔ اور نکاح نافذ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زنا کا گناہ نہ ہوگا۔ بہر حال جب یہ عزم اور یہ ارادہ معصیت ہوا تو یہ ارادہ نہ کیا جائے گا کہ طلاق دوں گا اور جب یہ ارادہ نہ ہوگا تو تزوج کے وقت احکام طلاق کا سیکھنا ضروری اور فرض بھی نہ ہوگا البتہ جب عزم طلاق ہو، اس وقت احکام طلاق سیکھنے فرض ہونگے کہ طلاق کس وقت دینی چاہئے۔ طہریں یا حیض میں اور کئے دینی چاہئیں۔ مثلاً تین طلاق دفعہ دینی چاہئیں یا متفرق طور سے۔ پھر جب طلاق موافق سنت دے دی تو اب یہ احکام سیکھنے ضروری ہیں کہ یہ طلاق رجعی ہوئی یا بائن اور عدت کے احکام سیکھنے لازم ہوں گے کہ عدت میں نفقہ ضروری ہے یا نہیں تو ان احکام کا اس وقت سیکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں۔ زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔

پس اسی طرح یہ مضمون مقصود بالبیان بھی اسی قسم سے ہے کہ اس کی ہر شخص کو ضرورت نہیں ہے کیونکہ مکان تعمیر کرنے کا ہر شخص کو سابقہ نہیں پڑتا ہے۔ گو شوق اور خبط تقریباً عام طور پر سب کو تعمیر مکانات کا ہے الا نادراً چنانچہ جو لوگ مکان بناتے ہیں اگر ان کو گنجائش نہیں بھی ہوتی تب بھی اپنی رعیت سے زیادہ صرف کر دیتے ہیں یہاں تک اگر حوصلہ سوکا ہے تو پانچ سو خرچ کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ غرض تعمیر مکان کی تمام شخصوں کو حاجت نہیں ہے البتہ اکثر کو بے شک ضرورت ہے۔ ایسے افراد بہت کم ہیں کہ جن کو تعمیر مکان کی حاجت نہیں ہے۔ زیادہ وہی ہیں جن کو ضرورت ہے۔ پکا نہ سہی تو کچا سہی

اور لحاظ زیادہ افراد کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ ملاکتر حکم اس لئے اگر کوئی شخص اس مجمع میں ایسا ہو کہ اس کو تعمیر مکان کی حاجت نہ ہو تو اس کی رعایت سے اس وقت اس بیان کو چھوڑا نہ جائے گا کیونکہ النادر کا معدوم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ مضمون یعنی تعمیر مکان کا اکثر کے متعلق ہے اور چونکہ اس کے آداب اور شرائط معلوم نہیں اور ہم خود مختار ہیں نہیں اور کچھ احکام ہم پر اس کے متعلق بھی ہیں۔ اس لئے ان احکام کے بتلانے کی ضرورت ہے اس سے بعضہ جہلا یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے کہ ہر چیز کے احکام ہیں کہ اس طرح کھاؤ اور اس طرح پیو۔ تمام چیزوں کے قواعد بنا دیئے ہیں بلکہ مزید برآں فی زمانہ بہت لوگ تو احکام شرعیہ کو مولویوں کی گھڑت خیال کرتے ہیں۔ خداوندی حکم بھی خیال نہیں کرتے اور جو خداوندی احکام خیال کرتے ہیں وہ ان احکام میں تنگی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ احکام میں بے حد سہولت ہے اور حیرت تو یہ ہے کہ گمان یہ ہو گیا ہے کہ احکام تنگی کے واسطے موقوف ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کے واسطے مسہل کا نسخہ تجویز کرے مگر مریض اس مسہل کی غایت پر نظر نہ کرے کہ اس کے ذائقہ کی تلخی دیکھ کر طبیب کو برا بھلا کہنے لگے۔ تو جیسے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے اسی طرح اس شخص پر بھی حیرت ہے جو دین کے احکام کو تنگی کے واسطے موضوع قرار دے۔ چنانچہ ہر شخص مریض کی باتوں کو سن کر کہے گا کہ اس مریض نے غایت پر نظر نہیں کیا

صاحبو! مسہل کی ناگواری اسی وقت تک ہے جب تک مواد فارمدہ

دفع ہو کر قوت نمود نہ کرے اور جب مواد دفع ہو جاوے گا اور دو میل تک تفریح کے لئے بے تکلف جا سکے گا اور فرحت اور تازگی پیدا ہوگی جو پہلے نہ تھی اس وقت مجوز مسہل کی قدر ہوگی کہ واقعی طبیب بہت شفیق تھا جس نے غایت شفقت سے مسہل دے کر مواد فاسدہ کو دفع کر دیا۔ اسی طرح سے احکام شرعیہ کی حالت ہے۔ جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کو عمر بھر کبھی تنگی اور پریشانی پیش نہیں آتی بلکہ وہ بیکر راحت میں رہتے ہیں۔ اس مضمون کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ ہم تو اہل اللہ کو بھی تنگی اور مصیبت میں دیکھتے ہیں۔ وہ راحت میں کہاں ہیں۔ تو اصل یہ ہے کہ معترض تنگی و پریشانی کو ذات واقعہ کی صفت اور اثر خیال کرتا ہے حالانکہ یہ اس کا محض خیال ہی ہے۔

تنگی اور پریشانی کی وجہ | حقیقت میں تنگی اور پریشانی ذات واقعہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ دوسرے عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے مثلاً ایک واقعہ جو یہ ہے کسی کو بغل میں دبا لینا سو اس کے متعلق ایک حالت تو یہ ہے کہ کوئی شخص جا رہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آکر دبا لیا۔ جب اس نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک جانی دشمن ہے۔ تو اس وقت اس کی حالت جو کچھ ہوگی وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہی کوشش کرے گا کہ کسی صورت سے جلدی چھوڑے اور جس صورت سے بھی ہو میں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔

ایک حالت یہ ہے کہ یہ چلا جا رہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آ

کر دیا لیا۔ اُس نے پیٹ پھیر کر جو دیکھا تو اُس کا وہ محبوب تھا جس کی بریسوں سے تلاش میں تھا اور مدت سے اُس کی وجہ سے خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ اُس کو دبائے ہوئے ہے۔ بتلائیے اُس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی کیا اُس کا دباننا کچھ ناگوار ہوگا۔ ہرگز نہیں! بلکہ اگر وہ محبوب اُس سے یوں کہے کہ اگر تجھے میرا دباننا ناگوار معلوم ہو تو میں اُس تیرے رقیب کو اسی طرح سے دباؤں تو ہرگز یہ شخص پسند نہ کرے گا بلکہ یہی خواہش کرے گا کہ جتنا جی چاہے مجھے دبا لے اور اپنی مکر کو اُس سے ملا دے گا۔

تو ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں واقعہ ایک ہی ہے یعنی دونوں جگہ وہ واقعہ بغل میں دیا گیا ہی ہے۔ مگر دونوں واقعوں میں بڑا فرق ہے۔ تو اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات واقعہ موجب پریشانی اور حزن نہیں بلکہ عوارض موجب حزن ہوتے ہیں۔ اگر واقعات فی نفسہ موثر ہوتے تو اُس واقعہ میں دونوں جگہ اثر یکساں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعہ فی نفسہ موثر نہیں بلکہ عارض موثر ہے انتساب الی العدو کا اور اثر ہے اور انتساب الی الصديق کا اور اثر ہے۔ یہی فرق ہے اُن واقعات میں جبرائیل اللہ اور اہل دنیا دونوں کو پیش آتے ہیں کیونکہ ذات واقعہ تو پریشانی اور حزن میں موثر ہے۔

اہل دنیا کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو تنگ اور بدحواس ہوتے ہیں اور اہل اللہ کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اُن کے لئے موجب فرحت ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کلفت دہ چیز سے اُن کو طبعی تکلیف بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس تکلیف میں بھی اُن کو فرحت عظیم ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کے پھوڑا نکل رہا ہو۔ جراح یا ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھ کر نشتر لگانا تجویز کیا مگر ڈاکٹر کے پاس بیہوش کرنے کی دوا (کلورفارم) اس وقت موجود نہ تھی۔ اس نے ہوش ہی میں نشتر لگا دیا۔ نشتر لگتے ہی تکلیف کی وجہ سے ایک آہ نکلی۔ مگر جب مواد نکل چکا اس وقت ہنس رہے ہیں اور ڈاکٹر کو انعام میں پچاس روپیہ دیئے جا رہے ہیں مگر ڈاکٹر اس کو کم سمجھ کر واپس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زیادہ انعام لو لگا اور یہ خوش ہو رہے ہیں۔ گو نشتر لگتے ہی طبعاً تکلیف بھی ہوئی اور آہ بھی نکلی مگر باوجود اس کے بعد میں خوش ہو رہے ہیں اور انعام دیا جا رہا ہے اور مانگا جا رہا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ گورنچ طبعی ہوا مگر فرحت عقلی کی وجہ سے وہ رنج رنج نہیں سمجھا گیا۔

اسی طرح سے جو لوگ اہل اللہ ہیں ان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے خواہ کتنا ہی موجب حزن و پریشانی ہو مگر ناگواری جس کا نام ہے وہ ان کے پاس بھی نہیں آتی۔ گو کسی واقعہ کلفت وہ سے طبعی تکلیف ہو مگر ناگواری کا نام نہیں ہوتا بلکہ فرحت غلطیہ ہوتی ہے انتساب الی الحق کی وجہ سے کیونکہ ذاتِ سب واقعہ تو موثر نہیں بلکہ انتساب موثر ہے۔ تو انتساب الی الحق کی وجہ سے ان کو فرحت ہوتی ہے اور اس وقت وہ یوں کہتے ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو در بخشی فدائے تو

جہاں شدہ قتلائے تو ہر چہ کنی ضلّائے تو

غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ احکام شرعیہ تنگی کے واسطے موضوع نہیں

اور احکام شرعیہ میں فی نفسہ آسانی ہے محض آثار سے تنگی ہوتی ہے اور وہ آثار
اسی شخص کے حالات ہوتے ہیں جن کو یہ درست کر سکتا ہے۔ اس کی شرح
یہ ہے۔ یہ تنگی اسی وقت تک ہے کہ صرف علم الیقین کا درجہ ہو جو بشرط ایمان
ہے اور عین الیقین میسر نہ ہوا ہو۔ جب عین الیقین کا مرتبہ میسر ہوگا۔ یہی معنی ہیں
ان آثار کے درست کرنے کے، اس وقت آپ کو بھی ہر حکم میں سہولت
معلوم ہوگی۔ اور یہ درجہ کوئی سلف صالحین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اب بھی
حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مقام ولایت کا ایک درجہ ہے اور نبوت تو بیشک
ختم ہو گئی مگر ولایت ختم نہیں ہوئی ہے۔

ہنوز آل ابر رحمت و نشان است خم و خنجانہ باہر و نشان است

توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ جب طاعت کرو گے اسی وقت
اثر معلوم ہوگا کہ کس قدر اور کس درجہ عمل میں سہولت ہے اور کس قدر عمل سے
فرحت ہوتی ہے۔ عرض احکام شریعت میں یہ خیال کر لینا کہ ان میں تنگی ہے
محض خیال خام ہے۔ شریعت میں اصلاً تنگی نہیں۔ شریعت کی تہ کی تو ایسی تنگی ہے
جیسے ایک حکیم نے ایک مریض کے واسطے بہت سی چیزیں بتلا دیں کہ یہ مضر ہے
اور یہ مفید ہے۔ اس پر کوئی یہ کہے کہ ان حکیم صاحب کے مزاج میں تنگی ہے،
ان سے تو فلا نے حکیم بڑے اچھے ہیں کہ وہ کسی چیز کو بھی منع نہیں کرتے اصل
یہ ہے کہ وہ محض نام ہی کا حکیم ہے جو کسی چیز سے نہیں روکتا اور وہ حکیم شفقت ہے
جو مضرات سے روکتا ہے اور اس وقت ہر شخص یہ کہے گا کہ طبیب کا مقصود تنگی
نہیں بلکہ مقصود شفقت ہے۔ اسی طرح احکام شرعیہ کا مقصود تنگی نہیں بلکہ خوش

ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہی مقتضی ہوئی ہے ہر امر سے
تصریح کرنے کی اور احکام بتلانے کی۔ تو احکام کا اصل منشأ رحمت ہے تنگی
نہیں ہے اس لئے ہر چیز کا قانون اور حکم معلوم کرنا ضروری ہے۔

البتہ احکام میں درجات ہیں۔ سب میں اہم تو عقائد ہیں۔ اس کے بعد
مرتبہ شعائر دین کا ہے جیسے نماز روزہ۔ اُس کے بعد بقیہ احکام۔ مجھ کو اس وقت
عقائد یا نماز روزہ کے متعلق بیان کی چنداں ضرورت نہیں گو وہ سب سے زیادہ
ضروری ہیں۔ مگر اس کی ضرورت اور جزو دین ہونا سب کو معلوم ہے بلکہ ایسے
حکم کے بیان کی حاجت ہے جو واقع میں جزو دین ہے مگر لوگ اس کو جزو
دین نہیں خیال کرتے۔ ایسے مضمون کے بیان کی سخت ضرورت ہے اور میں
نے ایسا ہی مضمون اختیار کیا ہے۔

مگر یہ مضمون اس بنیاد کی بابت نہ سمجھا جاوے جو کل رکھی گئی ہے جو
بوجہ عموم کے اُس کو بھی مشتمل ضرور ہے اور نہ مجھ کو اس بنیاد کی بابت زیادہ
مضمون بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی زور دینے اور نہ تزیینی مضمون
بیان کرنے کی حاجت ہے۔ وہ کام خود اپنی ضرورت ظاہر کر دے گا کہ مجھے
اعانت کی حاجت ہے۔ ج

مشک آنت کہ خود بیوید نہ کہ عطار بگوید

ہاں کوئی اس کام کو کام ہی نہ سمجھے تو دوسری بات ہے۔ اس وقت
انتظار ادا بنیاد مدرسہ پر ایک مضمون ذہن میں آگیا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ دینی مدارس
و مساجد پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ان میں انتظام اور صفائی نہیں۔ نہ بورے

درست ہیں نہ کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اگر ہم کبھی سبائیں بھی تو کہاں بیٹھیں۔ مگر میں ان معترضین سے کہتا ہوں کہ آپ یہ اعتراض کس پر کروہے ہیں۔ صاحب مدرسہ کسی منتقم یا متولی کا گھر نہیں۔ سب مسلمانوں کا مشترک مدرسہ ہے اگر وہاں کی بے انتظامی اور عدم صفائی سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو اپنے مدرسہ کی صفائی اور نظافت کا آپ خود کیوں نہیں خیال کرتے۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ دوسروں کو کہتے ہیں کہ اُن کی یہ حالت ہے اور واقع میں وہ خود اپنی حالت ہے اور وہ اعتراض خود اپنے اوپر پڑتا ہے۔

حملہ بر خود میکنی اسے سادہ مرد ہچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک بیوقوف کالا کاروٹی کھارے تھا۔ پانی پینے کی غرض سے اٹھا تو ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ باپ کو آواز دی کہ ابا! اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے آکر دیکھا تو اسے اپنی صورت نظر پڑی۔ تو آپ کہتے ہیں کہ نف ہے تیرے اوپر۔ بوڑھے ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ شرم نہیں آتی۔ نف ہے تیری اوقات پر۔

تو جیسے وہ اپنے زعم میں دوسرے کو کہہ رہا تھا اور واقع میں اپنے ہی کو کہہ رہا تھا۔ یہی حال ہمارا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود میکنی اسے سادہ مرد ہچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

میں ایک دفعہ شاہجہانپور گیا۔ ایک رئیس کے مساجد کی عدم خبر گیری | یہاں دعوت تھی۔ ہم لوگ دعوت میں گئے

مگر نماز عشاء کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ بیشتر ہم نماز پڑھ لیں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھاویں گے۔ چنانچہ ہم لوگ مسجد میں گئے مگر وہ میزبان صاحب تشریف نہ لائے۔ وہ نماز تو پڑھتے تھے مگر مسجد میں نہ آتے تھے۔ مسجد کی حالت بہت خراب تھی۔ افسوس ہے کہ اللہ میاں کے گھر کی ایسی پیفدری کی جاتی ہے کہ نہ اس کی صفائی کا اہتمام ہے نہ خبر گیری کی جاتی ہے۔ عرض اس مسجد میں کسی قسم کا بھی انتظام نہ تھا مٹی کی ایک ڈبیا رکھی تھی اور روشن ہو رہی تھی۔ جس کے دھوئیں اور بو سے سخت کلفت ہوئی۔ مسجد سے واپسی کے بعد میں نے اس حالت پر افسوس ظاہر کیا تو وہ رہیں شرما گئے۔

غیبت ہے یعنی تو ایسے موقع پر فتوحی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو اسی واسطے اپنے گھر پر نماز پڑھ لیتے ہیں کہ مسجد میں صفائی کا اہتمام نہیں۔ مگر میں ادب و تہذیب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جو گھر پر نماز پڑھتے ہیں اسی لئے تو وہاں صفائی نہیں کیونکہ اب نماز پڑھنے والے صرف غریب ہیں۔ وہ بیچارے اپنی ہمت کے موافق جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے انتظام کرتے ہیں۔ تو آپ کا مسجد والوں پر اعتراض کرنا درحقیقت اپنے اوپر اعتراض ہے کیونکہ مسجد سب مسلمانوں کی ہے۔ صرف غریبوں کی نہیں ہے۔ آپ بھی تو مسجد والوں میں داخل ہیں۔ پھر آپ خود کیوں نہیں انتظام کرتے۔ جب کوئی ایسی مسجد کو اس حالت میں دیکھے گا، وہ تو یہی کہیگا کہ یہاں کے مسلمان بہت ہی ناقد رہے ہیں جو مسجد کو اس حال سے رکھتے

ہیں جس میں آپ بھی داخل ہوں گے۔ کم از کم ایک آدھ وقت کی نماز تو آپ مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ اور مسجد کی خبر گیری رکھئے۔ مسجد خود بتلا دے گی کہ میرے اندر فلاں فلاں کمی ہے۔

اسی طرح سے مجھے یہاں کچھ ضرورت ترغیبی مضامین بیان کرنے کی نہیں ہے۔ مدرسہ خود بتلا دے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے اور اگر اس پر بھی اعانت نہ کریں تو حق تعالیٰ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔ اگر میں اس پر ترغیبی مضمون بیان کرتا تو اس وقت تو سامعین جوش میں کچھ دے دیتے مگر بعد میں بعضے لوگ میری طرف نسبت کرتے کہ ہم نے اس کی وجہ سے دے دیا۔ لہذا مجھے احسان لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ دین کا کام سب مسلمانوں کا ہے میں اپنے اوپر کیوں احسان لوں۔

ابھی قریب کا واقعہ ہے کہ جلال آباد میں ایک شخص نے مدرسہ کے لئے کچھ رقم دی، مرض موت کی حالت میں۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے لئے فراغ کا مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے جواب تو لکھ دیا جس میں وصیت اور میراث دونوں حکموں کی تحقیق لکھ دی مگر دستخط نہیں کئے۔ بعض لوگوں نے دستخط پر اصرار کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ دستخط سے ورثہ مجبور ہو جائیں گے۔ اور میراث کہیں گے کہ ہم نے فلاں شخص کے کہنے کی وجہ سے وصیت کو مان لیا ورنہ نہ مانتے۔ تو میں خواہ مخواہ کیوں احسان لوں ضروری جواب میں نے لکھ دیا ہے۔ اگر اس میں شبہ ہے کسی اور عالم سے فراغ نکالو لیں۔ اور اپنا اطمینان کر کے جو کچھ کریں خود کریں۔ میرے

اوپر احسان رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

سفرارش کی خرابیاں | صاحبو! اسی واسطے تجربہ کاروں کی طبیعت آج کل سفرارش سے رک گئی ہے۔ اس لئے کہ اولاً

تو سفرارش کا اس زمانہ میں کوئی اثر ہی نہیں اور اگر اثر بھی ہو تو بہت ذلت سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ساری عمر دوسرے کا اپنی گردن پر احسان رہتا ہے کہ اس کی سفرارش سے ہم نے ایسا کر دیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جیبوں کا کوئی اثر بھی نہیں ہے۔ مگر جہاں اثر نہیں ہوتا وہاں کے لئے کوئی سفرارش بھی نہیں چاہتا۔ سفرارش دین کر لیتے ہیں جہاں کچھ اثر ہو۔ سو ایسی جگہ دوسرے کو تکلیف ہے اور جہاں اثر نہ ہو وہاں اپنی ذلت ہے۔

اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں ایجاب و سلب کا مقابلہ ہے اور یہ حصر عقلی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حصر عقلی نہیں ہے بلکہ ان میں باہم تضاد ہے جہاں ارتقاع دونوں کا ممکن ہے۔ اس لئے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نہ ذلت ہو اور نہ کسی کو تکلیف ہو بلکہ سفرارش کا اثر ہو محبت کی وجہ سے۔ تو جہاں یہ صورت ہو وہاں سفرارش کا مضائقہ نہیں۔ مگر آج کل ایسا نادر ہے۔ و نادر کا معدوم۔

الحاصل سفرارش کی تین صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نہ تو محبت کا اثر ہو اور نہ وجاہت کا اس میں تو ذلت ہے۔ ایک یہ کہ وجاہت کا اثر ہو محبت کا نہ ہو اس میں مخاطب کو تکلیف ہے۔

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر نہ ہو محض محبت کا ہو۔ اس میں مضائقہ نہیں اس میں نہ سفارش کرنے والے کو ذلت نہ مخاطب کو تکلیف۔ بشرطیکہ محبت کافی ہو۔ اور بے تکلفی بھی ہو۔ چونکہ غیر قسّم نادرا لوجود ہے اس لئے میں نے سفارش کرنی چھوڑ دی۔

اسی طرح تحریک چندہ کی بھی یہی دو حالتیں ہیں یا تو محرک کا اثر ہے یا نہیں۔ اگر محرک کا اثر نہیں تو ذلت ہے اور اگر ہے تو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اثر وجاہت ہی کا عموماً ہوتا ہے اور اس اثر سے چندہ لینا حلال نہیں (الا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ حدیث ہے) اور اس وجہ سے میں بھی تحریک نہیں کرتا اور اس میں زبان کا بند کرنا ہی بہتر خیال کرتا ہوں۔ اور چونکہ خدا کا کام ہے اس لئے زبان سے چنداں تحریک کرنے کی حاجت بھی نہیں۔ اس کی صورت خود ہی شفاعت کریگی اور کرتی ہے۔ صرف خلوص کی ضرورت ہے۔ کسی اثر ڈالنے اور پالیسی کی حاجت نہیں۔ کام شروع کر دینا چاہئے۔

چنانچہ حضورؐ نے تبلیغ اسلام میں کوئی تدبیر نہیں کی۔ کوئی کاوش نہیں کی۔ ہم لوگ اگر اس وقت موجود ہوتے تو ہم تو یہی مشورہ دیتے کہ پہلے ہی اثر لوگوں کو اپنا متفق کرنا چاہئے۔ جب وہ متفق اور ہم خیال ہو جاویں گے تو اور لوگوں پر زیادہ اثر ہوگا۔ مگر حضورؐ نے ہرگز ہرگز یہ تدبیر نہیں کی۔ یا اثر لوگوں کو دد کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ چند عزا ہی اول حضورؐ کے ہم خیال ہوئے اور پھر آپؐ نے کفار کے مقابلہ میں کتنی سخت بات کہی تھی کہ خدائے وحدہ

لا شریک لہ پر ایمان لاؤ اور اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ دو۔ سو ایسی ناگوار بات پھر وہ بھی علی الاعلان۔ پھر اس میں ذی اثر لوگ ہم خیال بھی نہیں مگر پھر بھی آپ کو تبلیغ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی اور نہ کسی تدبیر کا اہتمام ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو ذی اثر لوگوں کو ہم خیال کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ حضورؐ کا تو سچا رنگ تھا جو خود لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا تھا۔ اس کو کسی دوسرے اثر کی ضرورت نہ تھی۔

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب رنگ خال و خط چہ حاجت روئے نیاز

حضورؐ کی تبلیغ اسلام | صاحبو! شعیبوں کی اس کو ضرورت ہوتی ہے جو واقعی تصرفات پر قادر نہ ہو اور جو واقعی تصرفات پر قادر ہوں انہیں شعیبوں کی کیا ضرورت ہے۔ حضورؐ کو یہ حکم ہوا تھا کہ فاصدع بما تو مروا عنہ عن المشركین اور یہ حکم ہوا تھا کہ وانذر عشیة تک الاقرین اور انجن کرنے کا اور انجن بنانے کا حکم آپ کو نہیں ہوا۔

چنانچہ حضورؐ یہ حکم سنتے ہی پہاڑ پر تشریف لے گئے اور تمام آدمیوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک غنیم پڑا ہوا ہے اور وہ تم کو لوٹنا چاہتا ہے تو تم میرے قول کو کیا سمجھو گے۔ سب بولے کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امین دیکھا ہے اس لئے ہم ضرور آپ کے قول پر یقین اور اعتماد کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ

اُن خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ورنہ سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہ سن کر سب لوگ بگڑ گئے اور گستاخیاں کرتے ہوئے واپس ہوئے اُس کے بعد بھی اسلام میں ضعتا ہی داخل ہوئے اور کسی ذی اثر کے متفق کرنے کی سعی نہیں کی گئی مگر جب حق واضح ہو گیا تو بیساختہ ذی اثر لوگوں کو بھی حلقہ بگوش اسلام ہونا پڑا اور سمجھ گئے کہ واقعی یہی طریق فلاح ہے۔

اسی طرح ہم کو بھی اول کام کرنا چاہئے اور کسی کے متفق بنانے کا وہم نہ کرنا چاہئے۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ جب تک کسی ذی اثر کو کام میں داخل نہ کریں اُس وقت تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری انجمن کو ترقی نہ ہوگی۔ پس انجمن کی ترقی کا موجب یا اثر لوگوں کو خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے۔

کانپور میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی اور پہلے سے ایک سیٹھ کو انڈا لٹنے کے واسطے پڑھا کر لائے تھے کہ جب میں تقریر کر چکوں تو کھڑے ہو کر کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں۔ چنانچہ جلسہ میں اُن صاحب نے تقریر کی۔ جب تقریر کر چکے تو وہ مہاجن صاحب کھڑے ہو کر بولے میں بھی تائید کرتا ہوں۔ ان صاحب نے آہستہ سے کہا کہ تائید۔ تو انہوں نے کہا کہ تروید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے تعلیم کی مہاجن صاحب بولے کہ میں تاکید کرتا ہوں۔ خیر وہ ساکت ہو گئے کہ تاہم تائید ہو گئی۔

عزم یہ حالت ہو گئی ہے۔ یہ بھی سلیقہ نہیں رہا کہ تائید کا کون اہل

ہے اور کون نااہل۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس شخص کا اثر ہوگا۔ پس جس شخص کو ذی اثر سمجھتے ہیں اُنہی کو تلاش کرتے ہیں۔

نااہل کو منظم یا منہم بنانا | حدیث میں ہے اخذوا من الاموال غیر اہلہ فانظر الساعۃ۔ آج کل

یہی حالت ہے کہ نااہل کے کام سپرد کرتے ہیں اور اہل کے اسلئے سپرد نہیں کرتے کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ اہل کہتے ہیں، اُن کے کرتے پا جائے پھٹے ہوئے ہیں۔ وضع قطع غیر مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری مجلس کی بیفردی ہوگی۔

اس لباس پر نظر کرنے پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ مجھے ایک مرتبہ مدعو ہو کر اپنے احباب کے ساتھ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بعدِ جمعہ میرا بیان تھا۔ کرنل عبدالمجید خاں جن کی طرف سے وعظ کا اعلان تھا، اُن سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا انہیں کا بیان ہوگا۔ انہوں نے کہا، ہاں۔ وہ صاحب بولے کہ ان کا لباس کیسا ہے جیسے پاخانہ میں سے اُٹے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بعد وعظ کے کہنا۔ چنانچہ انہوں نے بیان سنا۔ بعدِ وعظ کے بولے کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ جیسے کپڑے ہیں ویسی لیاقت ہوگی مگر ان تو برعکس قصہ ہے۔

یہ قصہ مجھے بھی معلوم ہوا تو دوسرے بیان میں میں نے کہا کہ صاحبو! غصے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولویوں کو اعلیٰ درجہ کے اور قیمتی کپڑے پہنانا چاہیے۔ میں اس رائے کی تائید کرتا ہوں کیونکہ اس کا منشاء محض برائی مصلحت

ہے کہ باوقعت لباس سے واعظ کے اثر کی وقعت ہوگی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو قیمتی کپڑے بنانے دشوار ہیں۔ اس لئے کہ اگر جائز آمدنی سے روپیہ کمانا چاہیں تو کوئی مولوی تحشیہ کتب کا کپڑے کھاتا ہے اور کوئی تدریس میں مشغول ہے جن میں کوئی دل کا ملازم ہے اور کوئی بیس کا۔ انتہائی معرکہ اور نہایت عزت ہوئی تو یہاں روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ اس آمدنی میں تو قیمتی کپڑے بننا دشوار ہیں اور اگر اس کے سوا دوسرا طریقہ اختیار کریں کہ وعظ کہتے اور وصول کرتے پھریں۔ سو وہ عقلاً و نقلاً دونوں طرح ناجائز ہے۔ بس اس حالت میں صرف ایک یہ طریقہ رہ گیا کہ آپ لوگ ایک جوڑا بنا دیجئے اور حلتی قیمت کا چاہے بنوادیجئے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے اپنے گھر نہ لے جاویں گے بلکہ شملہ میں ہی رکھ جاویں گے اور جب یہاں آنا ہوا کرے گا تو اسے پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے۔ اور اگر کسی دوسری جگہ بھی اس مذاق کے آدمی ملیں گے ہم ان سے بھی جوڑا بنوا کر رکھ لیں گے۔ اب میں منتظر ہوں کہ یہ معترض صاحب جنہوں نے محض خیر خواہی کی وجہ سے ہمارے لباس پر اعتراض کیا ہے کیسا قیمتی جوڑا بنا کر لاتے ہیں۔ ان معترض صاحب کو یہ سن کر بے حد غیرت آئی۔

بس آج کل لباس کو دیکھا جاتا ہے۔ جن کے کپڑے اچھے ہوتے ہیں اُس کو لیڈر اور سیکریٹری بنا لیا جنہیں کام کا طریقہ بھی معلوم نہیں۔ محض نیکے لوگ انجنیروں کے منتظم ہیں۔ ایسے مواقع میں کام کے آدمی رکھے نہیں جاتے۔ چنانچہ آج کل ایسے منتظمین بہت ہیں اور وہ جوجی میں آتا ہے کہ کپڑے نکلتے

یہ حالت ہے آج کل کے کام کرنے والوں کی۔ اسی کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ اذا وسد الاموالی غیر اھلہ فانظر الساعة۔ صاحبو حضورؐ نے تو ضعفاء کو پہلے متوجہ کیا تھا اور ہم ذی اثر لوگوں کو پہلے لیتے ہیں۔ حالانکہ حضورؐ کے انتخاب سے ضعفاء کا مرتبہ پہلے ہے اقویا کا پیچھے۔ ضعفاء میں باطنی قوت، ہمت، برکت، خلوص زیادہ ہوتا ہے برکت اقویا کے۔ چنانچہ مجھے ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ ایک گاؤں سے کیرانہ کے راستہ میں۔ وہاں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھے اڑھائی آنے دیئے۔ میں نے فوراً لے لئے اور دعا دی۔ اس لئے کہ اڑھائی آنے کے پیسے میں اگر کوئی زبردستی بھی ربا کی نیت کرے تب بھی قادر نہیں۔ خدا تعالیٰ سمجھتا ہے۔ اگر کوئی سو پچاس دیتا ہے تو طبیعت رکتی ہے۔ کیونکہ احتمال ربا وغیرہ کا ہوتا ہے اور اڑھائی آنے کے پیسے میں کسی چیز کا بھی احتمال نہیں۔

بہر حال غریب اور ضعفاء ہی کے پیسے میں خاص برکت ہوتی ہے حدیث میں ہے هل تنصرون وترزقون الا بضعافکم۔ معلوم ہوا کہ نصرت علی الاعداء بھی ضعفاء ہی کی وجہ سے ہے۔ تو بیرونی برکت اور اندرونی برکت دونوں ضعفاء ہی کی وجہ سے ہیں۔ نصرت سے مراد بیرونی برکت ہے اور رزق سے مراد اندرونی برکت ہے۔ یہ سب غریب کی بدولت ہے گو یہ ظاہری سائنس کے خلاف ہے کیونکہ ضعفاء میں کوئی ظاہری اثر نہیں ہوتا مگر مشاہدہ یہی ہے۔

عزیز آج کل ظاہری وجاہت پر نظر کر کے ہر کام نا اہل کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور ہر کام میں نا اہل گھسے ہوئے ہوتے ہیں جو بجائے کام کے روپیہ جمع کرنے کو بڑا مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود کام ہے خواہ کسی پیمانہ پر ہو۔ پس جس پیمانہ پر کام کرنا قدرت میں ہو اس کے موافق شروع کر دینا چاہئے۔

کام کی برکت حق تعالیٰ نے کام میں برکت رکھی ہے۔ چنانچہ چند عہدہ خاندان نے اسلام کا کام شروع کر دیا تھا۔ تو مشرق سے مغرب تک آواز گونج گئی۔ چنانچہ انجیل کی ایک مثال عہدہ اہل حق کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن میں نقل فرمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں۔
 كَذَرَعَا خَوْجَ شَطَاةٍ فَآذَرْنَا سْتَغْلُظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ

سَوْفَهُ لِيَجِبَ الزَّرْعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ

کہ جیسے دانہ زمین میں ڈالا گیا تو جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوٹی نکالی۔ پھر اس نے اس کو قوی کیا۔ پھر وہ کھیتی موٹی ہوئی پھر اپنے پتے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ کسانوں کو کھلی معلوم ہونے لگی۔ تاکہ ان سے کافروں کو جلاوے۔

یہ برکت ہے کام کی کہ اگر رات کا بھی دانہ ڈالو تو کھیت میں کس قدر بڑا درخت ہو جاتا ہے۔ جب کام شروع کرنے میں اس قدر برکت ہے تو مجھے تحریک پتہ کی کیا ضرورت ہے۔

میں کانپور میں تھا جب کام شروع کیا۔ اور مدرسہ جامع العلوم کی

ابتداء ہوئی تو صرف پانچ روپیہ ہاتھ میں تھے۔ مدرسہ خدا کے نام پر شروع کر دیا۔ پھر بعد اللہ مدرسہ نے اس قدر ترقی کی کہ کانپور میں باوجودیکہ اکثریت مدرسے تھے مگر ان کے سامنے سب مانڈ پڑ گئے۔ لوگ دوسرے مدارس کے چنڈہ کی تحریک کرتے مگر سننے والے انہیں تو دیتے نہیں تھے اور جامع العلوم میں دیتے تھے۔ شہر کے لوگ کسی جگہ کے متولی کا اعتبار نہ کرتے تھے اگر کوئی مسلمان ہوتا تو ان کے اسلام کا اعتبار نہ کرتے جب تک جامع العلوم میں آکر مسلمان نہ ہوتا۔

ان سب امور کی وجہ صرف نیت خالص تھی۔ کوئی دنیاوی غرض نہ تھی۔ کسی سے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہمارے مدرسہ میں چنڈہ دو اور اگر ان خود دینا چاہا اور قرآن سے معلوم ہو گیا کہ یہ دوسرے میں دیا کرتا ہے اور دال کا چنڈہ یہاں منتقل کرتا ہے تو لینے سے انکار کر دیا سب اتنا کچھ کہ یہ نیت کر لی تھی کہ جب نہیں چلے گا چھوڑ دیں گے۔ اس لئے کہ غایت تو حق تعالیٰ کی خوشنودی تھی۔ اپنی ذات کے واسطے نہیں کیا تھا۔ بس جب تک انہوں نے چاہا کام لیا۔ اگر وہ نہ چاہتے تو ہم چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جاتے۔

صاحبو! مدارس اور مساجد کی غایت یہی ہونی چاہئے۔ اور اگر اس کے خلاف ذہن میں ایک مقدار معین کر لیتے کہ مدرسہ اس قدر اونچا ہوتا چاہئے ایسے انداز کا ہو تو جب اس انداز کا حلال آمدنی سے نہ بنتا تو حرام سے بنانے کی سعی کرتے۔ اس کا انجام سوائے بربادی کے کچھ نہ ہوتا۔ مگر

چونکہ رضا مندی خدا تعالیٰ غایت تھی اس لئے کسی قسم کی سعی نہیں کی گئی۔ خدا نے اس میں برکت کر دی۔ واللہ خدا کے واسطے کام کر کے تو دیکھو۔ انشاء اللہ خوب خوب ترقی ہوگی۔

پہلی بھیت میں ایک بزرگ تھے اور وہ اصطلاحی عالم بھی نہ تھے گناہی بنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب نے اسٹیشن پر مسجد بنانا شروع کی۔ ہندوؤں نے بھی مندر بنانے کی درخواست دے دی۔ کلکٹر نے خوف فساد مسجد کی تعمیر کو بھی روک دیا۔ شاہ صاحب کو خبر کی گئی فرمایا اچھا بھائی خدائیرا بھلا کرے اور تعمیر بند کر دی۔ لوگوں نے کہا کہ حضور اس میں کوشش کی اجازت دیجئے۔ ضرور کامیابی ہوگی۔ فرمایا ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ ہم مسجد کس کے واسطے بناتے تھے۔ ہم تو خدا کے لئے بناتے تھے لوگ نہیں بننے دیتے پس نہیں بناتے۔ ہم اپنا گھر کب بناتے تھے۔ کلکٹر کو جو کہ مسلمان تھے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ کلکٹر خود شاہ صاحب کے مکان پر آئے۔ اور ایسی صورت سے کہ لوگ نہ پہچانیں۔ شاہ صاحب دروازہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں ایک تخت آنے والوں کے لئے پڑا ہوا تھا اور ایک چارپائی پر شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ کلکٹر پہنچے، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس نے بیٹھ کر کہا کہ سنا ہے کہ آپ کوئی مسجد بنانا چاہتے تھے اس کا کیا واقعہ ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی ایک مسجد بنانا چاہتے تھے مگر کلکٹر نے روک دیا۔ ہم نے کہہ دیا اچھا بھائی خدائیرا بھلا کرے ہمیں تو ثواب مقصود تھا اور وہ نیت

سے مل گیا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا مسجد بھی بن جاتی۔ اب اُن کو منظور نہیں ہے۔
تو ہم بھی اصرار نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے جب کلکٹر سے یہ بیان کیا تو
وہ اس سادگی سے متاثر ہوا اور کہا کہ وہ کلکٹر میں ہی ہوں۔ چلتے آپ مسجد کی
تعمیر جاری کر دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا خدا تمہارا بھلا کرے۔

اس پر کچھ اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ مسجد کوئی کسی کے باوا کا گھر
تھا جو کسی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اسے خدا کا گھر ہے جو بنوا دے گا
اُسے خود ثواب ملے گا۔ ہم پر کیا احسان ہوا۔ مگر آج کل یہ بھی ایک طریقہ نکلا
ہے کہ جب کوئی مدرسہ میں چندہ دیتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں
نہ معلوم یہ کس چیز کا شکریہ ہے۔

میں نے ایک جلسہ میں کہہ دیا تھا کہ ہم کسی چندہ دینے والے کا
شکریہ ادا نہیں کریں گے بلکہ دینے والوں کو الٹا ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہئے
کہ ہم مصیبت جھیل کر ان کی رقم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کو موقع خیر
میں صرف کرتے ہیں۔ اور جو لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ
خود اپنے گھر رکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے شاہ صاحب کی اس سادگی اور
خلوص کی کس قدر برکت ہوئی اور کس قدر اثر ہوا۔ عارف شیرازی فرماتے
ہیں کہ

دلخیز بیانِ نبائی ہمہ زبور مستند دلبراست کہ با حسنِ خدا داد آمد

زیر بارِ نذرِ حقان کہ شہرِ ہارند

اے خوشامرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

بنادگی اور جاذبیت | غرض سادگی تو خود جاذب ہوتی ہے مگر ہم
 پر تکلفات لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے
 اس جذب کا احساس نہیں ہے۔ واللہ اگر علماء اس سادگی کو اختیار کریں
 اور یہ تصنع اور بناوٹ چھوڑ دیں تو اہل دنیا ان کے دروازہ پر خود ہی اگر
 ماتھا رکھنے لگیں۔

پچھلے دنوں دیوبند میں کچھ مخالفت تھی۔ کچھ آدمی شہر کے مدرسہ کا
 ممبر ہونا چاہتے تھے اور مدرسہ والوں کی طرف سے انکار تھا۔ حضرت
 مولانا گنگوہی سرپرست تھے۔ میں نے مولانا کی خدمت میں گنگوہ خط لکھا
 کہ اگر یہ لوگ ممبر بنا دیئے جاویں تو کسی سے اندیشہ تو کچھ ہے نہیں کیونکہ
 یہ تو ظاہر ہے کہ فیصلہ تو کثرت رائے پر ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مدرسہ
 کے لوگ کبیر ہیں۔ اس وقت مصلحت ایسی کو مقتضی ہے کہ ان لوگوں کو
 ممبر بنا دیا جاوے ورنہ یہ لوگ مخالف رہیں گے۔ جس میں مدرسہ کی قوی
 حضرت کا اندیشہ ہے۔

مگر ان حضرات کی عقل تو قدسی ہوتی ہے وہ دوسری ہی عقل ہے
 کہ اس کے برابر کسی عقل کا ہونا مشکل ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ
 ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگر ہم ان کو مدرسہ میں داخل نہ کریں گے
 تو غایت مافی الباب وہ لوگ مخالفت کریں گے۔ اور ان کی مخالفت مدرسہ
 کو مضرت ہوگی۔ اور مدرسہ ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے ٹوٹ جاوے ہم
 تو نہیں توڑتے، جو ہم سے سوال ہوا اور اگر ہم نے ان کو داخل کر لیا تو

آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ تم نے ناپاہل کو کیوں داخل کیا اور تخریر فرمایا کہ ہم کو حق تعالیٰ کی رضا مقصود ہے اور نہ مقصود نہیں۔

اللہ اکبر! کس قدر قوت کی بات ہے۔ پھر حضرت نے اہل شہر کی مہم کو منظور ہی نہ کیا۔ آخر دو چار دن چلا کہ سب خود ہی بیٹھ رہے اور بعد کو سب سیدھے ہو گئے۔ یہ کاسے کا اثر تھا صرف اس کا کہ حضرت کو رضائے حق مطلوب تھی، بقاد مدرسہ مقصود بالذات نہ تھی۔ جس کا یہ مذاق ہوگا وہ اہل دنیا کی ہرگز خوشامد نہ کرے گا۔ اہل مدارس کو یہی طرز اختیار کرنا چاہئے۔ پس یاد رکھو کہ بڑی پیروں کی محبت اور عزت ہے۔ علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہئے جس میں ان کی بھی عزت ہوگی۔ اور دین کی عزت استغناء میں ہے۔ علماء دنیا داروں سے جب تک استغناء نہ کیجئے اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی۔ اور جب علماء استغناء کریں گے، اسی وقت عزت اور عظمت رونما ہوگی اور یہ دنیا دار خود ان کے دروازوں پر ماتھا رکھتے پھریں گے۔

خود داری کا تقاضا | مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر خود بخود ہی ہے کہ دنیا داروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانا لاتے ہیں۔ چنانچہ دیوبند کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک تحصیلدار صاحب تھے۔ ایک طالب علم کا کھانا ان کے یہاں مقرر تھا۔ وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتے تھے اور کھانے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی تو ان کا خالی وقت بیکار رہتا تھا۔ انہوں نے تحصیلدار صاحب سے

ایک فن و سوزی سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بیکار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیتا پھرتا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا آپ نے پڑھ کر کیا کیا۔ میرے دروازہ پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جاوے گا۔ یہ ہے آج کل علم دین کی قدر۔ علماء کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے دروازوں پر پیشاب بھی نہ کریں مگر صرف احتیاج کی وجہ سے ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ دوڑنے والے عذر کرتے ہیں کہ۔

آنکہ شیریں راہ کدرو باہ مزاج احتیاج است احتیاج است احتیاج
مگر دوسرا شعر اس کا جواب بھی ہے کہ۔

شیرین کے پیشو رو بہ مزاج میزند بر کفش خود صد احتیاج
انبیاء علیہم السلام کی تو یہ نشان اور حالت تھی کہ جب وعظ و پند فرماتے تو صاف فرماتے ہیں۔ یقوم لا اسئکم علیہ اجرا اور یقوم لا اسئکم علیہ مال۔ کہ ہم تم سے اجرا اور مال نہیں مانگتے۔ یہی تمہاری بھی حالت ہونی چاہئے۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اگر نہ مانگیں تو کام کس طرح چلے گا۔ تو صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ کام خود ہی چلے گا۔ میں تو اکثر وعظ میں یہی کہہ دیتا ہوں کہ آپ مانگنا چھوڑ کر دیکھئے کہ اہل دنیا خود ماتھا رگڑیں گے اور آپ کو دیں گے۔

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی خود یہ حالت ہو گئی کہ ایک جگہ ایک دیر

تھا۔ اس کے جلسہ میں ایک واعظ صاحب فرما رہے تھے کہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسی ناپتی تو اس کو لوگ کس قدر دیتے۔ ہمیں ایک کسی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹہ بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا۔ افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی تو نہ آئی۔ مجھے تو اگر کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو انشاء اللہ تعالیٰ ایسی بات زبان سے کبھی نہ نکلے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک وفد میں نواب صاحب کی خواہش پر میرا ڈھاکہ جانے کا قصد ہوا اور راہ میں کلکتہ بھی ٹھہرنا ہوا۔ وہاں نواب صاحب کے ایک دست ہم لوگوں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ وہ مل کر کہنے لگے ہمیں آپ کے تشریف لانے سے بہت مسرت ہوئی کیونکہ آنے کی اس لئے امید نہ رہی تھی کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی ہے کہ کچھ دیا نہ جائے۔ میں نے کہا یہ شرط کون سی دشوار تھی۔ کہنے لگے ایسا کب ہو سکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کو توجی چاہتا ہی ہے۔ میں نے کہا کیا محبوب کی خدمت اسی میں منحصر ہے کہ محبوب ہی محب کے گھر جاوے۔ محب بھی تو محبوب کے گھر جا کر خدمت کر سکتا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ معاف کیجئے پیاسا کنوئیں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ بدتمیزی تو دیکھئے۔ مجھ کو بے حد غصہ آیا اور میں نے کہا کہ صاحب آپ کا تو یہ خیال ہے کہ ہم پیاسے میں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ آپ ہی پیاسے ہیں۔ مگر ہمارے پاس تو دلیل ہے آپ کے پاس دلیل نہیں۔ وہ

ویل سنیے کہ ہمارے پاس دین ہے اور اس کی آپ کو ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں اور آپ کے پاس دنیا ہے اور وہ بھلا اللہ تعالیٰ ہمارے پاس بقدر ضرورت موجود ہے۔ اب آپ خود فیصلہ فرماویں کہ بیاسا کون ہے۔ وہ صاحب یکن کر معافی کے خواستگار ہوئے اور پشیمان ہوئے۔

میں نے قوالاً تو اپنے مجمع کا استغناء اس طور سے ظاہر کیا اور علماء اس طرح ظاہر کیا کہ میں پھر ڈھکا کہ نہیں گیا۔ کلکتہ ہی سے واپس ہو گیا اور مکان چلا آیا۔ اس پر بعض نو تعلیم یافتہ لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے کہ ہم کو تمہارا ڈھکا کہ جانے کا بہت افسوس تھا اور اب یکن کہ بہت خوشی ہوئی کہ کلکتہ ہی سے واپس چلے آئے۔

علماء اور ترقی | صاحبو! آپ لوگ جو ہمیں رائے دیتے ہیں کہ ترقی کرنی چاہئے تو ہمارے اندر اوڈلا تو وسائل بھی ترقی کے نہیں اور وسائل اختیار کریں مثلاً حکام سے ملیں، لوہوں کے یہاں و فربنا کر لے جائیں تو بعد میں پھر آپ ہی اعتراض کریں گے کہ مولویوں کو ایسا مناسب نہیں۔ چنانچہ میرا ڈھکا کہ جانا بظاہر مذاق اہل ترقی کے موافق تھا۔ مگر دیکھئے انہیں لوگوں نے بعد میں اس کا نامناسب ہونا ظاہر کیا اور واپسی پر مسرت کا اظہار کیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اس قسم کے وسیلے اختیار کرتا ہے کہ حکام سے ملاقات وغیرہ کرے تاکہ مسلمانوں کو نفع پہنچے اور اس میں مشغول ہو کر

اُسے شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل جائے تو یہی ترقی کی رائے دینے والے
بعد میں اعتراض کرتے ہیں کہ محاسب یہ تو مجرب ہیں اور چٹاں ہیں اور چین ہیں
ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کرتا جن کو شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل گیا ہے
اور نہ مجھے حمایت کی ضرورت ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو ان پر اعتراض
کا حق نہیں کیونکہ آپ کی تو رائے کے موافق انہوں نے عمل کیا۔ مگر افسوس
اہل دنیا کی رائے پر عمل کر کے بھی وہ نیک نام نہ ہوئے بلکہ بدنام ہو گئے
اگر ہم اس قسم کے وسائل اور ذرائع کو اختیار نہ کرتے تو بے اعتبار نہ ہوتے
اس وقت ترقی کا صرف ایک اعتراض ہوتا کہ مولوی ترقی نہیں کرتے۔ مگر
وہ حالت عدم ترقی کی اس ترقی کی حالت سے ہزار درجہ افضل تھی۔

بیس مولویوں کو تو اس طرح رہنا چاہیے۔

شانِ علماء

نہ برائے سوارم نہ چوں اختر زیر بادم

نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

یعنی ان حضرات کو صرف تبلیغ عام یا خاص سے تعلق رکھنا چاہیے مال
سے تعلق ہی نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس باب میں نہایت آن بان سے رہنا
چاہیے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے یہاں پانچ روپے بھیجے۔ اور یہ لکھا کہ طلباء
سے دعا کرادینا۔ میں نے روپے واپس کر دیئے۔ اور یہ لکھ دیا کہ یہاں دعا
کی دکان نہیں ہے اور دعا بکتی نہیں ہے۔

ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ ایک شخص پانی پت کے قریب کے

رہنے والے تھے اور مجھ سے بیعت تھے انہوں نے مدرسہ کے لئے
پندرہ روپیہ مجھے دیئے۔ میں نے کہا کہ باوجود پانی پیت ہیں مدرسہ ہونے کے
جو آپ سے قریب ہے آپ یہاں کے مدرسہ میں کیوں دیتے ہیں اس میں
مجھے یہ شبہ ہے کہ تم یہاں اس نیت سے دیتے ہو کہ مدرسہ میں بھی یہ روپیہ
صرف ہوگا۔ اور پیر صاحب بھی خوش ہوں گے۔ دونوں باتیں حاصل ہو جاؤ گی
اور میں نے یہ بھی کہا، دیکھو سچ بتانا اخفاء نہ کرنا۔ انہوں نے کہا جی ہاں مقصود
تو یہی تھا۔ میں نے کہا ایسے روپیہ کو میں پسند نہیں کرتا جن سے خوشنودی خدا
تعالیٰ اور میری خوشی دونوں مقصود ہوں۔ میں اسے شکر سمجھتا ہوں۔ آپ
نے تقرب خدا تعالیٰ میں مجھے بھی شریک کیا۔ ان کی سمجھ میں آگیا اور واپس
لینے پر رضا مند ہو گئے۔ پھر صبح کو انہوں نے کہا کہ بے شک اس وقت تو
میرا یہی مقصود تھا لیکن اب رات کو میں نے سوچا تو اب میرا جی یہی چاہتا
ہے کہ اسی مدرسہ میں دوں اور دوسری نیت سے تو یہ کر لی اس وقت
وہ روپے میں لے لئے۔ میری اس غیرت سے آخر وہی فائدہ تو ظاہر تھا مگر
ظاہری اور دنیاوی فائدہ بھی نہ ہوا۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب نے دوسروں کے میرے پاس
مدرسہ کے لئے بھیجے اور انہی کے ساتھ دنانے کی تحریک بھی کی۔ میں
نے روپے واپس کر دیئے اور ان کو لکھ دیا کہ اگر ان کے ساتھ میرے
بلائے کی درخواست نہ ہوتی تو میں قبول کر لیتا۔ اب تو یہ شبہ ہے کہ آپ
مدرسہ میں یہ رقم دے کر گویا مجھ پر احسان رکھ کر دیا۔ ڈالنا چاہتے ہیں سو

مدرسہ میں رقم دینے کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ اُن صاحب کا جواب ہے یا آپ
روپیہ وصول کر لیجئے میں نہیں بلاتا۔

تو یہ سارا استغناء محض اس وجہ سے ہے کہ مجھے مدرسہ کا چلانا مقصود
نہیں بلکہ محض رضائے حق مطلوب ہے اور یہ نیت کر لی ہے کہ اگر حدود
کے اندر کام چلتا رہا چلا تے رہیں گے اور جس دن کچھ تجاوز کرنا پڑا یا تذبذب
سوچنا پڑیں کہ اب کیا انتظام کریں، کہاں سے رقم لائیں، ایسی دن مدرسہ بند
کر دوں گا۔ غرض یہ نیت رکھنی چاہئے کہ جس روز مدرسہ نہ چلے گا نہ چلے۔
ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے۔ کوئی ہمارا ذاتی کام تو ہے نہیں۔

اگر یہ کہا جاوے کہ اس طرح مسلمانوں کی سبکی اور ذلت ہے، تو
اس کا جواب یہ ہے کہ علوشان کی حاجت ہی کیا ہے۔ حضرت عمر رضی
اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام۔ تو ہماری
علوشان کے لئے اسلام کافی ہے۔ ہمیں تو خدا نے اسلام سے عزت
دی ہے۔ اگر مسجد چوڑی نہ بنے بلا سے نہ بنے۔ جعلت الارض
لنا مسجد او طہورا۔ تمام زمین مسجد ہے۔ یہ نیت کر لینا کہ اس قدر طول
وطویل ہوا اور ایسی ہیئت و شکل پر ہو فضول ہے۔ ہر کام میں یہی نیت رکھئے
کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ خوشی سے شریک ہو، فہما ورنہ بھوڑ دیکھئے
یہ نیت رکھو کہ بالکل نہ رہے گا نہ سہی اور کم پیمانہ پر ہوگا تو کم ہی سہی۔

ایک ہندو کی حکایت ہے کہ وہ بچے پورے ہر دوار کو چلا جس کے
پاس گنی تھی۔ پھر کسی موقع پر خیرات کیلئے روپوں کی ضرورت ہوئی۔

تو ایک دکاندار سے کہا کہ مجھے ایک گنی کے روپے دے دو۔ اُس نے کہا کہ پورے پچیس روپے نہ دوں گا بلکہ بیس دوں گا۔ یہ راضی ہو گیا تو اُس نے اور کم کرنا شروع کئے اور یہ راضی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ دس تک نوبت آگئی۔ اُس نے کہا کہ لا تو دس ہی دے دے۔ تو وہ بولا کہ معلوم ہوتا ہے تم چڑا کر لائے ہو جو اس طرح کم کرتے جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا کہ اہل یہ کہ میں اس وقت دان پُن کے واسطے چلا تھا۔ تو تو جس قدر کم دیتا میں اُس میں پُن کی نیت کر لیتا۔ اگر تو یہ بھی کہتا کہ میں کچھ بھی نہیں دیتا تب بھی میں راضی ہو جاتا اور تجھے گنی دے دیتا۔

تو صاحبو! حیرت ہے کہ ایک ہندو تو مقصود اصلی کو سمجھا اور مسلمان مقصود اصلی کو نہ سمجھے۔ جس طرح اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مقصود ثواب ہے خواہ گنی زیادہ میں جائے یا کم میں مجھے ثواب پورا ہی ملے گا، اسی طرح مسلمان کو سمجھنا چاہئے کہ کام خواہ اعلیٰ بیمانہ پر چلے یا ادنیٰ بیمانہ پر مقصود تو ثواب ہے اس کی فکر نہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ بیمانہ پر ہی کام ہو۔

طاعت اور توفیق | صاحبو! اسلام نے غیرت کی بھی تعلیم دی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَنْلَوْا مَكْتُوبَهَا وَانْتَمِ

لَهَا كَارِهُونَ۔ تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے مڑھیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ۔ اور فرماتے ہیں کہ لست علیہم بمصیط۔ آپ اُن پر مسلط نہیں ہیں اور فرماتے ہیں۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآَمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا فَاِنَّكَ

الناس حتی یكونوا مومنین وما كان لنفس ان تؤمن الا
بإذن الله۔

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ
سب کے سب ایمان لے آتے۔ سو کیا آپ لوگوں پر بروقتی
کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان لے ہی آویں حالانکہ کسی شخص کا
ایمان لانا بدولت خدا کے حکم کے ممکن نہیں۔
اور فرماتے ہیں۔

وان كان كبر عليك اعراضهم فان استطعت ان تبغى
نفقاني الارض او سلما في السما فقاتيهم بآيتك ولو شاء
الله لجمعهم على الهدى فلا تكونن من الجاهلين۔
اور اگر آپ کو ان کا اعراض گماں گزرتا ہے اور اگر آپ کو
یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی
سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ کو
منتظر ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا۔ سو آپ نادانوں
میں نہ ہو جیئے۔

اور فرماتے ہیں۔

قل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر۔
اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے
سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے

کافر ہے۔

تو ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو استغناء کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کسی کے پیچھے نہ پڑے۔ اسی طرح مدرسہ والے بھی اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ بھی مدرسہ میں کچھ دے دے، وہ بھی کچھ امداد کر دے۔ کسی کے پیچھے پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب خدا کا حکم ہوتا ہے جب ہی کوئی دیتا ہے۔

زکوٰۃ، خیرات اور احسان | جب کوئی دیتا ہے تو کسی پر کیا احسان ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطان بھی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بادشہنت

خدا کا احسان ہے کہ وہ ہم کو اپنی طاعت کی توفیق دے دیں اور ہماری طاعت بدنیہ اور مالیہ کو قبول فرمائیں۔ اگر وہ قبول نہ فرمادیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں غرض جو کوئی مدرسہ کی امداد کرتا ہے خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ ہتھم مدرسہ پر کیا احسان ہے۔ پھر وہ کیوں کسی کی خوشامد کرے اور کیوں کسی کا شکریہ ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استغناء ہی سے کام لیا ہے۔

چنانچہ ایک شخص منافق تھا۔ اس نے بکریاں پالیں اور حضورؐ سے دعا کرتا تھا کہ آپؐ نے دعا فرمادی۔ وہ بہت بڑھ گئی۔ اس سے زکوٰۃ مانگی گئی تو اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی۔ پھر خود لایا تو حضورؐ نے بوجہ و جی کے نہ لی۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں زکوٰۃ دینا چاہی مگر حضورؐ کی متابعت میں زکوٰۃ نہ

قبول کی گئی۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دینی چاہی اس وقت بھی نہیں قبول کی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے بھی نہیں لی۔ پھر وہ آپ کے زمانہ میں سر کیا۔ اس وحی خاص میں جس کی متابعت حضرات خلفاء نے بھی کی یہ بھی نکتہ تھا تا کہ ظاہر ہو جاوے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں کسی پر کچھ احسان نہیں صرف اپنا ہی نفع ہے اگر تخم ایک بار انکار کر و گئے تو ہم دس بار واپس کر دیں گے۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا کوئی احسان نہیں بلکہ چندہ لینے والے کا احسان ہے کہ اس نے لے کر آپ کو پاک صاف کیا۔

بقا و علم کی صورت | خاص کر جب کہ یہ ایسی جگہ ہے جو ایک زمانہ تک مرجع خلافت رہی ہے تو اس کا حق ادا کرنا سب ہی کے ذمہ ہے نہ کہ ایک شخص پر تمام بار ڈال کر اس کا انتظار کیا جاوے۔ کیا وہ سب سے مانگے اور وہ زمانہ مفتی الہی بخش صاحب کا تھا جو اپنے وقت کے آفتاب تھے اور وہ حق یہ ہے کہ ایسی جگہ درس تدریس کا سلسلہ ضرور قائم و باقی رکھا جاوے۔

اس کی بقا کی صورت ہمارے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوئی ہے کہ مدرسہ کا ایک خاص مکان ہو جس میں کچھ جگہ درس تدریس کے لئے ہو اور کچھ جگہ طلباء کے رہنے کی ہو اور کتب خانہ بھی ہو اور وہ مکان وقف ہو اور مدرسہ کی ملک ہو اور اس میں طلبہ و مدرسین درس و تدریس میں مشغول رہیں اگر عقلاء اس کے سوا ہمیں اور کوئی صورت قیام علم کی بتلا دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر عجب کو سمجھا دی جاوے میں ضرور قبول کر لوں گا۔ اور یہ بھی وعدہ

کہتا ہوں کہ دو چار مدرسے جن میں میرا من و جہ اختیار ہے ان کے ویران
 کرنے کی سب سے اول میں ہی کوشش کر دیں گا۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ ایسی
 صورت ہو کہ تجربہ سے اس کا صحیح اور درست ہونا معلوم ہو گیا ہو۔ تو اس
 وقت میں ان منتظم مدرسوں کو اس مجذوب کی لنگوٹی کی طرح رخصت کر دینا
 جیسے ایک مجذوب کا قصہ ہے یہ خدا کو معلوم ہے کہ واقع میں بھی
 مجذوب تھے یا نہیں۔ غرض وہ شنگے پھرا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مریدوں
 نے لنگوٹا باندھ دیا مگر چونکہ مجذوب تھے اس واسطے کھانا اس طرح کھاتے
 تھے کہ روغن وغیرہ سب لنگوٹے پر گرتا تھا آخر وہ چکنا ہو گیا۔ چوہوں نے
 اسے کترنا شروع کر دیا۔ جب چوہے بکثرت ہو گئے تو ان کے لئے بلی
 پالی گئی تاکہ چوہوں کو کم کرے۔ بلی نے ہر چیز کھانی شروع کر دی۔ جو چیز
 کھانے کو رکھی گئی وہی کھا گئی اس کے واسطے کتا پا لایا گیا۔ جب کتے نے
 شنانا شروع کیا تو اس کی حفاظت کے واسطے ایک نوکر رکھا گیا اور جب
 وہ ادھر ادھر نظر کرنے لگا تو اس کا نکاح کر دیا گیا اور اقران صغریٰ و کبریٰ
 سے نتیجہ پیدا ہو گیا۔ ایک دن مجذوب صاحب کو جو کچھ افادہ ہوا تو ایک
 ہجوم دیکھ کر پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ میرے اس پاس یہ ہجوم کیسا ہے مریدوں
 نے سارا قصہ بیان کیا تو مجذوب صاحب نے لنگوٹی اتار کر پھینک دی
 کہ یہی بکھیرے کی جڑ ہے ہم اسی کو نہیں باندھتے۔

تو ہم بھی اگر آپ تعالیٰ نے علم کی اور کوئی تدبیر بتلائی گے اور سمجھا
 سکیں گے تو ان مدرسوں کو لنگوٹا سمجھ کر پھینک دیں گے۔ مگر جب بقاء علم

کی صورت اہل تجربہ کے تجربہ سے اسی صورت میں منحصر ہو گئی ہے تو اب
 اس کے ابقاء کی کوشش میں کیا عذر ہے اور اس کو خوب سمجھ لیجئے کہ صرف
 مدرسہ ہی آپ کا محتاج نہیں بلکہ آپ بھی اس کے محتاج ہیں۔ یعنی مدرسہ جیسے
 آپ کی اعانت کا محتاج ہے اسی طرح آپ مدرسہ کی برکت کے محتاج
 ہیں بلکہ مدرسہ تو مجازاً ہی محتاج ہے مگر آپ حقیقت میں محتاج ہیں۔ جیسے
 فقیر سخاوت کا حقیقتہً محتاج ہے اور سخاوت کو فقیر کی مجازاً حاجت ہے
 اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

بامگ می آید کہ اسے طالبِ بیا جو محتاج گدایاں چوں گدا
 اور احتیاج سے مراد تو قف ظہور ہے مجازاً احتیاج سے تعبیر کر دیا
 اور عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ ظاہراً مولانا پر جذب کا علیہ کم ہے عارف
 شیرازی سے مگر اس مضمون کو حافظ شیرازی نے نہایت متین عنوان سے
 تعبیر کیا ہے اور مولانا کا عنوان ذرا موہم ہے۔ اس لئے کہ مولانا نے
 احتیاج سے تعبیر کیا ہے برخلاف حافظ صاحب کے کہ انہوں نے شوق
 سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سایہ معشوق گرا قباد بر عاشق چہ شد

ما بہ او محتاج بودیم او بما مشتاق بود

تو حافظ کا اشتیاق سے تعبیر کرنا مولانا کی اس تعبیر سے سہل ہے
 گو حق تعالیٰ تو اشتیاق لغوی سے بھی جو کہ ایک قسم کا انفعال ہے بمنزہ
 ہیں۔ مگر اس کے سہل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اشتیاق حدیث میں وارد

ہے۔ چنانچہ حدیث بیہقی میں ہے۔ قال جبریل علیہ السلام ان اللہ
قد اشتاق الی لقاءک۔ (کذا فی نشر الطیب)، تو اشتیاق کا لفظ حدیث
میں موجود ہے برخلاف لفظ احتیاج کے کہ وہ حدیث میں موجود نہیں ہے
یہ سب کلام مدارس دینیہ کی ضرورت کے متعلق تھا۔

مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ | اب مقصود آیت کی طرف مود کرتا ہوں جس
کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس وقت مدرسہ

کی عمارت کی نسبت خصوصاً اور جملہ عمارات کی بابت عموماً بیان ہوگا چنانچہ
حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں افعن اسس بنیانہ علی تقویٰ۔ یہ آیت
ایک خاص قصہ اور ایک خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے
اس سے علت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کا حکم بیان کرنا
ہے۔ اور اس پر پھر جملہ تعمیرات کو قیاس کرنا ہے۔ عرض یہ آیت مسجد
خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔

ملخص قصہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلہ ہے قبا
اس کا نام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ
تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلہ میں قیام فرمایا۔ پھر شہر میں تشریف
لائے تھے تو زمانہ قیام میں جس جگہ آپ نماز پڑھتے تھے وہاں اس
محلہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنائی اور اس میں نماز پڑھا کرتے۔
کسی نے خوب کہا ہے کہ

در منزلکہ جاناں و نہ بے سید باشد با خاک آستانش داریم مر جائے

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ کنی کی تدبیروں میں ہر وقت لگے رہتے تھے، یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجن ہو اور اس کا پریدہ پڑنٹا بوہرہ راسب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اور ابو عامر کا ہرقل شاہ دم سے میل جول تھا۔ ابو عامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہرقل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا۔ جس سے اسلام نیست و نابود ہو جاوے گا۔

ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال بچتہ کر لیا تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ان اللہ معنا کی تھی کہ کفار کسی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس ہے کہ آج کل بھی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کنا۔ ہو رہی ہے۔ کیونکہ مرغیبات الہی سے مسلمان بہت کچھ ہٹ رہے ہیں۔ اس لئے مخالفوں کا بھی ان پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ اگر مسلمان اس چھری کو تیز کر لیں یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آجائے جو کبھی پہلے تھا۔

عرض ان لوگوں نے انجن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس عرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے مسجد

کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورتہ مسجد کی شکل تھی۔ غرض جب وہ مکان تیار ہوا تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رجسٹری کرائنا تھا۔ جیسے بیعنامہ کی رجسٹری کرائی جاتی ہے۔

حضورؐ نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے۔ محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تاکہ وسعت و سہولت ہو۔ گویا سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مسجد میں سب سما نہیں سکتے۔ اس سے گنجائش ہو گئی۔ نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جاسکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے۔ حضورؐ نے بنا پر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کر لیا۔ غرض حضورؐ نے وعدہ فرمایا کہ نبوک سے آکر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا وَضَرَاءً وَتَفَرُّقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَارْصَادًا لِّلْحَرْبِ أَلَمْ يَكُفَرُوا بِمَا بَيْنَ يَدَيْهِمْ
يَحْلِفُونَ أَنَا دَنَا إِلَى الْحَسَنِ وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّهُمْ كَاذِبُونَ
لَا تَقْرَفُ فِيهِ أَبَدًا الْمَسْجِدَ اسْ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ
أَن تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ

اور بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد

بتائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں۔ اور ایمانداروں
 میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس
 کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاوینگے
 کہ بجز بھلائی کے ہماری اور کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے
 کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ
 جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس
 لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے آدمی
 ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ
 خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض آیت میں خدا کے یہاں سے اس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی کہ
 یہ مسجد صرف صوری ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں
 کو ضرر پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے۔ اور
 ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اس کی پناہ کے واسطے تیار
 کی گئی ہے۔ اور یہ لوگ قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں
 حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہو جائیں اور نہ نماز
 پڑھیں۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھیں جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ
 پر رکھی گئی ہے۔ اس میں ایسے آدمی ہیں کہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے
 ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے سے ممانعت ہو گئی چنانچہ

صنور نے بوجہ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہوتے تھے چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوا دی اور منہدم کرا دی۔ اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار کے لئے بنائی گئی تھی۔

قرآنی طرز نصیحت | اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ افسمن اسس بنیانہ علی تقویٰ من اللہ ورضوان

خبیرا من اسس بنیانہ علی شفا جوف ہارقا نہاربہ فی نار جہنم ہمترہ استفہام کا ہے اور فافتریع کا ہے۔ اوپر دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا ہے۔ اب یہ بتلا کر کہ ان میں سے ایک کی تو بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور دوسری کی کفر پر۔ اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے جب بناؤں کی حالت معلوم ہو گئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہو گئی اور بنیان مصدر ہے مبنی کے معنی میں اور ہ کی ضمیر من کی طرف راجع ہے اور من اللہ تقویٰ کی قید ہے تاکہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے پاکی حاصل کی اس واسطے کہ تقویٰ من بجانب اللہ ہے اور رضوان بھی مقید ہے من اللہ کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھائی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یہ طرز بلاء غنت ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا۔ پس دونوں کے افعال بیان کر

دیئے اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا موثر ہے۔ اور اگر نا صحت خود ہی فیصلہ کر دے تو اس سے مخاطب پر گرائی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کی تائید میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مدرسہ میں جلسہ تھا۔ ایک واعظ صاحب نے وعظ فرمایا اور وعظ میں یہ فرمایا کہ علی گڑھ کالج والے سووی ڈگریاں کرتے ہیں اس لئے ملعون ہیں۔ بات تو صحیح تھی مگر الفاظ سخت تھے اس لئے سامعین کو گراں گزرا اور ناگوار ہوا۔ سامعین بکڑ گئے جب لوگوں کی ناگواری کا مہتمم جلسہ کو احساں ہوا تو اس کا تدارک کرنے کے واسطے کھڑے ہوئے۔ اور خود تقریر کی کہ خدا اور رسولؐ نے یہی کہا ہے جو واعظ صاحب نے فرمایا ہے۔ وغیرہ۔ مگر مہتمم صاحب کی تقریر سے بھی اس کا کوئی تدارک نہ ہوا۔ تو مہتمم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے۔ غریب کی جو رو سب کی بھابی۔ چونکہ مجھ کو اپنے کرم فراوان سے انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس لئے ہر ایسے موقع پر مجھے ہی سب پھنسانا چاہئے ہیں۔ اول تو میں نے کہا کہ تمہاری یہی سزا ہے۔ بات کہو مگر نرمی سے کہو سختی کی کیا ضرورت ہے۔ کرو تم اور بھگتوں میں۔ یہ اچھی رہی مگر وہ اصرار کرنے لگے تو میں کھڑا ہوا۔

میں نے کہا، صاحبو! اعمال و افعال مباحہ میں نیت پر مدار ہے۔ تو اگر کوئی شخص سخت لفظ کہہ دے مگر نیت مذموم نہ ہو تو ناگوار نہ ہونا چاہئے کیونکہ نیت تو مذموم نہیں ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ مولوی صاحب

کی نیت کیا تھی ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے محض شفقت کی راہ سے کہا ہے۔ جیسے کسی کا لڑکا زیر کھانے لگے اور وہ اس کو سختی کے ساتھ دھمکائے تو اس سے کسی کو تاگواری نہیں ہوتی کیونکہ جانتے ہیں کہ منشاء اس کا محض شفقت ہے۔ اب بتلایئے کہ ہم لوگ جو بُرے افعال کرتے ہیں۔ ان سے مولوی صاحب کا کیا نقصان ہے اور اگر ہم پارسا ہو جائیں تو اس سے مولوی صاحب کا کیا نفع ہے۔ ظاہر ہے کہ نفع نقصان جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ہم کو مضرباتوں سے سختی کے ساتھ روکتا ہے تو یہ اس کی شفقت ہے یا نہیں۔ اس کو آپ کی حالت بگڑنے پر افسوس ہوتا ہے اس لئے غصہ اور تیزی کے ساتھ آپ کو روکتا چاہتا ہے۔ اگر شفقت نہ ہوتی تو اس کی جوتی کو عرض پڑی تھی جو کسی کی اصلاح کے درپے ہوتا۔

علاوہ ازیں مجھ کو حیرت ہے کہ آپ لوگ تو فطرت کے بہت معتقد ہیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً مختلف المزاج پیدا ہوئے ہیں۔ مزاجوں میں باہم بہت بڑا تفاوت ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیزی سب کو معلوم ہے اور ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ایک ہمارے حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو آپ نے مولوی صاحب کی سختی کو فطرت کا تابع کیوں نہ تجویز کر لیا۔

پھر میں نے اسلامی احکام اور کالج والوں کا ان سے بعد بیان کر

کے اخیر میں کہا کہ اب آپ ہی بتلائیے کہ ایسا شخص جو ان احکام کی پابندی نہ کرے مروجہ برحمت خاص ہو سکتا ہے یا رحمت خاص سے اس کو بعد ہوگا اور یہی معنی ہیں لعنت کے۔ بس آپ ہی فیصلہ کر دیجئے ہم کچھ نہیں کہتے تو میں نے دونوں قسم کے افعال بیان کر کے فیصلہ خود اُن سے چاہا۔ جس سے سب سامعین خود معترف ہو گئے کہ ہم ہی خطا وار ہیں۔

تو ایک طرز تو یہ ہے کہ اُن کے اقوال و افعال اجنبیانہ طور پر بیان کر دیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے۔ پھر خود اُن سے ہی فیصلہ دریافت کر لیا جائے تو یہ طرز زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کر کے حکم لگا دو کہ تم ملعون ہو۔ جیسے ان مولوی صاحب نے کیا تھا۔ یہ طرز مؤثر نہیں ہوتا۔

تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان دونوں میں کون تہیر ہے یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھائی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو رکھی ہو۔ یعنی ڈھانگ پر رکھی ہو۔ جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی کو لے کر گرے گی۔ جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا، وہ بھی گر گیا۔ یہ سب سے زیادہ ضرر ہے۔ اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔

تعمیری بنیاد | ایک نظیر یاد آگئی۔ میں بھرت پور گیا تھا۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب میرے ہمراہ تھے۔ چند وعظ بیان کرنے کا اتفاق ہوا جو خواجہ صاحب نے لکھے۔ وہ سفر میں تھے ان کے ہمراہ ایک بیگ تھا جس میں وعظ بھی تھے۔ وہ بیگ ریل میں چوری چلا گیا خواجہ صاحب کو وعظوں کے ضائع ہونے کا بہت رنج ہوا۔ میں نے ان کے رنج دفع کرنے کو کہا کہ میاں سر سلامت چاہئے ٹوپیاں بہت۔ یعنی واعظ رہے تو وعظ بہت۔

اسی طرح اگر بانی رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں۔ مکان بہت بن سکتے ہیں۔ اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔

اس بیٹھ جانے کے متعلق ایک بات یاد آگئی کہ آج کل یہ بھی مرض ہے کہ بہت اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں۔ پھر جب وہ گرتی ہیں تو کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ سب کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان آفات سے محفوظ تو گاؤں کے مکان ہیں جو نیچا ہونے کی وجہ سے زلزلہ میں بھی نہیں گرتا۔ ۲۸ اپریل منگل کے دن کانگوٹے میں زلزلہ آیا۔ زلزلہ میں شدت تھی۔ ایک تو زلزلہ کی شدت دوسرے بڑے اور اونچے مکانات میں حرکت تو میں نے کہا یا اللہ تیرا شکر ہے کہ ہمارے مکان چھوٹے چھوٹے ہیں جو زلزلوں کے اثر سے محفوظ ہیں۔ اس واسطے کہ یہ قاعدہ ہے کہ مرکز سے محیط کو جس قدر بُعد ہوگا۔ اُس میں حرکت زیادہ ہوگی۔ ویسا ہی قدر بلی ہوگی

زلزلہ میں حرکت زیادہ ہوگی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ نیچے نیچے گھر والے دنیا میں بھی شدت زلزلہ سے محفوظ رہیں گے اور خدا تعالیٰ کے یہاں بھی محفوظ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کو یہ مسئلہ بھی بتانا تھا کہ مکان ایسا بنانا چاہئے جو لیکن کو نہ لے بیٹھے اور کچھ مکاؤں اور نیچے گھروں میں گو بعض تکالیف ہوتی ہیں مگر راحتیں زیادہ ہیں۔ اگر کبھی گر پڑا تو جلدی سے دوسرا ویسا ہی بن سکتا ہے۔

خدا اگر بحکمت بہ بند دے کتا یہ بہ فضل و کرم دیگرے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے تائیس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا بلکہ بنیان مقید بقید خاص پر نکیر فرمایا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ خود مکان بنانا مذموم نہیں بلکہ وہ تو اگر بقید ضرورت ہو تو محمود ہے۔

مکان کی اہمیت | ہاں بناء الفاسد علی الفاسد نہ ہو۔ وجہ یہ کہ بغیر مکان کے گزر نہیں ہو سکتا اور سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب مکہ تشریف لے گئے تو فاقوں کو تو جیل لیا مگر مکان کی تکلیف نہ برداشت فرما سکے۔ دعا کی کہ اے اللہ ایسی بیٹھنے کی جگہ مرحمت فرما دے کہ جس سے کوئی اٹھا نہ سکے۔ ایک سو نہ مطاف میں تشریف رکھتے ہوئے ذکر میں مشغول تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی تشریف لائے اور کچھ پیسے ہاتھ پر رکھے اور فرمایا تمہارے ہاتھوں لاکھوں کا خرچ رکھا گیا۔ حضرت نے عرض کیا میں اس کا متحمل نہیں۔ البتہ ایک ایسا گھر چاہئے۔ فرمایا یہ بھی ہو جائے گا۔ جس کا غیب سے

یہ سامان ہوا کہ ایک شخص نے حضرت کے نام مکان خرید دیا۔ حضرت نے اس مکان میں بیٹھ ہی معاً وقف نامہ لکھا کہ حیات تک میں رہوں گا پھر میرے بعد یہ مکان دوسرے اغراض محمودہ کے لئے وقف ہے۔ اور اس طرح کی شرط لگانا وقف میں جائز ہے کہ اپنے انتفاع کی یا اپنی اولاد کے یا اولاد کی اولاد کے انتفاع کی شرط لگالے۔ یہ بھی ثواب کا مرتبہ ہے مگر میں اس کا کسی کو مشورہ نہیں دیتا۔ کیونکہ بعض دفعہ وقف کرنے کے بعد اولاد کو کوئی ایسی تکلیف ہوتی ہے جس سے اولاد کو مجبوری کی وجہ سے مکان بیچنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی وقت وہ محلہ ویران اور خطرناک ہو گیا یا ہمسائے شریہ ہو گئے۔ اب مکان بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر وقف کی وجہ سے اس کو بیع نہیں کر سکتے۔ آگے ہر شخص اپنی مصلحت سمجھ سکتا ہے۔

غرض مکان کے نہ ہونے کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ حافظ عارف شیرازیؒ بھی مقام امن کی ضرورت کو فرماتے ہیں۔

مقام امن و مے بے غش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود نہ ہے تو رفیق

ہاں شرط یہ ہے کہ مقام امن ہو گریڈ نہ ہو ورنہ پھر مکان سے خاک بھی فراغت نہیں ہوتی۔

اپنے اختیار کی جگہ نہ ہونے کی تکلیف پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہم ایک دفعہ عدن میں اترے۔ عدن مشہور جگہ ہے اولیہ بھی عوام میں مشہور

ہے کہ وہاں بہشت تھی مگر وہ جنت اسی قبل سے ہے کہ تمع بالمعید
خیر من ان ثواب غرض یہ غلط مشہور ہے کہ وہاں بہشت ہے۔ تو میں جب
عدن پہنچا ایک دوسا تھی اور بھی ہمراہ تھے۔ ہم کو عدن کی بیر کرتے کرتے
شام ہو گئی۔ سوچا کہ مسجد میں جا کر سو رہیں گے کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے وہاں
کسی کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسجد میں پہنچے۔ پھر سوچا کہ چپکے سے چھت
پر جا کر لیٹ رہیں۔ تاکہ مؤذن وغیرہ آکر نہ نکال دیں۔ چنانچہ چھت پر لیٹ کر بچھا
کر چپکے سے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مؤذن آیا۔ اُس نے آکر کہ نکلو کن
ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ ہم نے بھی بہت مسافروں کو مسجد سے نکالا ہے
آج اس کی قدر ہوگی۔ غرض ایک ساتھی نے مؤذن کو دھمکایا اور کہا کہ تمہیں
خبر نہیں کہ ہم آتے جاتے ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں اور
عربی میں کہا کہ تو جانتا نہیں ہم عرب ہیں۔ تو وہ مؤذن ذرا ٹھنڈا ہوا اور کہا کہ
کہ آکر اندر مسجد میں لیٹ جاؤ۔ اُس وقت ہم نچھت سے اتر کر مسجد کے
اندہ آ گئے اور پردہ چھوڑ کر لیٹے اور کہا کہ خدا تیرا بھلا کرے۔ تو واقعی مکان
نہ ہونے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم عاد کی تقلید | مگر مختصر مکان ضرورت کے لائق کافی ہے۔ زیادہ
اونچا مناسب نہیں۔ حدیث میں ہے و بیت یشکل
فیہ کہ مکان ایسا ہو جس میں بے تکلف داخل ہو سکے۔ زیادہ اونچا کہ نامکان کا
قوم عاد کی میراث ہے۔ قوم عاد شان کے لئے نئے نئے اونچے اونچے
مکان بنایا کرتے تھے۔ ہمارے یہاں تھانہ بھون میں بھی بعض مکان اندر سے

تو بہت ہی مختصر ہیں مگر دروازہ نہایت عالیشان اور نہایت بلند ہے۔ عذر
 یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوروں سے حفاظت نہ ہتی ہے مگر یہ سب امور
 فضول اور لغو ہیں۔ چور تو جہاں چوری کرنا چاہتے ہیں تو اونچے سے اونچا
 مکان بھی مانع نہیں ہو سکتا۔ وہ تو لقب کے ذریعہ سے کام کرتے ہیں بہت
 لوگ ایسے ہیں جن کے مکان بہت چھوٹے چھوٹے اور نیچے ہیں مگر چور
 سناری عمر میں بھی کبھی ان کے گھر نہیں آتے تو اونچے مکان کے لئے چور
 کا نہ آنا اور نیچے مکان کے واسطے چور کا آنا لازم نہیں۔ چور کے آنے کے
 اسباب اور ہیں۔

غرض بلا ضرورت اور بچا اور وسیع مکان بنانا فضول ہے بقدر ضرورت
 بنانا چاہئے۔ ہاں اگر کسی شخص کو ضرورت زیادہ ہو کہ اوجھل بھی ہوں اور جانور
 بھی ان کی مقدار کے موافق وسعت کرنے میں مضائقہ نہیں ہے غرض اللہ
 تعالیٰ نے نفس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا۔ ہاں بنیان مذموم پر نکیر فرمایا ہے
 چنانچہ اس کی ایک فرد کے باب میں فرمایا ہے کہ فانہار بہ فی نار جہنم
 اور ناکید و عبید کے لئے یہ بھی فرمایا۔ واللہ لا یمدی القوم الظالمین۔
 غرض یہاں دو مسجدوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک وہ مسجد جس کی بنائیں غرض
 باطل اور نیت فاسد پر تھی۔ اور ایک وہ جس میں غرض صحیح تھی۔ یہ تو مساجد خدا
 تعالیٰ جن کا ذکر اس مقام پر ہے۔ اب میں ان سے اور مساجد کی طرف حکم
 کا تعدیہ کروں گا۔ پھر مدارس کی طرف پھر عمارات کی طرف۔ مگر اول ایک
 غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری ہے۔

اہل فتاویٰ کی غلطی | یہاں پر بعض اہل فتاویٰ کو مسجد کے متعلق سنت غلطی ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ جب کسی قدیم مسجد کے

مقابلہ میں کوئی جدید مسجد بنی تو انہوں نے جدید پر فوراً مسجد ہزارہ کا حکم لگایا کہ یہ مسجد فساد اور لڑائی کی وجہ سے ہے اور محض تقاضا پر بنی ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ اگر نیت مذکورہ ہے تو مصیبت ضرور ہے مگر اس سے یہ حکم نکلنا کہ مسجد ہزارہ ہے کیسے صحیح ہے۔ عزم جو مسجد جدید بنی اس کو مسجد ہزارہ فوراً کہہ دیا اور اشیٰ اذا ثبتت ثبت بلوازمہ ہی کے لاعدہ سے بعض اس سے آگے بڑھے کہ اس کے جملہ نے اور گرا نے کا حکم کر دیا بلکہ شک مسجد ہزارہ کا تو یہی حکم ہے مگر پہلے یہ تو ثابت ہو جاوے کہ یہ مسجد ہزارہ ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی تو بقیہ تقریعات ہو سکتی ہیں۔ تو جو مسجد دیا اور تقاضا کے لئے بنائی جاوے مجھے اس کے مسجد ہزارہ کہنے میں کلام ہے۔

اگر کوئی کہے کہ مسجد ہزارہ پر قیاس ہے تو میں کہوں گا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ مقیس علیہ میں تو درحقیقت مسجد ہی بنانے کی نیت نہ تھی کیونکہ ان کے اعتقاد سے مسجد بنانا موجب تقرب نہ تھا۔ بخلاف مقیس کے کہ وہاں ہانی مسجد بنانے ہی کی نیت کر رہا ہے اور مسجد بنانے کے موجب کو تقرب سمجھتا ہے گو اس میں نیت فساد بھی ملی ہوئی ہے۔ تو فساد نیت کو فساد عقیدہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

اصل یہ ہے کہ مساجد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مسجد صلاۃ، ایک مسجد ہزارہ، ایک مسجد صلاۃ ہزار یعنی ایک تو وہ محض نماز کے لئے ہو اور ایک وہ جو محض ہزار

کے لئے ہوا اور ایک وہ جو اضرار اور نماز دونوں کے لئے ہو۔ تو جو محض اضرار کے لئے ہو وہ مسجد اضرار ہے اور جو نماز اور اضرار دونوں کے لئے ہو وہ مسجد اضرار نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ مسجد اضرار کے لئے اصل شرط یہ ہے کہ مسجد ہی بنانے کی نیت نہ ہو جو حاصل ہے آیت کا اور جب یہ شرط مستحق نہ ہو گویا اور کوئی دوسری غرض بھی شامل ہو تو مسجد اضرار نہ ہوگی۔ اس لئے احکام ظاہری میں وہ مسجد ہے گو عند اللہ وہ مقبول نہ ہو۔

جیسے کوئی شخص کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور نیت خالص نہ تھی تو گو وہ عند اللہ شہید نہ ہو مگر ظاہری احکام شہید کے تو اس پر لگائے ہی جاویں گے غرض مسجدیت اور مقبولیت میں تلازم نہیں۔ فقہاء جن کی شان یہ تھی کہ لا یقادروا شیئاً ولا کبیرۃ الا احصاھا کہ تمام جوئیات کا انہوں نے احاطہ کیا ہے مگر یہ جزئی کہیں ان سے منقول نہیں کہ مسجد بہ نیت دیا وغیرہ احکام میں بھی مسجد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب منقول ہوئے کا دعویٰ کریں تو ہرمانی کر کے دکھائیں ہم نے کسی مجتہد سے کہیں یہ جزئی منقول نہیں دیکھی۔ باوجودیکہ فقہاء کے زمانہ میں بھی اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر فقہاء نے کہیں یہ تصریح نہیں کی حالانکہ احکام مساجد کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اور مسجد ہونا نہ ہونا احکام فقہ میں سے ہے۔ پھر عدم تعرض دلیل ہے اس امر کی کہ مسجد تقاضا وغیرہ کی نیت سے بنانا احکام ظاہری اور فقہی کے اعتبار سے مسجد ہی کا حکم رکھتی ہے۔ لہذا ہر مسجد کو ضرر کہہ دینا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

پھر جب ایسی مسجد مسجد اضرار کے حکم میں نہیں ہو سکتی تو یہ خیال کر کے کہ

یہ مسجد ضرار ہے اس کے ویران کرنے کی کوشش جائز نہیں ہو سکتی۔ پھر کسی کی نیت پر فتویٰ کا مدار کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ نیت کا علم کسی کو سوائے خدا کے نہیں ہو سکتا۔ پہلے اس شخص سے تو تحقیق کر لو جو بانی مسجد ہے ممکن ہے کہ اس کی نیت اچھی ہو۔ راور وٹاں تو نیت کا حال وحی سے معلوم ہو گیا تھا اور اب بوجہ انقطاع وحی ہمیں نیت کا حال معلوم ہو نہیں سکتا، اور جس طرح کسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے اسی طرح کسی مدرسہ پر بھی مدرسہ ضرار کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اس لئے کہ مسجد دار العمل ہے اور مدرسہ دار العلم ہے۔

در سے اور کھالیں | جب ایک شہر میں مساجد متعدد ہو سکتی ہیں تو مدارس کے متعدد ہونے میں کیا مضائقہ ہے۔ البتہ اسی طرح

دو دو یا تین تین مدرسے چلانے سے کیا فائدہ جیسے مدارس آج کل چل رہے ہیں اور چلتے ہیں کہ جب قربانی کے دن آئے تو جہاں مدارس متعدد ہیں وہاں گھر گھر مدرسہ والے بھاگے پھرتے ہیں۔ پھر ہر ایک اپنے مدرسہ کے لئے کھال لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جانوروں کی کھال اترنے سے پہلے آدمیوں کی کھال اترنے لگتی ہے۔ اس قدر ذلیل افعال سے غیرت بھی تو نہیں آتی! ایسے مدرسہ کے چلانے سے کیا فائدہ؟ ایسی صورت میں تو مدرسہ والوں کو چاہئے کہ ایک جگہ دو مدرسے چلانے کا نام بھی نہ لیں۔ اور کھال کی کوشش تو مدرسہ والوں کو کسی حال میں بھی مناسب نہیں گو ایک ہی مدرسہ ہو۔ اس میں دوسرے اہل حاجت سے کشمکش ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں پہلے سے قربانی کی کھال موڈلوں کو دینے کی عادت تھی وہاں موڈلوں کی کھال اترتی ہے۔

جہاں بقرعید کے دن آئے اور مؤذنوں نے مدرسہ والوں کو دیکھا، کو سنا شروع کر دیا کہ خدا ان مدرسہ والوں کو کھودے۔ انہوں نے ہماری آمدنی تباہ کر دی۔ غرض کمال کے قصہ میں مولویوں سے اکثر لوگ ناخوش ہیں تو علماء بلا ضرورت کیوں مبعوض بنیں۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو دستاویز پر دستخط نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے عداوت ہوتی ہے۔ اسی طرح علماء کو کمال کے قصہ میں بھی نہ پڑنا چاہئے کیونکہ یہ بھی باعث عداوت ہے۔ اگر کہیں سے آگئی لے لی ورنہ پھر نے پھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدرسہ دیوبند پھر غنیمت ہے کہ وہ اس طرح کمالوں وغیرہ پر زور نہیں دیتے بلکہ یہ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں اوروں کا خیال کرتے ہو وہاں ہمارا بھی خیال کہ لینا۔ غرض علماء کو آزاد رہنا مناسب ہے۔ خوب کہا ہے۔

زیر بازند در خفاں کہ شرم و آید خوشتر آن سرو کہ از بند غم آزاد آید
 خصوص جہاں کئی مدرسہ ہیں وہاں تو بہت ہی جھگڑا ہے اور کسی
 کا کسی پر بس تو چلتا نہیں۔ لہذا مسجد حزار و مدرسہ حزار کے لقب سے ملقب
 کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں۔ حالانکہ صاف اور واضح طور سے قرآن
 میں ایسے القاب سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ولاتنابزوا باللقاب
 بلکہ اگر واقعی بھی کسی کا کوئی بڑا لقب ہو تو پڑانے کی نیت سے بھی نہ
 کہنا چاہئے۔

تعمیر مساجد اور احتیاط | اب میں خاص مسجد کی خاص عمارت سے مطلق
مساجد کی عمارت عامہ کی طرف حکم کا تعدیہ
کرتا ہوں اور مساجد کی عمارت میں جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں، ان کا مختصر
بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل لوگ تعمیر مساجد میں اپنے کو شتر بے تہار سمجھتے ہیں کسی
قسم کی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے اور اس جواب کو کافی خیال کرتے
ہیں کہ ہم اپنا گھر تو نہیں بناتے۔ حالانکہ یہ جواب بالکل نا کافی ہے کیونکہ خدا
کے گھر میں تو بدرجہ اولیٰ احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہاں احتیاط نہ کرنا زیادہ
رنج و ملال کی بات ہے۔ چنانچہ مساجد میں گنبد کو ضروری خیال کرتے ہیں اور
استرکاری تو درجہ فرائض میں سے ہے۔ بلا ان امور کے تو مسجد مسجد ہی
نہیں ہو سکتی۔ منارہ کو اس قدر طویل کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں۔ اور منارہ
کی طوالت کی اکثر یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ دُور سے نظر آوے کہ مسجد ہے
مگر یہ وجہ بھی صحیح نہیں۔ بعض دفعہ آڑ ہو جاتی ہے تو طویل منارہ بھی دُور سے
نظر نہیں آتا۔

علاوہ ازیں دُور سے نظر آنا بھی ضروری نہیں۔ منارہ بنانے کی اصل
وجہ تو صرف یہ ہے کہ مسجد و دوسری عمارات سے مشتبہ نہ ہو۔ منارہ مسجد
ہونے کی علامت ہے اور وہ علامت نفس منارہ ہے نہ کہ منارہ کا اس قدر
طول و طویل ہونا۔ سو علامت کے لئے چھوٹے چھوٹے گز گز بھر کے منارے
کافی ہیں۔ یا بجائے منارہ کے اور کوئی علامت کر دی جائے۔

بعض لوگ طوالت منارہ کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں شان اسلام ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات ہے تو شان کے برابر تو لمبا ہونا چاہئے تھا۔ پھر تو سب مساجد کے منارے کم از کم قطب کی لاٹھ کے برابر تو ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسجد بٹتا تو دشوار ہی ہو جاتی ہے۔ پس ایک منارہ پر ہی عمریں تمام ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ قطب کی لاٹھ کی بابت مشہور ہے کہ بادشاہ کا مسجد بنانے کا قصد تھا مگر اس وقت تک ایک ہی منارہ بنا تھا کہ بادشاہ صاحب چل بسے۔ دوسرا منارہ نہ بنا اور نہ پوری مسجد بنی ورنہ معلوم نہیں کیا کیا تکلفا ہوتے۔ ہماری ان رسوم سے ہماری مساجد کی واقعی وہی حالت ہو رہی ہے کہ مساجد عامۃ وہی خراب۔ کہ ظاہر میں تو مساجد آباد ہیں مگر باطن میں خراب ہیں۔ ان میں روح نہیں فقط ظاہر ہی ظاہر ہے۔

چنانچہ بیٹی کی یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو دہان کی مساجد جیسے حد آباد ہیں۔ لیکن اور بہت جھاڑ قانون فروش فروش مگر سنت کے خلاف جماعت میں متفرق طور پر آدمی کھڑے رہتے ہیں اور پورے طور سے صف بندی بھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ مگر مکرہ کی تقلید ہے مگر دہان تو خط مستقیم کھینچتا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ خانہ کعبہ کے رخ پر نماز پڑھتے ہیں اس لئے پورے طور سے صف بندی دشوار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اکثر متفرق طور پر صفوف رہتی ہیں۔ مگر بیٹی میں کوئی عذر نہیں۔ بیٹی والے نماز کے افعال و ہیئت میں اکثر مکہ والوں کی تقلید کرتے ہیں۔ امام و مؤذن بھی

زیادہ تر عرب ہی ہیں مگر یہ سب دین کی ظاہری صورت ہے اور باطنی حالت یہ ہے کہ مہر سے پیر تک بدعات میں غرق ہیں۔

ایک ہمارے دوست طالب علم بمبئی میں ملے اور قصہ بیان کیا کہ ان سے کسی نے شیخ سدو کے بکرے کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے نہ سنا سنا کہہ دیا بس ٹکوریہ گویا۔ اب جس مسجد میں جاتے ہیں وہاں حکم ہوتا ہے کہ نکالو وہابی ہے۔ اس جہالت کی بھی کوئی حد ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں ہے ومن اظلم ممن منع مساجدا للہ ان ینذکر فیہا اسمہ وسعی فی خواجہا۔ غرض جس جگہ اور جس مسجد میں جاتے ہیں وہابی وہابی کہہ کر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مسجد شافعیہ کی تختی وہاں سجا کر نماز پڑھی۔ میں نے کہا کہ یہاں فتویٰ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ دیا ہوتا کہ مجھے معلوم نہیں۔

غرض یہ بہانہ محض لغو ہے کہ مسجد کی زینت و آرائش سے شک اسلام بڑھتی ہے۔ اسلام کی شوکت تو اتباع احکام سے بڑھتی ہے۔ اگر ان کی شوکت سے شوکت اسلام بڑھا کرتی تو جس زمانہ میں شوکت اسلام عروج پر تھی اس زمانہ میں ان باتوں کا ضرور وجود ہوتا مگر ان چیزوں کا کہیں پتہ نہیں۔

دیکھئے حضرت عمرؓ کتنے بڑے صاحب شوکت و سلطنت و سیاست تھے اور کس قدر عالی دماغ اور بلند حوصلہ تھے۔ لیکن جب مسجد نبویؐ بنوانے لگے تو بخاری میں ہے کہ مستری سے فرمایا کہ اکن الناس من الجور والبدو یعنی مسجد ایسی بناؤ کہ گرمی اور بارش سے بچاؤ ہو جاوے۔ چنانچہ حضرت

عمر خانی نے باوجود کثرت فتوحات کے نقش و نگار کی اجازت نہیں دی۔ تو اس زمانہ میں قلت زینت مساجد کی وجہ سے کیا عروج اسلام میں کچھ کمی آگئی تھی یہ گز نہیں بلکہ ایسا عروج تھا کہ آج مسلمان اس کو ترستے ہیں۔

تھانہ بھولن کے اسٹیشن پر جب مسجد بنی ہے تو معمار نے اس میں نقش و نگار بھی نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ خر بوزہ اور تر بوزہ بنانے شروع کر دیئے۔ منتظم نے روکا کہ یہ قصہ مدت کرو اور میرا حوالہ دیا کہ وہ پسند نہ کرے گا۔ معمار نے کہا کہ اگر وہ پسند نہ کرے گا تو مزدوری نہ دینا۔ منتظم نے کہا کہ یہ تو یقینی امر ہے کہ وہ پسند نہ کریں گے۔ پھر مزدوری بھی یقینی طور پر نہ ملے گی۔ معمار نے اس کو بھی منظور کیا۔ پھر میرا مسجد دیکھنے کی غرض سے وٹاں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے سب نقش و نگار دیکھا کہ صاف کرا دیئے۔ اور معمار کو موافق و مددہ دونوں بوجہ قاعدہ شرعیہ اجازت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اگر مسجد میں اس طرح سے نقش و نگار کئے جاویں تو مسجد مسجد نہیں رہتی بلکہ تماشا گاہ ہو جاتی ہے کہ سیاح اس کو دیکھنے کو آتے ہیں اور نمازی بھی اگر وٹاں نماز پڑھتے ہیں تو خیال نقش و نگار کی طرف رہتا ہے۔ نماز کی طرف نہیں رہتا۔ جب مساجد میں ان خرافات کی اجازت نہیں اور مساجد میں یہ خرافات فضول ہیں حالانکہ ان کی زینت یا شوکت میں ایک گونہ دینی مصلحت بھی محتمل ہے تو بقیہ عمارات میں بدرجہ اولیٰ یہ قصہ فضول ہے۔

مکان اور تقویٰ | غرض عمارات میں ریا و تفاخر و اسراف سے نحر لازم ہے۔ ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کی ضرورت ہے۔

اگر دونوں جمع ہو جائیں سبحان اللہ! ورنہ صرف تقویٰ بھی بدرجہ اعلیٰ کافی ہے اور تقویٰ اور رضوان میں جو فرق ہے اُس کو بیان کرتا ہوں۔

طلب رضوان جو جو ریات سے ہے اور تقویٰ عدمیات سے یعنی طلب رضوان کا حاصل ثواب کے لئے فعل مامورات ہے خواہ واجب ہوں یا مستحب اور تقویٰ کا حاصل استراذ عن المنہیات ہے۔ پھر تقویٰ اور رضوان کو یہاں لفظ واو سے جمع کیا گیا ہے اور لفظ واو ہر چند کہ جمع کے لئے آتا ہے مگر اجتماع کے لئے نہیں آتا۔ پس ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کا جمع کرنا ضروری نہیں کیونکہ عمارت کی دو قسمیں ہیں یعنی عمارت جیسے مساجد وغیرہ میں تو رضوان و تقویٰ کا اجتماع ہوتا ہے کیونکہ نیت بھی ثواب کی ہوتی ہے اور خلاف شرع افعال و نیت سے بھی بچنا ضروری ہوتا ہے اور اگر اپنا مکان بناویں تو اس میں تقویٰ تو ہر حال میں ضروری ہے لیکن رضوان و ثواب کی رعایت قدرے مشکل ہے۔ اگر اس میں بھی رضوان و ثواب کا قصد شرعاً ضروری ہوتا تو ہم اس صورت میں مکان بنانے میں خوشنودی خداوندی کی آخر کیا نیت کہ تلے تکلف ہی کہنا پڑتا۔ چاہے حق تعالیٰ ہمیں کسی نیک نیت پر جو ہم بہ تکلف کر لیں، ثواب دے دیں مگر نیت کرنا خود ہوتا تکلف۔

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ اُن کے ایک مرید نے مکان بنا یا تھا تو وہ بزرگ مکان دیکھنے تشریف لائے۔ دریافت کیا کہ بھائی یہ روشن دان کیوں رکھا ہے۔ عرض کیا کہ حضور روشنی کے واسطے۔ فرمایا اگر یہ نیت کر لیتے کہ اس میں سے اذان کی آواز آوے گی تو ثواب بھی ملتا اور

دشمنی تو ہر صورت میں ہوتی ہی۔

مگر یہ سچ یہ ہے کہ ہر فعل میں اس قسم کی نیت ہے مشکل۔ یہ خاص لوگوں کا کام ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ عنوان کی رعایت ہر عمارت میں مامور بہ نہیں۔ ہاں اگر نیت خیر ہو اس کے مستحب ہونے میں کلام بھی نہیں مگر سب میں ایسی ہمت کہاں کہ کھانا کھاوے، چلے پھرے، ہر ایک فعل مباح میں کوئی خاص نیت کرے۔ عوام اگر نیت کریں گے بھی تو محض درجہ لفظ میں ہوگی نہ کہ حقیقت۔ بہر حال ہر کام میں ایسی نیت دشوار ہے۔ نتیجہ اس کا وہ ہوتا کہ غیر ضروری نیت کے ساتھ ضروری نیت بھی جھوٹ جاتی۔

جیسے ایک صاحب کو میں نے دیکھا میزان پڑھانے بیٹھے تو الحمد للہ میں تقریر کرنے لگے کہ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔ استغراق اور جنس اور عہد و ہنی اور عہد خارجی وغیرہ۔ حالت یہ تھی کہ وہ بیان کر رہے تھے اور طلباء ان کا منہ تک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ان پڑھنے والوں کے نزدیک تو الف لام کی ایک ہی قسم ہے یعنی استغراق۔ کیونکہ یہ بیچارے سب مستغرق ہو گئے۔ تو وہ بتدی جس نے میزان شروع کی ہے۔ ان باتوں کو کیا سمجھ سکتا ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہے۔ بجز اس کے کچھ نہیں کہ جب سمجھ میں نہ آوے تو چھوڑ دے تو نتیجہ اس دشواری کا اکثر ضروری چیز کا بھی ترک ہوتا ہے۔

اکثر واعظین اس قسم کی حکایات عوام کے سامنے بیان کر دیتے ہیں اور ان کا درجہ بیان کرتے نہیں۔ عوام ان کو ضروری سمجھ جاتے ہیں۔ جس سے ان سب امور کا نتیجہ ترک عمل ہوتا ہے۔ اگر ہر عمارت میں طلبہ عنوان و ثواب

کی نیت کا مکلف بنایا جائے تو عوام تقویٰ کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے۔ عرص
 عمارت کے لئے دو چیزوں میں سے بطور مانعہ الخلو کے کسی ایک کی ضرورت
 ہے تقویٰ کی یا رضوان کی اور اس لفظ واؤ سے تقویٰ اور رضوان کا محتمل پایا جانا
 ضروری نہیں ہو گیا۔ کیونکہ یہاں تو واؤ سے فقط حکم میں دونوں کو جمع کرنا منظور
 ہے نہ کہ وجود میں اور وہ حکم ہے خیریت۔ تو یہاں جمع فی الخیریت مراد ہے
 کہ خیر ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ پس ہر شخص کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ ہر
 عمارت میں تقویٰ اور رضوان دونوں باتوں کو مجتمع کرے بلکہ بعض عمارت میں
 جہاں رضوان و ثواب کی نیت میں تکلف ہو، صرف تقویٰ بھی کافی ہے۔

اب تقویٰ کی مختصر فہرست بتلاتا ہوں جس میں سب سے
 مکان اور ضرورت پہلی بات تو یہ ہے کہ بے ضرورت مکان نہ بنائے

یہ بھی خلاف تقویٰ ہے۔ جب ضرورت ہی شدید ہو تو مجبوری ہے۔ حدیث
 میں آیا ہے کہ سب چیزوں میں اجر ملتا ہے مگر عمارت کہ اس میں اجر نہیں
 ملتا اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت میں زیادتی ہو ہی جاتی ہے اور
 میں خود اس خطبہ میں بتلاتا ہوں۔ کہیں ذرا سا گوشہ نکلا ہوا بڑا معلوم ہوتا ہے کہیں
 نیچا ہے اس کا مساوی کرنا ہے۔ کہیں صرف اس ضرورت سے کہ مقابلہ
 ٹھیک نہیں ہوتا کوئی چیز بنائی جاتی ہے۔ اگر دروازہ سے پورا تقابل نہیں
 ہوتا تو مقابلہ میں دروں کے نشان بلا ضرورت ڈالتے ہیں۔ عرص عمارت
 وبال ہے البتہ ضرورت مستثنیٰ ہے۔ حدیث میں اویعت یتداخل فیہ
 وارد ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کی ضرورت مختلف قسم کی ہوتی ہے

اس لئے اختصار بھی ہر اک کے لحاظ سے مختلف ہے۔

جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خالقاہ میں ایک شخص اٹھ دس روٹی کھایا کرتا تھا۔ لوگوں نے شکایت کی۔ بزرگ نے نصیحت کی کہ بھائی کم کھانا چاہئے۔ خیر الامور اوسطا تھا۔ اُس نے عرض کیا کہ حضرت میری خوراک چالیس روٹیاں ہے اس لئے میرا اوسط یہی ہے بلکہ اوسط سے بھی کم ہے عرض ہر شخص کی ضرورت جدا ہے۔

ایک شخص ہے کہ اُس کے گھوڑے وغیرہ بھی ہیں۔ اُس کو ان وجوہ سے بڑے مکان کی حاجت ہے۔ اس لئے ہر شخص کا اوسط جدا ہے غرض بعد ضرورت میں تعمیر کرنا چاہئے اور ضرورت سے زائد کو ترک کرنا چاہئے۔
خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو آرائش ہے اور ایک آرائش ہے آرائش کی مقدار تک تو مکانوں میں وسعت جائز ہے۔ مگر آرائش کا اہتمام مذموم ہے۔ مخصوص جب ساختہ میں نمائش بھی ہو۔ بس ہر عمارت میں یہ امر ضروری و قابل لحاظ ہے کہ یہ تعمیر آرائش کے واسطے یا آرائش و نمائش کے واسطے ہے۔ تو جو عمارتیں آرائش و نمائش کے واسطے ہوں وہ تقویٰ کے خلاف ہیں۔ اور اکثر عمارات تو ایسی ہی ہیں جن میں ضرورت کا لحاظ نہیں کیا جاتا چونکہ بعض مکانوں میں دروازے بہت بلند ہیں بلکہ بعض مکان تو ایسے ہیں کہ دروازہ تو نہایت عالیشان مگر اندر سے مکان بہت ہی مختصر۔ وہی مثل ہے کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا، کھول کے دیکھا تو آدھا بڑا۔ پرانی عمارتوں میں اکثر ایسے دروازے دیکھے جاتے ہیں جو ٹھیک اس خنجر کے مصداق ہیں۔

از نقش و نگار در دیوار شکستہ آثار پدید دست صنادید محم را
ان مکانوں میں اکثر مکان ایسے بنائے گئے ہیں کہ جس لاگت میں ان
کے دروازے بنے ہیں اتنی لاگت میں دو تین حویلیاں تیار ہو سکتی تھیں۔ تو اس
کو سوا آرائش بلکہ نمائش کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

میرے ایک عزیز بھتیجے انہوں نے تین سو روپیہ میں ایک حویلی خرید
لی جس میں ایسا عالیشان برج تھا کہ تین سو روپیہ کا تو وہی ہو گا اور اندر سے
مکان کچھ بھی نہیں۔ غرض آج کل شان اور فخر سے بہت کام لیا جاتا ہے۔
معمولی مکان بنانے سے عار آتی ہے۔

عشق اور وظیفہ | یہ عار وہ بلا ہے کہ انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی
عار ہی کی وجہ سے ابوطالب مقصود سے رہ گئے حالانکہ

وہ حضور کے عاشق اور بھائی تھے۔ حضور نے مرتے وقت ان سے فرمایا کہ
ایک دفعہ کلمہ کہہ دو۔ احب بہاری اس وقت ابو جہل بھی پاس بیٹھا تھا
کہنے لگا۔ ان ترغیب عن ملت قریش۔ تو ابوطالب حضور سے کہنے لگے
کہ میرے بھتیجے! میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا مگر لوگ کہیں گے کہ ابوطالب
نے عذاب کے ڈر سے اپنا دین چھوڑ دیا۔ غرض آخر کلمہ ان کی زبان سے
یہ نکلا ہو علی دین عبدالمطلب۔

غرض یہ عار وہ بلا ہے جس کی وجہ سے ابوطالب ایمان نہ لاسکے۔
پس اس کا علاج کریو اور اس کا علاج وظیفوں کا پڑھنا نہیں بلکہ عشق پر دیا
کر لے۔ یہ اس سے ضرور بھاتا رہے گا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کہ اس جامہ ز عشقے چاک شد
اور نہ حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سوائے
اے طیب جملہ علتہائے
اے دوائے نعت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما
اور فرماتے ہیں کہ

عشق آل شعلہ است کو چوں بر فروخت

ہر چہ ہر معشوق باقی جسد سوخت

تبع لا در قتل غیر حق براند
در گھر آخر کہ بعد لاما چہ ماند
ماند لا اللہ باقی جملہ رفت
مرحبا اے عشق شکر ت سوز رفت

اور خود یہ عشق بھی و طیفوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ صحبت سے پیدا ہوتا
ہے۔ جیسے خر لوزہ کو دیکھ کہ خر لوزہ رنگ بدلتا ہے پس اس کی تائید یہ ہے

قال را بگذار مرد و حال شو
پیش مرد کا ملے پا مال شو
تو عشق کے پیدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ عشاق کی صحبت اختیار کرو
یعنی ان کا اتباع اور انقیاد کرو جو وہ تجویز کریں اور تعلیم کریں اس پر عمل کرو
یاد رکھو وہ و خلیفہ نہ بناویں گے نہ وہ اپنے پاؤں دباویں گے بلکہ لوگوں کی
خدمت کراویں گے۔ ان امور کو جان و دل سے قبول کرنا چاہئے اگر نفس
کو ناگوار ہو

عبر کن در کار خضر اے رفاق
تا نہ گوید خضر و ہذا فراق
مگر یہ سختی چند ہی روز ہوتی ہے۔ پھر ان سے بڑھ کر کوئی شفق نہیں
ہوتا۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی ایک بزرگ

تھے۔ میں اُن کی خدمت میں دو دفعہ گیا۔ آخری مرتبہ اُن کی ایسی شفقت تھی کہ جب میں روانگی کی اجازت پچھتا تھا۔ فرماتے تھے کیا جلدی ہے۔ مگر اول مرتبہ لہجہ تند تھا اور خفگی نمایاں تھی۔

اکثر خفگی اور تندی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان حضرات کو خلاف سنت سے تنگی ہوتی ہے۔ چنانچہ مسجد میں جاتے وقت کوئی بایاں پیر پہلے رکھ دیتا تھا تو مولانا کو ناگوار ہوتا تھا اور غصہ اُچھاتا تھا۔ مجھ سے جس مرتبہ تند لہجہ میں بولے تھے اُس کی وجہ بھی یہ تھی کہ میں راستہ کو گیا تھا اور حدیث میں راستہ کو جانے کی ممانعت آئی ہے۔ لہذا خفگی ہوئی۔ مگر میں نے سمجھا کہ یہ خفگی میرے لئے اصلاح ہے۔ اس لئے ذرا ناگوار نہ ہوئی۔ بلکہ دوبارہ پھر حاضر ہوا۔ اُس وقت مولانا غایت شفقت سے پیش آئے اور حصین حصین کا درس شروع کر دیا اور حدیث وغیرہ کی اجازت دی اور بہت توجہ فرمائی۔

پس بزرگوں کی خفگی کو چند روز برداشت کر لو تو پھر غم کو وہ اپنی دولت سے رنگ دیں گے اور اگر خفگی کی وجہ سے کوئی اُن سے بھاگے تو ان حضرات کا اس میں کیا نقصان ہے اپنا ہی نقصان ہے۔ افسوس عشق کی طلب اور ذرا سی خفگی سے ناگوار رہے۔

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق
اور خود اُن کی یہ شان ہوتی ہے کہ اگر کوئی اُن کو بُرا بھی کہے تو اُن کو اس کی بھی پرواہ نہیں بقول حافظؒ
گر چہ بدنامی مست نزو عافلاں تا بخی خواہیم تنگ و نام را

نہ یہ تکلفات جانتے ہیں۔ تکلفات کے متعلق ان کا مذاق یہ ہوتا ہے
 کہ خرقہ کو بھی تکلف سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ
 ایں خرقہ کہ من دارم در دہن شراب اولی
 ویں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی
 اس شراب سے مراد شراب محبت ہے یعنی اس خرقہ کو شراب محبت
 میں ڈیونا چاہئے۔ ورنہ بدولن اس کے وہ آگ میں جلانے کے قابل ہے
 کما قالہ

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد
 اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد
 بہت لوگ خرقہ پہن کر عجب و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقت
 میں صوفی نہیں۔ الہی میں کھوٹ ہے۔ ان کو ابھی حجابہ کی ضرورت ہے تاکہ
 یہ خناس و مانع سے نکلے۔ اگر یہ خناس موجود ہے تو حقیقت میں وہ صوفی
 نہیں۔ جب یہ خناس نکل جاوے گا تب صوفی ہوگا۔ اس وقت یہ حال ہوگا
 کہ نہ جہا کی طلب رہے گی نہ عزت کی بلکہ ہر حال پر راضی ہو کر کہے گا کہ
 زندہ کنی عطاے تو و رہکشی فائے تو
 حال شدہ مبتلاے تو ہر چہ کنی رضاے تو
 جب یہ حالت ہو جاوے گی تب عشق پیدا ہو جاوے گا۔ اور جب عشق پیدا
 ہوگا اس سے نخوت خود بخود جاتی رہے گی۔ پس تفاخر کا علاج یہی ہے
 کہ عشق پیدا کرو اور جب تک عشق پیدا نہ ہوگا اس وقت تک عمارت میں لباس

میں وضع قطع میں ہر چیز میں یقیناً تفاخر پیدا ہوگا اور اُس سے بچنا دشوار اور قریب بہ محال ہوگا۔ غرض ایک امر تقویٰ کے خلاف تو یہ ہے کہ عمارت فضول اور بے ضرورت بناتے ہیں۔

تواضع اور رجم کا فقدان | دوسری چیز اُس فہرست کی یہ ہے کہ اپنی عمارت کی اصلاح کے لئے جس کی زمین پاس دیکھی دہائی تاکہ اپنی عمارت نہ بگڑے۔ صاحبوا! افسوس ہے کہ پہلے زمانہ میں تو کفار سلاطین بھی ایسا نہ کرتے تھے۔ پھر حیرت ہے کہ ہم مسلمان اور ضعیف القدرہ ہو کر یہ حرکتیں کریں

نوشیرواں بادشاہ تھا۔ جب اپنا محل بنانا چاہا تو ایک بڑے صیاد کا مکان محل کے قریب تھا جس کے ملائے کی ضرورت تھی ورنہ محل میں رہنچ رہتا تھا لگھاؤں نے دینے سے انکار کر دیا تو نوشیرواں نے اُس پر زور نہ دیا اور نہ جبر کیا بلکہ اپنا مکان ٹیڑھا ہی بنا لیا اور ایک گوشہ کے بگڑنے کا خیال نہ کیا۔ اصل یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں طبعاً یا عقلاً خلوص اور تواضع اور حفاظت حدود تھی۔ اسی لئے اُن کی تعمیرات پائدار اور مضبوط اور خوشنما بھی ہیں اور آج کل یہ حالت ہے کہ سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی ہے کہ کسی کی زمین پاس ہے اُس کو دیکھ کر آدمی باؤلا بن جاتا ہے کہ کسی طرح یہ بھی میرے مکان کے اندر آجائے۔ اور اگر کسی غریب اور کمزور کی ہے تو وزیر و زبانی عمارت کو تھوڑا تھوڑا دھڑکھکانا شروع کر دیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج کل تواضع اور رجم بالکل نہیں اور اس کے فقدان سے آخرت کا تو ضرر ہے ہی۔ مشاہدہ ہے

کہ عمارت بھی ٹاپا ڈار ہوتی ہے۔

تواضع کے ذکر پر اس کے متعلق ایک ضروری بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ تواضع سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تم چھوٹوں کو اپنے سر پر بٹھاؤ بلکہ یہ مطلب ہے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو کسی کا حق ضائع نہ کرو نہ کسی کا حق دباؤ اور بعض بزرگوں سے جو ایسے واقعات منقول ہیں کہ انہوں نے چھوٹوں کو سر ہانے بٹھالیا تو یہ غلبہ حال ہے۔ بعض اہل حال بزرگوں پر تواضع کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب ایک مرتبہ پائنتی بیٹھے تھے۔ حجام خط بنانے کے واسطے آیا تو آپ نے فرمایا کہ سر ہانے بیٹھ کر بنا دو۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ سر ہانے بیٹھ جاویں۔ فرمایا اگر تمہیں خط بنانا ہو، تو یہیں بیٹھ کر بنا دو، ورنہ پھر کسی وقت جب مجھے سر ہانے بیٹھا دیکھو اس وقت آکر بنا دینا۔ اب تو میں اٹھ کر سر ہانے نہیں بیٹھتا۔ وہ حجام مجبور ہو گیا اور سر ہانے بیٹھ کر ہی خط بنانا شروع کر دیا۔

مگر یہ غلبہ حال ہے۔ اس وقت مولانا پر کوئی خاص کیفیت تھی بسبب بزرگوں کا ایسا ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض دفعہ بزرگ جن پر اس حالت کا غلبہ نہیں ہوتا اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرتے ہیں کیونکہ انہیں فرائض سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم اس درجہ تواضع کریں گے تو چھوٹوں کو تکلیف ہوگی یا گرامی ہوگی یا اس کے لئے مضر ہوگا اس مصلحت سے وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ معاملہ چھوٹوں کا سا کرتے

ہیں اور تواضع نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی بزرگ تواضعاً ایسا کریں بھی تب بھی چھوٹوں کو نہ چاہئے کہ ان کے سر ہانے بیٹھیں اور حکم موکد اس سے مستثنیٰ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر ایسی تواضع کا خاص طور پر مذاق غالب تھا۔ چنانچہ ایک بار مولانا تھانہ بھون تشریف لائے اور آپ کا وعظ ہوا تو مولانا پائنتی بیٹھتے تھے اور ہماری قوم شیخ زادہ کو دیکھتے کہ وہ مولانا کے سر ہانے بیٹھتے تھے۔ مولانا تو قوم کے بھی شیخ زادہ تھے۔ اگر مولانا سر ہانے نہ بیٹھتے تھے تو ان لوگوں کو یہ زیبہ تھا کہ اس پلنگ کو خالی چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی نہ بیٹھتا۔ مگر اللہ بچائے ایسی شیخ زادگی سے بھی کہ کسی کی تعظیم و تکریم بھی نہ کریں۔ مگر مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ ان کو اپنے سر ہانے کسی کے بیٹھنے سے ذرا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تو قصداً پائنتی بیٹھتے تھے مگر بعض کا مذاق دوسرا ہوتا تھا۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرنا چاہئے۔ اس سے ان کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجھے عزیز مہیاں انشرف علی لکھا کرتے تھے۔ اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب خط میں مخدوم مکرم وغیرہ الفاظ لکھتے۔ میں نے ایک مرتبہ عریفہ لکھا کہ سہرت سے یہ تو توقع نہیں کہ حضرت چھوٹوں کے القاب سے مجھے یا و فرماویں اس لئے اگر حضرت عنایت فرما "وغیرہ تحریر فرمادیا کریں تو بھی گوارا کرونگا

پھر اس کے جواب میں جو خط آیا اس میں بھی وہی مخدوم و مکرم وغیرہ القاب موجود تھے۔

حضرت مولانا سلیم علیہ الرحمہ کا ذوق غالب ہے اور حکماء و شریع پر یہ مذاق غالب ہے کہ اگر کوئی چھوٹا شخص ان کی پائنتوں بیٹھتا ہے تو بیٹھنے مہینے ہیں۔ اہتمام کر کے اس کو اپنے سر ہانے نہیں بٹھلاتے۔ لیکن اگر وہ چھوٹا پہلے سے سر ہانے بیٹھا ہو تو خود اہتمام کر کے اس کے سر ہانے بھی جا کر نہیں بیٹھتے۔ مگر ہماری نخوت کی تو یہ حالت ہے کہ اگر کہیں مجلس میں جائیں اور کوئی غریب آدمی سر ہانے کی طرف پہلے سے بیٹھا ہو تو اس کو دھمکا کر پائنتی کی طرف کر کے خود سر ہانے بیٹھیں گے۔

عبادات اور نخوت
بجلا یہ تو عادات میں نخوت مٹی بعض مشکبران تو عبادات میں بھی نخوت کرتے ہیں۔ کاپی کی مسجد میں ایک داروغہ صاحب تشریف لائے اور ایک بچہ را گندھی مسٹر تاج بھی اسی مسجد میں آیا۔ داروغہ صاحب نے نماز بہت جلدی جلدی پڑھی جب وہ سلام پھیر چکے تو اس گندھی نے کہا کہ آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ داروغہ جی کو گندھی کی اصلاح بہت ناگوار معلوم ہوئی اور اس کو دھمکایا کہ تو ہمیں اصلاح دیتا ہے۔ گندھی نے کہا، صاحب چاہے آپ پڑھا بھی لیجئے مگر نماز کا اعادہ کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی اور لوگوں

لے اس بیان کے وقت حضرت زندہ تھے۔

نے جو وہاں حاضر تھے اُن سے کہا کہ وارو غریجی اس میں آپ کا نفقہ ان ہی کیا ہے آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ خیر انہوں نے مجبور ہو کر نماز کا اعادہ کیا۔ اب تو وہ گندھی صاحب مشہور ہو گئے۔ جدھر جاتے ہیں لوگ ہلاتے ہیں کہ حضرت یہاں آئیے۔ ہر ایک اپنے پاس اُس نے کی درخواست کرتا ہے۔ خوب عطربیل کی بکری ہوئی اور تعظیم تکریم بھی ہوئی۔ اور واقعی اُن کی یہ بات سچی بھی تعظیم کے لائق۔ دیکھئے ان وارو نے عبادات میں بھی نخوت سے کام لیا۔

ہماری اکثر یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو متواضع ہیں۔ بات بات پر خاکساری ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نصیحت کر دے تو یہ حال ہو جاتا ہے واذا قيل له اتق الله اخذته العزة بالاثمہ پس ہماری تواضع محض تصنع ہے بقول مولانا

کہ گپے آپسے دو غمیزنی از برائے مسک دو غمیزنی
مگر بناوٹ سے کام نہیں چل سکتا۔ نہ تصنع حق تعالیٰ پر مخفی رہ سکتا ہے۔
کار با اور است باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن
عرض یہ نخوت بہت ہی بُری چیز ہے اور یہ عشق ہی سے زائل ہوتی ہے اور عشق کے پیدا کرنے کی تدبیر جیسا اوپر مذکور ہوا صحبت عشاق ہے اور جب تک صحبت عشاق عیسر نہ ہو اس وقت تک یہ تدبیر کی جاوے کہ ذلت کے افعال اختیار کئے جائیں اور متواضعین کے طریقہ کو بتکلف دستور العمل بنایا جاوے۔ مثلاً کوئی مسجد میں نماز کی عرض سے آوے، کسے

یا شہ اس کے واسطے لوٹ بھر کر رکھ دیا یا اس کے جوتے اٹھا کر رکھ دیے
اس لئے کہ

النفس كالطفل ان تهمله شب على

حب الرضاع وان تفضمه ينظم

یعنی نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اس کو جیسے کاموں کی عادت ڈالو گے
اُسی کا اثر قبول کر لے گا۔ پس ابتداء ہی میں نفس کو ذلت کے کاموں کا عادی
کرو۔ پہلے ہی دن بڑے بننے کی فکر نہ کرو۔ پس جیسا ابھی مذکور ہوا ابتداء میں
یہ کام کرو کہ مسجد میں جا کر فرش بچھا دیا، اذان کہہ دی۔ کیونکہ آج کل لوگ اذان
کہنے کو بھی بہت عیب خیال کرتے ہیں اور مؤذن کو بہت ذلیل سمجھتے ہیں
اس سے نخوت کا علاج ہو جاوے گا۔ جن کی وجہ سے عمارات میں کسی کا حق
دبانے کا خیال ہو جاتا ہے۔ اگر تم سب کو اپنے سے بڑا سمجھو تو پھر ایسی
بے راہی کی کبھی ہمت نہ ہو۔

تعمیر میں خلوص کا اثر

غرض مکان بنانے میں اس کی رعایت رکھو کہ
کسی کی زمین نہ دباؤ۔ کسی کی زمین میں دروازہ نہ

کھولو۔ کسی کی ملک میں نالی نہ نکالو۔

مجھے ایک مکان کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے ایک مکان خریدا
اس مکان کا جو صدر دروازہ تھا اس کی بابت لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا
کہ یہ دروازہ دوسرے کی زمین میں بنا ہوا ہے۔ گو صدر دروازہ کے لائق وہی
جگہ تھی مگر میں نے اسے بند کر دیا اور بند بھی اس طرح کرایا کہ اینٹ نکلا

کہ بطور اتصال تربیع کے ردہ سے ردہ ملوادیاتاکہ کبھی ملک کاشتہ تک نہ رہے۔ اگر کوئی زمیندار اس مکان کو خریدتا تو ایسے موقع کو غنیمت خیال کرتا مہتمم تعمیر نے اس سمت میں باجارت مالکان زمین موریوں رکھ دی تھیں۔ میں نے ان کو بھی بند کرا دیا کیونکہ اب تو یہ تبرع ہے۔ پھر یہی حق سمجھا جانے لگے گا۔ تو مکان میں ان امور کا لحاظ رکھا جاوے۔

تیسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ تعمیر میں حرام مال نہ لگایا جاوے ورنہ بروئے حدیث ویرانی کی جڑ پکڑی ہے۔ تھانہ بھون میں پیر محمد صاحب کی مسجد عالمگیر کے وقت کی ہے جس کی دیواریں اور گنبد گارے سے کسے ہیں۔ مگر پائیداری کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ مال حلال تھا اور نیت میں خلوص تھا۔ اور جو شخص تعمیر میں ان امور کی رعایت نہ کر سکے تو مثل مشہور شعر گفتن پر ضرور، وہ تعمیر ہی نہ کرے۔ اور ان امور کی رعایت تو قدر ضرورت کی تعمیر میں ہے۔ باقی ضرورت سے زیادہ تعمیر تو اصل ہی سے ناپسند ہے اس کی نسبت ختم آیت پر فرماتے ہیں۔

واللہ لا یہدی الظالمین
والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔
کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے

یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے۔ اگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔ فرماتے ہیں۔

لا یزال بنیانہم الذی بنواریبۃ فی قلوبہم الا ان یقطع

قلوبہم واللہ علیم حکیم۔

ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان
دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ کیونکہ جس عزم سے بنائی تھی وہ
نہ ہوئی اور نیت کی قلعی کھل گئی وہ الگ۔ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی
عزم کوئی ارمان نہ نکلا۔ اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان
ہاں اُن کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاویں تو وہ ارمان
اُس وقت ختم ہو جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ اُن کو
شرارتوں کو جانتے ہیں۔ حکمت والے ہیں۔ مناسب سزا دیں گے۔
جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اُس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی ہے
حالت اُن کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی۔
عدت بھی مشترک ہے تمام عمارت میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارت
ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہوں
ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہو گئی۔ چنانچہ
اور مشاہدہ ہے کہ بُری نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اُس کو قیام نہیں
اب میں الان تقطع قلوبہم کے متعلق ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔

ختم کرتا ہوں۔

اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان ان
لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا۔ بجز اس کے کہ اُن
کے دل ہی قطع ہو جاویں اور یہ مرجاویں۔ تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے۔ کیونکہ

قلب اور موت

جب دل ہی نہ رہے گا جو محل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا۔ پس ایک تو یہ تو جبر ہے الا ان تقطع قلوبہم کی کہ بعد فنا و موت کے اس خاص حسرت سے راحت ہو جاوے گی۔

ایک تو جبر یہ بھی ہو سکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے کہ الا ان تقطع قلوبہم تاکید ہے وہ ام حسرت اور ارمان کی کہ ان کو حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹک نہ نہ ہو گی کیونکہ قلب کو موت نہیں آ سکتی۔ اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں ایک تو قلب جو مصنفہ صنوبری ہے۔

دوسرا قلب حقیقی جو محل ادراکات ہے۔ عقائد وغیرہ کا حصول بھی یہی قلب سے ہوتا ہے۔

یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اس کی بقا ضروری ہے اس وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اس لئے کہ کفر بھی باقی رہتا ہے۔ اخلاق جو ناپاک ہیں وہ بھی ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ عشق کا ذب بھی باقی رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوڑتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ بعض عشاق مرنے کے بعد اس غم سے رشتہ کار ہو جانے کا دعوے کرتے پھرتے ہیں، بالکل غلط ہے اس غم سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ ان کی کیفیات زائل ہوتی ہیں۔ عرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے کیونکہ قلب حقیقی کو موت نہیں۔ اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو

بھی دوام رہے گا۔ اس تقدیر پر الا ان تقطع قلوبہم میں اشتنا رہے
جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ولا عیب فیہم غیر ان سیوفہم
بھن فلول من قراع الکثائب

ای ان کان فیہم فہو ذاک

ولہذا لیس بعیب فلا عیب فیہم اصلاً

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں جیسے
قلب ہلاک ہو جاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہذا دوام حسم
وارمان بھی دوام ثابت ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ و رضوان
لئے ہونے کا۔ تو جو عمارت غیر تقویٰ و رضوان حق پر مبنی ہوں گی ان کے
کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور جس علم
کی بنا تقویٰ اور رضوان پر ہو وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے۔ واللہ علیہم
اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ حکم
ہیں کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل و تارک کو مناسب سزا
سزا دیتے ہیں۔

الحمد للہ! بیان ختم ہو گیا۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے
آمین! والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ
اجمعین۔

مواظی انسانیکو پیدا

اگر ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :-

- ① ہم اللہ جل شانہ کا دیا ہوا رزق کھاتے ہیں لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے۔
- ② ہم اس کے ملک میں رہتے ہیں لیکن اس کے قانون کا احترام نہیں کرتے۔
- ③ ہم دوستوں کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے۔
- ④ ہم اس کے رسول مقبول کو برحق سمجھتے ہیں لیکن ان کے اسوۂ حسنہ کا اتباع نہیں کرتے۔
- ⑤ ہم اس کے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔
- ⑥ ہم موت کو یقینی سمجھتے ہیں لیکن دوسروں کو دفن ہوتے دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتے۔

- ⑦ ہم حساب روز محشر کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن دوسروں کی حق تلفی سے دریغ نہیں کرتے۔
- ⑧ ہم جنت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس کے حصول کی قطعاً فکر نہیں کرتے۔
- ⑨ ہم دوزخ کا یقین رکھتے ہیں لیکن اس کی آگ سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔
- ⑩ ہم شیطان اور نفس کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں لیکن ان کی خواہش پر چلنا ترک نہیں کرتے۔
- ⑪ ہم دوسروں سے خدمت خلق چاہتے ہیں لیکن خود کسی کی خدمت نہیں کرتے۔
- ⑫ ہم دوسروں سے ہمدردی چاہتے ہیں لیکن خود رشوت، سفارش یا واقفیت کے بغیر کسی کا کام نہیں کرتے۔

برائے نام مسلمان ہیں اور ایک جھوٹی اور منافقانہ زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی

لئے قرآن نے کہا ہے:-

لَا تَزِدُوهُمْ حُجَّتًا وَلَا تَقْوِیَ لِقَائِهِمْ وَلَا تَجْعَلْ لِحُجَّتِهِمْ سَبِيلًا
تَقُولُ بِحُجَّتِهِمْ رَاغِبًا

”تم یوں نہ کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ کہو کہ اسلام لائے اس لئے کہ
ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔“

وہ ہمارا عمل کتاب و سنت کے مطابق ہوتا۔ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ:-

أَوْعِظْ بِالْحَقِّ بِمَا نَزَّلْنَا وَالْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَةُ

لوگوں کو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت و موعظت سے بلاؤ

اور اس طرح اس دین حق کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچاؤ:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ
عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الفقہ)

وہی ہے جس نے اپنا رسول بھیجا ہدایت اور سچے دین کے ساتھ
تاکہ اُسے غالب کرے ہر دین پر۔

دوسروں کو دین کی طرف بلاتا ہوائے خود رہا ہم خود ہی دین حق پر مستقیم نہیں رہے

اور جنہیں ہم کافر کہتے ہیں وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنے اپنے دین، مذہب اور عقیدے

کو پھیلا سنے میں اجتماعی طور پر شب و روز مصروف ہیں کیونکہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں

ہر ممکن ذریعہ سے لاف مہمیت پھیلا رہے ہیں ہندوستان میں پورے جبر و تشدد کے

ساتھ مسلمانوں کو ہندو بنایا جا رہا ہے۔ مرزا کی بڑی جدوجہد کے ساتھ یورپ، امریکہ

اور افریقہ میں اپنے مراکز قائم کر کے اپنا دین پھیلا رہے ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف بابوں

نہ تاجم چھاپ رہے ہیں اور عیسائی یورپ کنیڈا اور امریکہ ایسے دور دراز ممالک سے
نیا بنی ممالک میں خدمت نخل اور تبلیغ دین مسیح کا فریضہ ادا کر رہے ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ
فریضہ تبلیغ کو بھلائے ہوئے ہیں اور عافیت کی نیند سو رہے ہیں۔

اس لئے موجودہ دینی بے بسی اور بے رغبتی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے
م خود دین کا ضروری علم حاصل کریں اور اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلائیں اور اپنے قرب و
د میں تبلیغی مہم چلائیں اور اس غرض کے لئے ان بزرگان دین کی کتابوں سے مدد لیں۔
لی ساری عمر وعظ و تبلیغ میں گزر گئی اور جن کی خدمت دین حق تعالیٰ کو اتنی پسند آتی
ہوں نے ان کے تمام سرمایہ شد و ہدایت کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ
نے کے اسباب پیدا کر دیئے۔ جس کی بدولت آج ہمارے پاس بیش بہا علمی، دینی
رقمانی ذخیرہ موجود ہے۔

ان علماء میں سرفہرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام نامی ہے
کے مواعظ و خطبات کا ایک ایک لفظ خود ان کا نظر ثانی کردہ محفوظ ہے ان میں تمام
ی، اجتماعی، قومی اور روحانی بیماریوں کا بے خطا علاج موجود ہے۔ ان میں آج بھی
رگی اور تنگی پائی جاتی ہے جو وعظ و ارشاد کے وقت تھی۔ یہ ایک ایسا مواظظی
یکلو پیڈیا ہے جس سے دین کے متعلق پوری پوری واقفیت و بصیرت حاصل
نی ہے اور طبیعت خود بخود مائل بہ اصلاح ہو سنے لگتی ہے۔

ہم نے ان مواظظ اشرفیہ کو آٹھ سو صفحات کی ۳ جلدوں میں شائع کرنے
م کیا ہے۔ ہر جلد بذات خود اپنے موضوع پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی
ن وقت بفضلہ تعالیٰ مندرجہ ذیل جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ دنیا و آخرت ۲۔ علم و عمل ۳۔ دین و دنیا ۴۔ میلاد النبی ۵۔ حقوق و فرائض ۶۔

نظام شریعت۔ ان میں سے جلد ۲-۳ اس وقت تیار ہے۔ اس سال سلسلہ میں ہم مندرجہ ذیل جلدیں شائع کر رہے ہیں۔ ۷۔ حقیقت عبادت ۸۔ حقیقت مال و سبھا ۹۔ فضائل صبر و شکر ۱۰۔ فضائل صوم و صلوٰۃ۔ ہم اس سیرٹ کے مستقل خریداروں کو موجودہ قیمتوں میں بھی ایک تہائی رعایت دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو یہ دینی لٹریچر قریباً اصل لاگت پر مل جاتا ہے۔ اس طرح ہماری نشر و اشاعت کا نفع براہ راست خریدار کو پہنچتا ہے اور بصورت ثواب ان حضرات کو پہنچتا ہے جو اس تبلیغی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے مالی امداد دیتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں آپ سے یہ اعانت چاہتے ہیں:-

- ۱۔ آپ اس سلسلہ کے مستقل خریدار بن کر اس سے دینی اور دنیوی فائدہ اٹھائیں۔
- ۲۔ اگر ممکن ہو تو ایک کی بجائے دو جلدیں خریدیں۔ ایک اپنی ذات اور گھر والوں کے مطالعہ کے لئے رکھیں اور دوسری اپنے دوستوں، ہمسایوں وغیرہ کو بڑھائیں۔
- ۳۔ اگر کچھ وقت نکال سکیں تو کسی مناسب جگہ پر اپنے قرب و جوار کے لوگوں کو جمع کر کے روزانہ یا ہفتہ وار اس کے کچھ صفحات پڑھ کر سنانے کا اہتمام کریں۔
- ۴۔ اپنے عزیزوں بزرگوں کے ایصالِ ثواب کیلئے زیادہ مقدار میں خرید کر عوام میں تقسیم فرمائیں۔
- ۵۔ اپنی زکوٰۃ یا مالی امداد سے اس تبلیغی منصوبہ کو جو ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتا ہے مستحکم بنائیں اور اس طرح مگر بیٹھے بٹھائے تبلیغی فریضہ ادا فرمائیں۔

ہر جلد کا حجم قریباً ۸۰ صفحات۔ سیاہ پارچہ کی سنہری ڈائیاں مضبوط جلد۔ قیمت ۱۲ روپے۔
محصولہ ڈاک فی جلد ۸۸ پیسے۔

آپ کا خادم:- منشی عبدالرحمن خاں

ناظم مکتبہ اشرف المعارف۔ چمپلیک۔ ملتان شہر۔

سلسلہ مواعظ اشرفیہ نمبر ۸

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حقیقت مال و حیاہ

از اضافات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

مرتبہ ✓
عفتی عکب الرحمن خاں

تالیف کردہ

مکتبہ اشرف المعارف، چمپا

ملتان شہر ————— قون نمبر ۲۶۷